ہمایون

اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا

بیادگارِ علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر۔ حامد علی خاں۔ بی۔ اے

جہاں نما

کیا مشرق اور مغرب کے نوجوان لامذہب ہیں؟

ہمارے ملک میں اکثر یہ شکایات سنی جاتی ہیں کہ موجودہ زمانہ کے نوجوان لامذہب ہیں۔ یہ شکایات اور ان کی وجہ صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہیں۔ ڈاکٹر جے۔ ایچ لینتھراپ بنگلور کے ایک مذہبی جلسہ میں فرماتے ہیں۔

موجودہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا طبقہ جسے ہم لامذہب سمجھتے ہیں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ امریکا میں بھی موجود ہے۔ امریکا میں اس وقت نصف سے کچھ زیادہ آبادی ایسی ہے جس کا تعلق دنیا کے کسی مذہب کے ساتھ نہیں ہے۔ شاید آپ یہ سن کر ان کافروں کو کسی مذہب میں واپس لانے کے لئے مبلغ بھیج دیں گے۔ مگر کبھی آپ نے سوچا کہ کیا وجہ ہے کہ اُن کا تعلق کسی مذہب کے ساتھ نہیں ہے۔

اس کا جواب فاضل مقرر اس طرح دیتے ہیں:۔ اول آپ دیکھیں گے کہ اُن کے ہلکے دل ناپائیدار مسرتوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ میرے خیال میں وہ اپنی خداداد قابلیتوں کو ضائع کر رہے ہیں اور وہ اطمینانِ قلب جو وہ حاصل کر سکتے تھے ان سے دور ہے۔ لیکن انہیں لامذہبوں کا ایک گروہ اور ہے یعنی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اُن لوگوں کا گروہ جو جدید سائنس کا مطالعہ اپنے طور پر کر رہے ہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ خیالات جدیدہ تمام اُن مذہبوں پر فوقیت رکھتے ہیں جن کا انحصار تمام تر توہمات پر ہے۔

ہندوستان کی طویل سیاحت کے بعد جو نتائج میں نے اخذ کئے ہیں مجھے بتاتے ہیں کہ ہندوستانیوں کا ایک بڑا طبقہ اسی نوعیت کے خیالات کا ہے جیسا کہ امریکا میں ہے دوسرے لفظوں میں میں کہوں گا کہ اس معاملہ میں دونوں ملکوں کے عقائد ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ میں بہت سے ایسے والدین کو جانتا ہوں جو اپنے بچوں کی لامذہبی کی شکایت کرتے ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ کسی زمانہ یا نسل کے مردوں یا عورتوں کی مذہبیت یا لامذہبیت کا پتہ کس طرح لگانا چاہئے تو میں کہوں گا کہ اس مرد، عورت یا بچے کے متعلق صرف یہ معلوم کرلو کہ کیا وہ کسی چیز کو متبرک سمجھتا ہے؟ اگر بوڑھے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے بڑھاپے کی عزت نوجوان نہیں کرتے اور اگر نوجوان سمجھتے ہیں کہ وہ اب اس چیز کی عبادت اسی طریق پر نہیں کر سکتے جس طریق پر اُن کے آباواجداد کرتے چلے آئے ہیں تو ہم اُن پر لامذہبی کا الزام نہیں لگا سکتے۔ میرے خیال میں آج دنیا میں کئی چیزیں ایسی ہیں جنہیں نوجوان ایسا ہی متبرک سمجھتے

ہیں جیسا کہ اُن کے آباؤ اجداد سمجھتے تھے۔ اور سب سے پہلی بات جو ہمیں یاد رکھنی چاہیئے یہی ہے کہ جب تک کوئی مرد یا عورت کسی چیز کو متبرک سمجھتا ہے وہ ایک مذہب کا پابند ہے۔ آج انسانیت کو اس قدر متبرک اور پاک سمجھا جاتا ہے کہ تاریخ عالم میں اُس کی مثال موجود نہیں ہے۔

اس وقت امریکا، انگلستان اور ہندوستان میں بچوں کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی تحریکات عمل پیرا ہیں۔ کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ ہر انسانی بچے کا پیدائشی حق ہے کہ دنیا کی خوش قسمتیوں میں ہمارا ساجھی ہو اور اپنی طاقتوں کو پوری طرح بسہولتِ تمام تکمیل تک پہنچائے۔

اب ریاستہائے متحدہ میں یہ تحریک ہو رہی ہے کہ سزائے موت کو قطعاً منسوخ کر دیا جائے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے مقابلہ میں انسانی زندگی کو زیادہ متبرک سمجھتے ہیں۔

انسان کا انسان سے رشتہ آج ایسا متبرک خیال کیا جا رہا ہے جیسا اس سے قبل کبھی نہ کیا گیا تھا۔ دنیا میں کبھی اس قدر سچے انسان نہیں ہوئے جس قدر آج ہیں۔ کیونکہ موجودہ سائنس ہمیں سکھاتا ہے کہ تجربہ گاہ میں مادہ کے ایک ذرہ کے متعلق جھوٹ بول کر تجربہ کے درست نتائج حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ ہم ریاضی کے متعلق جھوٹ بول کر صحیح جواب حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم اگر ڈاکٹر ہیں تو نسخہ کے متعلق جھوٹ بول کر مریض کو صحتیاب نہیں کر سکتے۔ ہر جگہ سائنس نے سچائی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ہمیں ان سچے اور متبرک انسانوں کی قدر کرنی چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نوجوان نسل انسانی زندگی کو ویسی ہی متبرک اور پاک سمجھتی ہے جیسا کہ ان کے آباؤ اجداد کسی کتاب، انسان، چھڑی یا پتھر کو سمجھتے تھے اور پھر نیک نیتی سے بھی۔ آپ کے چند بڑے بڑے معلموں کو جو آج بھی زندہ ہیں کہنا پڑا ہے کہ "گھر کی چار دیواری کے اندر خاوند اور بیوی کے درمیان، باپ ماں اور بچے کے درمیان یا شہر یا سلطنت کے اندر اور قوموں کے درمیان صرف ایک قانونِ زندگی جاری و ساری ہے، جس کا مطلب زندگی ہے اور موت نہیں" یہی خیر خواہی کا راستہ ہے۔ رسول نے کہا تھا کہ اپنے دشمنوں کو معاف کر دو خواہ تمہیں ستر دفعہ بھی کرنا پڑے۔ اگر کوئی تمہارے ساتھ ایک منزل چلے تو اُس کے ساتھ دو منزل چلو۔" سو اگر آپ اپنی مذہبی کتب میں تلاش کریں گے تو ان میں بھی انہی حقائق کو پائیں گے۔ صرف ایک رشتہ جس پر ہمارے قیام کا امکان ہے اور پھر جس پر ہم کامیابی کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں یہی ہے جسے موجودہ زمانہ کا نوجوان دل متبرک ترین سمجھتا ہے۔

ان لوگوں کو لامذہب نہ سمجھو۔ ان کے ایمان کو اپنے دل میں سوچو ممکن ہے ان کا ایمان تمہارے ایمان سے بہتر ہو۔ میں نوجوان مردوں اور عورتوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم نے کچھ پرانے اعتقادات چھوڑ دیتے ہیں تو تم مذہب سے بیگانہ نہیں ہو گئے کیونکہ مذہب کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

ترکی میں تعلیمِ نسواں

ان ترکی خواتین کی تعداد جو انہیں چند سال میں فارغ التحصیل ہوئی ہیں ایک سو دس تک پہنچ گئی ہے۔ ان میں سے بیس مدرسہ قانون سے کامیاب ہو کر نکلی ہیں، چودہ مدرسۂ طبیہ سے اور تیس مدرسۂ فنون سے۔ نو نے فلسفہ میں، سات نے تاریخ میں، نو نے جغرافیہ میں، اور باقیوں نے ادبیات میں امتیازی سندیں حاصل کی ہیں۔

مدرسۂ علوم نے بھی بہت عظیم الشان کام کیا ہے چنانچہ اس تعلیم گاہ نے اب تک اکثر خواتین کی تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ جن میں سے اکیس طبیعیات کی، انتیس کیمیا کی، چار صنعت کی، ایک کیمیائے طبعی کی، ایک ریاضی کی اور پانچ دانتوں کے امراض کی ماہر ہیں۔

لاسلکی کے ذریعہ سے تصویریں

تصاویر کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کرنے میں لاسلکی نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اُس کا مشاہدہ حال ہی میں کپتان فلٹن نے کرایا ہے۔

تصویر منتقل کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کا ایک بلاک تیار کیا جائے۔ پھر اس کو آلۂ ترسیل پر رکھ دیتے ہیں اور چار منٹ کے اندر تصویر ہزار ہا میل پر پہنچ جاتی ہے۔

صبح کے ساڑھے گیارہ بجے ایک عکاس نے کپتان فلٹن کی تصویر برقی روشنی سے لی۔ اس کے پندرہ منٹ بعد پلیٹ تیار ہو چکی تھی اور جونہی کہ وہ سوکھی اسے آلۂ ترسیل پر رکھ دیا گیا۔ ٹھیک چار منٹ بعد وصول کرنے والوں کو یہ تصویر کاغذ پر تیار ملی۔

گویا اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کسی ایک واقعہ کی تصویر لے کر سفری آلۂ ترسیل کے ذریعہ سے چند لمحوں میں ہزاروں کوس کے فاصلہ پر بھیجی جا سکے۔ اور امید کی جاتی ہے کہ جلد ہی ہر ڈاک خانہ سے اس طرح عام طور پر تصاویر بھیجی جا سکیں گی۔

پولیس ان مشینوں کے معاملہ میں خاص دلچسپی لے رہی ہے۔

دماغی اختلاف

نفسیات کے شایقین آج کل اتنی دلچسپی کسی دوسرے مسئلہ میں نہیں لے رہے جتنی ان مسائل میں لے رہے ہیں کہ ایک شخص کا دماغ دوسرے سے اختلاف کس لئے رکھتا ہے۔ مدرسوں میں صنعت گاہوں میں اور شفاخانوں میں نفسیات کے جن بڑے بڑے تجارب سے استفادہ کیا جاتا ہے اُن کی بنیاد بجائے لوگوں کے اتصال کے ان کے اختلاف پر ہوتی ہے۔ نفسیات کے اس تقریباً نئے سلسلہ میں بڑی کاوش کے بعد جو انکشافات ہوئے ہیں وہ عوام کے لئے بھی دلچسپی لیتے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:۔

اندھے آدمی کی سماعت ایک عام آدمی کی سماعت سے کچھ زیادہ تیز نہیں ہوتی۔

ہر سو میں سے تین یا چار آدمی ایسے ہوتے ہیں جو سرخ اور سبز رنگ میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ مردوں میں یہ نقص عورتوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

بعض عورتوں کے دائیں ہاتھ میں بہ مقابلہ دوسری عورتوں کے تگنی طاقت ہوتی ہے۔

ہماری عقل و شعور کی قوت اٹھارہ برس کی عمر تک بڑھتی رہتی ہے۔ دماغ کے قدیم ممتحنوں نے اس ترقی کو چودہ سال کی عمر تک محدود کیا ہے، لیکن یہ درست نہیں۔ شاید اٹھارہ برس کے بعد بھی ہم میں یہ خصوصیت باقی رہتی ہے۔ مگر ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہوا۔

حافظہ اور ایجاد و اختراع کا مادہ عمر کے بڑھنے سے گھٹتا ہے۔

سر کی شکل اور حجم کو کسی شخص کی دماغی قابلیتوں سے کچھ زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔

کالجوں کے پروفیسر اتنے ذہین نہیں ہوتے جتنا لوگوں کے خیال میں ان کو ہونا چاہئے۔

عورتیں مردوں کے مقابلہ میں زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کا حافظہ بھی زیادہ اچھا ہوتا ہے ذہانت کے لحاظ سے لڑکیاں لڑکوں کی بہ نسبت بہتر طالب علم ثابت ہوتی ہیں۔

ہر شخص تقریباً ہر پیشہ میں معمولی کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

اکثر پیشوں میں بہترین آدمی ادنیٰ درجہ کے آدمی سے تین یا چار گنا زیادہ قابلیت رکھتا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی ایک پیشہ میں نمایاں کامیابی حاصل کر لیتا ہے تو وہ کسی دوسرے شعبہ میں قطعاً ناکام بھی رہ سکتا ہے۔ نپولین نے ——— جو خود املا میں بڑی غلطیاں کیا کرتا تھا۔ جب ایک بلند پایہ ریاضی دان لاپلاس کو کابینہ میں ایک اہم عہدہ پر فائض کیا تو وہ اس کے لئے بالکل غیر موزوں ثابت ہوا۔

خلیفۃ اللہ فی الارض سے خطاب

اے مسلماں! یہ جان رکھ کہ تجھے   دہر میں کامیاب بننا ہے
اپنی ہمت جوان رکھ کہ تجھے   مصلحِ شیخ و شاب بننا ہے

مائلِ پستیٔ خیال نہ ہو   تجھ کو رفعت مآب بننا ہے
اپنے نامِ بلند کو نہ ڈبو   تجھ کو کیوان جناب بننا ہے

جستجوئے سکوں نہ کر، اک دن   منبعِ اضطراب بننا ہے
انقلابات سے نہ ڈر، اک دن   مصدرِ انقلاب بننا ہے

گرمِ اتمامِ کار ہونا ہے   قادرِ فتح باب بننا ہے
فائزِ اقتدار ہونا ہے   مالکِ رعب و داب بننا ہے

نیک و بد کا حساب لینا ہے   صاحبِ احتساب بننا ہے
عدل کو ہمرکاب لینا ہے   معدلت انتساب بننا ہے

پھر تجھے رحمتِ دمادم کا   نقطۂ انتخاب بننا ہے
پھر تری ذات کو دو عالم کا   مرکزِ انجذاب بننا ہے

بے خبر! قطرگی اسیر نہ بن   رشکِ بحر و سحاب بننا ہے
شرم کر، ذرۂ حقیر نہ بن   غیرتِ آفتاب بننا ہے

اٹھ اور اپنے کو ضوفشاں فرما
چارۂ ظلمتِ جہاں فرما

حکیم آزاد انصاری

قصرِ بخت نصر ثانی

شہرِ بابل کا قدیم حصہ دریائے فرات کے داہنے کنارے پر آباد تھا اور جدید شہر جسے بخت نصر ثانی نے تعمیر کرایا تھا بائیں کنارے پر بستا تھا۔ بادشاہ نے رعایا کے آرام کی غرض سے دریا پر ایک نادر پل بنایا تھا جو شب کو بند ہو جاتا تھا اور دن کو کھول دیا جاتا تھا۔ اس پل کے قریب ہی بادشاہ نبوپلیسر کا قدیم محل چار مساوی مربعوں پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے مغرب میں بخت نصر ثانی نے ایک عالی شان قلعہ نو مساوی مربعوں پر بنایا تھا جس کی فصیل شہری تھی اس محل کے کھنڈر القصر کے نام سے مشہور ہیں۔ ڈاکٹر کالڈیوی سوا سال تک اس کی تحقیقات کرتے رہے۔

یہ قلعۂ معلّیٰ جیسا کہ کتبہ سے ظاہر ہے ارسنت باب ایلی یعنی وسطِ شہر بابل میں بنایا گیا تھا۔ چونکہ عہدِ عتیق سے خاص قلعہ کا مقام یہی چلا آتا تھا اور شہر کے دیوتا مردوخ (مشتری) کے مندر عیسیٰ غیلا کو جانے والی سڑک اسی کے سامنے سے گذرتی تھی اس لئے بقول ڈاکٹر کالڈیوی بابل کا نام باب ایلی (دیوتاؤں کا دروازہ) رکھنا کچھ بعید نہ تھا۔ قصر کے جنوبی مشرقی گوشہ کے کھودنے سے بہت نیچے جا کر قدیم آبادی کے آثار نمودار ہوئے اور متعدد گلی ظروف، چقماق، پتھر کے ہتھیار اور مختلف اقسام کے اوزار وغیرہ بھی برآمد ہوئے [۱]۔

بعد فتح مصر بخت نصر ثانی نے اس عالی شان قصر کی تعمیر شروع کی جب تک جدید قصر زیرِ تعمیر رہا بادشاہ مذکور کا

---

[۱] ممالکِ بابل و اسیریا کے قدیم شہروں کے آثار جو شارعِ عام کے گرد و نواح میں واقع تھے ان کو اول اول سیاح ریگ کے ٹیلے تصور کرتے رہے لیکن شہرِ نینوہ اور بابل کی روایات سولہویں اور سترھویں صدیوں میں یورپین سیاحوں کی کشش کا باعث ہوئیں کچھ تو شوقِ تحقیق اور کچھ دفائن و خزائن کے لالچ نے غیر معمولی شوق قدیم شہروں کے کھودنے کا پیدا کر دیا۔

اٹلی کے باشندہ ڈیلاوال نے اپنے سفرنامہ میں آثارِ بابل و مقیار کا تذکرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ قصر کے ایک حصہ کو بھی کھودا گیا تھا اٹھارھویں صدی کے شروع میں ڈنمارک کے مشہور فاضل نائی بوہر (Niebuhr) نے شہرِ بابل کے کھنڈروں کی تحقیقات کی اور انہیں کے طفیل سے یہ مسئلہ طے ہوا کہ جو ٹیلے قصبہ حلہ کے متصل ہیں وہ شہرِ بابل کے آثار ہیں! اس صدی کے آخر میں مسٹر بی جم نے وضاحت کے ساتھ ان ٹیلوں کا حال قلمبند کیا جن کے نیچے شہرِ بابل کے آثار دبے ہوئے تھے۔

مسٹر ریچ، مسٹر بنگسن، موسیو فرزنل، موسیو اوپرٹ، سر ہنری لے یارڈ، مسٹر رسیم، اور ڈاکٹر کالڈیوی نے فرداً فرداً اور مختلف سنوں میں قسمت آزمائی کی تھی۔

قیام قدیم محل میں تھا۔ جدید قصر کی تکمیل ہوتے ہی قدیم محل گرا دیا گیا اور اس کی بنیاد پر دوسرا محل تعمیر کیا گیا۔ نیز قصر و محل کے درمیانی حصے کو ملبے اور گٹی سے بھر کر مشرقی حصہ کے برابر کر دیا تھا۔

اس قصر میں لاتعداد کمرے تھے۔ بادشاہ حامورابی کے عہد سے داد و ستد کا تعلق شاہی محل سے چلا آتا تھا۔ تمام قضیے اور جھگڑے یہیں طے ہوتے تھے[۵۱]۔ نیز تجارت، بیوپار، خرید و فروخت، لین دین جملہ معاملات کی تکمیل قصر کی چار دیواری کے اندر ہو جاتی تھی[۵۲]۔ الغرض قریب قریب تمام عدالتیں قصر کے اندر تھیں اور اُن کے لئے مکانات مخصوص تھے۔ علاوہ ازیں خاص خاص ارکانِ دولت اور دیگر ملازموں کو بقدرِ حیثیت و خدمت قصر کے مکانات رہنے کے لئے دیئے جاتے تھے۔ تمام شاہی کارخانے بھی اسی قلعہ کے ایک حصہ میں تھے اور جو اشیا بادشاہ کے استعمال میں آتی تھیں قلعہ ہی میں بنائی جاتی تھیں۔

قصر کی دیوار کے جنوبی مغربی گوشہ کے کمرے سے متعدد نہایت اعلیٰ سنگِ مرمر کے نامکمل مرتبان برآمد ہوئے ہیں۔ ایسے مرتبانوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے[۵۳]۔

مغرب کی جانب بادشاہ نبوپولیسر کے قدیم محل پر شاہی محل سرا جس میں باغِ آویزاں تھا تعمیر کی گئی تھی[۵۴]۔ اس محل سرا میں تین مدوّر چاہ بھی برآمد ہوئے ہیں۔ سہ چاہ ایک مختصر پیمانہ کے کمرے میں تھا جس کی دیواریں سطحِ آب تک گئی تھیں۔ چاہ کے گرد گٹی کی بھرتی دی گئی تھی تاکہ پانی صاف اور ستھرا رہے۔

چھتوں کے پرنالوں کے موہرے نہایت خوبصورت اور خوشنما تھے۔ بارش، غسل خانوں اور روزمرہ کا مستعمل

---

۵۱ عہدِ عتیق میں تو بادشاہ خود فیصلے کرتا تھا بعد میں حکام زیرِ نگرانی بادشاہِ وقت ہر قسم کے مقدمات فیصل کرنے لگے تھے۔

۵۲ اس کی شہادت ان کتبوں سے پہنچتی ہے جو جدید خاندانِ شاہانِ بابل کے عہد کے ہیں اُن پر مقامِ تکمیلِ اسناد یا نام عدالت کی بجائے "البیت شہر بابلی" کندہ ہے جس کا مطلب ہے "احاطۂ قلعہ محل"۔

۵۳ شاہانِ سلف اکثر تحائف کے طور پر سنگِ مرمر کے مرتبان اپنے ہمعصر بادشاہوں کو بھیجا کرتے تھے۔ خاندانِ کیانی کے مشہور بادشاہ بہمن دراز دست نے سنگِ مرمر کے مرتبانوں پر اپنا نام اور لقب کندہ کرا کر فرعونِ مصر اور شہر یارِ ایشیاء کوچک کو تحفۃً بھیجے تھے۔

۵۴ محل سرا کے کھودنے سے ایک قبر برآمد ہوئی جس میں ایک گلی تابوت رکھا ہوا تھا۔ تابوت مذکور کے اندر لاش کے ساتھ طلائی اور جڑاؤ زیور نیز ایک مستطیل منقش طلائی تختی برآمد ہوئی۔ اس تختی کے چاروں کونوں پر ایک ایک سوراخ ہے جس کی وجہ سے اسکو جوشن یا بازوبند کا ایک حصہ قیاس کیا گیا ہے۔ اس پر کسی مندر کا نقشہ ٹھپہ کیا ہوا ہے۔ بقول ڈاکٹر کالڈیوی سامانِ قبر سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نبوپولیسر کی لاش ہے۔

پانی نہایت عمدہ پختہ اور وسیع بیٹھی ہوئی موریوں اور نالیوں کے ذریعہ سے خارج ہوتا تھا۔

یہودی مورخ جوزیفس کا قول ہے کہ بادشاہ بخت نصر ثانی نے اس عالی شان قصر کو پندرہ روز کے عرصہ میں تعمیر کرایا تھا مورخ مذکور کا بیان مبالغہ آمیز تصور کیا جاتا تھا لیکن بخت نصر ثانی کا ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جو لندن کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس سے مورخ مذکور کے قول کی صداقت ہوئی۔

بخت نصر ثانی اپنے دوسرے کتبہ میں بیان کرتا ہے "تا پرتی نیسی (عجائب روزگار یعنی قصر) کی بنیاد نہایت مضبوط قائم کی ہے اور اس کو پختہ خشت و قیر سے پہاڑ کے برابر بلند بنایا ہے۔ اس کی چھت پر میں نے بڑے بڑے زبردست دیودار کے شہتیر ڈالے ہیں۔ اس کے کواڑوں پر جو دیودار کے ہیں تانبے کے پتر جڑوائے ہیں۔ ان کی چوکھٹیں اور چولیں برنجی ہیں۔ چاندی، سونا، جواہر اور تمام وہ بیش قیمت اشیا جو شوکت، دولت اور ثروت کا لازمہ ہیں نیز قابل قدر نادرات بے قیاس جمع کر کے اس محل کے شاہی خزانہ میں محفوظ کی ہیں۔" قصر کا عالیشان دروازہ مشرقی جانب تھا جس کے بیرونی حصہ پر گرگج بنے ہوئے تھے۔ اس شاندار اور وضعدار پھاٹک کے کواڑوں پر تانبے کی چادریں جڑی ہوئی تھیں۔ چوکھٹیں اور چولیں پیتل کی تھیں۔ ان پر نہایت خوشنما بیل بوٹے ٹھپہ کئے ہوئے تھے دیوی نن ماخ کے مندر کے متصل ہونے کی وجہ سے اس دروازہ کا نام باب بعلتی یعنی بیگم کا دروازہ تھا۔

قصر کی تین ڈیوڑھیاں نہایت وسیع تھیں۔ ان کے دونوں جانب محافظان محل، دربانوں، یساولوں اور چوبداروں کے لئے خوبصورت خوبصورت صحنچیاں بنائی گئی تھیں۔ ڈیوڑھیوں کے دروازے شان اور وضع میں صدر دروازہ کی طرح تھے۔ ہر ڈیوڑھی کے بعد ایک صحن تھا جس کے چاروں طرف خوش وضع اور خوش قطع دالان در دالان بنے ہوئے تھے۔ ہر صدر دالان جنوبی سمت میں بنایا گیا تھا تاکہ تمازت آفتاب سے پناہ ملے۔ بعض دالانوں اور صحنچیوں میں حکام کے اجلاس تھے۔ سب سے زیادہ خوبصورت اور وسیع دالان صحن کے جنوب کی طرف بنا ہوا تھا جس کو دربار عام کہتے تھے۔ اس کی دیواروں کا عرض چھ میٹر تھا[۱]۔ اس دالان کے تین دروازے صحن کے رخ کھلتے تھے۔ درمیانی دروازہ کے بالکل مقابل یا سامنے کی دیوار کے آثار میں ایک دوہرا طاق نہایت بلند اور وسیع آراستہ و مزین بنا ہوا تھا۔ یہ طاق کسریٰ کا ہمسر اور طاق نوفل سے برتر تھا اور اس میں بادشاہ بخت نصر ثانی کا تخت بچھا رہتا تھا۔

---

[۱] میٹر۔ ایک میٹر برابر ہے ۳۹.۳۷۰ انگریزی انچ کے یا ۳۹.۳۸۰ امریکن انچ کے۔

چونکہ اس کمرہ کی دیواریں دیگر کمروں کی دیواروں سے زیادہ عریض تھیں اس لئے قرین قیاس ہے کہ اس کمرے کی چھت ڈاٹ کی تھی۔

والان کی پیش عمارت (برآمدہ) کی روکار میں نہایت خوش رنگ و خوشنما منقش روغنی چوکے[۵۱] نصب تھے اس برآمدہ کے ستون اور فیل پائے بسنتی رنگ کے اور ان کے اوپری حصے نیلے تھے مگر ستون و سرستون کے اطراف سفید تھے۔ ستونوں کے سروں پر پیچ در پیچ رنگین تحریروں کا ایسا جال بنایا تھا کہ دیکھ کر عقل حیران ہوتی تھی[۵۲]۔ قصہ مختصر آرائش آسمانی و بسنتی رنگوں میں کی گئی تھی جو دیدنی ہے الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی۔ دیواروں پر رزم و بزم، شکار و دربار وغیرہ کے مناظر تصاویر میں دکھائے تھے جن کی مصوری کو دیکھ کر انسان عالم سکوت میں رہ جاتا تھا۔

چوکوں کی رنگ آمیزی سے اور غلطان و مشبک اشکال بنا کر ایسے جوڑ ملائے تھے کہ ہزاروں برس بدستور رہ کر کمالِ صناعی کا زبانِ حال سے اظہار کر رہے ہیں اور جن کو دیکھ کر آج کل کے صناعوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑتے ہیں۔ اس قصر کے در و دیوار کی سنگ تراشی، منبت کاری، نقاشی، مصوری اور دستکاری کمال درجہ کی تھی۔ اس عمارت میں بختنصر ثانی دربار کرتا تھا۔ سب اعلیٰ و ادنیٰ، چھوٹے بڑے اپنے اپنے پایہ مرتبہ پر آکر کھڑے ہوتے تھے۔ ارکینِ دولت بقدرِ منصب و درجہ دالانوں میں اور عوام صحن میں دست بستہ کھڑے ہو کر منتظرِ جلوۂ بادشاہی ہوتے تھے بادشاہ بختنصر تخت پر جلوس فرماتا تھا وہ مجرا گاہ میں تسلیمات و آداب بجالاتے تھے۔ موافق قدر و منزلت ہر ایک کو سرفرازی ہوتی تھی۔

گردشِ آسمان و انقلابِ لیل و نہار کو دیکھئے کہ قرب و جوار کے سب آثارِ قصر کی طرف ڈر کے مارے نہیں جاتے بھوتوں کا اکھاڑا سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں شب کو ہر حرف سے بھوت پریت نکل کر ناچتے کودتے ہیں۔

افسوس گردشِ افلاک نے اس عدیم المثال عمارت کے نام و نشان کو حرفِ غلط کی طرح صفحۂ زمین سے مٹا دیا۔ اب صرف تواریخ کی نوحہ خوانیاں رہ گئی ہیں۔

آں قصر کہ بر چرخ ہمے زد پہلو ۔۔۔ بر درگہِ او شہاں نہادندے رو
دیدیم کہ بر کنگرہ او فاختۂ ۔۔۔ بنشستہ ہمی گفت کہ کو کو کو کو

باغ آویزاں ۔ قصر مذکور کے اندر وہ مشہور باغ بھی تھا جس کا ہفت عجائبِ عالم میں شمار ہوا ہے واللہ

---

۵۱ اگر انصاف سے دیکھا جاتے تو پچیکاری خواہ وہ اشکال ہندسی ہوں یا پھول پتیاں ہوں عہدِ عتیق کے منقش روغنی چوکوں سے اخذ کی گئی ہیں۔

۵۲ اس کام کو فنِ عمارت کی اصطلاح میں غالب کہتے ہیں۔

اعلم کہ اس باغ کو یونانی مورخین نے باغ آویزاں کیوں لکھا ہے حالانکہ صحیح اصطلاح اس کے واسطے غلطان باغ ہے۔
بہرحال بروسس بابلی، ٹی سیاس، ہراڈوٹس، اسٹریبو، کرٹیس روفس، ڈائڈورس کے اقوال شاہد ہیں کہ اس باغ کو بادشاہ بخت‌نصر ثانی نے اپنی بیگم اموھیا[51] کی خوشنودی کے لئے بنایا تھا تاکہ بیگم مذکور کو اپنے وطن کی پہاڑیوں اور شاداب جنگلوں کا پورا لطف اس کفِ دست میدان میں حاصل ہو۔

بابل جیسے لق و دق میدان میں اپنی بیگم کی دل بستگی کے لئے مصنوعی پہاڑ اور جنگل بنانا پھر وہ نزہت افزا اور پُرلطافت باغ نمونۂ بہشت بریں لگانا جو دنیا کے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہو بخت‌نصر کی دولت و اقبال کا اعلیٰ ثبوت ہے۔

باغ مذکور مربع شکل میں تھا جس کا ہر ضلع ۴۴۰ (چار سو چالیس) فیٹ اور طبق بر طبق یا سیڑھی پر سیڑھی بلند ہوتا ہوا فصیل کی سطح تک پہنچ گیا تھا۔ ایک طبق یا چبوترے سے دوسرے چبوترے تک دس فیٹ کا فاصلہ تھا اور تمام چھتوں کو محراب دار بناتے ہوئے چلے گئے تھے۔ دونوں پہلوؤں میں نو نو گز چوڑی دیواریں اور چھتیں ڈاٹ کی تھیں یعنی ستونوں پر محراب بنا کر سولہ فیٹ طویل اور چار فیٹ عریض سنگین سلیں پاٹ دی تھیں۔ ان کے اوپر ایک تہ گھانس کی بچھا کر دوہری اینٹوں کا کھرنجہ قیر سے جما کر موٹی موٹی جست کی چادریں بچھادی تھیں۔ ان جست کی چادروں پر مٹی ڈال کر کیاریاں بنائی گئی تھیں لیکن کیاریوں میں اس قدر موٹی تہ مٹی کی دی تھی کہ بڑے بڑے درخت مثل سرو، شمشاد، بیدِ مجنون، انار، املی، سرس وغیرہ نشو و نما پاسکیں۔

یونانی اور رومن مورخوں کا بیان ہے کہ سب سے اوپر کے طبق یا چبوترہ پر پانی کھینچنے کی مشین اس خوبی سے لگائی گئی تھی کہ باہر سے معلوم نہیں ہوتی تھی۔ یہ مشین نلوں کے ذریعہ سے دریائے فرات اور اُس کی نہروں کا پانی کھینچ کر حوضوں میں بھرتی تھی اور وہاں سے پانی مختلف طبقوں کی کیاریوں میں تقسیم ہوتا تھا[52]۔ آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ باغ چار طبقوں کا تھا اور پائے جن پر محرابیں قائم کی گئی تھیں ایک دوسرے سے ساڑھے فیٹ کے فاصلہ پر قائم کئے گئے تھے۔ ہر پایہ کا دور بائیس فیٹ تھا۔

ڈاکٹر کالڈیوی کا قول ہے کہ دورانِ تحقیقات میں ایک باولی برآمد ہوئی جو نہایت عمیق اور وسیع تھی اور جس کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ درمیانی حصہ چوکور اور ادھر اُدھر ایک ایک مستطیل چاہ تھا۔ گمانِ غالب ہے کہ ان پر بہت بڑا

---

۵۱ اموہیا کو بگاڑ کر یونانی مورخوں نے امی تس یا امائی تس کر لیا تھا۔ یہ بیگم کے کاوس بادشاہِ ایران کی لڑکی تھی بادشاہ مذکور کا نام زبانِ ژند میں ہووک شاتارہ تھا۔

۵۲ مسٹر رسیم جن کا ذکر پہلے آچکا ہے بیان کرتے ہیں کہ دورانِ تحقیقات میں اس باغ کے سب سے بالائی طبقہ پر کچھ نل ایسے دیکھنے میں آئے جو پتھر کی سلوں میں گذر کر زیرین حصوں میں پہنچے تھے۔ کوڑے کرکٹ سے اٹ گئے تھے۔ صاف کرنے پر ہزاروں برس کے بعد بھی پانی بھرا ہوا پایا۔

رہٹ لگا ہوا تھا جو شب و روز چلتا ہوگا۔[ا۵]

ہر دو مستطیل چاہ سے رہٹ کی ڈولچیاں ہو کر گذرتی تھیں اور پانی کسی قریب کے خزانہ میں جمع ہو کر مختلف طبقوں کے حوضوں میں تقسیم ہوتا تھا جہاں سے کیاریوں میں دوڑایا جاتا تھا۔[۵۲]

اس قدر بلندی پر نونہالانِ باغ کی پرورش کے لئے جو ذرائع آب رسانی کے اس قدیم زمانہ میں اختیار کئے گئے تھے وہ قابلِ ستائش ہیں۔

ہر قدیم مورخ نے اس بے نظیر باغ کی ثنا و صفت میں خوب نغمہ سرائی کی ہے اُن کے خیال کا اظہار مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے

ہر کہ می خواہد کہ بیند شکلِ فردوسِ بریں   گو بیا ایں قصر و ایں باغِ ہمایوں را ببیں

کبھی اس باغ میں بارہ دربان، سرد خانے، نشاط خانے، سیرگاہیں، بزم گاہیں وغیرہ وغیرہ موقع موقع اور سلیقہ سے بنی ہوئی تھیں اور چاروں طرف نہریں جاری تھیں۔ جا بجا حوض بنے ہوئے تھے۔ پانی لہراتا تھا۔ فوارے چھوٹتے تھے۔ پھول کھلتے تھے طائرانِ خوش الحان نغمہ سرائی کرتے تھے۔

سب سے اوپری منزل سے کوسوں تک سبزہ زار کا نظارہ اور دریائے فرات کا پیچ در پیچ لہرانا عجیب فرحت افزا اور حیات بخش تھا۔ عجیب زمانہ تھا جب کہ یہ باغ کمالِ نزہت و طراوت کے باعث رشکِ ارم نظر آتا تھا اور اس کی سیر سے ناظرین و سیاحین کو بہشتِ شداد کا لطف حاصل ہوتا تھا مگر زمانۂ ناسازگار نے سب ویران کر دیا۔ وہ سرو جو قدِ یار پر طعنہ مارتے تھے۔ وہ پھول جو دلبروں کے لبوں پر ہنستے تھے نام کو بھی نہ رہے۔ روشیں مٹ گئیں۔ نہریں ٹوٹ گئیں۔ حوض بند ہو گئے۔ فوارے چپ ہو گئے۔ کوئیں اندھے ہو گئے آبشاروں کا نام نہ رہا الغرض

جلتا ہے اب پڑا خس و خاشاک میں ملا   وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

گذروں میں حسن خرابہ پہ کہتے ہیں واں کے لوگ   ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

محمد حامد دہلوی

[ا۵] یہ قرین قیاس ہے کہ درمیانی چاہ کی علتِ غائی رہٹ کی مرمت تھی یعنی جب کوئی حصہ رہٹ کا قابلِ مرمت ہو جائے تو انجینیر وغیرہ اس میں اتر کر مرمت کر دیں۔

[۵۲] عموماً رہٹ گھوڑوں یا بیلوں کی امداد سے عراق عرب میں چلایا جاتا ہے مگر باولی مذکورہ کے آس پاس اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ گھوڑے یا بیل پھر سکیں۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ قیدی یا غلام اس خدمت کو انجام دیتے ہوں یا کوئی مشین آب رسانی کی ایسی لگی ہو جس کے ذریعہ سے بغیر خارجی امداد کے آبپاشی ہوتی ہو مگر اس وقت تک کسی کتبہ سے ایسا ثابت نہیں ہوا۔

راز و نیاز

۱

رگ رگ میں بسی ہے تیری خوشبو اب تک — فرقت میں ٹپک رہے ہیں آنسو اب تک
اِک عمر ہوئی جدھر بٹھایا تھا تجھے — ویران ہے اُس دن سے وہ پہلو اب تک

۲

آجا، مرتا ہوں غم کے مارے، آجا — بھیگی ہوئی رات کے شرارے، آجا
اے شام کا وعدہ کر کے جانے والے! — اب ڈوب رہے ہیں دیکھ تارے، آجا

۳

میں رات گئے اٹھا ہوں سوتے سوتے — آنکھوں کا بُرا حال ہے روتے روتے
تارے کے قریب ماہِ نَو ہے، اے کاش — اِس وقت مرے قریب تم بھی ہوتے!!!

۴

کیا عہد تھا وہ اے بُتِ پُرفن تیرا — دیتا تھا مجھے ہوائیں دامن تیرا
افسوس وہ دن، کہ کھیلتا تھا پہروں — جب میری جوانی سے لڑکپن تیرا

جوش
ملیح آبادی

قدرتی مناظر

ایک سنسکرت کا شاعر کہتا ہے کہ "جہاں ہری ہری دوب کا فرشِ زمرّدیں بچھا ہے۔ قریب ہی خوبصورت جھرنے بہ رہے ہیں جن میں آہوانِ دشت کے کھُروں کے نشانات بنے ہیں۔ نازک اور خوبصورت پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو میں لپٹی ہوئی عطر بیز ہوا چل رہی ہے۔ اشجار مستوں کی طرح جھوم رہے ہیں جن پر طائرانِ خوش نوا چہچہا رہے ہیں اُن کے شیریں اور روح پرور نغمات سے میدان گونج رہا ہے۔ بھلا ایسے دل آویز نظارے کس کے دل کو فریفتہ نہیں کر سکتے۔"

قدرتی مناظر کی خوبصورتی اور خوشنمائی سے اگرچہ کسی کو انکار نہیں ہو سکتا مگر انہیں بخوبی سمجھنے کی قابلیت بہت تھوڑے انسان رکھتے ہیں۔ جب ہم کسی بحرِ بے کراں کو پہلے پہل دیکھتے ہیں اُس کی مہیب اور ہولناک لہروں کے تھپیڑوں کی صدائیں سنتے ہیں یا کسی سنسان اور لق ودق وادی میں جا نکلتے ہیں۔ یا فلک رفعت برفانی چوٹیوں پر نظر ڈالتے ہیں یا کسی کوہِ آتش فشاں کو آتش فشانی کی حالت میں دیکھتے ہیں تو حیران اور ششدر ہو کر رہ جاتے ہیں ان قدرتی مناظر کو قدرت کے پرستان کی پریاں تصور کرنا چاہئے جو اپنے کرشمہ ہائے سحر ساز سے دیکھنے والوں کو متحیر بنا دیا کرتی ہیں۔

قدرتی مناظر پر غور کرنے سے قبل مشاہدہ کرنے کی عادت ڈالنا ضروری اور لابدی ہے۔ کیونکہ کسی شے پر غور وخوض کرنے کی بہ نسبت اس کا مشاہدہ کرنا کہیں زیادہ آسان ہے۔ اور پھر یہ بھی ایک مسلہ امر ہے کہ انسان جس شے کا مشاہدہ کرتا ہے اُس کی تحقیق کی طرف بھی اُس کی طبیعت راغب ہوتی ہے۔ بزاں بعد قوتِ بیانیہ کے عمل کا شوق پیدا ہوتا ہے محققین اور عوام کی آنکھوں میں بظاہر تو کوئی تفاوت نظر نہیں آتا البتہ بباطن اُن کی وسعتِ نظری اور باریک بینی کے روبرو عوام کی آنکھیں بے کار سی ہیں۔ بدن کے تمام اعضا خدا نے تمام انسانوں میں یکساں بنائے ہیں۔ مگر دانشمندوں اور بے عقلوں کے حرکات وسکنات وغیرہ میں زمین وآسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ جو نظرِ تعمق سے مشاہدہ کرنے کے عادی ہیں موسمِ برسات میں ہر گھڑی ایک نیا نظارہ دیکھتے ہیں کھیت میں یا جنگل میں جہاں کھڑے ہوں پُر کیف منظر سے آنکھیں روشن کرتے ہیں۔ آسمان پر منڈلاتے ہوتے بادلوں کے دل ربا نظارے کا لطف

اٹھاتے ہیں۔

قدرتی مناظر کو دیکھ کر حظ حاصل کرنا دل کی صفتِ محمود ہے اگر ہم اس کی بیخ کنی کر ڈالیں تو ہماری ہستی پر اس کے لازوال نتائج کا اثر ظہور میں آئے گا۔ اس لئے جو انسان قدرت کی خوبصورتی اور خوشنمائی سے متاثر ہو کر لطف اٹھاتے ہیں وہ خواہ نیک ہوں یا بد شگفتہ خاطر رہتے ہیں۔

جس وقت آم کے بُور کی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ بھونرے گونجتے ہوئے آتے ہیں اور شیفتہ ہو جاتے ہیں یا جب پودوں میں نئی نئی کونپلیں اور پتے نکل کر خوبصورت جھنڈر کی طرح خوشنما معلوم ہونے لگتے ہیں تو بسنت کی خوبصورتی اور دل ربائی رشیوں اور منیوں کے قلوب کو بھی کھینچ لیتی ہے پھر انسانوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

شعرا نے پھولوں کو پہلا درجہ دیا ہے اور یہ مناسب بھی ہے کیونکہ جب کسی باغ یا چمن کا منظر نظروں کے سامنے آتا ہے تو سب سے پہلے پھولوں ہی پر نظر جاتی ہے۔ قدرت کی دیوی نے پھولوں کو انسان ہی کے مفاد اور آرام کے لئے بنایا ہے۔ بچے پھولوں سے محبت کرتے ہیں۔ لازوال خوشیاں بخشنے والے پھولوں پر کسان اور باغبان بھی شیفتہ ہو جاتے ہیں عیش و طرب کے بندے، راحت و آرام کے دلدادے بھی پھولوں پر جان دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ شہری اور دیہاتی بھی پھولوں سے الفت رکھتے ہیں۔

ہر موسم میں پھول جُدا جُدا قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن صحراؤں، کوہوں، بنوں میں ہر قسم کے پھول ہر موسم میں پائے جاتے ہیں اسی طرح سمندر کے ساحلوں پر بھی ہر موسم میں ہر قسم کے پھول کھلتے رہتے ہیں۔

پھولوں کے نظارہ سے صرف آنکھوں ہی کو لطف حاصل نہیں ہوتا بلکہ پُر نصیحت اور اخلاقی اسباق بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کے مختلف رنگوں اور مختلف اشکال سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے ضرور کسی اہم کام کے لئے انہیں پیدا کیا ہے۔ پھولوں کی طرح درختوں اور بیلوں کے پتے بھی نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں یہ گویا اُن کے لباس ہیں۔ بڑے بڑے تناور درختوں پر چھوٹے چھوٹے پھولوں کا لگنا اور چھوٹے چھوٹے پودوں اور بیلوں میں بڑے پھولوں کا آنا یہ بھی ایک نرالی ہی خوبصورتی ہے لیکن درختوں کی خوبصورتی کو پتے ہر موسم میں قائم رکھتے ہیں اور درخت سراپا حسنِ فطرت کی تصویر نظر آتا ہے۔

سرد ممالک کے بن موسمِ گرما میں سرسبز ہوتے ہیں لیکن موسمِ سرما میں جب برف پڑنے لگتی ہے تو درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں شاخوں میں کونپلوں کا نام و نشان تک بھی نہیں رہتا صرف برف کا سیمیں ملمع چڑھا رہتا ہے۔ اُس نظارہ کی کیفیت بھی نرالی ہی ہوتی ہے۔ منطقہ حارہ کے جنگلوں کی رونق میں اس سے نہایت اختلاف پایا جاتا

ہے یہاں اشجار اونچے اونچے چرخ بریں سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ زیریں حصہ کچھ دور تک یعنی درختوں کی جڑوں سے شاخوں کے نکلنے کے مقام تک ایک لمبا سیدھا تنا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے زیریں حصہ کشادہ رہتا ہے اور گھرے سائے کے سبب بہت سرد بھی ہوتا ہے۔ بالائی حصہ میں درختوں کی شاخیں اتنی گنجی رہتی ہیں کہ اچھے خاصے بادلوں کے گروہ دکھائی دیتے ہیں، جو مہرِ عالمتاب کی زریں شعاعوں کے استقبال کو اوپر چڑھتے محسوس ہوتے ہیں۔ چوپائے اشجار پر چڑھ جاتے ہیں۔ طائرانِ خوش الحان درختوں کی بلند سے بلند شاخوں پر بیٹھ کر شیریں نغمات گایا کرتے ہیں۔ سانپ اور دوسرے رینگنے والے جانور بھی درختوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ بیلوں کو درختوں سے لپٹی ہوئی دیکھ کر جوشِ محبت کا سماں بندھ جاتا ہے جتنی قسمیں بیلوں کی منطقۂ حارّہ میں پائی جاتی ہیں اتنی کسی اور خطہ میں نہیں پائی جاتیں۔ دکن کے جنگلات کے حالات جو سنسکرت کے مشہور شاعر بھو بھوتی نے اتر رام چرتر میں قلمبند کئے ہیں گویا دلکش تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جس جگہ یہ سلسلہ ہائے کوہستان پھیلے ہوتے ہیں اُس سرزمین کی رونق کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ مست موروں کی صدائیں ہوا میں گونجتی رہتی ہیں آہوان دشت قطاروں میں کلیلیں کرتے پھرتے رہتے ہیں۔ ندی کے کنارے پر درختوں کی قطاروں کی خوشنمائی قابلِ دید ہے۔ بیلوں کی کثرت کے نظارہ کی رونق حدِ بیان سے باہر ہے۔ گنجان جنگل کیا ہے ایک پرکیف نظارہ ہے جہاں طرح طرح کے پرند دلفریب نغمات گاتے ہیں۔ بار آور اشجار ہیں کہ اثمار کے بار سے جھکے پڑتے ہیں۔ جن کا سایہ گوداوری کے پانی میں جھلملا جھلملا کر رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بانسوں کے جنگلات میں جگہ جگہ اُن کے آپس میں ملنے سے قدرتی کٹیاں سی نظر آتی ہیں جن سے الوؤں کی خوفناک صدائیں نکل کر سنائی دیتی ہیں۔ ان کو سن کر زاغ گونگے کی طرح خاموش بیٹھے رہتے ہیں اور اس قدر خائف ہو جاتے ہیں کہ کسی طرف اُڑنا تو درکنار اُڑنے کا قصد بھی نہیں کرتے۔ طاؤس اِدھر اُدھر جنگلوں میں صدائیں کرتے پھرتے ہیں جن کے شور سے سانپ گھبرا کر پرانے درختوں کے کھوکھلوں میں کنڈلی مارے پڑے رہتے ہیں جن پہاڑوں سے گوداوری ندی نکلتی ہے وہ سیاہ بادل کی طرح نظر آتے ہیں۔ گوداوری کی دھار شور کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس میں اونچی اونچی لہریں اٹھتی ہیں اور آپس میں ٹکراتی ہیں۔ اور پھر گوداوری اُس خوبصورت اور مقدس بحرِ بے کراں میں داخل ہو جاتی ہے جس کے پانی کا منظر نہایت دل کش ہے"۔

بہت سی جنگلی اقوام درختوں کو دیوتاؤں کی طرح پوجتی ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ اگر ہم اکیلے کسی بن میں جا نکلیں اور کوئی درخت ہم سے گفتگو کرنے لگے تو ہمیں خوشی ہوگی اور لطف بھی آئے گا۔ دن کے وقت گنجان جنگل میں جانے سے خوف بھی طاری ہوتا ہے جس سرزمین پر درختوں اور بیلوں کی حکومت ہوتی ہے وہاں

پانی کا مقام ضرور نزدیک تر ہوتا ہے مثلاً ندی، تالاب، آبشار وغیرہ اور بن کا منظر نہایت ہیبتناک ہوتا ہے۔ بادل گھر کر نیلگوں فلک کی رونق کو دوبالا کرتے ہیں۔ علی الصباح کہرے کے دھندلکے میں تالاب اور چشموں کا صاف شفاف پانی بلور پتھر کی طرح چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دنیا کی نباتات کی زندگی کا انحصار پانی ہی پر ہے اس کی بدولت بڑے بڑے وسیع میدان سرسبز نظر آتے ہیں۔ پانی کے بہاؤ سے دریائے نربدا کے کاٹے ہوئے بڑے بڑے پہاڑ اور پتھر دیکھنے سے دستِ قدرت کی صناعی کے بے مثال نمونے آشکار ہوتے ہیں۔

جب کوئی تھکا ہوا مسافر مہاندی یا کشادہ تالاب کے نزدیک پہنچتا ہے تو سفر کی تمام کلفتوں کو فراموش کر دیتا ہے۔ پانی میں نہانے سے تکان کا نام ونشان تک بھی نہیں رہنے پاتا۔ کالی داس کا بیان ہے کہ "صاف اور گہرے پانی میں خوب غوطے لگا کر فرحت حاصل ہوتی ہے"۔ نازک پھولوں کی خوشبو سے بھری ہوئی ہوا ہر فرد کو مست کر دیتی ہے۔ موسمِ گرما میں گہرے سائے میں فوراً ہی نیند آجاتی ہے۔ شام کا وقت عجیب فرحت بخش ہوتا ہے۔ بحری سیاحوں کو سمندر نہایت دلکش معلوم ہوتا ہے۔ آسمان کی بہ نسبت سمندر زیادہ آزاد اور پُر جلال ہے سمندر کا ساحل بے شمار جانداروں اور نباتات کا گہوارہ ہوتا ہے اُن میں سے بہت سے مدوجزر کی تفتیش میں ہمہ تن محو ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں سمندر کی موجیں سمندر سے نکال کر پھینک دیا کرتی ہیں۔ ساحلِ سمندر پر کھڑے رہنے سے پرندوں کی خوفناک صدائیں سنائی دیا کرتی ہیں۔ اور سمندری ہوائیں تو ایک برقی اثر معلوم ہوتا ہے کہ بدن سے لگتے ہی دلوں میں سنسنی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جوش اور امنگ کے دریا موجزن ہونے لگتے ہیں۔

سمندر کی حالت میں ہر وقت تغیر و تبدل ہوا کرتا ہے صبح سے شام تک کتنے ہی انقلابات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر ہمارا مکان سمندر کے کنارے ہو اور ہم دریچے میں بیٹھے ہوئے نیچے کی طرف دیکھ رہے ہوں اور نیچے چھوٹا سا میدان بھی ہو تو اُس سے آگے کی طرف نشیبی زمین معلوم ہوتی ہے اس کے بعد بہت بڑا تفاوت نظر آتا ہے سامنے سمندر کے بیچ میں تقریباً ایک کوس کے فاصلہ پر ریت کے خوبصورت اور زرد زرد ٹیلے نظر آتے ہیں۔ اُدھر شاہِ خاور افق کی نقاب سے چہرۂ خنداں کو نکال کر اپنی جھلملاتی ہوئی شعاعوں سے سمندر کو روشن کر رہا ہوتا ہے۔ جوں جوں آفتاب اوپر چڑھتا جاتا ہے سمندر کے زیادہ حصہ میں روشنی پھیلتی جاتی ہے۔ دور کے بند حصے کہرے کے پردے میں مستور ہو جاتے ہیں۔ نو بجے کے قریب سمندر کا رنگ بالکل فق ہو جاتا ہے۔ آسمان نیلگوں معلوم ہونے لگتا ہے اور جہاں تہاں لکہ ہائے ابر روئی کے پہلوں کی مانند پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سامنے کے پتھریلے علاقے کی ترائی، کھیت اور صحرا پتھروں کی کانیں اور سنگِ خارا معلوم ہوتے ہیں۔ جب آفتاب نصف النہار پر ہوتا ہے تو سمندر پھر اپنا رنگ تبدیل کر لیتا ہے اب وہ بالکل گہرا

نیلگوں جامہ زیب تن کئے ہوئے معلوم ہوتا ہے اور سامنے کے جزیرہ میں سایہ دار جنگل، سبز سبز مرغزار اور زرد زرد رنگ کے کھیت نظر آتے ہیں۔ شکستہ چٹانوں کے حصص بھی بخوبی دکھائی دینے لگتے ہیں مچھیروں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور کالے کالے بادبان بالکل نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔

سمندر کی یہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہتی کچھ دیر بعد پھر یکایک تبدیلی واقع ہوتی ہے اور آسمان پر بادلوں کے دل منڈلانے لگتے ہیں۔ تیز اور تند ہوا چلنے لگتی ہے طوفان نمودار ہونے لگتا ہے درختوں کے پتوں پر گرتے ہوئے پانی کے قطروں کی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ سامنے کا ساحل تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا طوفان سے خوف زدہ ہوکر چھپ گیا ہے۔ اس حالت میں سمندر کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور پانی کھولتا ہوا خوفناک صدائیں کرتا ہے جب خاموش ہوجاتا ہے تو پھر آسمان کی طرح نیلگوں نظر آنے لگتا ہے۔ آفتاب غروب ہونے سے قبل اس پر پھیکا پن چھا جاتا ہے اور مغرب کے وقت پھر ایک نئی سنہری خوبصورتی سے چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح سمندر کی حالت میں دن بھر تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں۔ سمندر کی حالت میں رات کے وقت بھی انقلابات ہوا کرتے ہیں۔ اگر کبھی تاریکی کا عالم ہوتا ہے تو کبھی لاتعداد سیاروں اور ستاروں سے آراستہ آسمان کے روبرو صاف اور شفاف شیشہ کی طرح دکھائی دیتا ہے اور کبھی چاند کی چاندنی میں بالکل سفید براق نظر آتا ہے۔

کبھی طوفان کے وقت آسمان پر قوسِ قزح نظر آتی ہے جس کے مختلف رنگوں کو دیکھ کر حسنِ ازل کا جلوہ آنکھوں میں سما جاتا ہے ٹامسن لکھتا ہے کہ "لال رنگ سب سے گہرا اور خوشنما ہے بیچ میں زرد رنگ سونے کی طرح معلوم ہوتا ہے نارنجی، ہرا، اور نیلا مختلف رنگوں سے قوسِ قزح خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔"

رنگوں کے متعلق اس سے زیادہ ہم اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اگر رنگوں کی واقفیت نہ ہوتی تو محض سایہ، شکل اور روشنی کی امداد سے جُدا جُدا اشیاء کی شناخت مشکل ہوجاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم خود یہ سوال کرتے ہیں کہ خوبصورتی کیا شے ہے؟ تو ہمارے دل میں مختلف رنگ کے چرندوں، پرندوں، پھولوں، پتنگوں، جواہرات، آسمان اور قوسِ قزح وغیرہ کا تصور بندھ جاتا ہے۔

فطرت نے ہمیں جو حواسِ خمسہ عطا کئے ہیں اس کی یہ ہم پر بڑی مہربانی ہے۔ اگر کان نہ ہوتے اور قوتِ سامعہ نہ ہوتی تو دنیا کی شیریں آوازیں اور دوستوں کے شیریں تکلم ہمارے لئے بے سود تھے۔ آنکھوں کی بناوٹ میں اگر تل بھر بھی فرق ہوتا تو وسعتِ قدرت کا نظارہ، اشیا کی خوشنما اشکال، رنگوں کی چمک دمک، قدرت کے جنگلات کی خوبصورتی کوہ، دریا، تالاب وغیرہ قدرتی مناظر کا مشاہدہ کرنے سے محروم رہ جاتے۔ اگر قوتِ ذائقہ نہ ہوتی تو لذیذ اشیا بے کار تھیں

حسن کے دلدادہ رسکن نے لکھا ہے کہ پہاڑوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں قدرت نے صرف انسانوں کے لئے بنایا ہے تعلیم کے لئے قدرتی درس گاہیں موجود ہیں جو علم کی تشنگی بجھانے کے لئے علم کے سرچشموں سے پُر ہیں۔ تفکر و تدبر کے لئے پُرسکون اور غیر آباد کنج عزلت موجود ہیں۔ خدا کی عبادت کے لئے مقدس عبادت گاہیں ہیں۔ ان سنسان مقامات میں چٹانوں کے دروازے بادلوں کا فرش فلک رفعت چوٹیوں سے پانی کے بہنے کی آواز برف کی چٹانوں سے بنے ہوئے چبوترے کیا ہی دلکش مناظر ہیں۔ بے شمار سیاروں ستاروں سے آراستہ پیراستہ نیلگوں آسمان کا شامیانہ ہے۔ تمام دنیا خوبصورتی سے آراستہ ہے اور یہ قدرت کی ہی بدولت نہایت دلکش اور دلفریب بنی ہوئی ہے۔ جو دیکھنے والے یہاں آگئے اسے دیکھ کر متحیر ہو کر رہ گئے"

آسمان کی خوشنمائی دل کو محو کر لیتی ہے جس وقت دل پژمردہ ہو اور بے چینی کا عالم ہو، اس وقت اس کو محظوظ کرنے کے لئے آسمان کی طرف نظر دوڑاؤ۔ اگر دوپہر کا وقت ہے تو آسمان کا نیلگوں رنگ اور چاروں طرف پھیلے ہوئے بادل دلفریب نظر آئیں گے۔ صبح اور شام کے وقت تو ہمیشہ ہی آسمان کا منظر قابل دید ہوتا ہے۔ رات کا وقت ہے تو بزم فلک کا کہنا ہی کیا ہے۔ سیاروں اور ستاروں سے بھرا ہوا آسمان ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہیروں سے تھال بھرا ہوا ہے۔ ان کے طلوع اور غروب ہونے کے وقت ان کی گردش کی کیفیت وغیرہ دیکھ کر نہایت لطف آتا ہے۔ خدا کی ابدی طاقت اور صناعی کے تصور سے دل میں پرستش کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ جس وقت ہم ستاروں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہم کو ایک جگہ ساکن محسوس ہوتے ہیں لیکن اس وقت وہ خوب تیزی سے حرکت کرتے ہیں۔

آسمان کی فضا میں دس کروڑ سے بھی زیادہ سیارے ہیں اور ان کے علاوہ ستارے بھی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بہت سے اجرام فلکی ایسے بھی ہیں جن کی روشنی اب قطعی زائل ہو چکی ہے کسی وقت وہ آفتاب کے مانند تاباں اور درخشاں تھے لیکن اب بالکل تاریک اور شل ہیں۔ ایک سائنسدان کا خیال ہے کہ ہمارا آفتاب بھی تقریباً ایک کروڑ ستر لاکھ سال کے بعد بالکل ویسا ہی ہو جائے گا۔ دُم دار ستارے بھی آسمان پر موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ دوربین کے بغیر نظر آسکتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو ہماری حدنگاہ سے باہر ہیں۔

ستاروں کی بے شمار تعداد کو دیکھ کر انسانوں کو تعجب ہو جاتا ہے پھر بھلا اُن کے وسیع اجسام اور ایک دوسرے سے فاصلہ کا علم ہونے پر نہ معلوم کیا حال ہوتا ہوگا۔ سمندر بہت زیادہ وسیع اور عمیق ہے اور اس کو بحر بے کراں کہتے ہیں لیکن اگر آسمان سے سمندر کا مقابلہ کیا جائے تو سمندر اُس کے مقابلہ میں بے حقیقت ہے۔ بہت سے اجرام فلکی ایسے ہیں کہ اگر اُن کا مقابلہ زمین سے کیا جائے تو زمین بالکل بے حقیقت معلوم ہوگی اور اگر

اُن کا مقابلہ آفتاب سے کیا جائے تو آفتاب سے وہ بہت چھوٹے نظر آئیں گے۔ کچھ ستارے ایسے ہیں جو ہماری زمین سے کروڑوں میل کی دوری پر ہیں۔ اُن کی روشنی کی چال لاکھوں میل فی سیکنڈ ہونے پر بھی ہماری زمین تک پہنچنے میں برسوں کا عرصہ درکار ہے۔ کچھ ستارے اتنی دور ہیں کہ نظر نہیں آسکتے یہاں تک کہ دوربین سے دیکھنے پر بھی وہ کہرے کی طرح دھندلے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ سائنسدانوں نے بہت کچھ پوشیدہ راز معلوم کئے ہیں لیکن اب بھی اُس کی قدرت کا پار نہیں پایا ؂

جانتا قدرت کو ہے اک کھیل تُو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

(ترجمہ از ہندی) اندرجیت شرما

کسی شخص کی قوتِ عمل کا امتحان منظور ہو تو دیکھو کہ وہ بے مہریٔ ایام اور تلخیٔ دوران کا شاکی تو نہیں جنہیں اپنے پر اعتماد ہوتا ہے وہ زمانہ کی بے اعتنائیوں کو خاطر میں بھی نہیں لاتے۔

اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لئے قناعت ضروری ہے۔ حصولِ قناعت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کو سادہ بناؤ، ضروریات گھٹا دو اور خواہشات کم کرو۔

امید پر زندگی گذرانا اچھا ہے لیکن رشتۂ امید کو طول نہ دو کہ اُس کے ٹوٹ جانے پر تم یاس و حرمان کا شکار ہو جاؤ۔

دنیا سے امیدیں کم لگاؤ تاکہ تمہیں مایوسی بھی کم ہو۔

مال و دولت اچھی چیز ہے لیکن اُس کے حاصل کرنے میں خودداری و غیرتِ نفس کو ہاتھ سے نہ دے بیٹھو۔ تمہارے گرد و پیش کتنے مالدار لوگ موجود ہیں جن کی دولت و ثروت کے باوجود تم ان کو اپنے سے کمتر خیال کرتے ہو۔ اگر روپیہ ہی پیدا کرنا ہے تو معزز و محبوب خلائق بن کر پیدا کرو۔

دولت اور علم شاذ و نادر ہی اکٹھے ہوتے ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ جو مالِ دنیا اور دولتِ علم سے مالا مال ہو۔

محبت ایک کیفیت ہے جس کا تعلق قلب سے ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کا اظہار بھی کیا جائے بلکہ اپنے انتہائی مدارج میں تو وہ شرمندۂ تکلم ہونا گوارا بھی نہیں کرتی۔ جو شخص بار بار اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے سمجھ لو کہ وہ بوالہوس ہے۔

عاشق بٹالوی

تجلّیات

وہ لطفِ ابتدائے تمنّا نہیں رہا
شکوہ تو ہے پہ شکوۂ بے جا نہیں رہا

ہر عرضِ شوق پر وہاں اقرارِ سہل ہے
یعنی وہ لطفِ حسنِ تقاضا نہیں رہا

آئینۂ خیال ہے جلوہ گہِ جمال
اب میں حریفِ شوقِ تماشا نہیں رہا

کیا کر دیا نگاہِ حقیقت شناس نے
وہ رنگِ دلفریبیٔ دنیا نہیں رہا

بیزارِ شوق ہے دلِ ناکامِ آرزو
وہ اعتبارِ وعدۂ فردا نہیں رہا

مایوسیوں نے سارے زمانے سے کھو دیا
واحسرتا کہ اب کوئی سودا نہیں رہا

اُس رشکِ آفتاب پر اٹھتی نہیں نگاہ
پردہ بھی ہے اب کوئی پردا نہیں رہا

مشکل میں پڑ گئی نگہِ مشکل آرزو
پردہ بقدرِ شوقِ تماشا نہیں رہا

میں وہ فریب خوردۂ حباب ہوں جسے
دنیا میں اعتبار کسی کا نہیں رہا

جوشِ جنوں میں گھر ہی کو صحرا بنائیے
اکبر بقدرِ شوق جو صحرا نہیں رہا

جلال الدین اکبر

نوائے سروش

پردۂ چشم میں جب تک تُو تھا　　دل کا ہر گوشہ مقامِ ہُو تھا

ہو گیا داغِ چمن بالآخر　　گُلِ خوشرنگ بھی آتش خُو تھا

تیری صُورت تھی جدھر مُنہ پھیرا　　جس طرف آنکھ اُٹھائی تُو تھا

کیا کہیں داغِ محبّت اپنا　　کس قدر قابلِ شُست و شُو تھا

موجِ طوفانِ فنا کیا جانے　　تشنہ لب کون کنارِ جُو تھا!

دم اُلجھتا ہے اب اس کی تدبیر؟　　دل پھنسانے کے لئے گیسُو تھا

جلوۂ حسن ترا کیا کہئے!　　کہیں اعجاز کہیں جادُو تھا

ہم ہی برگشتۂ ایماں تھے تپش
ورنہ جو بُت تھا وہ قبلہ رُو تھا

عبداللطیف تپش

ستارہ

نادر شاہ کی داستانِ عشق

(۱)

نادر شاہ اپنے خیمہ میں لیٹا اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ ان دنوں مغلوں کی عظیم الشان سلطنت اُس کے قدموں میں بے دست و پا پڑی سسک رہی تھی۔ فتح و نصرت اُس کی ہم رکاب تھی۔ وہ اس خیال میں محو تھا کہ بہت جلد وہ سکندرِ اعظم کے مرتبہ پر پہنچ جائے گا۔ وہ ایک نئی دنیا کی فتح کے دل خوش کن خواب دیکھ رہا تھا۔

وہ پیدائشی ترک تھا اور اپنی خداداد قابلیت اور سپاہیانہ جرأت کی وجہ سے اس مرتبہ پر پہنچا تھا کہ دنیا اُس کے نام سے تھراتی تھی۔ اُس کی مثال بالکل ایک بگولے کی سی تھی، جو پوری شان و شوکت سے اُٹھا، آندھی کی طرح چھا گیا اور پھر ایسا مٹا کہ اُس کا نشان ملنا محال ہے۔ نپولین اعظم کی زندگی بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جس وقت وہ تخت پر متمکن ہوا ایران عجیب کشمکش کی حالت میں مبتلا تھا۔ ترک، افغان اور روسی دشمن سلطنت کو زیر و زبر کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ ہر طرف فتنہ و فساد، سازش اور بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی لیکن اس بے آئینی کی حالت میں اس نئے حکمران نے اپنی خداداد قابلیت اور قوتِ تدبیر سے بہت جلد ملک میں امن قائم کر لیا اور بہت جلد اپنے جاں نثاروں کی مدد سے برِ اعظم ایشیا کے لئے ایک ہشت بن گیا۔

ان دنوں اُس نے ہندوستان پر حملہ کر کے مغل شہنشاہ محمد شاہ رنگیلے کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اُس کا حریف اُس کے لشکر میں صلح کی گفت و شنید کے لئے آیا تھا اور ذلت سے واپس کر دیا گیا تھا ۔۔۔۔ وہ حریف جس نے ایک مرتبہ نادر شاہ کے متعلق توہین آمیز کلمات کہنے کی جرأت کی تھی!

وہ سوچ رہا تھا کہ کامیابی واقعی عجیب چیز ہے لیکن انتقام! انتقام اس بھی زیادہ پُر لطف ہے! اس خیال سے ایک لمحہ کے لئے اس جنگجو انسان کے لبوں پر ایک ملائم تبسم کھیلنے لگا۔

اُس نے علی اکبر اور احمد خاں قندھاری اپنے دو دانا وزیروں کو طلب کیا اور آیندہ طرزِ عمل پر بحث کرنے لگا۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ محمد شاہ کے صوبجات پر قبضہ کر کے اُسے اور اذیت پہنچائی جائے اور اُسے اچھی طرح ذلیل

کیا جائے۔ اُس کا ارادہ تھا کہ لشکر کے تازہ دم ہوتے ہی دارالسلطنت دہلی پر حملہ کردے اور کچھ عرصے کے لئے ایک فاتح کی حیثیت سے شہر پر قابض رہے اور پھر سلطنت محمد شاہ ہی کو دے کر خود واپس چلا جائے۔

لیکن اس کا ایک مقصد اور بھی تھا، دہلی میں بے شمار دولت تھی! مسلسل جنگلوں میں اُسے بے شمار اخراجات برداشت کرنے پڑے تھے، اور اُس کی اپنی رعایا محصولات کے بوجھ سے چلّا رہی تھی۔ اور اب وہ اسے زیادہ تنگ کرنا نہیں چاہتا تھا اُس نے خیال کیا کہ آخر اس بوجھ کو شکست خوردہ حریف کے کندھوں پر کیوں نہ ڈال دیا جائے۔ علاوہ ازیں وہ دہلی کی دولت سے اپنے آئندہ ارادوں کے لئے راستہ ہموار کرنا چاہتا تھا۔

نادر ایک مرتبہ پھر مسکرایا۔

معًا وہ رک گیا، خیمہ کے باہر سے کچھ آوازیں آرہی تھیں، ایک لمحہ بعد خیمہ کا پردہ اُٹھا اور ایک خادم خاموشی کے ساتھ اندر داخل ہوا، نادر نے پوچھا: "کیا ہے؟"

خادم جھک کر آداب بجالایا اور کہنے لگا: "مغل شہنشاہ نے موعودہ تحائف بھیجے ہیں، ایک ہاتھی، چند گھوڑے، پچاس غلام اور بہت سی حسین ہندی عورتیں"۔

نادر اُٹھ کر بیٹھ گیا، یہ تحائف بے وقت پہنچے تھے۔ وہ شام سے اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت تاریکی پھیل چکی تھی، اور وہ تھکا ہوا بھی تھا، اس لئے اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ ہاتھی گھوڑوں کے معائنہ کو صبح پر اُٹھا رکھے۔

لیکن عورتیں! وہ انہیں دیکھنے کا بے حد مشتاق تھا۔ اُس نے ہندی حسن کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ احمد خاں نے اُسے بتایا تھا کہ وہ سرو کی مانند نازک، ہرن کی مانند چالاک و چوبند ہوتی ہیں اور اُن کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں اور آہوانِ مست کی آنکھوں کو شرماتی ہیں! احمد خاں قندھار کا باشندہ تھا جو ہندوستان کے بالکل قریب ہے، اس لئے یقینًا وہ ہندی عورتوں کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔

نادر نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور اپنے خیمہ سے نکل کر اس خیمہ کی طرف چلا جس میں وہ فروکش تھیں۔ اُس نے داخل ہوتے ہی بیک نظر معلوم کرلیا کہ واقعی اُن کے حسن کے متعلق مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ ان میں ایک سے ایک زیادہ حسین تھی، مگر نادر کی نگاہیں صرف اُس لڑکی کے چہرے پر ٹھہریں جو قطار کے وسط میں کھڑی تھی ـــــ بلند قامت اور نازک بدن، اُس کے رخسارے انگارے کی مانند سرخ ہو رہے تھے۔ اُس نے نہایت بے اعتنائی سے نادر شاہ کی طرف دیکھا اور نگاہیں نیچی کرلیں۔

نادر شاہ نے پوچھا: "یہ لڑکی کون ہے؟"

ایک خواجہ سرا نے ادب سے جواب دیا "جہاں پناہ یہ ایک راجپوت دوشیزہ ہے"

لڑکی ایک نفرت آمیز طریق سے ہنسی اور نہایت بے باکانہ انداز میں کہنے لگی "دوشیزہ! جھوٹ بکتے ہو! میں شادی شدہ ہوں!"

خواجہ سرا، لڑکی کی گستاخی سے غضبناک ہو کر، چابک لے کر، اُن لبوں پر جن سے یہ گستاخ الفاظ نکلے تھے مارنے کے لئے آگے بڑھا، لیکن یکایک پیچھے ہٹ گیا، کیونکہ ستارہ نے ——— یہی اُس حور وش کا نام تھا ——— کمر سے ایک خنجر نکال لیا تھا، اور اُسے مارنے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ اُس کے اس انداز سے شجاعت اور غیرت نمایاں تھی۔

نادر ہنسا۔ وہ ستارہ کی اس جرات پر از حد خوش تھا۔ وہ اسے مخاطب کر کے بولا "یہ خنجر مجھے دے دو!"

لیکن ستارہ بالکل بے حس و حرکت کھڑی رہی! ———

اُس نے پھر کہا: "یہ خنجر مجھے دے دو!"

اس مرتبہ اُس کی آواز میں درشتی تھی۔

ستارہ نے کچھ تامل کے بعد خنجر اُس کے حوالے کر دیا۔ نادر نے اُسے اپنی کمر میں رکھ لیا اور ایک لفظ کہے بغیر عورتوں کی قطار کے آگے سے گزر کر باہر چلا گیا۔

(۲)

خیمہ میں واپس آ کر نادر دیر تک گوناگوں خیالات میں غرق رہا۔ ستارہ کی ادا اُسے کچھ ایسی بھا گئی تھی کہ وہ اسے دل سے محو نہ کر سکتا تھا، اور جب وہ بیٹھا اُس کے خنجر سے کھیل رہا تھا ایک خفیف سا تبسم اُس کے لبوں پر نمودار ہو گیا۔ ستارہ واقعی حسین تھی!

اُس نے بڑی بڑی حسین عورتیں دیکھی تھیں، اور اُن سے محبت کی تھی، لیکن ستارہ جیسی حسین عورت اُس نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ اُس میں دس مردوں جتنی طاقت تھی اور اُس کا حسن! اُس نے زندگی بھر ایسا حسن نہ دیکھا تھا، معاً اُس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی جو محبت سے لبریز تھی، اُس نے ارادہ کیا کہ ایک مرتبہ پھر اُسے دیکھنا چاہیئے اور اس دفعہ تنہائی میں دیکھنا چاہیئے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور ایک خادم سے کہنے لگا:

"آغا باشی کو فوراً یہاں بھیج دو"

خادم یہ الفاظ سنتے ہی حکم بجالانے کے لئے دوڑا۔

ایک لمحہ بعد آغا باشی خیمہ میں داخل ہوا، وہ ایک بلند قامت مگر متین چہرے والا حبشی تھا، نادر نے اُسے اپنی خواہش سے آگاہ کیا، وہ کچھ ملول سا ہوگیا۔ وہ ایک وفادار خادم تھا اور ستارہ کی جرأت کو بخوبی جانتا تھا۔ اُس نے سوچا کیا وہ ستارا سے تنہا ملے گا؟ اُس نے اس کے خلاف کہنا چاہا لیکن نادر نے اُسے فوراً ٹوک دیا اور کہنے لگا "اُس لڑکی کو فوراً میرے پاس بھیج دو، میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں، ابھی اِسی وقت ———"۔

خواجہ سرا جھک کر اور "جو حضور کی مرضی" کہہ کر خیمہ سے باہر چلا گیا۔

نادر اُسے جاتے بغور دیکھتا رہا اور پھر خیمہ میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ رات کی پُرخوف خاموشی اُسے ستا رہی تھی، ستارہ کا خیال بار بار آرہا تھا۔ وہ اپنی نشست پر جا بیٹھا اور انتظار کرنے لگا۔

یکایک پردہ ایک طرف ہٹا اور غلام لڑکی اندر داخل ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھارہی تھی۔ مارے شرم کے اس کا سر جھکا ہوا تھا، لیکن اُس کی چال میں ایک عجیب شان تھی۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا، اور ہونٹ خوف سے کانپ رہے تھے۔ نادر ایک بت کی طرح اُس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ وہ پہلے سے ہزار گنا زیادہ حسین معلوم ہورہی تھی۔ نادر کی آنکھیں اُس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور شمع کی مدہم روشنی میں اُس کا سادہ لباس اُس کے حسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ وہ خیمہ کے وسط میں ٹھہر گئی، اور چپ چاپ کھڑی رہی۔ نادر نے کہا: "ذرا قریب آجاؤ، میری طرف دیکھو، تم خوفزدہ کیوں ہو؟"۔

ستارہ نے اُس کی طرف پُرخوف نگاہوں سے دیکھا۔ وہ واقعی خوفزدہ تھی، کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ وہ موت کے منہ میں جارہی ہے، جس کی اُسے تمنا نہ تھی۔ گو ایک گھنٹہ پیشتر اُسے زندگی کی ذرہ بھر پرواہ نہ تھی لیکن اب اب جب کہ اُس نے زندہ رہنے کا سبب معلوم کرلیا تھا، وہ زندہ رہنے کی متمنی تھی آج تک اُس کا شمار صرف محل کی کٹھ پتلیوں اور خوشامدی کنیزوں میں رہا تھا، لیکن اس وقت وہ ایک مرد کے سامنے کھڑی تھی۔ ایسا مرد جس کے وہ اکثر خواب دیکھا کرتی تھی۔ جو طاقتور، شجاع اور باجبروت تھا۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ اپنے تئیں اُس کے قدموں پر گرادے اور تا زیست خدمت گزاری کی قسم کھائے۔ وہ محبت کے بدلے محبت کی طالب تھی۔ وہ اپنے تئیں اس کا اہل تصور نہ کرتی تھی، لیکن اُس کی خدمت اُس کے لئے یہی کافی تھا کہ عمر بھر اُس کی خدمت کرتی رہے اور اگر ضرورت آن پڑے تو اس پر اپنی جان بھی نثار کردے!۔

نادر نے بھی تاڑ لیا کہ ستارہ کے دل میں اس قسم کے خیالات موجزن ہیں۔ عورتوں نے آج تک صرف دولت

وثروت کے لئے اُس سے محبت کی تھی، مگر یہ عورت جو خود بہادر تھی، ایسی تھی، جو محض اُس کی بہادری کے لئے اُس سے محبت کرتی تھی اور وقت پر جان تک دینے کو آمادہ تھی!!

نادر کو بخوبی معلوم تھا کہ ایسی بات کہنے کے لئے اُسے کافی جرأت سے کام لینا پڑے گا، اس لئے اُس نے نہایت شریفانہ لہجہ میں اُسے تسلی دی اور یقین دلایا کہ اُس کا قصور معاف کر دیا گیا ہے۔ پھر اُس نے اُس کی زندگی کے حالات دریافت کئے۔

معلوم ہوتا تھا کہ ستارہ کے دل میں مغلوں کی محبت نہ تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ ایک راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئی اور ابھی بچہ ہی تھی کہ گرفتار ہوگئی اور ایک مغل سپاہی کے ساتھ بیاہ دی گئی، لیکن وہاں سے وہ بھاگ نکلی اور کئی حادثات کے بعد چند مارواڑی تاجروں کے گروہ میں اُس نے پناہ لی۔ وہ اسے دہلی لے آئے، وہاں شہنشاہ کی ایک حرم اُس پر مہربان ہوگئی اور آج تک وہ اسی کی خدمت میں رہی۔

نادر کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا اور اُس کی آواز جوشِ محبت سے کانپ رہی تھی، وہ کہنے لگا: "کیا تو میری ملکہ بنے گی؟ ایسی ملکہ جس کے سامنے ساری دنیا کے سر خم ہونگے!"

ایک کپکپی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اُس کے جسم میں دوڑنے لگی۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ اُس کے کانوں نے واقعی یہ الفاظ سنے ہیں، وہ وہاں ایک مجرم کی حیثیت سے آئی تھی، مگر ایک فاتح شہنشاہ کو ملتجی دیکھ رہی تھی، جو اُسے عزت طاقت اور دولت پیش کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے تئیں نادر کے قدموں پر گرا دیا اور فرطِ محبت سے اُس کے پاؤں چوم لئے۔ یہی اُس کا جواب تھا!

نادر نے اُسے اٹھایا اور کہا: "اب تم میری ملکہ ہو، لونڈی نہیں ہو۔ تمام دوسری عورتیں تمہارے پاؤں چومیں گی۔ تم اپنے تئیں اس قدر ذلیل نہ سمجھو"!

اُس نے آغا باشی کو حکم دیا کہ قاضی کو بلائے اور چند لمحہ بعد ستارہ جو ایک حقیر کنیز کی حیثیت سے آئی تھی اس عظیم الشان سپاہی کی باعزت ملکہ بن گئی! ―― اُس وقت اُس کا لباس جواہرات سے چمک رہا تھا۔

سارے لشکر میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی، لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے، لیکن ستارہ کو ان باتوں کی ذرہ بھر پروا نہ تھی، وہ از حد مسرور تھی۔ نادر کی محبت اُس کے رونگٹے رونگٹے میں سرایت کر گئی تھی۔ اس کے سوا اُسے اور کوئی خیال نہ تھا اور نہ دوسرے خیالات کے لئے اُس کے دماغ میں جگہ تھی۔

بعض دفعہ وہ اپنے تئیں اجنبی اور تنہا محسوس کرتی جس کے لئے وہ مجبور تھی مگر وہ اس تنہائی میں بھی خوش تھی

اُسے اُن لمبے گرم دنوں سے از حد محبت تھی جن میں وہ اپنے خیمہ میں تنہا بیٹھی شام کا انتظار کیا کرتی تھی، نادر شام کو اُس کے پاس آتا تھا، ایک بادشاہ کی طرح نہیں بلکہ ایک شوہر کی طرح! اور پھر ساری رات وہ وہیں رہتا تھا۔
اور واقعی نادر ہر شام کو اُس کے پاس ہوتا تھا!

آہستہ آہستہ اُس نے لشکر کی دوسری عورتوں سے راہ و رسم پیدا کی کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ اس طریقہ سے اُس نے کئی بدگمان رقیبوں کو رام کر لیا، لیکن اُن میں ایک رقیب ایسی بھی تھی، جو ستارہ کی تمام خوبیوں کے باوجود اس کی دشمن تھی۔ اس بد باطن اور کینہ پرور عورت کا نام شیرازی تھا۔ وہ نادر شاہ کی چہیتی تھی جسے ستارہ کے آنے پر رد کر دیا گیا تھا۔

رقابت کی آگ کے تیز و تند شعلوں نے شیرازی کے دل کو بھڑکا دیا۔ اُس نے اپنے دل سے قسم کھائی کہ جب تک وہ ستارہ سے شدید ترین انتقام نہ لے گی چین سے نہ بیٹھے گی۔ بھولی بھالی ستارہ کو ان بد ارادوں کا علم نہ تھا۔ شیرازی اپنی مکاری سے اُسے یہ معلوم کرنے کا موقع ہی نہ دیتی تھی۔ اُس نے ستارہ سے خوب گہری دوستی پیدا کر لی تھی اور اپنی مکر آمیز چکنی چپڑی باتوں سے اُس کی رازدار بن گئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آخر یہی رازداری کام آئے گی۔ وہ ہر وقت ستارہ کی حرکات پر نگاہ رکھتی اور مناسب موقع کی تاک میں رہتی۔

شیرازی کوئی معمولی عورت نہ تھی۔ وہ علی اکبر کی بہن تھی، لیکن بیچاری ستارہ کو کیا معلوم کہ اس رازداری کے پردے میں کیسے کیسے مصائب و آلام اُس کے لئے اکٹھے کئے جا رہے ہیں۔ اور اگر اُسے معلوم بھی ہو جاتا تو کیا وہ اُس کی پروا کرتی؟ کبھی نہ کرتی! وہ ایک ایسی عورت تھی، جو "پچھلا کل دفنا چکے اور اگلا کل کل ہو" کے مقولہ پر عمل پیرا تھی۔ اُسے ایک ایسا محبوب مل گیا تھا، جسے اس سے پہلے کوئی عورت اس طرح حاصل نہ کر سکی تھی۔

نادر کے مصاحب اُس کی اس محبت پر سخت حیران تھے جو وہ ستارہ کے لئے ظاہر کرتا تھا۔ وہ انتہائے حیرت میں ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کرتے تھے کہ دیکھیں اس انوکھی محبت کا کیا انجام ہوتا ہے؟

(۳)

نادر شاہ کا جرار لشکر اسی طرح پڑاؤ ڈالے پڑا تھا، دن یکے بعد دیگرے تیزی سے گزر رہے تھے، نادر کو اندیشہ تھا کہ اگر اُس کی افواج اسی طرح کچھ اور عرصہ بےکار پڑی رہیں تو اُن کا جوش سرد پڑ جائے گا۔ اُس نے دہلی کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ یہ سنتے ہی لشکر میں تیاریاں شروع ہو گئیں۔ شام تک نادر شاہ بھی انہیں تیاریوں میں مصروف رہا اور پھر حسب معمول ستارہ کے خیمہ میں گیا۔ وہ از حد تھکا ہوا تھا، اور اُس آدمی کی مانند معلوم ہوتا تھا جو کسی خواب سے بیدار ہوا ہو۔ اُس

خیال سے کہ اب وہ پہلے کی طرح اُس کی پُرلطف محبت سے بہرہ ور نہ ہو سکے گا، نادر شاہ نے ستارہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہوں میں حسرت تھی، کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اب اُس کے سامنے زیادہ اہم معاملات پیش ہونے والے ہیں! ―― سلطنت اور جنگ کے معاملات! ―― وہ افسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک ہفتہ اور کیوں نہ ٹھیر گیا۔ عورت کی محبت! آہ ایک عورت کی محبت کس قدر زبردست اور قابلِ قدر چیز ہے! اُس کی خداداد طاقت سے بھی زبردست!

ستارہ بھی یہ بات اُس کے بشرے سے تاڑ گئی۔ اُس نے بادشاہ کا غم دور کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ وہ یہ معلوم کرنے کی ازحد مشتاق تھی کہ اُس کے غم کی وجہ کیا ہے۔ نادر نے اپنی پگڑی سے ایک بیش بہا اور نایاب ہیرا اتارا اور ستارہ کو دے کر کہا "میں یہ تمہیں بطورِ تحفہ دیتا ہوں۔ اگر تم میرے پاس آنا چاہو تو یہ ہیرا بھیج دینا۔ میں خواہ کسی حالت میں ہوں تمہیں ضرور بلالوں گا"۔

اب ستارہ کو اُس کے غم کا حال معلوم ہوا۔ اُس نے وہ ہیرا لے لیا۔ اُس وقت اُس کے دل میں وہم تک بھی نہ تھا کہ اُسے واقعی کبھی اس کی ضرورت پیش آئے گی۔

یہ واقعہ ستارہ کو صرف ایک گزرتا ہوا بادل دکھائی دیا، جس نے ایک لمحہ کے لئے اُس کی مسرت کو ڈھانپ لیا۔

دوسرے دن دہلی کی طرف کوچ شروع ہو گیا۔ ستارہ کے لئے یہ سفر نئے اور حیرت انگیز تجربات سے بھرا ہوا تھا، اور اُس نے اس کے ہر لمحہ سے لطف اٹھایا، کیونکہ وہ اپنے محبوب کے پہلو بہ پہلو سوار تھی، اور اسی طرح فتح و نصرت کے ہمرکاب وہ دہلی میں داخل ہوئی۔

یہ لمحہ اُس کی زندگی میں بیک وقت افسوسناک اور دل خوش کن تھا۔ وہ دہلی سے ایک قیدی کنیز کی حیثیت سے نکلی تھی اور اب ایک فاتح مالکہ کی حیثیت سے شاہی محل میں فروکش تھی۔ اُس کے گردوپیش عیش و عشرت کا سب سامان موجود تھا جو ایک فاتح کی منظورِ نظر رفیقۂ حیات کے شایانِ شان ہو سکتا تھا۔

دوسرے روز مغل ملکہ ―― جس کے محل میں ستارہ کبھی ایک ادنیٰ کنیز تھی ―― اُس کی ملاقات کو حاضر ہوئی اور دست بستہ التجا کرنے لگی کہ اپنے اقتدار سے شہر کو تباہی و بربادی سے بچالے۔ ستارہ نے خندہ پیشانی سے اس بات کا وعدہ کر لیا۔ اُس نے خیال کیا کہ جب زمانہ نے اُس کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا ہے تو اُسے بھی لوگوں پر مہربانی کرنی چاہئے۔

جب نادر رات کو اُس کے پاس آیا تو ستارہ نے اپنے وعدہ کا ذکر کیا۔ نادر نے ہنستے ہوئے قبول کر لیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ پہلے ہی افواج میں احکام صادر کر چکا ہے کہ ظلم و تعدی اور لوٹ مار سے پرہیز کیا جائے اور لشکر کو بھی ان احکام کی تعمیل میں عذر نہیں کیونکہ اُسے شہر والوں سے کسی قسم کا خوف نہیں۔ شکست نے اُن کی ہمت بالکل توڑ دی ہے۔

لیکن نادر کا یہ خیال بالکل غلط نکلا، چند روز بعد جب ستارہ کمرے میں نادر کی منتظر بیٹھی تھی، اُسے چیخ پکار اور شور وغل سنائی دیا۔ وہ یک دم اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے سوچا شاید نادر اپنا وعدہ بھول گیا ہے! پھر اُس نے خیال کیا کہ کیا یہ ممکن ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! نادر اپنا وعدہ کبھی نہیں بھول سکتا، لیکن پھر بھی اُس کی تشویش نہ مٹتی تھی۔ اُس نے آغا باشی کو بلا کر دریافت کیا، جس نے بتایا کہ شہریوں نے بلوہ کر دیا ہے اور اُنہیں اپنے کئے کی سزا مل رہی ہے +

سزا مل رہی ہے! ستارہ ان الفاظ کا مطلب بخوبی سمجھتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ نادر کی سزا کیا معنی رکھتی ہے۔ اُس نے نادر کو کہلا بھیجا کہ خدا کے لئے اپنا ہاتھ روک لے اور بدقسمت دہلی کو تباہی سے بچا لے، لیکن دیر تک اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ آخر بڑی مایوسی کے بعد اُس نے وہ ہیرا بھیجا +

لیکن اس پر بھی یہ ہولناک خونریزی بند نہ ہوئی۔ نادر کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اُس نے خیال کیا وہ مجھ سے ناراض ہے؟ کیا اُس نے میری منت اور سماجت کو رد کر دیا ہے؟ کیا میں نے ایک ایسے معاملہ میں دخل دیا ہے جس میں مجھے کچھ کہنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا؟

غریب ستارہ! وہ ازحد مغموم اور ناامید تھی۔ اُس نے آج ہی ایک درخواست کی تھی اور وہ مسترد ہو گئی تھی!

لیکن اُسے صحیح حالات کا علم نہ تھا۔ وہ بالکل نہ جانتی تھی کہ تمام دن اُس کی یہ التجا نادر کے پیش نظر تھی۔ فوج کے سردار اُس کے صبر و تحمل پر جو وہ شہریوں کو سزا دینے میں کام میں لا رہا تھا، حیران ہو رہے تھے، کہ نادر اور یہ تحمل! ستارہ کو یہ حقیقت اُس وقت تک معلوم نہ ہوئی جب تک نادر نے رات کو اُسے خود نہ بتایا +

آخر جب ایرانی عسکر دہلی کی بیش بہا دولت سے مالا مال ہو کر شمال کی جانب لوٹا تو ستارہ نے محسوس کیا کہ یہ ایک نئی زندگی کی ابتدا ہے، ایک ایسی زندگی کی ابتدا جس میں ماضی کا ہر لمحہ اور اُس کی یاد ایک خوش آئند مستقبل میں کھوئی جا رہی تھی۔

اُس کے سامنے ایک ایسی شاہراہ تھی جو ایک اجنبی ملک کو جاتی تھی جو اُس کے لئے نئی نئی دلچسپیوں اور امیدوں کی دنیا تھی، اور جہاں شاید شدید خطرات بھی تھے، لیکن ستارہ کسی خطرہ سے ڈرنے والی نہ تھی! وہ بخوبی جانتی تھی کہ اب اُسے اُن لوگوں سے سابقہ پڑے گا جو اُسے ازحد نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اُسے یہ بھی خیال تھا کہ نادر کی معیت میں، جو اس کے پہلو بہ پہلو ایک سچے سپاہی کی شان سے سوار تھا، اُسے کسی قسم کا خوف نہیں۔ اُس کی پگڑی میں وہ عظیم الشان ہیرا "کوہ نور" چمک رہا تھا جو اس وقت برطانیہ عظمےٰ کے تاج کی زیب و زینت ہے!

سفر کی کٹھن منزلوں کے بعد لشکر دریائے سندھ کے کنارے پر پہنچ گیا اور نادر نے آرام کرنے کا حکم دیا۔ اُس کا ارادہ

تھا کہ درۂ خیبر کو یوسف زئی قبائل کے علاقہ میں سے ہو کر عبور کرے اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر وہ شمال کی جانب بڑھا سارا دن اُس نے قبائل کے سرداروں سے گفت وشنید میں گزارا اور شام کو تھکان سے چور چور ہو کر واپس آیا اور جلد ہی سو گیا۔

رات بہت گرم تھی اور سنسان کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی، یہاں تک کہ کسی پتے کے کھڑکھڑانے کی آواز بھی نہ آتی تھی۔ ساری فضا پر موت کا سا سکوت طاری تھا۔ ستارہ کو نیند بالکل نہ آئی۔ وہ خیالات میں غرق اپنے بستر پر لیٹی رہی۔ معاً وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی حرکت کر رہا ہے وہ نہایت دلیری سے اٹھی اور دبے پاؤں خیمہ کے دروازہ تک گئی اور باہر دیکھنے لگی۔ ایک لمحہ تک وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ لیکن آہستہ آہستہ اُسے معلوم ہونے لگا کہ کوئی زمین کے ساتھ ساتھ رینگتا ہوا آ رہا ہے۔ اس کے بعد اُسے فولاد کی ایک چمک دکھائی دی، جس نے اُس کے شک کو یقین سے بدل دیا وہ خیمہ میں واپس آئی اور عین اُس وقت جب کہ قاتل اُس پر ٹوٹ پڑنے کو تیار تھے اُس نے نادر کو بیدار کر دیا۔ لیکن قاتلوں کو اس بات کا علم ہو گیا، اور وہ بھاگ گئے۔ باہر محافظوں کے مردہ جسموں نے ثابت کر دیا کہ ستارہ واقعی سچی تھی۔ اُس نے اپنے محبوب کو بر وقت ہوشیار کر کے اُسے موت کے منہ سے نکال لیا تھا۔

ابھی تک شیرازی نے ستارہ کا اُس کے محبوب کی محبت چھین لینے کا جرم معاف نہ کیا تھا، اور نہ وہ اس دوران میں انتقام کے خیال سے بے خبر رہی تھی۔ یہ بھی اُسی کی کارستانی تھی۔

(۴)

نادر شاہ ہرات پہنچا تو قاصدوں نے اُسے خوشخبری سنائی کہ ولیعہدِ سلطنت بڑی سرعت کے ساتھ استقبال کے لئے آ رہا ہے، اور امید ہے کہ کل صبح تک یہاں پہنچ جائے گا۔

نادر کو ولیعہد کی ملاقات کا از حد اشتیاق تھا۔ اُسے اپنے لختِ جگر سے ملے پورے دو سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ اس عرصہ میں وہ ایک جوانمرد سپاہی بن گیا ہوگا۔ اُسے اُس کے متعلق جس قدر خبریں موصول ہوئی تھیں سب مسرت آمیز تھیں۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا حاکم اور سپاہی ثابت ہوا ہے، اور صحیح معنوں میں شہنشاہ کا وارث ہے۔

لیکن افسوس صبح کو جب باپ بیٹا بغل گیر ہوئے ایک خیال نے نادر کی مسرت کو برباد کر دیا۔ وہی فطری خیال جسے بدگمانی [illegible] ہیں۔ اُس نے خیال کیا کہ کہیں شاہزادہ خود مختار تو نہیں ہو گیا۔ وہ بڑی تشویش میں پڑ گیا۔ اُسے خوف سا [illegible] کہ کہیں وہ اس کا مددگار ہونے کی بجائے اُس کے لئے بلائے جان نہ بن جائے اُسے معلوم تھا کہ وہ لوگوں میں

ہر دلعزیز ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ نادر نے اس بدگمانی کو چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن بےسود ——— +

اِدھر رضا خاں ولیعہد کے دل میں یہ خیال تھا کہ بادشاہ کی اس مراجعت سے اُس کی خودمختاری میں فرق آجائیگا اور اب وہ ایک دوسرے شخص کے تابع فرمان رہے گا، اور اُس کا ہر حکم بلا چون وچرا قبول کرے گا۔ اُس نے سوچا کیا وہ یہ برداشت کرسکے گا؟ یہی باتیں تھیں جو نادر اس سے چاہتا تھا اور جب تک ان کا فیصلہ نہ ہوجائے دونوں باپ بیٹے کے درمیان اعتماد یا دوستی کا رشتہ استوار نہیں ہوسکتا تھا +

ستارہ نے نادر کی اس ناامیدی سے متاثر ہوکر چاہا کہ کسی طرح دونوں باپ بیٹوں میں صلح ہوجائے اور نادر کے دل سے وہ بدگمانی دور ہوجائے جس نے اُسے اپنے بیٹے سے کشیدہ کردیا تھا۔

لیکن نادر کو اُس کا یہ دخل درمعقولات بہت ناگوار گزرا اور وہ بہت ناراض ہوگیا۔ اُس نے ستارہ کے لئے کیا کچھ نہ کیا تھا؟ اسے توقع تھی کہ وہ اس کے صلہ میں اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرے گی، کم ازکم اس وقت جب کہ اُسے اِس ہمدردی کی اشد ضرورت تھی! +

نادر سوچنے لگا کہ وہ کیوں اُن کے درمیان صلح کرانا چاہتی ہے؟ ایک خیال، ایک خوف بجلی کی طرح اُس کے دماغ میں کوندا، کیا شہزادہ اور اُس کی جماعت نے ستارہ کو رشوت دے کر یا کسی اور طریقہ سے اپنا طرفدار تو نہیں بنالیا؟ کہیں وہ اسے دھوکا تو نہیں دے رہی؟ کون! ستارہ؟ نہیں نہیں اُسے یقین نہ آتا تھا، لیکن اس شک نے اس کے دل کے گوشہ میں جگہ پکڑلی تھی، اور وہ عشق پیچاں کی بیل کی مانند اُس کے گرد لپٹا جاتا تھا +

اب شیرازی نے ——— اُس شیرازی نے جو ہمیشہ انتقام کی تجاویز سوچتی رہتی تھی ——— دیکھا کہ وقت آن پہنچا ہے وہ وقت جس کا وہ مدتوں سے گھڑیاں گن گن کر انتظار کررہی تھی، اور جس کے لئے وہ دیر سے ایک نہایت خوشنما، اور بالکل غیر معلوم جال بڑی احتیاط اور مکاری سے بچھا رہی تھی۔ پہلے اُس نے کوشش کی کہ کسی طرح نادر کی محبت کو پھر فتح کرے۔ یہ اب کوئی مشکل بات نہ تھی، کیونکہ ان دنوں اسے ایک ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو شہزادہ کے معاملہ میں اُس کی طرفدار ہو، اُس سے ہمدردی کا اظہار کرے، باقی باتوں کے لئے اُس کی نسوانیت کا جادو کافی تھا اور اس طرح شیرازی نے بتدریج اُس محبت کو غصب کرنا شروع کیا جو نادر کے دل میں ستارہ کے لئے تھی +

ستارہ اس منصوبہ سے بالکل بےخبر تھی۔ وہ اس تبدیلی سے بہت غمگین تھی جو نادر میں پیدا ہوگئی تھی۔ اُس کی سمجھ کام نہ کرتی تھی کہ کس بات نے اُسے ناراض کردیا ہے؟ اُس نے دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ ضرورات کو اپنے محبوب سے دریافت کرے گی اور اس رنجش کو دور کرے گی جو اُن میں پیدا ہوگئی تھی +

لیکن افسوس اس رات ستارہ کچھ دریافت نہ کرسکی! نادر اس رات اُس کے پاس نہ آیا! وہ دیر تک اُس کا بے سود انتظار کرتی رہی۔ اُس کے آنے کا مقررہ وقت گزر گیا، اور وہ تنہا منتظر بیٹھی رہی، اور اُس وقت تک نا امید نہ ہوئی جب تک اس نے شیرازی کے خیمہ سے قہقہوں کی آواز نہ سن لی۔ اُس وقت اُس نے اس خوفناک حقیقت کو پہچانا! اُس نے فرش پر لیٹ کر رونا اور آہیں بھرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ نیند نے رحم کھا کر اُسے اپنی شفقت بھری آغوش میں لے لیا۔

لیکن شیرازی ابھی مطمئن نہ تھی۔ صرف نادر کی محبت کے مدھم شعلوں کو دوبارہ تیز کرنا اُس کے لئے کافی نہ تھا، بلکہ وہ اپنے رقیب کو بالکل تباہ کر دینا چاہتی تھی۔ مدت سے اُس نے اس بات کی قسم کھا رکھی تھی، اور اب تک وہ اس پر قائم تھی۔

اُس نے بڑی مکاری سے ولیعہد کا اعتماد حاصل کر کے اُس کے سب راز معلوم کر لئے اور حرف بحرف نادر کو بتا دیئے، اور اس طریقہ سے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا۔ اُس نے اپنی کینہ پرور باتوں سے نادر کو ستارہ کے خلاف بدظن کر دیا، اُس ستارہ کے خلاف جس کی محبت ان تمام باتوں کے باوجود بھی اُس کے لئے ایک قیمتی تحفہ تھی۔ کوئی کمینہ حرکت ایسی نہ ہو گی جو شیرازی نے اٹھا رکھی ہو۔

چند روز بعد ایک مرتبہ پھر نادر کی جان لینے کی کوشش کی گئی، وہ ایک نالے کو عبور کر رہا تھا کہ کسی نے چھپ کر اس پر گولی چلائی۔ پہلی گولی کی آواز سنتے ہی ستارہ جھٹ اُس کے پہلو میں آ گئی، اور نادر اور اس سمت کے درمیان کھڑی ہو گئی جس طرف سے گولی آئی تھی۔ یہ دوسری بار تھی کہ اُس نے محض اپنی دلیری کی وجہ سے اُسے موت کے پنجے سے بچایا تھا۔

لیکن نادر نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اُسے بہت سے مفسدانہ اور قاتلانہ ارادوں کی خبر ملی تھی، اور وہ غصہ میں ستارہ کا شکریہ ادا کرنا یا اُس کا احسان ماننا بھول گیا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے جی میں ٹھان لی کہ کچھ بھی ہو ملزم کو ضرور تلاش کرنا چاہیئے اور اُسے کیفرِ کردار کو پہنچا کر دنیا کو دکھا دینا چاہیئے کہ نادر پر حملہ کرنے کا نتیجہ کیا ہے!

شیرازی نے اپنی تمام مکاری سے کام لے کر اس تحقیقات میں اُسے مدد دینے کا وعدہ کیا اور ایسی ایسی جھوٹی شہادتیں بہم پہنچائیں جن سے صاف ثابت ہوتا تھا کہ یہ گولی ولیعہد کے ایما ہی سے چلائی گئی ہے، اور وہی اس کا ذمہ دار ہے!

لیکن یہ بات بہت خوفناک تھی کہ اُس کا اپنا لختِ جگر اُسے قتل کرنے کی کوشش کرے! نادر کو اس بات کا یقین نہ آتا تھا تاہم وہ شیرازی کی فراہم کردہ عینی شہادتوں میں کوئی نقص نہ نکال سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ اُسے یقین ہو گیا کہ سب قصور ولیعہد کا ہے! اس کے علاوہ ایک اس سے زیادہ خوفناک اور بے معنی شبہ بھی اُس کے دل میں پیدا ہو گیا کہ رضا خاں اپنے

باپ کی ملکہ ستارہ کو دل و جان سے چاہتا ہے اور وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ بدگمانی غصہ اور غرور نے نادر کو بالکل اندھا کر دیا! اُس کے لئے یہ بات بیٹے کی غداری سے زیادہ مجرمانہ تھی۔ وہ اُن شہادتوں کو جو حلف اٹھا کر دی گئی تھیں کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ نادر کے دل میں محبت اور انتقام برسرِ پیکار تھے لیکن نتیجہ قطعی تھا۔ اُس کے خلاف ایک جرم کا ارتکاب کیا گیا تھا جو کسی حالت میں معاف نہ ہو سکتا تھا اور جس کے لئے ایک ہی سزا مناسب معلوم ہوتی تھی۔ لیکن موت! کیا وہ اپنے پیارے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دے گا؟ نہیں، نادر سا سنگ دل انسان بھی اس خیال سے کانپ اُٹھا۔

تاہم اُس نے خیال کیا کہ شہزادہ کو کچھ نہ کچھ سزا ضرور ملنی چاہئے ایک سخت سزا جو اسے آئندہ کے لئے کمزور و بے بس کر دے تو کیا پھر شہزادہ کی آنکھیں نکال کر اُسے جلاوطن کر دینا چاہئے؟ یقیناً یہی ایک سزا تھی جو اُس کے جرم کے لئے مناسب تھی! ایک ایسی سزا جو موت سے زیادہ ہولناک تھی، مگر جو نادر کو بہت نرم نظر آتی تھی! علاوہ ازیں اُس نے غور کیا کہ شاید یہ سزا ستارہ کے لئے ایک سبق کا کام دے سکے! ایک اندھا عاشق! کیا وہ اب بھی ——— ؟

نادر نے یہ فیصلہ صادر کر دیا اور شیرازی کا دل بے پایاں مسرت سے لبریز ہو گیا وہ بڑے عمدہ طریق سے اپنے منصوبوں کو عمل میں لا رہی تھی۔ اب وہ بدبخت شہزادے کی والدہ کے پاس گئی اُس سے بڑی ہمدردی ظاہر کی اور کہنے لگی "افسوس میں اب کچھ نہیں کر سکتی، شاہ پر اب میرا کوئی اختیار نہیں، لیکن ستارہ ——— "

ان الفاظ نے غمزدہ ماں کے دل میں امید کی ایک کرن روشن کر دی۔ ستارہ! ہاں شاید وہ کچھ مدد کر سکے۔ وہ اُس سے ملی اور اپنی درد بھری داستان سنا کر رحم کی ملتجی ہوئی اور اُس کی یہ کوشش بے سود ثابت نہ ہوئی۔ ستارہ نے بڑی ہمدردی سے اُس کی باتیں سنیں اور بے اعتباری کے باوجود نادر سے رحم کی درخواست کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اُسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ایک حماقت کر رہی ہے اور اُس کی منت و سماجت بے کار ثابت ہو گی تاہم اُس نے محسوس کیا کہ اُسے ایک فرض ادا کرنا ہے اور وہ اُسے ضرور ادا کرے گی!۔

اُس نے دلیری سے کام لے کر نادر سے ملنے کی درخواست کی جو منظور ہو گئی۔ جب وہ خیمہ میں داخل ہوئی نادر اکیلا بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے سے وحشت اور درشتی ٹپک رہی تھی۔ اُس نے ستارہ کے آنے کا مطلب سمجھ لیا۔ جب وہ بولی تو نادر کا چہرہ اَور درشت اور پُرغم ہو گیا۔

اپنے بیٹے کو سزا دینے سے اُس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا تھا لیکن ستارہ کا اس فیصلہ کے خلاف التجا کرنا اُسے سخت ناگوار گزرا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کا شک غلط نہ تھا۔ شیرازی کی باتیں یکے بعد دیگرے اُس کے دماغ میں خاص شکل اختیار کرنے لگیں۔ اُس کے خیال میں وہ شہزادہ کی محبت کی وجہ سے التجا کر رہی تھی۔ اُس کی سفارش نے نادر کو اُس کی بے وفائی

کا یقین دلا دیا - وہ ازحد غمزدہ ہوگیا، کچھ عرصہ خاموش رہا، پھر غضبناک آواز میں کہنے لگا:- "دور ہو جاؤ! نہیں تو میں تمہیں بھی اندھا کردوں گا!"

لیکن ستارہ نے اس کا بازو تھام کر کہا: "میرے آقا رحم کرو! رحم! وہ تمہارا بیٹا ہے! اُسے اور کوئی سزا دے دو، میرے آقا میں تمہاری منت کرتی ہوں اُس بیچارے کو اندھا نہ کرو!"

یہ نادر کی قوتِ برداشت سے زیادہ تھا - اُس کا غم غصہ میں تبدیل ہوگیا - وہ بیتاب ہوکر اٹھا اور پورے زور سے ستارا کی پیشانی پر خنجر مارا، وہ چیخ کر زمین پر گر پڑی اور دیر تک بے حس و حرکت پڑی رہی - اُس کی خوبصورت پیشانی سے خون بہ رہا تھا -

کچھ عرصہ نادر اُس کے جسم کو پریشانی سے دیکھتا رہا - اُس نے سوچا کہ میں نے کیا کر دیا ہے؟ کیا وہ مرگئی ہے؟ خوف نے اُس کے وحشیانہ غضب کو ٹھنڈا کر دیا، اور وہ بستر پر اوندھے منہ جا پڑا، وہ ایک بے خوف اور جری سپاہی تھا لیکن اس وقت وہ خوب جی کھول کر رو دیا - وہ دل شکستہ ہو چکا تھا!

(۵)

وفادار آغا باشی خیمہ میں داخل ہوا اور آرام سے ستارہ کو اٹھا کر لے گیا، اور اُسے طبیب کو دکھایا - وہ ابھی تک زندہ تھی - آغا باشی کو اُس سے ازحد عقیدت تھی اور چونکہ تنازعہ کے اصلی وجوہ سے بے خبر تھا، اِس لئے اُس نے یہی بہتر سمجھا کہ اس بات کو نادر شاہ سے پوشیدہ رکھے -

کئی دن تک ستارہ بیہوش پڑی رہی - اُس کی جان، موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا تھی - آخر کچھ دن بعد جب اُسے ہوش آیا اور وہ بولنے اور حرکت کرنے کے قابل ہوئی، تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ نادر سے کوسوں دور ہے -

آغا باشی نے اُسے ایک ارمنی خاندان کے پاس بھیج دیا تھا جس نے بڑی خندہ پیشانی سے اُس کی تیمارداری کی اور اُسے کہا کہ وہ بڑی خوشی سے اس وقت تک رہ سکتی ہے جب تک بادشاہ پر اُس کا زندہ ہونا ثابت نہ ہو جائے چنانچہ وہ مستقبل کا مقابلہ کرنے کے لئے وہاں رہنے پر رضامند ہوگئی -

ایک مہینہ گزر گیا، لیکن شاہی دربار سے کوئی امید افزا خبر موصول نہ ہوئی - دوسرا اور پھر تیسرا مہینہ بھی گزر گیا لیکن حالات جوں کے توں ہی رہے - اُس نے خیال کیا کہ شاہ کو یہ بتانا کہ میں زندہ ہوں، یقیناً اُن تمام اشخاص کی تباہی کا باعث ہوگا جو اس واقعہ سے تعلق رکھتے ہیں - اُسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ نادر نے اپنی موجودگی میں ستارہ کا نام تک لینے کی ممانعت کر دی تھی - وہ واقعی اپنے جنون پر قابو نہ پا سکتا تھا -

مصاحبوں کا خیال تھا کہ اس جنوں کا باعث غصہ ہے، اور یہی خیال ستارہ کا تھا۔ شیرازی ہاں صرف شیرازی ہی اصل حقیقت سے واقف تھی کہ یہ غم ہے جس نے اُسے دیوانہ اور ناامید کر رکھا ہے۔ نادر کو ستارہ سے محبت تھی، ایسی محبت جو بمشکل کسی مرد کے دل میں کسی عورت کے لئے پیدا ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں جس دن سے اُس نے ستارہ کو قتل کیا تھا اُسے کسی بات میں لطف نہ آتا تھا۔ وہ دیوانہ سا ہوگیا تھا!+

وہ قسمت کے ساتھ بیباکانہ جنگ کر رہا تھا۔ اُس قسمت کے ساتھ جو اُس نے سالہا سال کی کشمکش کے بعد اپنے لئے بنائی تھی، مگر بے سود۔ حکومت کی باگیں اُس کی گرفت سے نکلی جا رہی تھیں اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس میں اب انہیں دوبارہ پکڑنے کی ہمت نہیں۔ اس احساس سے اُس کے مزاج میں بے حد تلخی پیدا ہوگئی تھی اور اُس کے مصاحبوں کو ہر وقت اُس کے عتاب سے اپنی جانوں کا خطرہ رہتا تھا+

مہینے سالوں میں تبدیل ہوگئے لیکن ستارہ کو ایک لفظ نادر کی جانب سے موصول نہ ہوا۔ وہ بالکل مایوس ہو گئی اور اُسے یقین ہوگیا کہ واقعی نادر اُسے فراموش کر چکا ہے۔ وہ اب ایک ایسے شخص کی مانند تھی جس کی زندگی میں کوئی مسرت اور دلچسپی نہ ہو، لیکن اس پر بھی اُس کے دل میں اُس شخص کی طرف سے کوئی غصہ نہ تھا، جس نے بزعم خود اُسے قتل کر دیا تھا!

یکایک مشہور ہوا کہ کسی جنگی مہم کے سلسلہ میں نادر اس چھوٹے سے ارمنی گاؤں کے قریب سے گزرے گا جس میں وہ کئی سال سے پناہ گزین تھی۔ ستارہ کے دل میں نادر کو ملنے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ وہ ایسے نادر موقع کو ہاتھ سے کھونا نہ چاہتی تھی+

اُس کے بہی خواہوں نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن ستارہ کا مضبوط ارادہ بالکل متزلزل نہ ہوا۔ اُس نے کہا وہ ضرور جائے گی خواہ کچھ ہو۔ اُس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ اُسے موت کا بالکل خوف نہ تھا۔ اُس کے خیال میں سالہا سال کی بے لطف زندگی سے نادر کے ہاتھوں مر جانا ایک لازوال مسرت کے برابر تھا+

علاوہ ازیں اُس نے محسوس کیا کہ اس وقت نادر کو اُس کی سخت ضرورت ہے۔ اُس نے ایک معتبر قاصد تلاش کیا اور ایک خط دے کر ایرانی لشکر میں بھیجا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے وہ ہیرا بھی بھیج دیا جو مدت ہوئی نادر نے اُسے بطور تحفہ دیا تھا، اور خود انتظار کی گھڑیاں گننے لگی+

اُس کی نسوانی فطرت نے اُس کی بالکل ٹھیک راہنمائی کی تھی۔ نادر نے ابھی تک اُسے فراموش نہ کیا تھا۔ اُسے واقعی اُس کی ضرورت تھی۔ کوئی شخص اُس بے پایاں مسرت کو بیان نہیں کر سکتا جو اسے یہ سن کر ہوئی کہ ستارہ اُس کی

پیاری ستارہ ابھی تک زندہ ہے۔ اُس نے فوراً شاہی سواروں کا ایک دستہ اُس کی طرف بھیجا اور التجا کی کہ جس قدر جلد ممکن ہو اُس کے پاس چلی آئے۔ لیکن یہ التجا بلا ضرورت تھی۔ ستارہ نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور دو دن بعد ایک دفعہ پھر ایک ملکہ کی شان وتمکنت کے ساتھ ایرانی لشکر میں جا پہنچی +

نادر اس سے ملا ـــــ اس پُرمسرت گھڑی میں ماضی اور اُس کی تمام تکالیف ایک خواب کی یاد کی مانند فراموش ہوگئیں۔ اب اُن کی جدائی ناممکن تھی۔ محبت کی شکستہ زنجیر کی کڑیاں اب پھر مضبوطی سے جڑ گئیں، جنھوں نے ستارہ اور نادر کو پہلے سے کئی گنا مضبوطی سے جکڑ دیا +

لیکن اب نادر کی شہرت اور عظمت کے دن جا چکے تھے اور اُن کے ساتھ مسرت کے دن بھی رخصت ہو چکے تھے قسمت اُس کے خلاف ہوگئی تھی۔ وہ اب اپنی زندگی کے لئے جدوجہد کر رہا تھا، اور اُس کے اپنے پیروؤں میں اُس کے بدترین دشمن پیدا ہوگئے تھے۔ اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اُس کا انجام نزدیک آن پہنچا ہے +

اچانک ایک رات جب کہ ہر طرف خاموشی اور تاریکی مسلّط تھی اور ستارہ اپنے غمزدہ آقا کے بستر کے قریب بیٹھی اُس کی حفاظت کر رہی تھی، اسے باہر کسی کے حرکت کرنے کی آواز آئی، وہ فوراً اُٹھ بیٹھی، لیکن اس مرتبہ خطرہ کی خبر اُسے بہت دیر بعد ملی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ کسی قسم کی حرکت کرکے یا چیخ کر نادر کو جگا دے، قاتل خیمہ میں داخل ہوگئے اور خوابیدہ سلطان کو قتل کر دیا۔

اس کے بعد جب فرض ناشناس محافظ اندر داخل ہوئے تو انھوں نے ایک عجیب پُرغم نظارہ دیکھا۔ اُن کا ذی شان حکمران زمین پر بے حس وحرکت پڑا تھا، اُس کے دیوزاد جسم سے اُس حسین عورت کا نازک جسم لپٹا تھا جس سے اُسے ازحد محبت تھی، اور ایک تیز خنجر اُس کے دل میں گہرا پیوست تھا +

سراج الدین احمد نظامی

مسکراہٹ

اُس کے سادہ حسن میں فرشتوں کی سی حیا کی ملاحت ہے اور تبسّم کی وہ کرن جو ہر وقت اُس کے لبوں پر رقصاں رہتی ہے اُس کی پاک اور پیاری روح کا عکس معلوم ہوتی ہے۔

محسن عبداللہ

لمعات

نہ ملا سکونِ خاطر مجھے عمرِ جاوداں سے
جو ہُوا بھی کچھ میسّر تو وہ مرگِ ناگہاں سے

مرے دل میں ہے وہ طوفاں کہ خدا ہی جانتا ہے
یہ خیال، توبہ توبہ کہ بیان ہو زباں سے

ترے چارہ ساز آئے ترے دل نواز آئے
دلِ مبتلا ٹھہر جا، وہ ہیں تجھ سے بدگماں سے

اسے ڈھونڈھتا ہوں جس کو سرِ طور ڈھونڈتے تھے
اِسی جستجو میں آیا ہوں مکانِ لامکاں سے

میں فدائے حسنِ مطلق میں نثارِ حسنِ خوباں
میں شکارِ تیرِ جاناں، جو چھٹا نہیں کماں سے

جو خیال میں نہ آئے نہ سما سکے نظر میں
اُسی ذات کا ہوں شیدا جو بلند ہے گماں سے

مجھے شعر و شاعری سے نہیں دُور کی بھی نسبت
یہ لگی ہوئی ہے دل کی جو نکل گئی زباں سے

میں عمل کو چاہتا ہوں کہ عمل کا شیفتہ ہوں
کہ حیات ہے عمل سے نہ زبان اور بیاں سے

ترے در پہ آ کے بیٹھا ہے شہابِ شعلہ ساماں
وہ اُٹھے تو مٹ کے اُٹھے ترے سنگِ آستاں سے

مہر محمد خاں **شہاب** مالیر کوٹلوی

سچّی خوشی

اپنی طبیعت میں ایک تغیر ناشناس شیرینی کا پیدا کرلینا، صرف شستہ اور پاکیزہ خیالات کو اپنے دل میں جگہ دینا اور ہر حال میں خوش رہنا سیرت کا ایک ایسا حسن ہے جس کا حصول ہر شخص کا مقصدِ حیات ہونا چاہیئے، اور خصوصاً اُن لوگوں کا مقصدِ حیات جو دنیا کے مصائب کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ جو شخص، کج خلقی، آلودگی اور ناخوشی کی سطح سے اپنے آپ کو بلند نہیں کرسکا وہ بہت بڑے دھوکے میں ہے اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی نظریہ یا مذہبی اصول کی تبلیغ سے دنیا میں مسرت کو پھیلا سکے گا۔ وہ جو اپنی زندگی کے اوقات کج خلقی، آلودگی یا ناخوشی میں گزارتا ہے دنیا کی مصیبت میں اضافہ کرتا ہے۔ بخلاف اس کے وہ جو ہمیشہ نیکی اور فلاح پر نظر رکھتا ہے اور کبھی آزردہ خاطر نہیں ہوتا روز بروز دنیا میں خوشی کو فروغ دے رہا ہے۔

وہ جس نے خوش خلق ہونا، درگذر کرنا، محبت سے پیش آنا اور خوش رہنا نہیں سیکھا خواہ اُس نے انبار در انبار کتابیں پڑھ لیں اور آسمانی کتابوں کے لفظ لفظ کو حفظ کرلیا اُس نے دنیا میں بہت کم سیکھا، کیونکہ نیکی، پاکیزگی اور خوشی ہی سے ہم دنیا کے گہرے، حقیقی، اور صبر آزما اسباق کو سیکھ سکتے ہیں۔ زمانے کی تمام مخالفتوں اور مخاصمتوں کے بالمقابل ہشاش بشاش رہنا ہی اپنے نفس پر غلبہ حاصل کرلینے کی بہت بڑی دلیل ہے، دانشمندی کی شہادت ہے اور حقیقت کو پالینے کا ثبوت ہے۔

ایک مسرور اور شاداں روح تجربہ اور دانش کا پختہ ثمر ہے جو نظر تو نہیں آتا مگر اُس کی خوشبو دور دور تک پہنچتی ہے، دوسروں کے دلوں کو فرحت دیتی اور دنیا کی فضا کو پاکیزہ بناتی ہے۔ یہ نہ کہو کہ تمہارے گردوپیش کے حالات تمہارے مخالف ہیں۔ گردوپیش کے حالات کبھی انسان کے مخالف نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ اس کے موید ہوتے ہیں اور تمام وہ واقعات جن کے پیش آنے پر ہم اپنی طبیعت کی شگفتگی اور اپنے قلب کا سکون کھو بیٹھتے ہیں دراصل وہ منازل ہوتی ہیں جن سے گزرنا ہماری سیرت کی نشوو ارتقا کے لئے لازمی اور لابدی ہے، اور جب تک ہم ان منازل کو طے نہ کرجائیں اُس وقت تک نہ ہم کچھ جان سکتے ہیں اور نہ کوئی ترقی کرسکتے ہیں۔ نقص خود ہمارے نفوس میں ہے۔

سچی خوشی روح کی صحیح اور اصلی حالت ہے، اور ہر شخص اُسے حاصل کرسکتا ہے اگر وہ سچائی اور بے غرضی سے بسر کرے۔ تمام جانداروں کے لئے اپنے دل میں مہربانی کا جذبہ پیدا کرو، نامہربانی حرص اور غصہ کو دل سے نکال دو تاکہ تمہاری زندگی اُس روح پرور نسیم کی طرح ہو جائے جو پھولوں اور کانٹوں پر سے ایک سی نرمی سے گزر جاتی ہے۔

اگر تم اسے کچھ زیادہ مشکل سمجھ بیٹھے ہو تو بے اطمینانی اور ناخوشی تمہارے قلوب سے نہیں نکل سکے گی اسے آسان بنانے میں تمہارا یقین، تمہاری خواہش، تمہارا عزم سب بروئے کار آنے چاہئیں۔

مایوسی، تنک مزاجی، فکر و تردد، شکایت، ملامت اور غصہ ـــــ یہ سب خیالی گھن ہیں، قلب کی بیماریاں ہیں۔ یہ ایک ناقص دماغی کیفیت کی نشانی ہیں اور جو ان امراض میں مبتلا ہیں انہیں اپنے قلب و دماغ کا علاج کرنا چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ دنیا میں گناہ اور مصیبت کا دور دورہ ہے۔ اسی لئے دنیا کو ہماری محبت و رافت کی ضرورت ہے، لیکن ہمارے رنج و مصیبت کی دنیا کو ضرورت نہیں کیونکہ وہاں پہلے ہی اس کی کمی نہیں۔ اُسے ہماری خوشی اور خرمی کی ضرورت ہے کیونکہ وہاں خوشی اور خرمی کی کمی ہے۔ ہم دنیا کو حسنِ حیات و سیرت سے بہتر کوئی تحفہ پیش نہیں کرسکتے۔ اس کے بغیر سب چیزیں فضول ہیں، اسے سب پر فوقیت حاصل ہے، یہ پائدار، حقیقی اور غیرفانی ہے اور مسرت و برکت کلیتہً اس پر مشتمل ہے۔

اپنے گرد و پیش کو مایوسانہ نظروں سے نہ دیکھو اور دوسروں کی برائی کی شکایت یا اُس برائی کے خلاف جنگ کرنے کی بجائے خود اپنے گناہوں اور بدیوں کے بندھنوں سے آزاد ہو کر رہو۔ اطمینانِ قلب، خالص مذہب اور سچّی اصلاح کا یہی راستہ ہے۔ اگر تم لوگوں کو حقانیت سکھانا چاہتے ہو تو پہلے خود حق پرست بنو، اگر تم دنیا کو مصیبت اور گناہ سے آزاد کرنا چاہتے ہو تو پہلے خود آزاد بنو، اگر تم اپنے گھر اور اپنے گرد و پیش کو مسرور دیکھنا چاہتے ہو تو پہلے خود خوش ہو جاؤ۔ تم اپنے گرد و پیش کی تمام فضا کو بدل سکتے ہو اگر تم اپنے آپ کو بدل ڈالو۔

ایلین

منصور احمد

غزل

پوشیدہ دیکھتی ہے کسی کی نظر مجھے — دیکھ اے نگاہِ شوق تو رسوا نہ کر مجھے

رحمت پیام لائے گی عفوِ گناہ کا — عذرِ گناہ کی ہوئی توفیق اگر مجھے

مقصد سے بے نیاز رہا ذوقِ جستجو — میں بے خبر ہوا جو ہوئی کچھ خبر مجھے

تھی کج روی کی خو جو ازل میں پڑی ہوئی — گم کردہ راہ چھوڑ گیا راہبر مجھے

ڈوبا ہوا تھا کیف میں تیرِ نگاہِ ناز — رکھتی ہے مست لذتِ زخمِ جگر مجھے

میں شب کی بزمِ عیش کا ماتم نشیں ہوں آپ — رو رو کے کیوں رلاتی ہے شمعِ سحر مجھے

حیرت نے میری آئنہ ان کو بنا دیا — کیا دیکھتے، کہ رہ گئے وہ دیکھ کر مجھے!

قربان جاؤں، چھوڑ تکلف کی گفتگو
کہہ کر پکار وحشتِ شوریدہ سر مجھے

رضا علی وحشت

غزل

سر میں جنونِ عشق ہو، حکمت یہی تو ہے — دونوں جہاں کے علم کی دولت یہی تو ہے

دیکھا نہ چشمِ فلسفہ سے روئے یار کو، — ہے علم خود حجابِ حقیقت یہی تو ہے

ہر ذرہ کائنات کا ہے دفترِ رموز — "محرم نہیں ہے تو ہی مصیبت یہی تو ہے"

وہ ہیں جو بے نیاز، تو میں ہوں نیاز مند، — دونوں میں ایک راہِ محبت یہی تو ہے،

آنکھیں ملا کے شوق سے دل میں سمائیے — حضرت! حضور کا درِ دولت یہی تو ہے،

واعظ سے ارتباط نہ ہرگز بڑھائیے
پیرِ مغاں کی ایک نصیحت یہی تو ہے

مصطفیٰ خاں

جوگن

ایک زمانے میں جب میری تحریروں نے عوام کے ایک طبقہ کو میرے خلاف سخت مشتعل کر دیا اور جرائد و رسائل نے اپنی مشقِ ستم کے لیئے میرا نام منتخب کر لیا تو میں نے مناسب سمجھا کہ چپ چاپ کسی پُرسکون مقام کو چلا جاؤں اور یہ کوشش کروں کہ کچھ عرصہ کے لیئے خود مجھ کو بھی اپنی ہستی فراموش ہو جائے۔

کلکتہ سے کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں میں میرا ایک مکان ہے جہاں میں عوام کی نگاہوں کا ہدف بننے سے پناہ لے سکتا ہوں۔ گاؤں والوں نے ابھی تک میرے متعلق کوئی خاص رائے قائم نہیں کی۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ گاؤں کی اقامت سے میرا مقصد محض تفریح و تفرج یا عیش و عشرت کا حصول نہیں ہوتا کیونکہ میں نے گاؤں کی راتوں کے سکون کو شہر والوں کے عافیت سوز شور و شغب سے کبھی برہم نہیں کیا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں تارک الدنیا زاہد بھی نہیں، کیونکہ میری طرزِ زندگی میں انہیں آسائش و آسودگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ وہ مجھے سیاح بھی نہیں سمجھتے کیونکہ گو میں فطرۃً آوارہ گرد ہوں لیکن گاؤں کے کھیتوں کے گرد میرا چکر لگانا انہیں بالکل بے مقصد معلوم ہوتا ہے۔ انہیں یہ بھی ٹھیک معلوم نہیں کہ میری شادی ہو چکی ہے یا نہیں کیونکہ انہوں نے کبھی مجھے اپنے بچوں کے ساتھ نہیں دیکھا۔ میرا وجود اُن کے لیئے ایک ناقابلِ حل معما ہے۔ پس مدت سے انہوں نے میرے متعلق کسی قسم کا غور و فکر صرف کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

لیکن مجھے حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ گاؤں میں کم از کم ایک متنفس ایسا بھی ہے جس کو مجھ سے نہایت گہری دلچسپی ہے۔ ہماری ملاقات پہلے پہل جولائی کے گرم موسم میں ایک سہ پہر کو ہوئی۔ صبح لگاتار بارش ہوتی رہی تھی اس لیئے کہر نے اس وقت تک ہوا کو بوجھل اور نم آلود بنا رکھا تھا۔

میں بے کار بیٹھا ایک چتکبری گائے کو دیکھ رہا تھا جو دریا کے کنارے گھاس چر رہی تھی۔ سورج کی آخری کرنیں اُس کے چمکیلے جسم کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ گائے کے خوبصورت قدرتی لباس کو دیکھ کر میرے دل میں عجیب و غریب خیال پیدا ہو رہے تھے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اپنے جسم کو قدرتی لباس سے محروم کر کے کپڑے مہیا کرنے میں کس قدر اسراف سے کام لیتا ہے۔

میں انہیں خیالات میں محو بیٹھا تھا کہ ادھیڑ عمر کی ایک عورت میرے روبرو آکر ادب سے جھکی اور پھر میرے سامنے زمین پر سجدہ ریز ہوگئی۔ اس کے دامن میں پھولوں کے چند گچھے تھے جن میں سے ایک اُس نے مجھے دیا، اور اس کے بعد ادب کے ساتھ دست بستہ کھڑی ہوگئی۔ پھولوں کا یہ ہدیہ پیش کرتے وقت اُس نے مجھ سے یہ الفاظ کہے: "یہ ناچیز ہدیہ میرے معبود کی نذر ہے"

وہ چلی گئی۔ اس کے یہ الفاظ سن کر میں اس قدر گھبرا گیا تھا کہ اس کے روانہ ہو جانے سے قبل میں اس پر ایک نگاہ بھی نہ ڈال سکا۔ یہ تمام واقعہ بالکل سادہ سا تھا لیکن میرے دل پر اس سے ایک نہایت گہرا اثر پڑا۔ اور جب دوبارہ میں نے کھیت میں گائے پر نظر ڈالی جو سرگرمی سے گھاس کھانے میں مصروف تھی اور ساتھ ساتھ اپنے جسم پر سے مکھیاں بھی اڑاتی جاتی تھی، تو مجھے اس چوپایہ کا وجود بھی سراپا اسرار معلوم ہونے لگا۔ شاید قارئین مجھ پر ہنسیں، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس وقت میرا دل خدا کی تسبیح و تقدیس کے جذبات سے مملو ہو گیا۔ میں نے زندگی کی پاک مسرتوں کے عطیہ پر خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ وہی ہر قسم کی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ پھر میں نے آم کے درخت کی ایک نرم سی شاخ لے کر اپنے ہاتھ سے گائے کو کھلائی۔ اس سے میرا دل کچھ مطمئن سا ہو گیا گویا میں نے اپنے خدا کو خوش کیا ہے۔

دوسرے سال جب میں گاؤں میں آکر ٹھہرا، فروری کا مہینہ تھا۔ جاڑا ابھی رخصت نہ ہوا تھا۔ صبح کے وقت سورج کی دھوپ میرے کمرے میں داخل ہوئی جس کی گرمی نے میرے دل میں جذباتِ تشکر پیدا کر دیئے میں لکھنے میں مصروف تھا جب ایک خدمتگار نے مجھے اطلاع دی کہ ایک جوگن ملاقات کے لئے نیچے کھڑی ہے۔ میں نے بے پروائی سے اُسے اوپر بلانے کو کہا اور خود پھر لکھنا شروع کر دیا۔ جوگن نے اندر داخل ہوتے ہی ادب سے جھک کر میرے پاؤں چھوئے۔ میں فوراً پہچان گیا کہ یہ وہی عورت ہے جس سے گزشتہ سال میری ایک مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔

اب میں زیادہ غائر نگاہ کے ساتھ اس کو دیکھ سکا۔ اس کی عمر اس حد سے متجاوز ہو چکی تھی جب کسی عورت کے حسن کو معرض بحث میں لایا جاتا ہے۔ اس کا قد لمبا تھا اور جسم سے وہ بہت مضبوط معلوم ہوتی تھی، لیکن عبادت و ریاضت کی کثرت نے اُس کی کمر میں کسی قدر خم پیدا کر دیا تھا۔ اس کے انداز و اطوار میں کسی قسم کی جھجک نہ پائی جاتی تھی۔ اس کے چہرہ کا سب سے نمایاں حصہ اس کی آنکھیں تھیں جو ہر اس چیز میں جس پر وہ نگاہ ڈالتی تھی کھب جاتی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے نہایت زبردست قوتِ ادراک کا اظہار ہوتا تھا۔

جب وہ اندر داخل ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا اُس نے اپنی ان دو بڑی بڑی آنکھوں سے میرے جسم کو ایک دھکا سا دیا ہے۔ آخر اُس نے یوں سلسلۂ کلام شروع کیا۔

"یہ کیا! میرے معبود تُو نے مجھے اپنے تخت کے پاس کیوں بلالیا؟ میں تجھے درختوں کے سایہ میں دیکھا کرتی تھی تیرے ملنے کی صحیح جگہ وہی ہے۔ اور تجھے وہیں دیکھنا مجھے زیادہ پسند ہے"۔

غالباً اُس نے مجھے باغ میں ٹہلتے دیکھا ہوگا۔ لیکن گزشتہ چند دن سے مجھے نزلہ کی شکایت ہوگئی تھی اس لئے طبیب کے مشورہ کے مطابق میں گھر سے باہر نہ نکلا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جوگن نے کہا "اے میرے معبود مجھے نیکی کا کوئی درس دے"۔

میں اس ناگہانی سوال کے جواب کے لئے بالکل تیار نہ تھا چنانچہ میں نے بلا تامل یہ جواب دیا "نیکی کا درس نہ میں نے کبھی دیا ہے نہ لیا ہے۔ میں اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں اور منہ سے کچھ نہیں بولتا۔ اس طرح میں دیکھ بھی سکتا ہوں اور سن بھی سکتا ہوں، خواہ کوئی آواز پیدا نہ ہو اس وقت جو میں تمہیں دیکھ رہا ہوں یہ ایسا ہی ہے گویا میں تمہاری آواز سن رہا ہوں"۔

میری یہ گفتگو سن کر جوگن کے دل میں ایک ہیجان سا پیدا ہوگیا اور اُس نے کہا کہ "خدا نہ صرف اپنی زبان سے بلکہ اپنے تمام جسم کے ساتھ مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے"۔

میں نے کہا "میں خاموشی کی حالت میں اپنے تمام جسم سے سن سکتا ہوں اور میں کلکتہ سے صرف یہی آواز سننے یہاں آیا ہوں"۔

جوگن نے کہا "یہ مجھے معلوم ہے اور اسی لئے میں تیرے حضور میں بیٹھنے کے لئے آئی ہوں"۔

رخصت ہونے سے پہلے اُس نے پھر جھک کر میرے پاؤں چھوئے۔ مجھے جراہیں پہنے دیکھ کر اُسے تکلیف ہوئی کیونکہ وہ برہنہ پاؤں کو چھونا چاہتی تھی۔

دوسرے دن علی الصباح میں باہر نکل کر اپنے بالاخانے کی چھت پر بیٹھا جنوب کی طرف درختوں کی قطاروں کے پار مجھے اجاڑ اور سرسبز وسیع میدان نظر آتا تھا۔ مشرق میں ایکھ کے کھیتوں کے اوپر سے سورج طلوع ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ گھنے درختوں کے سایہ میں گاؤں کی سڑک نظر آتی تھی جو دوسرے قصبات کی طرف جاتی ہوئی دور جاکر دھند میں غائب ہوگئی تھی۔

اُس صبح کو یہ کہنا مشکل تھا کہ سورج طلوع ہوچکا ہے۔ ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی اور درختوں کی چوٹیوں

پر ابھی تک سفید پالا جما ہوا تھا۔

صبح کے اس دھندلکے میں میں نے جوگن کو چلتے ہوئے دیکھا۔ وہ خدا کی تعریف میں گاتی اور سنکھ بجاتی ہوئی پھر رہی تھی۔

رفتہ رفتہ دھند غائب ہوگئی اور سورج کی روشنی ہر طرف اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ پھیل گئی۔

جب میں اپنے حریص ایڈیٹر کی ادبی گرسنگی کی تسکین کے لئے جو کلکتہ میں بیٹھا ہل من مزید کا ورد کیا کرتا ہے دوات قلم لے کر لکھنے کے کمرے میں بیٹھ گیا تو مجھے سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ ایک لمحہ کے بعد جوگن آپ ہی آپ کوئی راگ گنگناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور میرے سامنے ادب کے ساتھ جھک کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے سر اوپر اٹھایا۔

اُس نے کہا "میرے معبود کل میں تیرے دسترخوان سے بچا کھچا کھانا تبرک کے طور پر لے گئی تھی"۔

میں یہ سُن کر چونک پڑا اور اُس سے دریافت کیا کہ تم نے یہ کس طرح حاصل کیا؟

اُس نے کہا "میں دروازے پر منتظر کھڑی رہی اور جب کھانے کے برتن باہر آئے، تو طشتری میں سے کچھ کھانا میں نے لے لیا"۔

یہ بات میرے لئے بہت تعجب انگیز تھی کیونکہ گاؤں میں سب لوگ جانتے تھے کہ میں یورپ جا چکا ہوں اور فرنگیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھا چکا ہوں۔ اس وجہ سے راسخ الاعتقاد لوگ میرے کھانے کو ناپاک سمجھتے تھے۔

میرے اس اظہار تعجب پر جوگن نے کہا "میرے معبود اگر میں تیرا کھانا اپنے لئے منع سمجھوں، تو پھر بھلا میں تیرے پاس کس لئے آؤں"؟

میں نے کہا "مگر تمہارے ہم قوم اس بات پر کیا کہیں گے"؟

اُس نے مجھے بتایا "میں پہلے ہی سے یہ بات سب لوگوں کو بتا چکی ہوں جس پر انہوں نے تاسف سے اپنے سر ہلائے لیکن پھر سب نے کہا کہ اسے اسی کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے"۔

مجھے معلوم ہوا کہ جوگن ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی ماں جو خوشحال ہے اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی، مگر اُس نے بھکارن بننے کو ترجیح دی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ در در کی بھیک مانگ کر جو روزی مجھے میسر ہوتی ہے اُس کو میں مقدس سمجھتی ہوں۔ اس کے قول پر غور کرنے کے بعد میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ جب ہمیں اپنی روزی خیرات کے طور پر میسر ہو تو ہم خدا ہی کو اپنا داتا سمجھتے ہیں اور اُس کے زیادہ شکر گزار ہوتے ہیں لیکن جب ہمیں گھر

پر معمول کے مطابق باقاعدہ کھانا ملتا ہے تو ہم اُسے اپنا حق سمجھنے لگتے ہیں۔

میں بہت چاہتا تھا کہ اس کے شوہر کے متعلق کچھ اس سے پوچھوں، لیکن چونکہ خود اس نے کبھی اس کی طرف اشارہ تک بھی نہ کیا تھا اس لئے میں نے اُس سے کچھ نہ پوچھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ جوگن کے دل میں گاؤں کے امرا کی کچھ بھی وقعت نہیں ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ خدا کے نام پر ایک پائی بھی نہیں دیتے لیکن اس کے باوجود خدا کی نعمتوں کے بہت بڑے حصہ دار ہیں۔ ان کے مقابلہ میں غریب فاقے کھینچتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم ان خدا ناشناس لوگوں میں جا کر کیوں نہیں رہتیں تاکہ انہیں سیدھا راستہ دکھا سکو پھر میں نے ذرا مذہبی جوش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ خدا کی عبادت کی افضل ترین صورت ہے۔"

جوگن پر میرے اس وعظ کا بظاہر کچھ اثر نہ ہوا اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ کر کہا "میں مطلب سمجھ گئی یعنی چونکہ خدا گنہگاروں کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے جب ہم اُن کی خدمت کرتے ہیں تو گویا خدا کی خدمت کرتے ہیں"

میں نے جواب دیا "ہاں میرا مطلب یہی ہے"

اُس نے بے صبری سے کہا "بیشک خدا انہیں کے ساتھ ہے، ورنہ وہ اس آرام سے زندگی نہ گزار سکیں لیکن مجھے اس سے کیا سروکار ہے، میرا خدا وہاں نہیں۔ میں وہاں اپنے خدا کی عبادت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ ان میں نہیں ہے۔ میں وہیں اُس کی تلاش کرتی ہوں جہاں وہ ملتا ہے۔"

اس گفتگو کے دوران میں اُس نے میرے سامنے ادب سے اپنا سر جھکا دیا۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ محض خدا کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کا نظریہ ہمیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اور ہمیں خدا کے ہر جگہ موجود ہونے کا خیال اس وقت تک ناقابلِ فہم معلوم ہوتا ہے جب تک کہ ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ سکیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جوگن میرے سامنے بحیثیت ایک انسان کے اظہارِ عبودیت نہ کرتی تھی، بلکہ میرے وجود کو اس نے عبادتِ ایزدی کا محض ایک وسیلہ قرار دے رکھا تھا۔ مجھے اس عبادت کے رد و قبول کا اختیار نہ تھا کیونکہ یہ میری نہیں بلکہ خدا کی عبادت تھی۔

دوسری دفعہ جب جوگن آئی اُس نے ایک دفعہ پھر مجھے کتابوں اور کاغذات میں گھرا ہوا دیکھا۔ اس پر اُس نے تنگ آ کر کہا "میرے معبود تو کیوں اس مصیبت میں گرفتار رہتا ہے جب میں آتی ہوں تجھے لکھتا پڑھتا

دیکھتی ہوں"۔

میں نے جواب دیا "خدا اپنی ناکارہ مخلوق کو ہر وقت مصروف رکھتا ہے تاکہ وہ فتنہ سے بچی رہے"۔

جوگن نے مجھے بتایا کہ میں نے اُس کے راستہ میں بہت سی روکاوٹیں پیدا کر رکھی ہیں جنہیں وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر وہ میرے پاس آنا چاہے تو نوکر اُسے اوپر آنے سے روکتے ہیں، اگر وہ عبادت کے لئے میرے پاؤں چھونا چاہے تو اس میں جرابیں حائل ہوتی ہیں، اور جب وہ مجھ سے سیدھی سادھی باتیں کرنا چاہے تو میرا دماغ اُسے الفاظ کے ایک صحرا میں بھٹکا ہؤا معلوم ہوتا ہے۔

اب کی بار رخصت سے قبل جوگن نے مجھ سے کہا: "میرے معبود آج صبح میں نے تیرے پاؤں اپنے سینے میں محسوس کئے۔ اُف وہ کتنے سرد تھے اور وہ برہنہ تھے، جرابوں سے ڈھکے ہوئے نہ تھے۔ میں انہیں سر پر رکھ کر دیر تک عبادت میں مصروف رہی۔ پھر مجھے بتا کہ اس کے بعد اب خود تیرے پاس آنا مجھے کیا ضرور تھا میں کیوں آئی۔ میرے آقا مجھے سچ سچ بتا کیا یہ محض ایک جنون نہیں ہے"؟

میرے گلدان میں کچھ پھول تھے جوگن کی موجودگی میں مالی ان کو بدلنے کے لئے کچھ تازہ پھول لایا۔ مالی کو پھول بدلتے ہوئے دیکھ کر وہ پکاری "بس کیا اب یہ پھول بے کار ہو گئے ہیں؟ تو پھر یہ میں لے لیتی ہوں"۔

اُس نے پھولوں کو نہایت نرمی سے اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں کی کٹوری میں رکھ لیا، اور جھکے ہوئے سر کے ساتھ ان کو نہایت احترام سے دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے نظر اٹھا کر مجھ سے کہا "تم کبھی ان پھولوں کو دیکھتے نہیں اسی لئے تم ان کو باسی سمجھنے لگتے ہو۔ اگر تم ان کو ذرا بھی غور سے دیکھو تو لکھنے پڑھنے کا شوق نام کو بھی نہ رہے"۔

اُس نے گلدستے کو بہ احتیاط اپنے آنچل سے باندھ لیا اور پھر نہایت تعظیم کے ساتھ اس کو اپنے سر پر رکھ کر کہنے لگی "اب میں اپنے معبود کو اپنے ساتھ لئے پھروں گی"۔

اس کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر مجھے محسوس ہؤا کہ ہمارے کمروں میں جو پھول گلدانوں میں پڑے رہتے ہیں، ہم اُن پر اپنی وہ محبت آمیز توجہ صرف نہیں کرتے جس کے وہ مستحق ہیں۔ پھول گلدانوں میں پڑے رہتے ہیں، جیسے مدرسہ کے شریر لڑکے سزا دینے کے لئے ایک قطار میں کھڑے کر دیئے گئے ہوں۔

اسی شام کو جوگن دوبارہ آئی اور بالاخانے پر آکر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔

اُس نے کہا "آج صبح جب میں اپنے معبود کی تعریف میں گاتی ہوئی گھر گھر پھر رہی تھی میں نے وہ تمام پھول بانٹ دیئے۔ ہمارے گاؤں کا مکھیا میری عقیدت مندی پر ہنسا اور کہنے لگا تم کیوں بے سود اُس کی اتنی پرستش کرتی ہو

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ دور و نزدیک بدنام ہے اور لوگ اُسے بہت برا بھلا کہتے ہیں؟ میرے معبود کیا یہ سچ ہے کیا لوگ واقعی تجھ سے نالائمت کے ساتھ پیش آتے ہیں؟"

لمحہ بھر کے لئے میں بالکل ساکت و صامت رہ گیا۔ میرے لئے یہ تکلیف دہ علم بالکل نیا تھا کہ مطبع والوں کی سیاہی کے دھبے اس قدر دور تک پہنچ چکے ہیں۔

جوگن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "مکھیا سمجھتا تھا کہ وہ میری پرستش کے شعلہ کو اپنی ایک ہی پھونک سے بجھا دے گا لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ کوئی چھوٹا سا شعلہ نہیں بلکہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ میرے معبود لوگ تجھے کیوں بُرا بھلا کہتے ہیں؟"

میں نے کہا "اس لئے کہ میں اسی قابل ہوں۔ غالباً میری حرص یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ میں چپکے چپکے لوگوں کے دل چرا لینے کی کوشش کر رہا تھا"

جوگن نے جواب دیا "اب تو نے دیکھ لیا، اُن کے دل کس قدر بے وقعت اور ناکارہ ہیں۔ ان میں زہر بھرا ہوا ہے۔ لیکن اب یہی زہر تجھے حرص سے شفا دے گا"

میں نے جواب دیا "جس شخص کے دل میں حرص موجود ہو اُسے ہر وقت سزا کا خطرہ لگا رہتا ہے یہ حرص خود دشمنوں کو زہر بہم پہنچاتی ہے"

اُس نے کہا "ہمارا مہربان خدا ہمیں اپنے ہاتھ سے سزا دیتا ہے اور زہر کے اثر سے ہمیں محفوظ رکھتا ہے جو شخص آخر تک خدا کی رضا پر صابر رہے وہ ضرور نجات پاتا ہے"

۲

اُس شام جوگن نے مجھے اپنی زندگی کی داستان سنائی۔ شام کے ستارے طلوع ہو کر درختوں کے اوجھل غروب ہو گئے، مگر وہ اپنا قصّہ بیان کرتی چلی گئی۔

"میرا شوہر بہت سادہ مزاج ہے۔ بعض لوگ اُسے سادہ لوح کہتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جو لوگ سادہ طور سے سمجھتے ہیں وہی صحیح سمجھتے ہیں۔ اپنے کاروبار اور گھر کے انتظام میں اُسے خاصی مہارت حاصل تھی۔ چونکہ اس کی ضروریات کم اور اُس کی خواہشات محدود تھیں اس لئے وہ اپنے چند خاص خاص فرائض کو نہایت اچھی طرح سے انجام دے لیتا تھا۔ دوسرے امور میں وہ نہ دخل دیتا تھا اور نہ اُن پر غور کرتا تھا۔

"ہماری شادی کے بعد میرے شوہر کے والدین زیادہ مدت تک زندہ نہ رہے، اور ہم تنہا رہ گئے لیکن

میرا شوہر ہمیشہ کسی اور کا مطیع ہو کر رہنا چاہتا تھا اور میں شرم سے یہ اقرار کرتی ہوں کہ وہ مجھے نہایت احترام کی نظر سے دیکھتا تھا اور مجھے اپنے مقابلہ میں بہت ارفع و اعلیٰ سمجھتا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگرچہ باتیں کرنے میں مجھے زیادہ ملکہ حاصل تھا مگر معاملات کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت اس میں مجھ سے کہیں زیادہ تھی۔

"اس کے دل میں اپنے گرو ٹھاکر کی بے انتہا عزت تھی۔ بلاشبہ یہ صرف عزت ہی نہ تھی بلکہ محبت تھی اور ایسی محبت جیسی اُسے تھی دنیا میں شاذ ہوتی ہے۔

"گرو ٹھاکر عمر میں میرے شوہر سے چھوٹا تھا۔ اُف! وہ کتنا خوبصورت تھا۔

"میرا شوہر لڑکپن میں اُس کے ساتھ مل کر کھیلتا رہا تھا۔ اس زمانے سے لے کر اب تک میرے شوہر کا دل اور جان اپنے عہدِ طفلی کے اس دوست کی محبت سے سرشار تھے۔ ٹھاکر میرے شوہر کی سادہ دلی سے واقف تھا اور اسے خوب ستایا کرتا تھا۔ وہ اور اُس کے ساتھی اپنی تفریح کے لئے میرے شوہر کا مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن وہ یہ سب کچھ برداشت کر لیتا تھا۔

پندرہ برس کی عمر میں خدا نے مجھے بچہ دیا۔ میں اتنی کمسن تھی کہ مجھے اس کی نگہداشت کیمتعلق بھی کچھ تجربہ نہ تھا۔ مجھے باتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔ میں گاؤں میں جا کر گھنٹوں اپنی سہیلیوں کے پاس بیٹھی رہتی تھی، اور اگر مجھے اپنے بچے کی خاطر کبھی گھر پر ٹھہرنا پڑتا تھا تو میں اس سے بہت تنگ آجاتی تھی۔ آہ میرا بالک دیوتا میرے پاس آیا لیکن میں نے اس کے کھلونے تیار نہ رکھے۔ وہ ماں کے آغوش میں آیا لیکن ماں کا دل ابھی کہیں پیچھے تھا۔ آخر وہ ناراض ہو کر مجھ سے رخصت ہو گیا، اور اب میں نے اُس کی تلاش میں دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا ہے لیکن اُسے کہیں نہیں پاتی۔

"بچہ باپ کی آنکھ کا تارا تھا۔ میری غفلت اور بے پروائی پر میرے شوہر کا دل دکھتا تھا لیکن خدا نے اُسے بے زبان بنایا تھا۔ اُس نے کبھی اپنے دکھ کا اظہار نہ کیا۔ تعجب یہ ہے کہ میری بے توجہی کے باوجود بچے کے دل میں میری محبت سب سے زیادہ تھی۔ اُس کے دل میں یہ خوف سمایا ہؤا معلوم ہوتا تھا کہ میں کسی دن اس کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ جب میں اس کے پاس بھی بیٹھی ہوئی ہوتی تھی، وہ نہایت اضطراب انگیز نظروں سے مجھے دیکھتا تھا۔ میں بہت کم اس کے پاس رہتی تھی، اس لئے میرے پاس رہنے کی خواہش اس کے دل میں اور بھی زیادہ تھی۔ جب میں دریا پر نہانے جاتی، وہ پیچ و تاب کھاتا اور میرے ساتھ جانے کے لئے اپنی باہیں پھیلا دیتا تھا۔ مگر نہانے کا گھاٹ میری سہیلیوں کے ملنے کی جگہ تھی، وہاں میں کندھوں پر بچے کا بوجھ لاد کر نہ جانا

چاہتی تھی۔

"یہ اگست کی ایک صبح کا واقعہ ہے۔ آسمان پر گھرے سیاہ بادل چھا رہے تھے۔ میں نے بچے کو خادمہ کے سپرد کرکے دریا کی راہ لی۔ بچہ میرے جانے پر رونے لگا۔

"جس وقت میں گھاٹ پر پہنچی وہاں کوئی اور موجود نہ تھا۔ مجھے تیرنے کی مشق گاؤں کی سب عورتوں سے زیادہ تھی۔ بارشوں کی کثرت کی وجہ سے دریا لبالب بھرا ہوا تھا۔ میں تیرتی ہوئی دریا کے وسط میں چلی گئی۔

"اس وقت مجھے کنارے پر سے آواز آئی، اماں! میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرا بچہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر مجھے پکارتا ہوا بڑھا آرہا تھا۔ میں نے چلا کر اُسے ٹھہرنے کو کہا مگر وہ ہنستا اور مجھے پکارتا ہوا بڑھا چلا آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں خوف سے اینٹھ گئے اور دنیا میری نگاہ میں اندھیر ہوگئی۔ شدتِ ہراس سے میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن آہ جب دوبارہ میں نے آنکھیں کھولیں، گھاٹ کی پھسلنی سیڑھیوں پر میرے بچے کے قہقہے ہمیشہ کے لئے خاموش ہوچکے تھے۔ میں کنارے پر پہنچی اور بچے کو پانی میں سے نکال کر گود میں لیا۔ وہ ہمیشہ میری گود میں آنے کے لئے التجائیں کیا کرتا تھا۔ اب میں اس کو گود میں لئے ہوئے تھی لیکن وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پہلے کی طرح اماں! نہیں کہہ سکتا تھا۔ اُس کی زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہوچکی تھی۔

"میرا بچہ، میرا دیوتا آیا، لیکن میں نے اس کی پروا نہ کی۔ میں ہمیشہ اپنے دیوتا کو رلاتی رہی۔ اس وقت مجھے اپنی یہ تمام بے توجہی یاد آئی، اور میرے دل کو صدمے پر صدمہ محسوس ہونے لگا۔ جب میرا بچہ میرے پاس تھا میں اسے تنہا چھوڑ جاتی تھی، میں اسے اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کردیتی تھی۔ اب اس کے مرنے کے بعد اس کی یاد ہر وقت میرے دل میں رہتی ہے اور مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑتی۔

"میرے شوہر کو جس قدر صدمہ ہوا اُس کا حال خدا کو معلوم ہے۔ اگر وہ مجھے میرے اس جرم کی سزا ہی دے دیتا تو یہ ہم دونوں کے لئے بہتر ہوتا۔ لیکن وہ ہر بڑی سے بڑی مصیبت کو صبر و رضا کے ساتھ برداشت کرلینے کے سوا اور کچھ نہ جانتا تھا۔ اس کے منہ سے کبھی میں نے کوئی درشت کلمہ نہ سنا تھا۔

جن دنوں میں رنج و غم سے تقریباً دیوانی ہو رہی تھی، اگرو ٹھاکر بنارس سے واپس آیا۔ ابتدا میں میرے شوہر اور گرو ٹھاکر کے تعلقات طفلانہ دوستی تک محدود تھے۔ اب اُس کے علم و فضل اور صدق و صفا کو دیکھ کر میرے شوہر کے دل میں اُس کا بے انتہا احترام پیدا ہوگیا۔ میرا شوہر گرو ٹھاکر سے اتنا مرعوب تھا کہ وہ اس کے سامنے بات کرتے ہوئے بھی جھجکتا تھا۔

"اُس نے گرو ٹھاکر سے درخواست کی کہ وہ مجھے تسلی دینے کی کوشش کرے۔ اس پر گرو ٹھاکر مجھے مقدس کتابیں پڑھ کر سنانے لگا۔ وہ ساتھ ساتھ اُن کے مفہوم کی واضح طور پر تشریح بھی کرتا جاتا تھا، لیکن میرا خیال ہے کہ اس تعلیم کا میرے دل پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اُن الفاظ کی میرے دل میں اگر کوئی قدر تھی تو وہ محض اس آواز کے طفیل تھی جو ان کو ادا کرتی تھی۔ خدا آسمانی شراب کو انسان کے دل کی گہرائیوں میں چھپا کر رکھتا ہے اور ہم اسے انسانی آواز کے ذریعہ سے پیتے ہیں۔

"میرے شوہر کو گرو سے جو محبت و عقیدت تھی وہ ہمارے گھر کے ذرہ ذرہ میں بس رہی تھی۔ میرے دل میں بھی یہ عقیدت پیدا ہوئی اور میں مطمئن ہوگئی۔ میں نے اپنے خدا کو اس گرو کی صورت میں دیکھا۔ وہ ہر صبح ناشتا کرنے کے لئے ہمارے گھر پر آتا تھا۔ جاگنے پر ہر صبح جو سب سے پہلا خیال میرے دل میں آتا وہ اس کے ناشتے کے متعلق ہوتا تھا اور اسے میں خدا کا ایک پاکیزہ انعام سمجھتی تھی۔ جب میں اس کے کھانے کی چیزیں تیار کرتی میرے ہاتھوں کی انگلیاں بھی گویا مسرت سے گانے لگتی تھیں۔

جب میرے شوہر نے دیکھا کہ مجھے اُس کے گرو سے اتنی عقیدت ہے تو اُس کے دل میں میرا احترام اور بھی بڑھ گیا۔ جب اُس کو یہ معلوم ہوا کہ اُس کا گرو مجھے نہایت شوق سے مقدس کتابیں پڑھاتا ہے تو اسے اس بات سے نہایت مسرت ہوئی، اُس نے خیال کیا کہ گرو کے دل میں اپنی نااہلی کے باعث جو جگہ میں خود حاصل نہ کرسکا تھا وہ میری ذہین بیوی نے حاصل کرلی ہے۔

"اس طرح اَور پانچ سال نہایت مسرت سے کٹ گئے اور میری باقی زندگی بھی اسی طرح گزر جاتی لیکن پردے میں چپکے چپکے کہیں چوری ہو رہی تھی۔ میں خود اس چوری سے واقف نہ ہوسکی لیکن میرے دل کے خدا نے اس کا سراغ نکال لیا۔ پھر ایک دن ایسا آیا جب ایک لمحہ میں ہماری زندگی کی بساط بالکل الٹ گئی۔

"یہ برسات کی ایک صبح کا واقعہ ہے۔ میں دریا پر نہا کر گھر کو واپس آرہی تھی اور میرے بھیگے ہوئے کپڑے میرے جسم کے ساتھ چمٹ رہے تھے۔ سڑک کے موڑ پر آم کے درخت کے نیچے مجھے اپنا گرو ٹھاکر ملا۔ وہ کندھے پر تولیہ ڈالے سنسکرت کا ایک گیت گاتا ہوا نہانے کو جارہا تھا۔ میں بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ اُس سے دوچار ہوتی ہوئی شرماتی تھی، اس لئے میں نے نظر بچا کر جلدی سے گزر جانا چاہا۔ لیکن اُس نے میرا نام لے کر مجھے بلایا۔ میں آنکھیں جھکائے شرم سے سمٹ کر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے بغور مجھے دیکھا اور پھر کہا "تمہارا جسم کتنا خوبصورت ہے!

"مجھے یوں معلوم ہؤا کہ آم کے درخت کی شاخوں میں دنیا جہان کے پرندے نغمہ سنج ہونے لگے ہیں اور میدان کی جھاڑیاں پھولوں کے نور سے جگمگا اُٹھی ہیں۔ آسمان زمین اور اُس کی ہر چیز مجھے ایک کیف اور نشاط میں ڈوبی ہوئی معلوم ہونے لگی۔

"مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں گھر کس طرح پہنچی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ میں گھر میں داخل ہوتے ہی عبادت کے کمرے میں چلی گئی لیکن کمرہ مجھے خالی معلوم ہوتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے صرف نور کے وہی سنہرے ستارے رقص کر رہے تھے جو دریا پر سے گھر کو آتے ہوئے اُس آم کے درخت کے نیچے مجھے لرزتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

"گرو تھا کر جب اُس دن ناشتے کے لئے آیا تو اُس نے میرے شوہر سے میرا پتا پوچھا۔ میرے شوہر نے میری تلاش کی لیکن میں اُسے کہیں نہ مل سکی۔

"آہ میرے لئے اب زمین و آسمان کا نقشہ بدل چکا تھا۔ میں نے مایوسی میں اپنے خدا کو بلایا لیکن اُس نے اپنی نگاہ بدستور میری طرف سے پھرائے رکھی۔

"دن خدا جانے کس طرح گزرا۔ رات کو مجھے اپنے شوہر سے ملنا تھا۔ رات کے سکوت اور تاریکی میں میرے شوہر کا دماغ چمک اُٹھتا ہے۔ اندھیرے میں اس کی گفتگو سن کر میں ہمیشہ اُس کے فہم و فراست پر ششدر رہ جایا کرتی تھی۔

بعض اوقات رات کو مجھے گھر کے کام کاج سے دیر تک فرصت نہ ملتی تھی۔ اور میرا شوہر بستر پر سونے کے بجائے میرے انتظار میں فرش پر بیٹھا رہتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ہماری گفتگو کا موضوع بالعموم ہمارا گرو ہؤا کرتا تھا۔

"اُس رات جب میں اپنے کمرے میں آئی وقت بہت گزر چکا تھا۔ میرا شوہر فرش پر سو رہا تھا۔ میں اس کے آرام میں خلل انداز ہوئے بغیر فرش پر اُس کے قدموں میں لیٹ گئی۔ میرے سر کا رخ میرے شوہر کی طرف تھا۔ ایک دفعہ سوتے ہوتے اُس نے اپنے پاؤں پھیلائے تو وہ میرے سینے پر لگے۔ یہ اس کا آخری عطیہ تھا۔

"صبح اپنے شوہر کے بیدار ہونے سے پہلے ہی اُٹھ کر میں اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ کھڑکی میں سے رات کے سیاہ دامن پر شفقِ صبح کی سرخی پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"میں نے جھک کر اپنی پیشانی سے اپنے شوہر کے پاؤں چھوئے۔ وہ اس طرح چونک کر اٹھا، گویا وہ کسی خواب سے بیدار ہؤا ہے۔ اُس نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا:۔

"میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ میں دنیا کو ترک کر دوں گی۔ میں آیندہ تمہارے پاس نہیں رہ سکتی۔ مجھے تمہارا

گھر چھوڑنا پڑے گا"۔

"شاید میرا شوہر یہ سمجھتا تھا کہ وہ اب بھی خواب دیکھ رہا ہے۔ اس لئے اُس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا

"میں نے پھر درد میں ڈوبی ہوئی آواز سے کہا: آہ میری بات سنو، اور اس کو سمجھو۔ تمہیں اب دوسری شادی کرلینی چاہیئے۔ میرے لئے رخصت ہوجانا ضروری ہے،

"میرے شوہر نے کہا: یہ کیا دیوانوں کی سی باتیں کر رہی ہو تمہیں کس نے دنیا ترک کرنے کو کہا ہے؟"

"میں نے جواب دیا: میرے گرو ٹھاکر نے،

"میرا شوہر کچھ حواس باختہ سا ہوگیا۔ اُس نے چلا کر کہا: گرو ٹھاکر نے! اُس نے کب تمہیں یہ نصیحت کی؟"

"میں نے کہا: کل صبح جب میں دریا پر سے آتی ہوئی راہ میں اُس سے ملی،

"اُس کی آواز ذرا کانپ گئی۔ پھر اُس نے میرے چہرے پر نظر گاڑ کر پوچھا: اُس نے تمہیں اس قسم کا حکم کیوں دیا؟"

"میں نے جواب دیا: مجھے معلوم نہیں اسی سے پوچھو۔ اگر وہ بتا سکا تو خود اُسی سے تمہیں یہ بات معلوم ہوجائے گی"

"میرے شوہر نے کہا: دنیا میں رہ کر بھی انسان دنیا کو ترک کرسکتا ہے۔ تمہارے لئے میرا گھر چھوڑنا ضروری نہیں۔ میں اپنے گرو سے اس کے متعلق ذکر کروں گا"

"میں نے کہا: تمہارا گرو تمہاری درخواست منظور کرے نو کرے، مگر میرا دل کبھی اس پر آمادہ نہیں ہوسکتا میرے لئے تمہارا گھر چھوڑنا ضروری ہے۔ اب دُنیا میرے لئے باقی نہیں رہی"

"میرا شوہر خاموش رہا اور ہم اندھیرے میں فرش پر بیٹھے رہے جب دن کی روشنی پھیل گئی تو اُس نے مجھ سے کہا: چلو ہم دونوں گرو کے پاس چلیں۔

"میں نے اپنے ہاتھ باندھ کر کہا: میں اب کبھی اس سے نہیں ملوں گی"

میرے شوہر نے غور سے میرے چہرہ کو دیکھا۔ میں نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ اُس کے بعد اُس نے کچھ نہ کہا۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرے دل کے حال سے واقف ہوگیا ہے اور اُس نے میری بات سمجھ لی ہے۔

"میری دنیا میں صرف دو متنفس تھے جن کو مجھ سے حقیقی محبت تھی یعنی میرا بچہ اور میرا شوہر۔ یہ محبت میرا خدا تھی، اس لئے یہ کسی قسم کی ناراستی کی متحمل نہ ہوسکتی تھی۔ ان دونوں میں سے ایک نے مجھے چھوڑ دیا اور دوسرے کو خود میں نے چھوڑ دیا۔ اب میرے لئے راستی سے لو لگانے کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا"

پھر اُس نے میرے قدموں کی خاک کو چھوا، اٹھی، جھک کر آداب بجالائی اور رخصت ہوگئی۔

(ٹیگور)

حامد علی خاں

مرے دل کو

مرے دل کو جب سے خبر ملی کہ کسی کو مجھ سے بھی پیار ہے
مری زندگی کی کلی کھلی مری روح باغ و بہار ہے

مرے باغِ زیست میں گلفشاں ہؤا جب سے عشق کا باغباں
مرے ہر نفس میں ہے بوئے گل مرا نغمہ بانگِ ہزار ہے

مری آرزو ہے فقط یہی مری جاں مجھے بھی جگہ ملے
ترے حسن و عشق کی سرزمیں میں سمندروں کے جو پار ہے

مری راگنی کی ہے تان تُو مری شاعری کی ہے جان تُو
یہ وہ پھول باغِ حیات کا ہے جسے خزاں بھی بہار ہے

تجھے کچھ خبر بھی ہے جانِ من کہ فلک پہ تاروں کی بزم میں
تری حسرتوں کے جو کچھ شرر ہیں مرا بھی اُن میں شمار ہے

مجھے ضبطِ غم کا سبق پڑھا مجھے حلم و صبر کی رہ دکھا
مرے دل میں درد ہے روز و شب مری جان زار و نزار ہے

بہار

وہ دونوں ملّاح

وہ دونوں ملاح جن کے شباب کی دنیا کو عشقِ ناکام کی افسردگیوں نے برباد کر ڈالا، اور جن کی جوانی کی رنگینیاں حسنِ جفا شعار کی بے اعتنائیوں سے مرجھا کر رہ گئیں کبھی دوست تھے۔ اس قدر گہرے دوست کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ مگر کارخانۂ قدرت کی انقلاب آفرینیاں یکسانیت کی دشمن ہیں اور زمانے کے نشیب و فراز کا خزانہ تبدیلیوں سے معمور ہے۔ چنانچہ واقعات نے انہیں ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا۔ وہی دل جو کبھی محبت اور الفت سے لبریز تھے نفرت اور حقارت سے بھر گئے، اور دونوں نے ارادہ کر لیا کہ جیتے جی ایک دوسرے سے کبھی نہ ملیں گے۔

برسوں کے تعلقات کو فراموش کر کے انھوں نے دوستی کو دشمنی سے بدل لیا، اور غلطی سے اپنی زندگی کی ناکامیوں کا ایک دوسرے کو ذمہ دار سمجھ کر الگ ہو گئے۔ اُن کی محبت کا آغاز بچپن کی سادگیوں میں ہوا اور شباب کی رقیبانہ شورشوں نے اُس کا خاتمہ کر دیا۔

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب وہ شیریں کے ساتھ دریا کے کنارے پر خشک اور زرد ریتوں میں کھیلا کرتے اور بچپن کی تمام سادگیوں کے ساتھ اُس کے حسنِ معصوم کی پرستش کیا کرتے تھے۔ صبح جب ملاح مسافروں کو پار اتارنے کے لئے دریا پر آتے تو بچے بھی اپنے بزرگوں کے ہمراہ آ جاتے، دن بھر بے فکری کی کھیلوں سے دل بہلاتے اور شام کو جب رات کی تاریکی دنیا کے کاروبار پر آرام اور سکون کے پردے ڈال رہی ہوتی تو ایک شیریں کا دایاں ہاتھ تھام لیتا دوسرا بایاں اور اُسے بیچ میں لئے ہوئے ہنستے ہنساتے گھر لوٹ آتے۔ یہ اُن کا روز کا معمول تھا۔ اُن کے ننھے سے دل جو انسانی زندگی کی تلخیوں سے نا آشنا تھے نہیں جانتے تھے کہ زندگی کا یہ کھیل جس کی ابتدا دریا کے کنارے کی خاموشیوں میں ہوئی کن ہنگاموں پر ختم ہونے والا ہے۔ انھوں نے اپنی محبت کی مختصر سی زندگی ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ شروع کی مگر جب رقابت کی ہنگامہ خیزیوں نے جذباتِ خفتہ کو بیدار کر دیا تو وہ ایک دوسرے سے پرے ہٹتے گئے یہاں تک کہ بچپن کی محبتیں عداوتوں میں تبدیل ہو گئیں اور وہ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے۔ رقابت کے جوش نے انہیں اندھا بنا دیا اور اُن میں سے ہر ایک نے شیریں کو اپنا بنا لینا چاہا، مگر اُس کے صلح پسند حسن نے کسی کو قبول نہ کیا اور اُن کی باہمی عداوت کی ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر انکار کر دیا۔ اُن بدبخت نوجوانوں کے دل ٹوٹ گئے۔ سنسان

راتیں اُن کے شوروشیون سے آباد ہوگئیں۔ پامال شدہ جذبات کی کش مکش پیشانی کی شکنوں میں تبدیل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ناکامی کی اندوہناکیوں نے ان کو وحشی بنادیا اور لوگ اُن سے خوف کھانے لگے لیکن دنیا کے ہر ہنگامے کا انجام سکوت ہے۔ اور ہر شورش آخر کار خاموشی پر ختم ہوجاتی ہے۔ وقت کے سکوت پرور ہاتھوں نے ہوتے ہوتے جذبات کی تلاطم خیزیوں کو فرو کردیا اور انہوں نے خاموشی اختیار کرلی۔ اس قدر گہری خاموشی کہ صرف سرد آہیں ہی اُس کی گہرائی کو معلوم کرسکتی تھیں۔ اور یہ اس طرح ہؤا کہ شیریں کی شادی ہو گئی۔ اب وہ قطعی مایوس ہوگئے تو انہوں نے اپنی تمناؤں کو آنسوؤں کے سیلاب میں بہادیا اور اپنے آپ کو ناکامی کی تلخیوں کے حوالے کرکے تنہائی کی زندگی بسر کرنے کا عہد کرلیا۔ دن گزرتے گئے اور آدم کے ان غمگین فرزندوں کے مقابلے میں شیریں بامراد اور شادکام ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اُس نے انہیں بالکل فراموش کردیا مگر بدقسمت ملاحوں کے دل اُس کی یاد سے آباد تھے اور وہ اکثر راتوں کو جب دنیا کی رونقیں محوِ خواب ہوتیں اپنی ناکامی پر روتے اور مایوس آرزوؤں کا ماتم کرتے۔ کبھی کبھی اتفاق ہی تو ہے، اگر ان میں سے کوئی شیریں کو دیکھ پاتا تو اس کا زخمی دل درد سے بیتاب ہوجاتا اور اس کی کشتی کئی دن تک ساحلِ دریا پر بے کار پڑی رہتی۔ دوسرے کو نہ جانے اس کا کس طرح سے علم ہوجاتا اور وہ دل ہی دل میں اپنے ناکام رقیب کی اتفاقی مگر عارضی کامیابی پر کڑھتا کڑھتا رہتا حتیٰ کہ اس کا بدبخت ساتھی اپنی روزانہ مصروفیتوں میں آشامل ہوتا اور دونوں اپنی تلخ اور خاموش زندگی کی افسردہ یکسانیتوں میں محو ہوجاتے۔

۲

ایک سال دریا کے بلاخیز سیلاب نے ساحل کو پانیوں میں گم کردیا، اور لہروں کی بلاانگیز روانیاں ارد گرد کی وسعتوں پر قابض ہوگئیں۔ تناور درخت مقابلے کی تاب نہ لاکر موجوں کے سامنے جھک گئے، اور پانی کی طغیانیوں نے زمین کی پستیوں کو بلندیوں سے ملادیا۔ انسانی آبادیاں اپنی کمزوریوں کے اعتراف میں سربسجود ہوگئیں، اور فانی انسان زروسیم کی کاہشوں سے آزاد ہوکر بے بسی کے عالم میں بہنے لگے۔ اس وقت جب کہ جان کے خطرے نے دلوں کو محبت اور نفرت کے جذبات سے یکسر خالی کررکھا تھا وہ دونوں ملاح اپنی اپنی کشتی پر سوار ایک ساتھ پانی کے زوروں کو چیرتے ہوئے بڑھے کہ اپنے بدنصیب ہم جنسوں کو دریا کے قہروغضب سے چھڑائیں مگر حسبِ معمول خاموش تھے۔ برسوں کے بعد ایک مشترکہ مصیبت نے دونوں کو اکٹھا کردیا تھا اور وہ ایک ہی مقصد کے ماتحت اپنی کشتیوں کو ادھر سے اُدھر لئے پھرتے تھے۔ مگر پانی کی غضبناک روانی ان کی تمام سعی و کوشش کو

بے کار بنا دیتی تھی۔ انسان جس کے اقتدار کے سامنے خشکی کی فراخی سمٹ کر تنگیوں میں بدل جاتی ہے اور جس کی ہمہ گیر قوتیں سطحِ زمین کے قدرتی نشیب و فراز کو اپنی صناعیوں کے زور سے مغلوب کر لیتی ہیں۔ چیختے چلاتے بہتے چلے جا رہے تھے۔ اور کوئی نہ تھا کہ اُن ڈوبتے ہوئے جسموں کو سہارا دے۔ پانی کی طوفان خیز بلندیوں کے سامنے انسانی تگ و دو ناکارہ اور لاچار تھی، اور طغیانیوں کا زور لحظہ بلحظہ بڑھتا چلا جا رہا تھا جب کہ مایوسین محبت کی پیہم کوششیں موجوں سے ٹکرا ٹکرا کر رہ جاتی تھیں انہوں نے ایک چیخ کی آواز سنی۔ دونوں تڑپ اُٹھے یہ بدنصیب شیریں کی چیخ تھی۔ اپنی جانوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اور گویا اُن میں سے ہر ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے انہوں نے کشتیوں کو پانی کے حوالے کیا اور دریا میں کود پڑے موجیں اُن سے لپٹ گئیں۔ اور لہروں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ سیلاب کی تندیوں نے بہتیرا زور مارا اور طغیانی کی تیزیوں نے ہر چند انہیں لپیٹنے کی کوشش کی مگر وہ ہاتھ مارتے ہوئے بڑھتے چلے گئے۔ بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ شیریں کے پاس پہنچ گئے۔ بچپن میں جس طرح ایک اُس کے داہنے ہاتھ کو تھام لیتا تھا اور دوسرا بائیں کو اسی طرح سے ایک نے اُسے دائیں بازو سے پکڑ لیا اور دوسرے نے بائیں سے اور چپ چاپ تیرتے ہوئے واپس لوٹے۔ سیلاب ترقی پر تھا اور کنارہ لحظہ بلحظہ دور ہوتا چلا جا رہا تھا، مگر شیریں کو زندہ اور سلامت دیکھنے کی آرزو فاصلے کی درازی سے بے پروا اور پانیوں کی تندی سے بے نیاز تھی۔ طغیانی کی پُرخروش لہروں نے ہر چند چاہا کہ اُن حسرت نصیب ملاحوں کو اور اُن کی قیمتی امانت کے بہا کر لے جائے مگر اُن کے تنومند بازوؤں نے انہیں مار ہٹایا اور وہ شیریں کو بیچ میں لئے آخر خشکی پر پہنچ گئے۔ وہاں ایک کھیت کے کنارے پر انہوں نے پریشان حال شیریں کو لٹا دیا۔ ایک اُس کے دائیں طرف تھا اور دوسرا بائیں جانب مگر دونوں سر جھکائے چپ چاپ حسرت سے اُس کی طرف تک رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب اُسے ہوش آیا اور اُس نے آنکھیں کھولیں تو بچپن کے پرستاروں کو موجود پایا۔ اُس کے رخساروں پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اُس نے پہلے ایک کی طرف دیکھا پھر دوسرے کی جانب۔ دونوں ملاحوں کی آنکھیں دوچار ہوئیں، اور وہ نہ جانے کیوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور رونے لگے۔ رونے لگے اور حسنِ محبوب کے حضور میں سر جھکا کر آنسوؤں کی تمام گرمیوں کے ساتھ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی تلخ زندگیوں کو باہمی عداوت کی تلخیوں سے اور زیادہ تلخ نہیں بنائیں گے +

امیر حسن ناز

غزلیات

(۱)

رہتا نہ کوئی طائر آزاد گلستاں میں ۔۔۔ تسخیر اگر ہوتی صیاد کے امکاں میں
دنیا میں نہ پھر ہوتی ایسی کوئی آبادی ۔۔۔ گھر انکا اگر ہوتا ہے میرے دلِ ویراں میں
قاتل کے تبسم میں جو ہے نمک افشانی ۔۔۔ پیدا نہیں ہو سکتی وہ بات نمکداں میں
میں طوق و سلاسل کا اسوقت گلا کرتا ۔۔۔ تکلیف اگر ہوتی مجھکو کوئی زنداں میں
اسکے بھی تو وحشت میں اے قیس اڑیں پرزے ۔۔۔ میں دامنِ صحرا کو ٹانکوں جو گریباں میں
کیا میں نے برائی کی کیوں میرے بنے دشمن ۔۔۔ منہ اپنا ذرا ڈالیں وہ اپنے گریباں میں

سچ پوچھو تو پھر انسان حیوان سے بدتر ہے
اخلاق وہ جوہر ہے یہ گر نہ ہو انسان میں

حبیب اللہ خاں حبیب رامپوری

(۲)

وہاں ہوں اب جہاں سے سیرِ ہفت افلاک کرتا ہوں ۔۔۔ نگاہِ حسن کی عاشق نوازی و زمیں کیا ہوں
فنا ہونا بقدرِ سعی آپ اپنے تجسس میں ۔۔۔ اگر معلوم ہو جاتا کہ میں اپنی تمنا ہوں
نگاہیں پھر کے آتی ہی نہیں اللہ ری محویت ۔۔۔ کوئی کانوں میں کہتا ہے کہ میں گرمِ تماشا ہوں

مری ہستی بھی کیا ہستی ہے جو مٹ ہی نہیں سکتی
جو گھٹ جاؤں تو قطرہ ہوں جو بڑھ جاؤں تو دریا ہوں

محمد مقصود علی شراد

(۳)

یہ مجھ کو جگہ دی ہے تقدیر نے مدفن میں ۔۔۔ پیوند لگایا ہے یادشت کے دامن میں
اے ہم قفسو وہ بھی اللہ کے بندے ہیں ۔۔۔ اٹھتے ہیں نشیمن سے مٹتے ہیں نشیمن میں
قربانِ چمن ان کی کیا رنگِ جہاں بدلا ۔۔۔ وہ رہتے ہیں فن پر ہم سوتے ہیں مدفن میں
اچھے ہیں قفس والے دو چار تو ہیں یکجا ۔۔۔ اک ہم ہیں کہ جو تنہا بیٹھے ہیں نشیمن میں

دو طور جلائے ہیں اس برقِ تجلی نے
اِک پہلوئے زیبا میں اک وادیٔ ایمن میں

زیبا ردولوی

(۴)

پوشیدہ مرے اشک میں ہے سوزِ جگر بھی ۔۔۔ اس قطرے کے دامن میں تڑپتے ہیں شرر بھی
تنہا نہیں آئی ہے مری شامِ جوانی ۔۔۔ ساتھ اپنے لگا لائی ہے پیری کی سحر بھی
اے کھیلنے والے مرے جذباتِ حزیں سے ۔۔۔ اس کھیل کے انجام کی ہے تجھ کو خبر بھی
باقی ہے اثر کچھ تو مرے نالۂ شب کا ۔۔۔ ہیں درد میں ڈوبے ہوئے نغماتِ سحر بھی
اس وہم میں ہر دشت سے کرتا ہوں محبت ۔۔۔ شاید ہوا سی میں مرا اجڑا ہوا گھر بھی

جلتا ہے عدو رشک سے میں تیری ضیا سے
اک آتشِ جاں سوز اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

اظہر امرتسری

(۵)

حال رہتا ہے شب و روز پریشاں دل کا ۔۔۔ آرزو نکلی نہ نکلا کوئی ارماں دل کا
زندگی شکل ہے اک بے سر و سامانی کی ۔۔۔ موت کہتے ہیں جسے ہے سر و ساماں دل کا
دیکھ لیتا ہے جسے بس یہ مچل جاتا ہے ۔۔۔ کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہے مرے ناداں دل کا
اشکباری کے سوا کام نہیں آنکھوں کو ۔۔۔ محشرستانِ محبت ہے یہ طوفاں دل کا

اندرجیت شرما

محفلِ ادب

مرزا نوشہ غالب کا آخری خط

دیگر از خویشتنم خبر نبود تکلف بر طرف　　این قدر دانم کہ غالبؔ نامِ یارے داشتم

ہجومِ غم سے فراغ نہیں۔ عبارت آرائی کا دماغ نہیں اگرچہ گوشہ نشین و خانماں خراب ہوں لیکن بحسبِ ربطِ ازلی کثیر الاحباب ہوں۔ اطراف و جوانب سے خطوط آتے ہیں ادھر سے بھی ان کے جواب لکھے جاتے ہیں جو اشعار واسطے اصلاح کے آتے ہیں بعدِ اصلاح بھیج دیئے جاتے ہیں۔

ان صاحبوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ نہ میں نے انہیں نہ انھوں نے مجھے دیکھا ہے۔ محبت دلی و نسبتِ روحانی سہی لیکن صاحبانِ بلادِ دور دست کیا جانیں میرا حال کیا ہے۔ ہفتاد و یک سالہ عمر کی کتاب میں سے فصلِ آخر کی حقیقت یہ ہے کہ دس پندرہ برس سے ضعفِ سامعہ اور قلتِ اشتہا میں مبتلا ہوا اور یہ دونوں علتیں روز افزوں رہیں جس حافظہ کا بطلان علاوہ، جوں جوں عمر بڑھتی گئی یہ امراض بھی بڑھتے گئے۔ قصہ مختصر اب سامعہ کا حال یہ ہے کہ ایک تختہ کاغذ کا مع دوات قلم سامنے دھرا رہتا ہے، جو دوست آتے ہیں پرسشِ مزاج کے سوا اور کچھ کہنا ہوتا ہے وہ لکھ دیتے ہیں میں ان کی تحریر کا جواب زبانی دیتا ہوں۔ غذا کی حقیقت یہ ہے کہ صبح کو آٹھ دس بادام کا شیرہ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، دو گھڑی دن رہے دو یا تین تلے ہوئے کباب۔ نسیان حد سے گذر گیا، رعشہ، دوران و ضعفِ بصر یہ بارانِ نو آمدہ سے ہیں۔ میر تقی مرحوم کا مطلع ورد زبان ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم　　القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

خط بکس میں یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں آگے بیٹھے لیٹے خط لکھتا تھا اب رعشہ یوں بھی نہیں لکھنے دیتا۔

صاحبِ اکمل الاخبار اور صاحبِ اشرف الاخبار نے جو ہمیشہ مجھ سے ملتے جلتے رہتے ہیں اور میرا حال جانتے ہیں از روئے مشاہدہ میرے کلام کی تصدیق کر کے اسی اعتذار کو اپنے اخبار میں چھاپا ہے۔ کل دیگر صاحبانِ مطبع اور راقمانِ اخبار اگر اسی عبارت کو اپنے اخبار کے اوراق میں درج کریں گے تو فقیر ان کا احسان مند ہوگا۔ اس نگارش کی شہرت سے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں

پہنچے تو تقاضا اور اگر نہ پہنچے تو شکایت نہ فرمائیں۔ میں دوستوں کی خدمت گذاری میں کبھی قاصر نہیں رہا اور خوشی خوشی سے کام کرتا رہا جب بالکل نکما ہوگیا نہ حواس باقی نہ طاقت، پھر اب کیا کروں بقولِ خواجہ وزیر ع

میں وفا کرتا ہوں لیکن دل وفا کرتا نہیں

اگر کسی کو میری طرف سے رنج و ملال ہو تو خالصاً للہ معاف فرمائیں۔ اگر جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلبگار ہوتا، اب جو بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں۔ غالب

"اردو"

شبِ ماہ

الاماں کیا چاندنی چھٹکی ہوئی ہے دشت میں
رقص کے قابل ہے اے دل یہ بہشتِ سبزہ زار

یہ شگوفوں کا تبسم یہ ستاروں کا جمال
موجِ رنگیں کے یہ ہلکورے یہ سبزہ کا نکھار

دھندلی دھندلی پتیوں پر یہ رپہلی چاندنی
آبِ جو کی راگنی پر یہ سکوتِ کوہسار

جابجا یہ ابر کے ٹکڑوں میں تاروں کا ہجوم
دور تک یہ جھاڑیوں میں جگنوؤں کا انتشار

یہ بساطِ نہر پر چاندی کی نازک دھاریاں
یہ جبینِ آب پر الماس کے نقش و نگار

چادرِ آبِ رواں پر یہ ضیائے مرتعش
جدولِ موجِ خنک پر یہ نقوشِ بے قرار

منہ اندھیرے جھلملاتے ہیں ستارے جس طرح
کانپتے ہیں اس طرح لہروں پہ جلوے بار بار

تیرتا پھرتا ہے یہ بادل کے ٹکڑوں میں ہلال
یا زمرد کا سفینہ درمیانِ جوئبار

یہ کلی پر قطرۂ شبنم میں ہے عکسِ قمر
آنکھ کی پتلی میں یا غلطاں ہے تابِ روئے یار

یہ گھنی شاخوں سے چھن کر آرہی ہے چاندنی
یا دلِ شب میں تصور صبح کا ہے بے قرار

مدحِ فطرت میں نہیں اشعار یہ ورد زباں
یہ جبینِ نطق کے سجدے ہیں اے پروردگار

ہاں مگر رونے کے قابل ہیں یہ احساسِ شکست
قامتِ فطرت پہ ملبوسِ زباں ہے تار تار

آہ اے فطرت! تری رعنائیوں کے سامنے
بہترین الفاظ ہو جاتے ہیں میرے شرمسار

ذکر تیرا ذوقِ گویائی کے سی دیتا ہے لب
راگنی تیری زباں کا توڑ دیتی ہے ستار

تیری محرابِ تجلی میں وفورِ شرم سے
سر جھکاتا ہے مرے زورِ بیاں کا افتخار

تیرا درد نطق کی وادی میں بہ سکتا نہیں
آدمی محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں

جوش ملیح آبادی

"مشاعرہ"

مذہب

انجمنِ مذاہبِ عالم نے جس کا اجلاس حال ہی میں کلکتہ میں ہوکر ختم ہوچکا ہے مذہب کے متعلق اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے:۔

"قیامِ امن کے لئے دنیا میں زبردست ترین قوت مذہب ہی ہے۔ بلکہ انسدادِ جنگ کا واحد امید افزا ذریعہ ہی یہ ہے کہ تمام مذہبی قوتوں کو مجتمع کرکے اس بدی کے استیصال کے لئے حرکت میں لایا جائے۔"

برنرڈشا کہتا ہے:۔

"ستر برس کی زندگی کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ لا مذہب لوگ اخلاقی نامرد ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سنجیدگی کی حالت میں جسمانی حیثیت سے بھی نامرد ہوتے ہیں۔ تمدن بغیر مذہب کے قائم نہیں رہ سکتا۔ رہی یہ بات کہ ہم مذہب کو کس نام سے موسوم کرتے ہیں۔ قوتِ حیات یا روحِ عالم یا تخلیقی ارتقا سے سو یہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ ضروری بات جو ہے وہ یہ ہے کہ مذہب کے بغیر انسانی زندگی محض حوادث کا مجموعہ بن کے رہ جاتی ہے۔ میں نجات کا تصور بغیر خدا کے تو کرسکتا ہوں لیکن بغیر مذہب کے نہیں کرسکتا۔"

ایچ جی ویلز کی رائے بھی ملاحظہ ہو:۔

"مذہب ہی اول ہے۔ مذہب ہی آخر ہے اور جب تک انسان خدا کو نہ پالے۔ اس کا آغاز آغاز نہیں، انجام انجام نہیں۔ اس کے یار دوست ہونے ممکن ہیں، اس کا طاعت شعار ہونا ممکن ہے اس کا صاحبِ اعزاز ہونا بھی ممکن ہے۔ لیکن یہ سب کچھ لاحاصل ہے۔ زندگی بار آور جبھی ہوسکتی ہے جب خدا کے ساتھ وابستہ ہو۔"

انگلستان کا شاعر کوپر اپنی نظم الیگزنڈر سلکرک کی (Soliloquy) میں گویا ہوتا ہے:۔

"اے مذہب تجھ میں کیسا لازوال خزانہ پوشیدہ ہے جو کہ تمام دنیا کے مال و زر سے بیش قیمت ہے لیکن واحسرتا گرجا کے گھنٹہ کی آواز کبھی ان چٹانوں اور گھاٹیوں میں سنائی نہیں دیتی۔ نہ ان سے کسی کی موت پر ماتم کرنا آتا ہے نہ کسی کے آنے کی خوشی میں اظہارِ مسرت۔"

"مخزن"

شریر دیوتا

میں نیند کی ان عمیق ترین گہرائیوں میں پڑی تھی جن سے میں پہلے آشنا نہ تھی کہ ایک عریاں لڑکے نے آکر میرے دروازے کو کھٹکھٹایا اور ایک شور برپا کر دیا۔

وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا، باہر بادل گرج رہے تھے موسلا دھار مینہ برس رہا تھا اور بجلی غضبناک ہو ہو کر بار بار چمکتی تھی۔ میرا بھولا بھالا دل نہایت نرم واقع ہوا ہے میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ لڑکا اپنے کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اندر آگیا۔

میں نے اُس سے اُس کا نام پوچھا۔ لیکن اُس نے کہا میں اپنا نام بھی بتاتا ہوں لیکن میں سردی سے کانپ رہا ہوں، مجھے آگ کی ضرورت ہے جو میرے جسم کو گرما دے، میں بالکل بھیگ رہا ہوں۔

وہ اپنی کمان کو نہایت احتیاط سے اُٹھائے ہوئے تھا اور اُسے ڈر تھا کہ کہیں بارش نے اُس کی تانت کو خراب نہ کر دیا ہو۔

وہ کانپ رہا تھا اور مجھ سے آنکھ نہ ملانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ننھے پاؤں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دل میں کہا یہ بچہ ہی تو ہے۔ ڈر کی کونسی بات ہے۔

لیکن اس لڑکے نے شوخی سے اپنے سر کو اس طرح حرکت دی کہ اُس کے دلکش، لانبے، سنہری بال پیچھے ہو گئے اور گوری گوری پیشانی نظر آنے لگی۔ اُس نے اپنے ترکش سے ایک دلآویز تیر نکالا اور پھر خطا نہ ہونے والے نشانے سے میرے سینے میں کھینچ مارا۔

"او ظالم اور بے وفا لڑکے تیرا خوفناک اور مسرت بخش نام میں جانتی ہوں۔ آہ! یہ تو نے میری مہربانی کا اجر دیا ہے"

شوخ دیوتا شرارت آمیز تبسم کے ساتھ بولا۔

"طوفان کی ان شورشوں کے باوجود جن کی اس وقت فضا پر حکومت ہے میری کمان محفوظ ہے لیکن اے بھولی لڑکی کیا تو کہہ سکتی ہے کہ تیرا دل بھی محفوظ ہے"؟

"ادبی دنیا"

حکمتِ قدیمہ کا ایک ورق

مصر کے عجائب خانہ میں حضرت عیسیٰ سے اڑھائی ہزار سال پہلے کی بانس کے کاغذ پر لکھی ہوئی ایک کتاب ہے جس میں وہ اخلاقی وصیت درج ہے جو ایک شخص "انی" نام نے اپنے بیٹے "کہیں سوہی ٹپ" کے لئے لکھی تھی۔ ان مضمون کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

(۱) اگر کوئی شخص تجھ سے مشورہ لینے آئے تو تُو اپنی واقفیت کے لئے کتاب سے امداد لے۔

(۲) کسی دوسرے شخص کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہو۔ اور جو شخص تجھے اپنے گھر میں آنے کی اجازت دے اُسے اپنے لئے باعثِ عزت سمجھ۔

(۳) اپنے گھر میں بیٹھ کر کسی دوسرے شخص کے کاموں کی فکر و تجسس نہ کر۔

(۴) کسی جماعت میں سب سے پہلے داخل ہونے والا یا کسی جماعت میں سے سب سے پہلے علیحدہ ہونے والا نہ بن۔ اس سے تیرے نام کے ساتھ سبکی اور بے رونقی کا اضافہ ہو جائے گا۔

(۵) خدا کی عبادت گاہ چلّا کر بولنے سے نفرت کرتی ہے۔ رقیق القلب ہو کر عاجزی کے ساتھ دعا مانگ جس کے لفظ نہایت نرمی سے آہستہ آہستہ کہے جاتے ہیں اس صورت میں خدا تیری عرض سنے گا، نذر قبول فرمائے گا اور تیری حفاظت کرے گا۔

(۶) اس بات کا خیال رکھ کہ کیا گزر چکا ہے۔ اپنی زندگی کے لئے وہ اصول اختیار کر جو پیروی کے لئے مثال ہوں۔

(۷) موت کا قاصد جس طرح اوروں کے پاس آتا ہے تجھے لے جانے کے لئے تیرے پاس بھی آجائے گا بلکہ آنے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ قیل و قال تجھے کوئی فائدہ نہ دے گی، کیونکہ وہ آتا ہے اور تیار ہے۔

(۸) تُو یہ نہیں جانتا کہ تو کب مرے گا۔

(۹) یہ نہ سمجھ کہ تو بچہ ہے۔ موت بچے کو اس کی ماں کی گود میں بھی آجاتی ہے اُسی طرح جس طرح اس بوڑھے آدمی کو جو اپنی مدت پوری کر چکا ہو۔

(۱۰) نہایت احتیاط سے خیال رکھ کہ تیری زبان سے کسی آدمی کا دل زخمی نہ ہو۔

(۱۱) صرف ایک وفادار خدمتگار رکھ لے، اور اس کے کاموں کی نگرانی کر، اور اپنے ہاتھوں سے اُس شخص کی حفاظت کر جو تیرے گھر اور مال پر مختار ہے۔

(۱۲) جو شخص بہت میسر ہونے پر تھوڑا دیتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔

(۱۳) خدا کا ناشکر گذار نہ ہو کیونکہ اُس نے تجھے ہستی عطا کی ہے۔

(۱۴) جو شخص مرتبے یا عمر میں تجھ سے بڑا ہو جب تک وہ کھڑا ہے تو نہ بیٹھ۔

(۱۵) بری بات کہنے والا جواب میں بھلی نہیں سنتا۔

(۱۶) جب تو خدا کو نذر گذرانے تو ایسی شے پیش نہ کر جو اُس کے حضور میں مکروہ معلوم ہو۔

(۱۷) اُن بھیدوں میں بحث و تکرار نہ کر جو خدا کی ذات سے متعلق ہیں۔

(۱۸) دنیا کا خدا آسمان سے اوپر نور کے جلال میں ہے، اور اس کے نور کا عکس زمین پر۔ جو روز اُسی کا وظیفہ بجا لاتے ہیں وہ اُن سے نزدیک ہے۔

"اصلاح"

مطبوعاتِ جدیدہ

فخر کائنات۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر و مستند سوانح عمری ہے جسے مولانا مسعود الرحمٰن خاں صاحب ندوی نے مسلمان عورتوں اور بچوں کے لئے ترتیب دیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس طبقہ کی راہنمائی کے لئے یہ ایک بہت اچھی کتاب ہے۔ حجم ۴۸ صفحات اور قیمت ۴ر۔ مینیجر رسالہ پیشوا، پوسٹ بکس نمبر ۵ ۱۰، دہلی سے طلب فرمائیے۔

اسلام اِن انگلینڈ۔ از شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی، گدیہ۔ انگریزی زبان میں سولہ صفحے کا یہ رسالہ انگلستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی مختصر تاریخ ہے۔ تحریکِ تبلیغ میں حصہ لینے والوں کو اس سے معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔

پردہ پر ایک نظر۔ اس میں مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی نے اسلامی نکتۂ نظر سے پردہ کے مسئلہ پر بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کا پردہ شریعتِ اسلام کے مخالف نہیں حجم ۴۸ صفحے اور قیمت تین آنے ہے۔ مینیجر مدینہ بک ایجنسی بجنور سے منگائیے۔

مسلمانانِ اندلس۔ مؤلفہ جناب مولوی عثمان علی مرزا صاحب۔ ۲۹ صفحات میں نہایت خوبی سے اس امر کو ظاہر کیا گیا ہے کہ علوم و فنون میں اندلس کے مسلمانوں نے کہاں تک ترقی کی اپنے اثر و اقتدار کو ہمسایہ قوموں پر کس طرح قائم رکھا اور یورپ میں جہالت کی تاریکیوں کو علم و تہذیب سے کیوں کر منور کیا قیمت تین آنے۔ پتہ، مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد (دکن)

تذکارِ سلف۔ اس کتاب میں جناب مولوی ضیا احمد صاحب ضیاؔ ایم اے لیکچرار انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ نے اسلاف اسلام کے اخلاق اور اُن کے کارناموں کا تذکرہ قطعاتِ نظم میں کیا ہے۔ زبان سلیس اور انداز بیان شگفتہ ہے بچوں اور نوجوانوں کے لئے ایک سبق آموز چیز ہے۔ حجم ۳۲ صفحات ہے جن میں نو نظمیں مولانا عبدالماجد کی تقریب اور مولانا عبدالسلام کا مقدمہ ہے

غالب اور اُس کی شاعری۔ جناب مولوی احمد الدین احمد صاحب مارہروی کے قلم سے مرزا غالب کے کلام پر چالیس صفحے کی ایک عمدہ تنقید ہے جو پڑھنے کے قابل ہے قیمت چھ آنے۔ پتہ، مینیجر سفیر بک ایجنسی، سبزی منڈی، الہ آباد۔

ترانۂ حریت۔ مرتبہ جناب محمد عرفان صاحب ہزاروی۔ یہ اقبال، ظفر علی خاں، جوش، حفیظ، سالک وغیرہ ادبا کی دلکش قومی نظموں کا مجموعہ ہے حجم ۳۲ صفحے اور قیمت ۲ر ہے۔ امان سرحد برقی پریس راولپنڈی سے منگائیے۔

بیمۂ زندگی۔ مولفہ ڈاکٹر سید محمد شریف صاحب متقی لدھیانہ۔ جیبی تقطیع پر ۳۲ صفحے کا یہ رسالہ ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً لائف انشورنس سے روشناس کرانے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ مسلمانوں کی اقتصادی ترقی کے لئے آج کل زندگی کا بیمہ کرانا ازبس ضروری ہے۔ قیمت پانچ آنے معہ محصول مقرر ہے۔ جناب مولف سے مل سکتا ہے

کوہستان کانگڑہ کی دلفریب وادی۔ یہ اردو زبان کا ایک خوبصورت مصور پمفلٹ ہے جسے ریلوے کے منتظمین نے

شائع کیا ہے۔ اس میں کانگڑہ کی تاریخی حیثیت صنعت و تجارت اور قدرتی مناظر کا دلکش بیان ہے یکم دسمبر ۲۹ء سے کانگڑہ ویلی ریلوے کا اجرا ہوا ہے اور اس پمفلٹ کی اشاعت کی غرض یہ ہے کہ لوگوں کو وادی کانگڑہ کی سیر اور تجارت کے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ ایجنٹ صاحب نارتھ ویسٹرن ریلوے سے طلب فرمائیے۔

آل انڈیا مشاعرہ۔ اُس عظیم الشان مشاعرے کی روئداد اور شعرا کا کلام ہے جو انجمن خیابانِ اردو انٹرمیڈیٹ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی جانب سے منعقد ہوا۔ شعرائے وقت کے کلام کا یہ ایک عجیب مرقع ہے جسے حضرت احسن مارہروی نے مرتب کیا ہے۔ حجم بڑی تقطیع کے ۵۶ صفحے ہے اور چھ آنے میں انجمن کے دفتر سے مل سکتا ہے۔

سالانہ رپورٹ۔ یہ انجمن علم و ادب شملہ کی ۱۹۲۷ء کی رپورٹ ہے جس کے ساتھ ۴ ستمبر ۱۹۲۷ء کے مشاعرے کی منتخب نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں حجم ۸۰ صفحات اور قیمت چھ آنے ہے پتہ۔ خواجہ شجاع صاحب منعمی پروفیسر کالج، بہاول پور

حزب اللہ اس کتاب میں سید ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب سجادہ نشین جلال پور شریف نے اُس لائحہ عمل کی تشریح کی ہے جو انہوں نے مسلمانوں کی تنظیم اور اصلاح کے متعلق مرتب کیا ہے۔ ان مصلحانہ مضامین کو پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سید صاحب کی تحریک مسلمانوں کی قومی، اقتصادی، معاشرتی اور تمدنی ارتقا و اعتلا کے لئے نہایت مفید ہے۔

"خضرِ راہ"۔ یہ نیا رسالہ نیا گاؤں، لکھنؤ سے نکلا ہے۔ جناب حامد علی صاحب اس کے اڈیٹر ہیں۔ انہوں نے اس کے لئے اچھے اچھے علمی و ادبی مضامین فراہم کئے ہیں اور اسے مفید بنانے میں اپنی پوری کوشش صرف کی ہے لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے حجم ساٹھ صفحے اور سالانہ قیمت چار روپے مقرر کی ہے۔

"نوشیروان" منشی بلدیو سہائے صاحب صحرائی سروری کے زیرِ ادارت یہ مصور رسالہ کوئٹہ سے نکلنا شروع ہوا ہے جناب صحرائی دیر سے زبانِ اردو کی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہے ہیں اور یہ رسالہ اُن کے ذوقِ ادب کا ایک دلکش نمونہ ہے اس رسالے کے دو نمبر ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ دوسرا نمبر پہلے سے بہتر شائع ہوا ہے، اس لئے امید کی جاسکتی ہے کہ اُن کا رسالہ کامیاب ثابت ہوگا۔ حجم بڑی تقطیع کے ۴۶ صفحات اور سالانہ چندہ چار روپے ہے۔

حجازی کیلنڈر۔ یہ ایک نہایت خوبصورت، رنگین اور روغنی کیلنڈر ہے جس میں اسلامی اور عیسوی دونوں قسم کی تاریخیں دی گئی ہیں پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم، اللہ۔ محمد اور کلمہ طیبہ بخطِ ثلث طغریٰ نما تحریر ہے، اس کے نیچے ایک اسلامی بندرگاہ کا نظارہ ہے اور پھر مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، کربلائے معلی اور نجف اشرف کی تصاویر ہیں۔ دلکش نقش و نگار اور بیل بوٹے ان کے علاوہ ہیں۔ ناشرین کا یہ دعویٰ بجا ہے کہ اس سے پہلے ایسا کیلنڈر ہندوستان بھر میں شائع نہیں ہوا قیمت چھ آنے ہے۔ وی پی منگوانے والوں کو نو آنے میں پڑے گا۔ حافظ قمرالدین اینڈ سنز، تاجرانِ کتب موچی دروازہ کوچہ قاضی خانہ لاہور سے طلب فرمائیے۔

فہرست مضامین

جلد (۱۶)

بابت ماہ اگست ۱۹۲۹ء

تصاویر:- ۱- رات- ۲- خواب

یہ موتی

کچھ کھویا نہیں گیا!

ہمیشہ آگے کو قدم بڑھائے جا!

ہر رات کے بعد دن ہے، ہر تاریک بادل کے پیچھے چمکتا ہوا سورج موجود ہے!

اور پھر رات، شاندار رات حسین وجمیل رات، اپنے ننھے تاروں والی اپنے پیارے چاندوالی رات!

کونسی تاریکی ہے جس کے اندر ہمارے پُرنور خدا نے روشنی کی جھلکیاں نہیں چھپادیں؟ سمندر کے پاس اُس کے آبدار موتی ہیں پہاڑوں کے بطن میں لعل وجواہر کا خزانہ ہے تو کیا ہوا تیرے دریا میں جو جنگل بیابان میں سے ہو کر گذرتا ہے تیرے اس آئینے میں اپنے گردوپیش کا عکس ہے اِس کے اندر حسن وحقیقت کی وہ جیتی جاگتی تصویریں ہیں جن کا نظیر دنیا پیش نہیں کرسکتی!

کچھ کھویا نہیں گیا!

تو اُس موتی کو کیا ڈھونڈتا ہے جو کل کھویا گیا، تیرے پروردگار کی شفیق فطرت نے تیرے ہی دل کی سیپی میں ارد ل لاکھوں موتی چھپا کر رکھ دئیے ہیں، چھوڑ اُس لاحاصل تلاش کو اور کھول اِس لازوال خزانے کا زرنگار دروازہ!

کل کا وہ موتی اے دوست! کھویا گیا لیکن آج کا یہ موتی دمکتا ہے تیرے دل میں آج کا یہ موتی جھلک رہا ہے۔ تیری آنکھ کے ہر آنسو میں!

آنسو جو تیری آنکھ سے گر گئے موتی جو گذرے دنوں میں کھوئے گئے اب بھی تیرے گلے کا ہار ہیں، تو سر کو بلند رکھے تو وہ زینت ہیں تیرے سراپا کی تو دل کو پاک کرلے تو وہ آرائش ہیں تیرے روح ورواں کے لئے!

تاریک بادل برس چکے، گذرے ہوئے رنج وراحت اب قوس قزح ہیں تیرے آسمان پر، کل گذر گیا رات ہو چکی وہ کروڑوں میل پر دور دور سورج افق سے ابھرا، اس کی سنہری روپہلی کرنیں چلی آتی ہیں دیکھ اور آج کے لہراتے شبنمی میدان میں تیری روح کے لاکھوں موتیوں میں وہ عکس ریز ہیں میرے دوست!

باغبان

جہاں نما

عورتیں اور سیاسیات

مس لوسی ایم پیرس نے عورتوں کے سیاسیات میں حصہ لینے پر سُنڈری دھرما میں یوں بحث کی ہے :-

عورتیں قوم کی خانہ دار ہیں اور یہ امر کہ وہ اپنے گھروں کا انتظام کرنا جانتی انہیں اس قابل ثابت کرتا ہے کہ وہ قومی پیمانہ پر بھی خانہ داری کر سکیں گی جو خانہ داری کی محض ایک بہت بڑی صورت ہے۔ اپنے گھر کا انتظام اور قوم کے گھر کا انتظام جسے سیاسیات کہتے ہیں حقیقت میں دونوں ایک ہیں اور دونوں بڑی حد تک ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ سیاسیات کا اُن امور سے ایک گہرا تعلق ہے جو ہماری خانگی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر کے استعمال کی اشیا صنعت سے تعلق رکھتی ہیں کھانے کی چیزیں پکانے کے برتن، آرائشی سامان، دریاں اور پہننے کے کپڑے یا ہاتھ سے بنائے جاتے ہیں یا کلوں کے ذریعہ سے، اور ان کے بنانے خریدنے اور بیچنے پر چند ملکی قوانین کی حکومت ہوتی ہے۔ کھانے کی چیزیں زراعت سے پیدا کی جاتی ہیں اور سیاسیات کا زراعت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ سیاسیات کا تعلق اُن تمام معاملات سے ہے جنہیں عورتیں اس قدر جانتی ہیں جتنا کہ مرد یا انہیں اسی قدر جاننا چاہئے جتنا مرد جانتے ہیں، کیونکہ وہ عورتوں پر اثرانداز ہوتے ہیں اور عورتیں بڑی حد تک اُن پر اثرانداز ہو سکتی ہیں۔

امساکِ باراں کی وجہ سے جب کافی غلہ پیدا نہیں ہوتا تو عورتوں کے پیشِ نظر اُن کے فاقہ کش بچے ہوتے ہیں، اور وہ حکومت کو مجبور کر سکتی ہیں کہ وہ زراعت پر زیادہ توجہ کرے اور ذخائرِ آب کے لئے تالاب بنوائے جیسا کہ قدیم زمانہ میں دستور تھا۔ عورتیں اپنے بھوکے بچوں اور شوہروں، اور اپنے گرد و پیش کے فاقہ زدہ لوگوں کو دیکھ کر اپنے درد انگیز جذبات کی زبردست طاقت کے ساتھ مردوں کے احساسات میں اضافہ کر سکتی ہیں۔ کاش عورتوں کو معلوم ہوتا کہ ان میں یہ طاقت موجود ہے۔ اور وہ تھوڑا سا وقت اپنے مردوں کی مدد سے ان اہم مسائل پر غور کرنے میں صرف کریں تاکہ علم و دانش کی رو سے موثر طریق پر رائے دے سکیں۔ سیاسیات میں حصہ لینے پر بہت زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا۔ اکثر عورتیں آپس میں بہت باتیں کرتی رہتی ہیں۔ اس کی بجائے وہ قحط سالی میں غریبوں کی خوفناک حالت پر تبصرہ کر سکتی ہیں، وہ ایک دوسری کے متعلق ایسی باتیں بھی کر سکتی ہیں جن کا درجہ معمولی بے فائدہ گفتگو سے ذرا بلند ہو

لیکن ہندوستانی عورتوں کو ابھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ وہ بے کار باتوں کے علاوہ کام بھی کرسکتی ہیں۔ ممکن ہے بعض امور کے متعلق مردوں اور عورتوں کا علم برابر ہو، جیسا کہ خوراک مہیا کرنے کا مسئلہ ہے۔ لیکن عورت کا احساس زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اسے اپنے گھرانے کے لئے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ مہیا نہیں ہوسکتی۔ لیکن بعض ایسے معاملات بھی ہیں جن میں عورتوں کو مردوں سے زیادہ علم ہوتا ہے مثلاً قانونِ ازدواجِ صغر سنی جو آج کل مجلس مقننہ کے پیش نظر ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق جو ہندوستان کے مردوں اور عورتوں دونو کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے صرف عورتیں ہی صحیح فیصلہ کرسکتی ہیں۔ صرف عورتیں ہی بتا سکتی ہیں کہ لڑکیوں کی شادی کس عمر میں ہونی چاہئے۔ اکیلے مرد اس بات کا فیصلہ سوائے قیاس پر انحصار کرنے کے کس طرح کرسکتے ہیں؟ قیاس صحیح سہی لیکن ایسے اہم مسئلہ میں جس کا تعلق تمام قوم کی زندگی سے ہو —— عملی تجربہ ضروری ہے۔ صرف قیاس پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔

چین کے طلبہ کی حالت

دوسرے ملکوں کے طلبہ کی طرح چینی طلبہ کے پیشِ نظر بھی سب سے مقدم امر فلسفۂ حیات ہے۔ طلبہ کی اکثریت مادیت کی طرف مائل ہے۔ چینی کم و بیش علمی لوگ سمجھے جاتے ہیں، یعنی وہ لوگ جن کا مذہب کے ساتھ کچھ زیادہ تعلق نہیں ہوتا، خصوصاً مذہب کی منظم حالت سے۔ وہ عام طور پر اخلاق کے ایک خاص درجہ پر مطمئن ہیں جو انہیں روزمرہ کی زندگی کے گذارنے میں مدد دیتا ہے۔ اس لئے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ وہاں عقاید کا اس قدر اختلاف کیوں ہے اور ایک ہی گھرانے کے افراد مختلف مذہبی عقاید پر کیوں عمل کرتے ہیں۔ چینی بے اعتقادی کی رواداری اور آزادی کے عادی ہوچکے ہیں۔ اسی لئے چینی طلبہ جدید مادیت اور الحاد کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔ عوام کی غربت و افلاس کی زندگی بھی اس زاویۂ نظر کے پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔

چینی طلبہ کے لئے دوسرا بڑا سوال صنفی زندگی کا ہے۔ گذشتہ زمانے میں دونوں صنفیں الگ الگ تھیں، اور دونوں کی معاشرت میں بڑا فرق تھا۔ مردوں کی تعلیم محدود تھی۔ اور عورتیں بالکل بے علم تھیں۔ لیکن اب تعلیم نے دونوں کو آپس میں ملا دیا ہے اور متاہل زندگی میں ایک انقلاب پیدا کردیا ہے۔ چنانچہ اب چینی والدین کا طرزِ عمل بھی ان کی ہمت افزائی کررہا ہے۔ خصوصاً نکاح اور صنفِ مقابل کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے پیدا کرنے کے معاملہ

ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سینما، ناٹک، ناچ گھر اور غیر ذمہ دارانہ کتب کی مقبولیت بہت زور سے بڑھ رہی ہے۔ یہ چیزیں ایک اہم مسئلہ کی صورت میں طلبہ کے دلوں میں جاگزین ہو رہی ہیں۔ آج چین میں صنفی معاملات پر اس قدر تصنیفات موجود ہیں کہ زندگی کے کسی اور شعبہ پر نہیں ہیں، اور میرے خیال میں اگر ہم اتنی ہی مذہبی کتب بھی شائع کریں جتنی صنفی کتب شائع کر رہے ہیں تو طلبہ کی بہت بڑی خدمت بجا لائیں گے۔

تیسرا اہم مسئلہ طلبہ کے نزدیک اقتصادی مسئلہ ہے۔ طلبہ عام طور پر چین کے متوسط طبقہ کے خاندانوں سے ہوتے ہیں۔ طبقۂ اعلیٰ کے طلبہ بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لئے والدین کو بچوں کی تعلیم کے اخراجات کے لئے کافی روپیہ کمانا پڑتا ہے۔ بعض اوقات انہیں مشکلات کے باعث سلسلۂ تعلیم کو چند سالوں کے لئے روک دینا پڑتا ہے۔ یہی مشکلات طلبہ کو جفاکش اور محنتی بنا دیتے ہیں۔ اور اس کا ثبوت اعلیٰ تعلیم کی وہ عالمگیر خواہش ہے جو طلبہ میں ظاہر ہو رہی ہے۔ طلبِ روزگار کا مسئلہ سب سے زیادہ پریشان کن ہے۔ کیونکہ اعلیٰ تربیت یافتہ لوگوں کے لئے اسامیاں کم ہیں اور اس لئے مقابلہ سخت ہے۔

طلبہ کے نزدیک آخری اور نہایت ہی اہم مسئلہ سیاسیات اور معاشرت کا ہے۔ وہ سیاسی اور معاشرتی ترقی میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ زندگی کے جدید نظریات میں بھی انہماک ظاہر کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مطالعہ کی کمی کے باعث یا اس لئے کہ نظریات ان کے سامنے عملی جامہ نہیں پہن سکتے ان کا علم خام اور سطحی ہو لیکن بہرحال اقتصادی اور معاشرتی تجدید کے جدید نظریات سے انہیں حقیقی دلچسپی ہے۔

ٹیلیفون کی حیرت انگیز ترقی

پالسن کا برقی فونوگراف جو آج سے تین سال قبل سویڈن میں ایجاد ہوا تھا ایک ترقی یافتہ صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ سے ٹیلیفون پر بھیجا ہوا پیغام نہ صرف مگر رسنا جا سکتا ہے بلکہ نہایت تیز رفتار سے بھیجا جا سکتا ہے اور سننے والا اسے معمولی گفتگو کی رفتار پر سن سکتا ہے۔

اگر آپ کو نو ہزار الفاظ کا ایک ضروری پیغام ٹیلیفون پر پیرس سے لندن میں اپنے ایجنٹ کو بھیجنا ہو تو ۱۵۰ الفاظ فی منٹ کے حساب سے اس کے ادا کرنے میں ایک گھنٹہ صرف ہوگا اور ایک گھنٹے کے کرایہ کی خطیر رقم ادا کرنے کے باوجود ممکن ہے کہ آپ کا سلسلۂ کلام دورانِ گفتگو میں قطع کر دیا جائے۔ لیکن موجودہ ٹیلیفون پر آپ اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھے ہوئے ایک کھلتی ہوئی تار پر اپنا پیغام ایک گھنٹے میں پڑھ دیتے ہیں۔ پھر اپنے ٹیلیفون

کا سلسلہ لندن سے ملاتے ہیں اور وہی تار ٹیلیفون کے آلہ میں سے دس منٹ کے اندر اندر گذر جاتا ہے اور آپ کا مکمل پیغام لندن میں موصول ہو جاتا ہے۔

وصول کرنے والا آلہ نوسو الفاظ فی منٹ کی رفتار سے پیغام وصول کرتا ہے۔ لیکن اس رفتار سے الفاظ سمجھ میں نہیں آتے۔ اب اس تار کو ایک اور آلہ سے ملا کر آہستہ آہستہ چلایا جاتا ہے مختصر نویس آپ کا پیغام حرف بحرف لکھ لیتا ہے۔ یہ کتنی بڑی سہولت ہے کہ آپ نے ٹیلیفون کا دس منٹ کا کرایہ ادا کر کے اس سے ایک گھنٹے کا کام لیا۔

یہ ٹیلیفون ایک جرمن سائنسدان ڈاکٹر سٹل کی محنت کا نتیجہ ہے جس نے ایک باریک لوہے کے تار میں برقی لہریں گذار کر اسے اس قابل بنا دیا ہے کہ پیغامات ہمیشہ کے لئے اس میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۰ء کے قریب سویڈن کے سائنسدان ڈاکٹر پالسن نے اس آلہ کو ابتدائی حالت میں پیش کیا تھا۔ اُس وقت تار کی آواز دینے والی طاقت دو تین روز میں زائل ہو جاتی تھی۔ لیکن موجودہ حالت میں اگر دس سال کے بعد بھی وہی پیغام سننا چاہیں تو سنا جا سکتا ہے۔ اور پیغامات کا کوئی خاص حصہ جسے محفوظ رکھنا مقصود نہ ہو حذف بھی کیا جا سکتا ہے۔

موت و حیات کی جنگ

انسان کی دائمی زندگی کا مسئلہ اس وقت دنیا بھر کے حکما کے پیش نظر ہے۔ انسانی زندگی کا مدار ہائیڈروجن آکسیجن کاربن اور نائٹروجن پر ہے ممکن ہے کہ ہم آیندہ زمانے میں ان کے ذریعے سے اپنے ہی جیسا ایک انسان پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

ایک امریکن حکیم کے پاس ایک چوزے کا دل بیس سال سے حرکت کر رہا ہے حالانکہ اس چوزے کے جسم کی خاک بھی اب تک منتشر ہو چکی ہوگی۔ یہ دل مع آنتوں کے ایک کیمیائی مرکب میں رکھا ہوا ہے۔ اگر چوزہ ذبح نہ کیا جاتا تو شاید چار سال تک زندہ رہتا۔ لیکن اس کا دل بیس سال سے زندہ ہے۔ اور یہ حکیم اُسے کیمیائی خوراک دیتا رہا تو اس کے ساکن ہونے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

روس کے حکما کئی سال سے خفیہ طور پر تجربات کر رہے تھے صرف چند ماہ ہوئے ان کے کارنامے آشکار ہوئے ہیں۔ انھوں نے پچکاری کے ذریعہ سے ایک مرکب ایک ایسے شخص کے جسم میں داخل کیا جسے مرے ہوئے چوبیس گھنٹے گذر چکے تھے کچھ دیر کے بعد اس کا دل آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگا۔ اور ایک ہلکی سی آواز اس کے گلے سے نکلی۔ دیکھنے والے حیران ہو گئے لیکن وہ شخص جلد ہی پھر مر گیا۔ پورے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا واقعی اس شخص کے ہوش و حواس قائم ہو گئے لیکن اس قدر ضرور کہا جا سکتا ہے کہ آیندہ تجربات زیادہ کامیاب ہونگے۔

رات

محبت کی سب سے بڑی بیٹی، اے خوبصورت اور بے داغ رات!
سکوت کی ملکہ اور نیند کی شہزادی!
جو اپنے سیاہ فام رخساروں کے پاکیزہ رنگ روپ سے،
محبت کرنے والوں کی آنکھوں کو اپنے حسن پر مفتون کر لیتی ہے

مارلو

اے پُراسرار رات! تُو خاموش نہیں، تیری بہت سی زبانیں ہیں

جونا بیلی

اے مقدس رات! میں نے اُس کو تجھ سے برداشت کرنا سیکھا ہے
جس کو انسان پہلے برداشت کر چکا ہے!
تُو افکار کے ہونٹوں پر انگلی رکھتی ہے،
اور پھر وہ شکایت کے لئے نہیں کھلتے۔

لانگ فیلو

خواب

خواب جہاں خیال تصوّر کی بھول بھلیاں میں دیوانہ ہو جاتا ہے

ینگ

بند پلکوں کے نیچے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم دیکھ رہے ہیں

فارڈنگھم

جس طرح خواب اُن لوگوں کے خیالات ہیں جو سو رہے ہیں، اسی طرح خیالات اُن لوگوں کے خواب ہیں ~~خواب~~ جو جاگ رہے ہیں۔

بلونٹ

منصور احمد

ہندوستان اور اسلامی تہذیب

"اسلامک کلچر" کے نام سے جو انگریزی رسالہ مسٹر پکتھال کی زیرادارت حیدرآباد دکن سے شائع
ہوتا ہے اُس کی ایک اشاعت میں اس عنوان سے سید امیر علی مرحوم کے قلم سے ایک پرمغز مضمون شائع ہوا تھا
جو درحقیقت قابلِ قدر تاریخی معلومات کا ذخیرہ ہے، ذیل کا مضمون اسی کی تلخیص ہے جس سے ناظرین کو اندازہ
ہوگا، کہ اسلام نے ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر کس حد تک اثر ڈالا،

کسی خاص تاریخی دور میں ایک قوم کی تہذیب و تمدن کے متعلق صحیح طور پر اندازہ نہیں ہوسکتا جب تک یہ معلوم ہو کہ اس کے گذشتہ کارناموں کی کیا نوعیت تھی، اور اس کے عروج و زوال کے کیا اسباب و علل تھے؟

ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی تاریخ تقریباً ایک ہزار برس پر مشتمل ہے، اسلام سے قبل ہندوستان ہزاروں برس سے ایک غیر معمولی تمدّن کا گہوارہ تھا، اس میں شبہ نہیں کہ ہندوؤں نے مختلف علوم و فنون میں غیر معمولی کمال بہم پہنچایا تھا، لیکن جہاں تک قومی زندگی کے تاریخی حالات و واقعات کا تعلق ہے، بجز افسانوں اور مذہبی ترانوں کے انہوں نے کوئی ایسا مستقل سرمایہ نہیں چھوڑا ہے، جو تاریخی حیثیت سے کسی خاص عظمت کا مستحق ہو، یا جس سے ملک اور قوم کی اندرونی زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہو، بہرحال قدیم ہندوؤں میں تاریخ نگاری اور تذکرہ نویسی کا مذاق تقریباً مفقود تھا یہی وجہ ہے، کہ مسلمانوں کی آمد کے قبل ہندوستان کے قدیم تمدنی حالات بالکل تاریکی میں پڑے ہوئے تھے،

لیکن جب اسلامی دور پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو کرۂ ارضی کے اس وسیع خطہ کے متعلق جہاں وہ پھیلا ہم کو کثرت تاریخی معلومات کا ذخیرہ نظر آتا ہے، چنانچہ صرف ہندوستان کے متعلق اس کثرت سے تاریخی تصنیفیں موجود ہیں، کہ صرف اُن کی فہرست تیار کرنے کے لئے غیر معمولی کاوش کی ضرورت ہے، محمود غزنوی کے زمانہ سے لے کر موجودہ دور تک تاریخی تصانیف کا ایک غیر مختتم سلسلہ ملتا ہے، بیہقی نے ذاتی واقفیت کی بنا پر محمود اور اُس کے وارث مسعود کے حالات بیان کئے ہیں، اسی طرح منہاج السراج نے رضیہ بیگم اور اُس کے بھائیوں کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے، شمس سراج عفیف نے وہ واقعات و حالات قلمبند کئے ہیں جو خود اُس کی نگاہوں کے سامنے گذرے تھے، فیروز شاہ نے خود اپنے کارناموں کا ایک تذکرہ چھوڑا ہے، جس سے مصنف کی خوبیوں کا دماغ پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے، بابر اور اُس کے ورثاء نے بھی اپنی

زندگی کے حالات نہایت دلکش انداز میں لکھے ہیں۔

دسویں صدی عیسوی کے ختم کے قریب جب کہ مسلمانوں نے شمالی ہند میں سب سے پہلے قدم رکھا، ایک عرب فلسفی ہندوؤں کی صحبت میں رہ کر اُن کے علوم فلسفہ و سائنس کے مطالعہ میں مصروف تھا، مامون جو خلفائے عباسیہ میں سب سے زیادہ مقتدر اور علم دوست تھا، اُس نے اپنے دربار میں بہت سے فاضل برہمنوں کو جمع کر رکھا تھا، جو ہندوؤں کی کتبِ نجوم و ریاضی کا عربی میں ترجمہ کرتے تھے، لیکن البیرونی پہلا اجنبی شخص تھا جس نے برہمنوں کے مکانوں پر رہ کر براہِ راست ہندو مذہب، فلسفہ، اور فنِ قانون کا مطالعہ کیا تھا، اس کی تصنیف جو ہندوستان کے متعلق ہے، درحقیقت عربوں کی تحقیقی صلاحیت کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے، اُس نے اپنی تصنیف میں نہایت فیاضانہ الفاظ میں برہمنوں کے مذہب اور فلسفہ کا تذکرہ کیا ہے، اور اُس نقصان پر اظہارِ افسوس کیا ہے، جو محمود غزنوی کے حملوں سے ہندوؤں کے تمدن کو پہنچا تھا،

ہندوستان کی اسلامی تہذیب کی نوعیت اور وسعت کی تحدید اُس وقت تک مشکل سے ہوسکتی ہے، جب تک ترکوں کی تہذیب و تربیت سے واقفیت حاصل نہ کی جائے، اس سے مراد وہ تربیت ہے، جو اسلام کو مغرب میں نصیب ہوئی، عام طور پر قانونی نظم و نسق ایک قوم کی ترقی کا بہترین مظہر سمجھا جاتا ہے، حکومت کا نظام، علوم و فنون کی تربیت اناث کی تمدنی اور معاشرتی حیثیت قومی نشو و نما اور ترقی کے اندازہ کرنے کے لئے قابلِ قدر معیار ہیں۔

ترکوں کے زیرِ حکومت مغربی ایشیا میں ایک ایسا نظامِ حکومت قائم تھا جو جزرسی اور تقسیمِ عمل کے لحاظ سے موجودہ دور کے بہترین نظامِ مملکت سے بآسانی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے، اور جو حقیقت میں اکثر ترقی یافتہ مغربی ممالک کیلئے نمونۂ تقلید بن سکتا ہے۔

عباسیوں کے عہدِ اقبال میں حکومت کی مخصوص شاخیں حسبِ ذیل قائم تھیں۔

مرکزی محکمۂ محاصل، محکمۂ احتساب، محکمۂ جنگ، ڈاک خانہ، محکمۂ زراعت، خط و کتابت اور عرائض و شکایات کے معائنہ کی کمیٹیاں، محکمۂ عطیاتِ سرکاری وغیرہ، ان کے علاوہ اور بھی اکثر چھوٹے چھوٹے محکمہ جات قائم تھے، ان تمام محکمہ جات کے افسروں کی ایک کونسل تھی، جو سلطنت کی اعلیٰ ترین انتظامی جماعت سمجھی جاتی تھی، اس جماعت کا صدر وزیرِ اعظم ہوتا تھا، فوجی نظام ایک بورڈ کے سپرد تھا جسکو دیوان الارض کہتے تھے، یہ لفظ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں اکثر آیا ہے، ہر شہر کی پولیس علیحدہ تھی، تجار کے منتخب نمایندوں کی ایک مجلس ہوتی تھی جو تمام تجارتی امور و حالات کی ذمہ دار تھی، اس جماعت کا صدر خود اسی کا ایک رکن ہوتا تھا،

اکثر بڑے شہروں میں کونسلیں ہوتی تھیں جن میں مقامی معززین اور بعض اوقات حکومت کے نمایندے بھی شامل ہوتے تھے، اس کونسل کا صدر انتخاب کے ذریعہ سے ہوتا تھا، جیساکہ موجودہ زمانہ میں رائج ہے۔

نظامِ عدل کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا، غیر مسلموں کے قانونی حقوق و معاملات کا تصفیہ خود اُن کے قبائل کے سرداروں اور ججوں کے سپرد تھا۔ ہر شہر میں ایک قاضی ہوتا تھا، اور بڑے شہروں میں متعدد نائب قاضی ہوتے تھے، بغداد کا خاص قاضی قاضی القضاۃ کہلاتا تھا، اور سلطنت کا مخصوص قانونی مجوز سمجھا جاتا تھا، قاضیوں کی امداد کے لئے عہدداروں کا ایک دوسرا طبقہ قائم کیا گیا تھا جس کو عدل کہتے تھے۔

فوجداری کا نظام مجسٹریٹوں کے ہاتھ میں تھا جن کو صاحب المظالم کہتے تھے، لیکن اعلیٰ ترین عدالت وہ بورڈ تھا جو شکایات کے تدارک کے لئے قائم تھا، اس کا صدر خود بادشاہ یا اُس کی عدم موجودگی میں کوئی خاص عہدہ دار ہوتا تھا۔ اس بورڈ کے دیگر ارکان قاضی القضاۃ حاجب مخصوص وزرارِ حکومت اور متعدد مفتی ہوتے تھے جو خاص طور پر شرکت کے لئے بلائے جاتے تھے، اس عدالت کے قیام و تاسیس کی ضرورت اس بنا پر محسوس ہوئی کہ اکثر جب مدعا علیہ معزز یا حکومت کا عہدہ دار ہوتا تھا تو قاضی کے فیصلوں کی تعمیل اور اس کے احکام کے اجرا میں دقت واقع ہوتی تھی، لیکن اس عدالت العالیہ کے احکام سے کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی ذی جاہ اور صاحبِ اقتدار ہو، سرتابی نہیں کرسکتا تھا،

سلاطینِ عباسیہ کو رعایا کی خوشحالی کا خاص خیال رہتا تھا، اور اُن کے آرام و آسائش کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے تھے خلیفۂ عباسیہ ثانی منصور نے گیہوں اور جوار کے ٹیکس کو جو پہلے نقد تھا فصل کے ایک مخصوص اندازہ کے مطابق جنس کی صورت میں بدل دیا، لیکن اور معمولی زراعتی فصلوں کھجور اور بارآور درختوں پر وہی سابق نقدی ٹیکس قائم رہنے دیا۔ لیکن چونکہ اکثر اس کے ذریعہ سے عمالِ مال کو جبر و تشدد کا موقع ملتا تھا۔ اس لئے اس کے بیٹے مہدی نے تخت نشین ہونے کے بعد اس تخصیص کو بھی مٹادیا اور عام حکم دے دیا کہ ہر حالت میں صرف واقعی پیداوار کے پرتہ سے ٹیکس وصول کیا جائے، اگر زمین خاص طور پر سرسبز و شاداب ہوتی تھی اور اُس کی کاشت کے لئے معمولی محنت کافی ہوتی تھی تو کاشتکار نصف فصل حکومت کو دیتا تھا، اگر زمین کی آبپاشی میں زیادہ خرچ اور دقت اٹھانی پڑتی تھی تو ایک ثلث، اور جہاں اور مشکلات کا سامنا ہوتا تھا وہاں صرف ایک ربع اور بعض اوقات ایک خمس" انگور، کھجور، اور دیگر قسم کے باغات پر ٹیکس اس طرح تشخیص کرتے کہ اُن کی فصلوں کا اندازہ نقد میں کرلیتے اور اس رقم کے نصف یا ثلث پر شرح کا تعین کر دیتے، اکبر نے اپنی اصلاحی انتظامات میں ان قواعد سے دوبارہ کام کیا تھا،

سپین میں بھی نظامِ حکومت زیادہ تر انہی اصولوں پر مبنی تھا، اگرچہ سلطان حکومت کا اعلیٰ ترین سردار تھا لیکن

جہاں تک حکومت کے علی انتظام کا تعلق تھا، وہ وزرا کے ہاتھ میں تھا، ہر محکمہ ایک وزیر کے سپرد تھا، خاص طور پر چار محکمے تھے، مال، امورِ خارجیہ، قضا، فوجی نظام، ان وزرا کی ایک کونسل تھی جس کا صدر حاجب کہلاتا تھا، وہ براہِ راست سلطان سے تعلق رکھتا تھا، اور تمام شاہی احکام بذاتِ خود لے کر اُن کی تعمیل کراتا تھا، غیر مسلموں کے حقوق کی نگہداشت ایک علیحدہ عہدہ دار کے سپرد تھی۔ سپین میں قاضی کا عہدہ بہت زیادہ معزز خیال کیا جاتا تھا،

دیگر مشرقی ممالک کی عورتوں کی بہ نسبت عرب کی عورتیں اکثر قیود سے زیادہ آزاد تھیں، عام طور پر وہ باہر نکلتی تھیں اور علانیہ تقریریں کرتی تھیں، منصور کی بھتیجیاں فوجی لباس پہن کر میدانِ جنگ میں جاتی تھیں، اور سپاہیوں کی ہمت افزائی اور مجروحین کی خدمت کرتی تھیں، صدیوں تک مغربی مسلمانوں میں تہذیب کی یہی حالت رہی، قدیم یونان میں عورتیں دنیا سے بالکل بے تعلق تھیں، روس میں پیٹر اول کے زمانہ تک عورتوں کو کسی معاملہ میں دخل دینے کا کوئی حق نہ تھا، ایران میں بھی یہی حال تھا، قدیم ہندوستان میں عورتوں کی آزادی کا بہت شور سنا جاتا ہے، لیکن دروپدی کا جو انجام ہوا اس سے بالکل برعکس نتیجہ نکلتا ہے، مہا بھارت کے پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ اس کے شوہر نے قمار بازی کے موقع پر کس طرح اس کو داؤ پر چڑھا دیا تھا، اور جب شوہر ہار گیا تو وہ کس طرح اندرونی کمرے سے بال پکڑ کر باہر گھسیٹی گئی، علاوہ اس کے منو نے عورتوں پر جو قیود عاید کئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں اس جنسِ لطیف کی تمدنی حالت کچھ بہت زیادہ خوشگوار اور مسرت انگیز نہ تھی،

اگرچہ ان مختلف قوموں سے اختلاط کی وجہ سے عرب کی شجاعت میں ایک حد تک تنزل آگیا، تاہم جہاں تک عورتوں کی عزت و احترام کا تعلق تھا، اس میں بہت کم فرق آیا، اور مسلمان عورتیں اب بھی اپنے ملک کی تمدنی ترقی میں نمایاں حصہ لیتی رہتی تھیں، سپین کے عربوں میں بھی عورتوں کو خاص عزت حاصل تھی، وہ علوم و فنون کی تحصیل اور عام طور پر تقریریں کرتی تھیں، اکثر تماشوں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔

ہندوستان میں بھی پٹھان اور ترکی بادشاہوں کے زیرِ حکومت عورتوں کو غیر معمولی عزت حاصل تھی، بادشاہ کی حرمِ خاص کو "ملکۂ جہاں" کا خطاب ملتا تھا، اکثر "مخدومۂ جہاں" بھی کہتے تھے۔ اکبر کی ماں حمیدہ بانو تاریخ میں مریم مکانی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اعزاز صرف برائے نام نہ تھا، بلکہ ان کی دماغی اور علمی قابلیت دراصل اس کی مستحق تھی۔ رضیہ سلطان بیگم نے جس قابلیت، ہمت اور عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی اس سے ہر شخص واقف ہے۔ اکبر کی رفیقِ زندگی سلیمہ سلطان بیگم نہایت قابل شاعرہ تھی، اور عام طور پر عزت کے ساتھ دیکھی جاتی تھی، زمانۂ مابعد میں اودھ کے شاہی خاندان کی عورتیں بھی تمدنی اور سیاسی حیثیت سے غیر معمولی اقتدار و اثر رکھتی تھیں،

اگرچہ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں عرب سندھ میں اقامت گزین ہو چکے تھے، لیکن ان کے حالات بہت کم معلوم ہیں، ہندوستان کی اسلامی تہذیب کی ابتدا در اصل اس وقت سے ہوئی، جب کہ غزنویوں نے اپنے کوہستانی ملک سے باہر نکل کر لاہور میں حکومت قائم کی،

اب ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو تین مختلف دوروں میں آسانی سے تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) پٹھان (۲) مغل، (۳) اور سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد کا زمانہ،

محمود اور اُس کے جانشینوں کے زمانۂ حکومت میں تمدن اور علوم وفنون کی جو حالت تھی اس کے متعلق البیرونی بیہقی اور دیگر معصر وقائع نگاروں کی تصانیف میں تاریخی معلومات کا ایک معتدبہ ذخیرہ موجود ہے، محمود باوجود اپنی کمزوریوں کے علوم وفنون کی تربیت اور سرپرستی میں نہایت فیاضی اور دریادلی سے کام لیتا تھا، اور اس کے دربار میں فضلا اور شعرا کا ایک مجمع رہتا تھا، علاوہ اس کے اُس نے غزنی اور دیگر مخصوص شہروں میں ترکی طرز پر بہت سی خوبصورت عمارتیں بنوائی تھیں، لیکن اُس کا نام خاص طور پر اُس کے وزیر خواجہ حسن میمندی کی وجہ سے مشہور ہے، جس نے ایک نہایت مفید قانونِ مال گذاری وضع کیا تھا، یہ قانون ایران اور مغربی ایشیا میں رعایا کے لئے اس قدر مفید اور راحت آفرین ثابت ہوا کہ ناصر خسرو جو ایک مشہور سیاح گذرا ہے اس نے ان ممالک کو چمن زار بیان کیا ہے، حسن میمندی درحقیقت زمانۂ حال کے وزراے مال کا ایک نمونہ تھا، پٹھانوں کے زمانۂ حکومت میں بھی مالی نظام میں کوئی اصلاح یا تغیر کرنا ہوتا تھا تو ہمیشہ اسی کے اصولِ قانون کو مدنظر رکھتے تھے۔ محمود کے آخر زمانۂ حکومت میں اس پر دفعتہً شاہی عتاب نازل ہوگیا اور وہ محمود کی وفات تک قعرِ مذلت میں پڑا رہا لیکن جب اس کا بیٹا مسعود تخت نشین ہوا تو اُس نے دوبارہ حسن میمندی کو طلب کیا، اور وزارت قبول کرنے پر آمادہ کیا، مسعود بہ نسبت اپنے باپ کے زیادہ متحمل، دور اندیش اور منکسر المزاج تھا، اور تجربہ کار ملازمین کے صلاح ومشورہ کو بغور سنتا اور اُس سے فائدہ اٹھاتا تھا، اُس کے زمانہ میں فضلا کی ایک جماعت تھی جس کا وہ خود صدر تھا، البیرونی بھی اس کا ایک رکن تھا، اور اکثر علمی بحثوں میں شریک رہتا تھا، وزرا کا ایک دفتر بھی تھا، جہاں ارکانِ حکومت بجز جمعہ کے روزانہ جمع ہوتے تھے۔

مسعود کے جانشین اگرچہ شاہی خاندان کے اقتدار وعظمت کو قائم نہ رکھ سکے تاہم علم وفن کی سرپرستی اور قدر شناسی میں کسی سے پیچھے نہ تھے " سلطان ابراہیم جس کا انتقال ۱۰۹۸ء میں ہوا، خود ایک ممتاز شاعر اور فلسفی ہونے کے علاوہ علما کا بہت بڑا دوست اور قدر شناس تھا، اور اُس کے دربار میں وسطِ ایشیا کے ہر حصہ سے صاحبانِ فن کا مجمع رہتا تھا، حکیم سنائی اُسی کے زمانہ میں تھے، اور اکثر اُس کے دربار میں حاضر ہوتے رہتے تھے،

ہندوستان کی مستقل فتح و تسخیر کا کام غور کے افغان بادشاہوں نے شروع کیا، پنجاب سے خاندانِ غزنوی کے قدم اکھڑ چکے تھے، اور اس وقت جب کہ ہنری آف آنجو (Henry of Anjou) انگلستان کا بادشاہ تھا، شہاب الدین محمد افغانستان پر حکومت کر رہا تھا، اجمیر کے راجپوت بادشاہ سے شکست کھانے کے بعد شہاب الدین نے ۱۱۹۱ء میں پانی پت کے میدان میں ہندوؤں کو بالکل پامال کر دیا، اور اسلامی ہند میں اسلامی شہنشاہی قائم کر دی، مسلمانوں نے ہندوؤں کے قدیم حقوق، اور رسم و رواج سے بالکل تعرض نہیں کیا، قانونِ مال گذاری بدستور سابق قائم رہا، معمول سے زیادہ رعایا سے لگان وصول نہیں کیا جاتا تھا، دیہات کے نظامِ برادری میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی، قانون میں بھی کوئی تغیر نہیں کیا گیا، متاکشرا جو ہندوؤں کی مخصوص قانونی کتاب ہے، بارھویں صدی میں ایک مسلمان بادشاہ کی سرپرستی میں دوبارہ مدون کی گئی تھی، مفتوحین کی زبان بھی فاتحین کی زبان سے مختلف تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے، کہ ہندو درباروں میں فارسی کا رواج تھا جیسا کہ شہاب الدین کے قاصد کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے، جو اُس نے راجپوت بادشاہ سے شرائطِ صلح کے متعلق کی تھی، سنسکرت بے شبہ ہندوؤں کی مقدس زبان تھی لیکن اُس وقت ایک عام زبان وجود میں آ رہی تھی جس نے فاتح و مفتوح کے درمیان رشتۂ اتحاد کا کام دیا۔

مسلمانوں کا سیاسی اقتدار جب دلّی میں مستحکم ہو گیا، تو ہندوستان میں ایک جدید تہذیب کا دور شروع ہوا جس کے آثار کی جھلک اب تک محسوس ہوتی ہے، انگریز مصنفین کا اب تک خیال ہے، کہ پٹھانوں کے زمانۂ حکومت میں بجز جور و ظلم اور خونریزی کے اور کچھ نہ تھا، اس میں شبہ نہیں کہ یورپ کی طرح اس دور کے تاریخی صفحات کشت و خون سے رنگین ہیں۔ اور اکثر فرمانروایانِ سلطنت وحشی، نیم تعلیم یافتہ اور رعایا کے مفاد سے غافل ہوتے تھے، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو نہایت ہوشمند مدبر، رعایا کے خیر خواہ، اور علم و فن کے مربی تھے، اُن میں سے ایک ممتاز فرمانروا سلطان شمس الدین التمش تھا جو ۱۲۱۰ء میں مسند آرائے حکومت ہوا تھا، تاتاریوں کے سیلابِ مظالم کی زد سے جو علما جان بچا کر بھاگے تھے، ان کو اسی کے دربار میں پناہ ملی، جہاں بحیثیت مہمان کے اُن کا استقبال کیا گیا، امیر خسرو نے جو دو برس تک تاتاریوں میں مقید تھے، ان مظالم کا تذکرہ نہایت دلچسپ انداز میں لکھا ہے، بارہ سال بعد منہاج السراج التمش کے دربار میں ملازم ہوا، اور اُس وقت سے اس کی نگرانی میں دلی کے روزانہ واقعات و حالات قلمبند ہونے لگے، اُس نے نہ صرف شاہی فتوحات کا تذکرہ کیا ہے، بلکہ یہ بھی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ملکی نظم و نسق کا کیا اصول تھا اور مختلف ارکانِ حکومت کس طرح مقرر ہوتے تھے، التمش نے جو مسجد اور کالج تعمیر کرائے تھے، وہ متعدد صدیوں تک قائم رہے، اور ان میں وقتاً فوقتاً تجدید ہوتی رہتی تھی، حوضِ شمسی جو دلی کی ایک خاص چیز تھی اکبر کے زمانہ تک قائم رہا، التمش کی بیٹی رضیہ بیگم کی وفات کے بعد اُس کے دو نا اہل بھائی تخت نشین ہوئے، لیکن تیسرا بھائی

نصیرالدین ایک لائق حکمران ثابت ہوا، منہاج السراج نے اسی کے عہد میں اپنی تاریخ مکمل کی، جو طبقاتِ ناصری کے نام سے مشہور ہے۔

اس زمانہ میں بہ نسبت پہلے کے ملک کے اندرونی حالات اور رفتارِ ترقی کے متعلق بہت زیادہ معلومات کا ذخیرہ ملتا ہے، حکومت کے امرا کو عام طور پر ملک کے لقب سے پکارتے تھے، اور جب کوئی ان میں سے بلند تر درجہ کو پہنچتا تھا، تو اس کو خان کا خطاب ملتا تھا، امیر العسکر کو عزیز کہتے تھے، خاص مذہبی پیشوا کا لقب شیخ الاسلام تھا۔

نصیرالدین کے زمانۂ حکومت میں دو اشخاص نہایت فاضل اور بدبر گزرے ہیں، جن کی بدایونی نے بہت زیادہ مدح سرائی کی ہے، ایک اُن میں سے شمس الدین تھا، جو علمی حیثیت سے دبیر کے نام سے مشہور ہے، امیر خسرو نے اپنی مثنوی ہفت بہشت میں اس کی بہت تعریف کی ہے، دوسرا امیر فخر الدین تھا جو ابن الکلام کے نام سے مشہور ہے،

ہندوستان کے پٹھان حکمرانوں میں سب سے زیادہ ممتاز تین نام نظر آتے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی تمدنی ترقی میں مخصوص حصہ لیا تھا، یعنی بلبن، تغلق، اور فیروز، ضیاءالدین برنی نے بلبن کے زمانہ کے حالات کا نہایت مفصل اور مبسوط تذکرہ کیا ہے، بلبن ۱۲۶۵ء میں تخت نشین ہوا تھا، رضیہ بیگم کے بعد جو بادشاہ ہوئے تھے، اُن کی کمزوریوں نے ملک میں ایک عام بدامنی پھیلا دی تھی، رہزنوں کی مستقل جماعتیں تھیں، جو جنگلوں سے نکل کر عام طور پر ڈاکے مارتی تھیں، بلبن نے اپنی توجہ خاص طور پر قیام امن کی طرف مبذول کی، اور اکثر اس تشدد سے کام لیتا تھا کہ بے رحمی کے درجہ تک پہنچ جاتا تھا، لیکن اس وقت کے حالات اسی کے مقتضی تھے، نظامِ عدل تجربہ کار حکام کے سپرد تھا، ضیاءالدین برنی کا بیان ہے، کہ بلبن عدل و انصاف کا نہایت شدت سے پابند تھا، اور اپنے بھائیوں، ملازموں، دوستوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا تھا، اور ہمیشہ مظلومین کی اعانت کے لئے تیار رہتا تھا، مورخ مذکور کا مزید بیان ہے، کہ اپنی چہل سالہ حکومت کے زمانہ میں اُس نے کبھی کسی ادنیٰ حیثیت کے آدمی سے گفتگو نہیں کی، اور نہ کبھی اپنے شاہانہ اقتدار کے خلاف کسی شخص سے بے تکلف ہوا، وہ کسی سے مذاق نہیں کرتا تھا، اور نہ کسی کو اُس کی موجودگی میں مذاق کرنے کی مجال تھی، وہ کبھی زور سے نہیں ہنستا تھا، اور نہ کسی کو اس کے دربار میں اس کی ہمت ہو سکتی تھی،

مظالم کے انسداد کی غرض سے اُس نے ہر شہر میں ایجنٹ مقرر کر دیئے تھے، جو خفیہ طور پر اس کو حالات کی اطلاع دیتے رہتے تھے، کبھی کبھی یہ لوگ اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھا کر جبر سے کام لیتے تھے، لیکن جب اُس کو اس کی اطلاع ملتی تھی تو وہ شدید ترین سزائیں تجویز کرتا تھا، علاوہ اس کے اُس نے ملک پر جو خاص احسان کیا وہ یہ تھا کہ شمالی ہند کے اکثر جنگلوں کو کٹوا کر صاف کرا دیا، اور ڈاکو جو اُن میں رہتے تھے بالکل نیست و نابود کر دیئے گئے، اور اس طرح اُس نے اِن رہزنوں کی مغاکیوں

سے ملک کو نجات دے دی، اُس نے مختلف اطراف میں افواج و تجار کی آمد و رفت کے لئے سڑکیں بنوائیں، اور حفاظت کے لئے مخصوص مقامات پر چوکیاں بھی قائم کر دیں، ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ ساٹھ برس گذر چکے ہیں لیکن اب تک سڑکیں محفوظ و مامون ہیں"۔

بلبن کا فرزند اکبر محمد فتح خاں نہایت قابل اور بہادر سپاہی تھا، اس کے دربار میں اس زمانہ کے بہترین اور فاضل ترین افراد کا مجمع رہتا تھا، اکثر شاہنامہ، اور سنائی، خاقانی، نظامی کے اشعار اس کے سامنے پڑھے جاتے تھے، اور اُن کے محاسن پر بحث ہوتی تھی۔ امیر خسرو اور امیر حسن جو پانچ سال تک ملتان میں دربارِ شاہی سے وابستہ رہے، شاہزادہ اُن کی بہت عزت کرتا تھا۔

اگرچہ اس وقت تک ہندوستان کی قومیت پردۂ مستقبل میں تھی، تاہم خسرو صحیح معنوں میں قومی شاعر تھا۔ اس کو اپنے وطن سے غیر معمولی محبت تھی، اور اُس کی تصنیفات ہندوستان کی مدح و توصیف سے مملو ہیں، چنانچہ مغربی مخالفین کی طرف مخاطب ہو کر جوش میں کہتا ہے،

"تم اس کو کالا ملک کہو لیکن وہ عروسِ نو کی طرح حسین ہے، سرسبز و شاداب ہے اور برِ اعظم کی طرح وسیع ہے"۔

موجودہ مخلوط زبان جس کا نام اردو ہے اس کی تخلیق اس وقت سے شروع ہوگئی ہوگی جب کہ مغربی اور وسطِ ایشیا کی قومیں ہندوستان میں آکر آباد ہونے لگیں، امیر خسرو کے عہد میں یہ بالکل ابتدائی غیر منظم حالت میں تھی، اور بہت کم خط و کتابت یا علمی اغراض کے لئے مستعمل تھی، یہ لشکر کی زبان تھی جس سے عام طور پر دیہاتیوں سے معاملہ کرنے میں کام لیا جاتا تھا، امیر خسرو کے بیان کے موافق اس وقت ہر صوبہ کی ایک مخصوص زبان تھی، سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گجراتی وغیرہ وغیرہ، سنسکرت سے صرف برہمن کام لیتے تھے، عوام اس سے بالکل ناآشنا تھے۔

۱۳۲۰ء میں خاندانِ تغلق کے دورِ حکومت کا آغاز ہوا، اس سلسلہ کا پہلا تاجدار غیاث الدین تغلق تھا، جس کے انتظام کے متعلق ضیاء الدین برنی لکھتا ہے۔

"اگر کوئی غریب مسافر کسی آفت سماوی کی وجہ سے سڑک پر گر کر مرجاتا تھا تو اُس کے احکام کے مطابق تمام دیہاتی عہدیدار مع قاضیوں کے طلب ہوتے تھے، اور اُن کی موجودگی میں لاش کی جانچ کی جاتی تھی، اور ایک رپورٹ مرتب ہوتی تھی جس پر مجسٹریٹ کی مہر لگتی تھی، اور جب اس کی تصدیق ہو جاتی تھی کہ اس کے بدن پر کوئی زخم کا نشان نہیں ہے، تو لاش دفن کر دی جاتی تھی"۔

مورخ مذکور کا بیان ہے کہ اس اصول کا یہ نتیجہ تھا کہ اس بادشاہ کے زمانہ میں کوئی طاقتور کسی کمزور پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔

غیاث الدین پانچ سال کی مختصر حکومت کے بعد انتقال کر گیا، اُس کے بیٹے اور جانشین محمد جونا خاں نے تغلق آباد کے نام سے ایک جدید شہر کی بنیاد ڈالی جس کے آثار اب تک موجود ہیں، اکثر مورخین کا خیال ہے کہ وہ نصف دیوانہ تھا، عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ

"از افراط ظلم و تعدی سلطان کردو اعتقاد او عین عدل بود ملک برباد شد"

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ باوجود ظلم و تعدی کے جس کی وجہ سے تمام ملک میں برہمی پھیلی ہوئی تھی اس ظالم کے دربار میں اکثر ارباب علم و فن کا اجتماع رہتا تھا، ضیاء الدین برنی مورخ اس کا دوست تھا جس سے وہ اکثر مشورہ کرتا تھا مشہور شاعر بدر چاچ اس کے دربار کا ملک الشعرا تھا، علاوہ ان کے ظہیر الدین معمار، شہاب الدین ابو العباس احمد خطیب، سراج الدین ابو الفتح عمر مفتن جونا خاں کی سرپرستی سے فیضیاب تھے، لیکن ان ارباب فن میں سے خاص ذکر کے قابل مشہور سیاح اور مورخ ابن بطوطہ ہے جس نے ۱۳۳۳ء میں دلی کا سفر کیا تھا، اور شہر کی وسعت اور دیگر خصوصیات کا دلچسپ تذکرہ چھوڑا ہے۔ اُس نے خاص شہر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"دیوار جس سے دلی محدود ہے اس کی کوئی مثال نہیں، گیارہ کیوبٹ موٹی ہے، اس میں مختلف کمرے بنے ہوئے ہیں جن میں محافظین اور پاسبان رہتے ہیں، ان کمروں میں سامان جنگ و خورد و نوش بھی رہتے ہیں۔ غلہ بغیر خراب ہوئے پڑا رہتا ہے، میں نے ایک کمرے میں سے چاول نکلتے ہوئے خود دیکھا تھا، رنگ سیاہ تھا، لیکن خوش ذائقہ تھا، یہ تمام غلے سلطان بلبن نے نوے سال قبل سے جمع کر رکھے تھے، پیدل اور سوار شہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک اس دیوار کے اندر سے گذر سکتے ہیں، شہر کی طرف اُس کے اندر روشنی کے لئے دریچے موجود ہیں، دیوار کا نیچے کا حصہ پتھر کا بنا ہوا ہے اور بالائی حصہ اینٹوں کا، شہر میں اٹھائیس دروازے ہیں"

اس زمانہ میں پوسٹمین (خطرسان) ڈاک کا تھیلہ ٹھیک اسی طرح لے کر چلتا تھا جس طرح آج دیہاتوں اور غیر معروف قصبوں میں ایک لمبے ڈنڈے پر جس کے ایک سرے پر آہنی حلقہ ہوتا ہے تھیلے کو رکھ کر جھنجھناتا ہوا چلتا ہے، اور اس طرح وہ اکثر دن میں بیس تیس میل کی مسافت طے کر لیتا تھا،

علاؤالدین اور جونا خاں کے عہد میں بھی علمائے مذہبی اور حکام عدالت کو جو آزادی تقریر و عمل حاصل تھی وہ ان سلاطین کی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے واقعی حیرت انگیز ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے جو بہلول لودی کے زمانہ میں وجود پذیر ہوا، بہلول کا بیٹا نظام خاں جو بعد کو سکندر لودی کے نام سے مشہور ہوا، اس واقعہ کے وقت

دلی کے اقطاعِ مشرقی کا گورنر تھا، اس کو خبر دی گئی کہ تھنیشور سے قریب کرکھت میں مفسد ہندوؤں کا ایک گروہ اپنے مقدس تالاب میں نہانے اور اس جگہ جو مندر واقع ہے اس میں عبادت کرنے کی غرض سے جمع ہوا ہے، اُس نے فوراً اُن کے قتل کا ارادہ کرلیا۔ لیکن اس کی تعمیل سے پہلے اس کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اس معاملہ میں ماہرین قانون سے رائے طلب کرے، چنانچہ یہ لوگ جمع ہوئے، اور ان میں جو سب سے زیادہ ممتاز تھا اور ملک العلما کا خطاب رکھتا تھا اس کے سامنے ناظم خاں نے یہ سوال پیش کیا کہ آیا میں ہندو پرستاروں کے قتل کرنے میں حق بجانب ہوں؟ واقعہ نگار کا بیان ہے کہ ملک العلما نے سلطان کو یہ یقین دلایا کہ یہ اس کے لئے نہایت نامناسب ہوگا کہ وہ ایک قدیم بت خانہ کو برباد کرے، اور رسوم مذہبی کے ادا کرنے میں مانع و مزاحم ہو، یہ گفتگو تھوڑی دیر تک جاری رہی پھر دفعتہً سلطان نے اپنا ہاتھ تلوار پر رکھ کر غضبناک لہجہ میں کہا "تم کفار کی طرفداری کرتے ہو، میں سب سے پہلے تمہارا ہی خاتمہ کردوں گا اور تب کرکھت کے مشرکین کو قتل کروں گا" اُس نے جواب دیا۔

> "ہر شخص کی جان خدا کے ہاتھ میں ہے، کوئی شخص بغیر اس کے حکم کے مر نہیں سکتا، جو شخص ایک ظالم کے سامنے آتا ہے اس کو پہلے ہی سے موت کے لئے تیار رہنا چاہئے، جو کچھ بھی ہو، تم نے مجھ سے ایک سوال کیا، احکامِ رسول کے مطابق میں نے اس کا جواب دے دیا، اگر تم اُن کا احترام نہیں کرتے تو اس تحقیقات سے کیا فائدہ؟"

اس دلیرانہ جواب نے بادشاہ کے غیظ و غضب کا سارا جوش ٹھنڈا کردیا۔

ہندوستان ہو یا یورپ ہر جگہ اس قسم کی مثالیں اس دور میں بکثرت ملتی ہیں، جب کہ انسانی زندگی اور انسانی حقوق کی قیمت نہایت ارزاں خیال کی جاتی تھی۔

جونا خاں کے زمانہ میں خواجہ کمال الدین احمد جو بہت بڑا صاحب علم تھا چیف جسٹس تھا جس کو عام طور پر صدر الصدور یا صدرِ جہاں کہتے تھے۔ ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ کے زمانہ میں ایک مدت تک لفظ صدر کا استعمال جاری رہا، ایسٹ انڈیا کمپنی نے مفصل عدالتوں کے لئے حکام کے تین درجے قائم کئے تھے ایک منصف جواب تک قائم ہے دوسرا صدر امین اور اس پر صدر امین اعلیٰ جن کو اب سب جج کہتے ہیں۔

جونا خاں کی وفات کے بعد اعیان و امرائے حکومت نے اُس کے بھتیجے فیروز کو تختِ شاہی کے لئے منتخب کیا، جو اپنے محاسن اور قابلیتوں کے لحاظ سے اُن تمام بدنظمیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جو سابق بادشاہ کی بددماغی اور برہم مزاجی کی وجہ سے سلطنت میں پیدا ہوگئیں تھیں، سب سے زیادہ موزوں اور اہل تھا۔ جونا خاں نے خزانہ شاہی

بالکل خالی کردیا تھا، اس کے زمانہ حکومت کے اختتام تک دلی کی صورت بالکل ایک ویرانے کی ہوگئی تھی، تخت نشین ہوتے ہی فیروز کی پہلی کوشش یہ ہوئی کہ رعایا کو واپس بلاکر آباد کیا جائے، اور اُن کے قلوب میں حکومت کا اعتبار قائم کیا جائے، چنانچہ وہ اپنی اس کوشش میں جس حد تک کامیاب ہوا، اُس کا چشم دید تذکرہ ضیا برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں ان الفاظ میں کیا ہے

"میں جس مقام پر جاتا ہوں، خواہ وہ مسجد ہو، یا عیدگاہ، سرائے ہو یا بازار، وہاں انسانوں کے ہجوم اور ان کی خوش حالی اور سکون وطمانیت پر میں متحیر ہو جاتا ہوں، اور مجھ کو تعجب ہوتا ہے کہ یہ مجمع آخر کہاں سے ابل پڑا ہے"

مورخین کا بیان ہے کہ رعایا کے لئے سامانِ امن وسلامتی کی فراہمی سے فارغ ہو کر فیروز نے اپنی توجہ تین خاص امور کی طرف مبذول کی، ایک قیدیوں کی رہائی، دوسرے مظلومین کی دادرسی، اور تیسرے مذہبی اور تعلیمی عمارتوں کی تجدید وتعمیر۔

ممالکِ مفتوحہ کے ساتھ وہ نہایت رحمدلی سے پیش آتا تھا، اُس کو دشمن کی عورتوں کی عزت کا اتنا خیال تھا، کہ وہ کبھی اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ کوئی مقام جبروزور سے حاصل کیا جائے، تاکہ اُس کے سپاہیوں کو کسی قسم کی دست درازی کا موقع نہ مل سکے،

بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے کے لئے اُس نے متعدد نہریں تعمیر کرائیں، جن میں سے ایک اب تک موجود ہے، ان نہروں کی نگرانی اور ان کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے اُس نے متعدد عہدہ دار مقرر کئے، دلی سے چار میل کے فاصلہ پر اُس نے ایک شہر فیروز آباد کے نام سے تعمیر کیا، جس میں مسجدیں مدرسے اور شفاخانے بنوائے، شمس سراج کا بیان ہے کہ آٹھ عام مسجدیں جو سلطان نے تعمیر کرائی تھیں، ان میں سے ہر ایک دس ہزار آدمیوں کی وسعت رکھتی تھی، سواری کے لئے گھوڑے اور خچر ہر وقت تیار ملتے تھے، لیکن جو لوگ گھوڑے کی سواری پسند نہیں کرتے تھے اُن کو گاڑیاں بھی ملتی تھیں جن کو گھوڑے یا خچر کھینچتے تھے، ان گاڑیوں کا کرایہ نہایت کم تھا، پالکی مع کہار کے ہر وقت مل سکتی تھی، طویل سفر کے لئے اونٹ گاڑیوں سے کام لیتے تھے؛

شفاخانوں اور مدرسوں کے اخراجات کی خود حکومت کفیل ہوتی تھی، فیروز کو باغ کا اس قدر شوق تھا کہ اُس نے اپنے صرفِ خاص سے دہلی اور اُس کے قرب واطراف میں بارہ سو باغات تیار کرائے، شفاخانوں کے علاوہ اُس نے ایک لنگر خانہ قائم کیا تھا، جہاں غربا اور مساکین کو روزانہ کھانا ملتا تھا، بے کاری کے انسداد کے لئے اُس

نے ایک مستقل نظام مقرر کر رکھا تھا،

فیروز نے اپنی تاریخ فتوحاتِ فیروز شاہی میں اپنے مورثوں کی یادگاروں کا حال لکھنے کے بعد خود اپنے رحم و انصاف کے کارناموں کا نہایت سادگی کے ساتھ تذکرہ کیا ہے جن میں سے دو واقعات خاص طور پر نہایت دلچسپ ہیں۔ لکھتا ہے،

"میں نے خدا کی عنایت سے ایک دار الشفا تعمیر کیا جس سے ہر شخص کو خواہ وہ کسی درجے کا ہو امداد ملتی ہے، وہاں اطبا ہر وقت حاضر رہتے ہیں، جو مرض کی تشخیص کرتے ہیں، غذا کی نگرانی کرتے ہیں، دوا اور غذا کا خرچ خود میرے اوقاف سے دیا جاتا ہے، ہر قسم کے بیمار لوگ خواہ وہ مستقل باشندے ہوں، یا مسافر، آزاد ہوں یا غلام وہاں آتے ہیں، ان کے امراض کا علاج کیا جاتا ہے، اور دوا

لئے "تاس گھڑیال" وجود میں آیا،

ہندوستان کم از کم تین شہروں کی تعمیر و تاسیس کے لئے فیروز کا رہین منت ہے، یعنی حسار، جان پور، اور فیروز آباد، لیکن بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ اسی نیک دل سلطان کی بدولت آگرہ کی دوبارہ تعمیر اور آبادی وجود میں آئی تھی،

فیروز نے تقریباً ۳۸ سال کی حکومت کے بعد ۲۶ ستمبر ۱۳۸۸ء کو ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی، اور اس کی موت کے ساتھ پٹھانوں کی حکومت کے جاہ و جلال کا خاتمہ ہو گیا۔

مرزا احسان احمد

وجدانیات

حریفِ شیوۂ تمکیں لبِ سوال ہؤا — یہی ہؤا کہ مجھے سخت انفعال ہؤا

کسی کی مشقِ تغافل کا جب کمال ہؤا — لبِ خموش بھی آمادۂ سوال ہؤا

مری خرابیٔ دل میں ہنوز شک ہے اُسے — کہ پھر وہ مائلِ آرائشِ جمال ہؤا

امید کا ہے تقاضا کہ ناامیدی کا — دلِ ستم زدہ بیتابِ عرضِ حال ہؤا

یہی سزا ہے کہ ہو پائمالِ جورِ فلک — وہ دل جو تیری جفا کا نہ پائمال ہؤا

کسے ہے دید کی رخصت یہاں کہ دیدۂ شوق — شریکِ حیرتِ آئینۂ جمال ہؤا

تیری جفا کا تو احساں ادا ہؤا نہ ابھی — ستم ہؤا کہ وفا کا تجھے خیال ہؤا

بہارِ گلشنِ امید کا مآل نہ پوچھ — وہ خواب رونقِ گلدستۂ خیال ہؤا

یہی خیال ہے ہر دم کہ دیکھئے کیا ہو — مآلِ عشق سے بدتر غمِ مآل ہؤا

وہ اس ادا سے ہوئے محوِ پرسشِ پنہاں — کہ تن پہ ہر سرِ مو وقفِ عرضِ حال ہؤا

جہانِ شوق میں کیا کیا رہا ہے شور انگیز — فسونِ عشق کہ افسانۂ جمال ہؤا

نہیں ہوں عشق کی دریا دلی سے بے بہرہ — کہ سینہ مخزنِ غمہائے لازوال ہؤا

ہے ذرہ پروریٔ آفتاب اس کی گواہ — کہ عشق شانہ کشِ طرۂ جمال ہؤا

ستم نصیب کا مرنا بھی تو نہیں ممکن — تمہارے ہجر میں جینا اگر محال ہؤا

پڑا ہے کام عجب مارِ آستیں سے ہمیں — ہمارے سینے میں دل جان کا وبال ہؤا

بہ فیضِ صحبتِ اہلِ کمال ہے وحشت
کہ روشناسِ سخن مجھ سا بے کمال ہؤا

رضا علی وحشت

تھورو کا ملاقاتی

اُس سے زیادہ سادہ مزاج اور با اصول انسان ملنا ناممکن ہے۔ برائی اور بیماری جو دنیاوی مصیبتوں کی جڑ ہیں اُس کے لئے مطلق کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھیں۔ اُس کی عمر اندازاً اٹھائیس برس ہو گی۔ بارہ سال ہوئے وہ کینیڈا میں اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر ریاستہائے متحدہ میں آرہا کہ محنت مزدوری کر کے اور کچھ پس انداز کر کے اپنے ملک میں زمین خرید کر اپنی بقیہ زندگی آرام و آسائش میں گزار دے۔ شکل و صورت سے وہ بھدا سا معلوم ہوتا تھا جسم مضبوط مگر سست سا تاہم چال پسندیدہ، موٹی سیاہ گردن، سیاہ گھنے بال اور نیلی بے رونق آنکھیں جو خوشی کے لمحوں میں اکثر اوقات چمک اٹھتی تھیں۔ وہ سر پر بھورے رنگ کے کپڑے کی چوڑی ٹوپی، جسم پر سیاہ رنگ کا بڑا کوٹ اور پاؤں میں موٹے چمڑے کے بوٹ پہنتا تھا۔ وہ گوشت بہت کھاتا تھا۔ اپنا کھانا ٹین کے ایک برتن میں اٹھائے ہوئے میرے گھر سے کچھ آگے ایک جگہ جایا کرتا جہاں وہ درخت کاٹا کرتا تھا۔ سارا موسم گرما وہ یہی کام کیا کرتا تھا۔ جب وہ میرے گھر کے پاس سے گزرتا تو کبھی کبھی مجھے پینے کے لئے قہوہ پیش کرتا۔ قہوہ ایک پتھر کی بوتل میں ہوتا جو اُس کی کمر سے لٹکی ہوتی تھی۔ وہ صبح سویرے کام پر چل دیا کرتا۔ لیکن اس کی چال سے بے فکری ٹپکتی تھی۔ وہ زیادہ کام کر کے اپنے جسم کو تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔ اگر اسے اتنے پیسے مل رہتے جن سے اُس کا بخوبی گزارا ہو جاتا تو وہ بہت خوش و خرم رہتا۔ درخت کاٹنے کے کام میں اُسے خوب مہارت حاصل تھی لیکن وہ اپنا کام ظاہرداری اور نمائش کے ساتھ کرنے کا عادی تھا۔ اس کے کاٹے ہوئے درخت ہمیشہ زمین کے برابر ہوتے تھے جس سے موسم سرما میں جب ان علاقوں میں ہر طرف برف جم جایا کرتی ہے برف گاڑیاں بغیر رکاوٹ کے اِدھر اُدھر دوڑ پھر سکتی تھیں۔

مجھے اس سے اس لئے رغبت تھی کہ وہ نہایت خاموش، تنہائی پسند اور خوش مزاج واقع ہوا تھا۔ اور اپنے حال پر مطمئن تھا۔ خوشی اور اطمینان اس کی آنکھوں سے ٹپکا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ درخت کاٹ رہا ہوتا اور میں اِدھر سے گزرتا تو وہ بے انتہا خوش ہوتا، اور کینیڈین فرنچ زبان میں مجھے سلام کہتا، اگرچہ وہ انگریزی زبان بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ جب میں اُس کے پاس جا کھڑا ہوتا تو وہ کچھ عرصہ کے لئے کام چھوڑ دیتا اور میرے ساتھ باتیں کرنے لگتا بعض اوقات ایسے انداز میں ہنستا، گویا خوشی کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کسی معمولی سی بات پر ہنسی آجاتی تو زمین پر لوٹنے لگتا، اور خوب ہنستا۔ درختوں کی طرف دیکھ کر کہتا "خدا کی قسم، مجھے یہاں درخت کاٹنے میں بہت

لطف آتا ہے۔ میرے لئے اس سے بہتر اور کوئی مشغلہ نہیں " فرصت کے اوقات میں وہ اپنا جیبی پستول لے کر جنگل میں نکل جاتا اور تھوڑے تھوڑے وقفوں پر یونہی فائر کرتا، گویا اپنے لئے سلامی اتار رہا ہو۔ سردیوں میں میرے پاس آگ کے قریب بیٹھ کر اپنا قہوہ گرم کرتا اور جب کھانا کھانے کے لئے کسی کاٹے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ جاتا تو چھوٹے چھوٹے پرندے درختوں سے نیچے اتر آتے اور آہستہ آہستہ اُس کے کندھوں پر آ بیٹھتے اور اس کی انگلیوں میں پکڑے ہوئے آلو پر چونچیں مارنے لگتے۔ اُس وقت اس کا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا اور وہ کہتا، "مجھے یہ ننھے ننھے پرندے بہت پیارے لگتے ہیں"

اُس میں حیوانیت کا عنصر غالب تھا۔ صبر، تحمل اور قناعت اور جسمانی تکالیف کو برداشت کر لینا یہ سب خوبیاں اس میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ایک دفعہ میں نے اس سے سوال کیا "کیا تم دن کی سخت اور صبر آزما جسمانی کاوش کے بعد رات کو تھکن محسوس نہیں کرتے؟" "نہیں" اُس نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا "میں اپنی ساری عمر میں ایک دفعہ بھی نہیں تھکا" مگر اس میں فہم و فراست اور قوت متخیلہ تقریباً معدوم تھی۔ اور روحانی جذبات اُس کے اندر خوابیدہ معلوم ہوتے تھے اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ بچپن میں اسے روحانی تعلیم ہی کچھ ایسے طریق پر دی گئی تھی جس سے بچے کی واقفیت میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے برعکس اس کی عقل خام رہ جاتی ہے۔ اور جو کچھ اسے اس زمانہ میں بتایا گیا ہو اس سے کچھ زیادہ سوچنے اور سمجھنے کی طاقت اُس میں ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ قدرت نے اُسے تخلیق کرتے وقت ایک مضبوط جسم، صبر و قناعت اور خوش اعتقادی جیسی بیش بہا دولت عطا کرنے میں فراخ دلی سے کام لیا تھا تاکہ وہ ساری عمر ایک بچے کی طرح سادہ لوحی اور خوشی میں گزار دے وہ اس قدر مخلص اور سادہ مزاج تھا کہ الفاظ کے ذریعہ سے ناظرین کو اس کے ساتھ تعارف کرانا ایک دشوار امر ہے۔

اُس کے لئے دوسروں کے کاموں میں چنداں دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ وہ وہی بات کہتا اور وہی کرتا جو اُس کے خیال میں درست ہوتی۔ لوگ اسے اس کے کام کی مزدوری دے دیتے، جس سے وہ اپنا پیٹ پالتا، لیکن اس سے زیادہ اسے ہرگز کوئی تعلق ان سے نہ ہوتا۔ وہ کبھی ان لوگوں سے تبادلۂ خیالات نہ کرتا۔ وہ اس حد تک سادہ تھا کہ اُسے اپنی سادگی کا بھی علم نہ تھا۔ عالم اور دانا لوگ اس کے نزدیک دیوتا تھے۔ پادریوں اور مصنفوں کی وہ خصوصاً بہت عزت کرتا۔ ان کے فعل اُس کے نزدیک بمنزلہ معجزہ کے ہوتے۔ جب میں نے اسے پہلی مرتبہ بتایا کہ میں بکثرت لکھا کرتا ہوں تو وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے خیال کیا کہ اس سے میری مراد محض خط سے ہے کیونکہ وہ خود اچھا خط لکھنا جانتا تھا۔

بسا اوقات میں برف پر فرانسیسی ہجوں میں لکھا ہوا اُس کی بستی کا نام دیکھتا جس سے میں سمجھ جاتا کہ یہ اُسی کے

ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور یہ کہ وہ اس راستے سے گزر کر گیا ہے۔ ایک دفعہ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا کبھی اپنے خیالات کو لکھ کر ظاہر کرنے کا خیال اُس کے دل میں آیا ہے، تو اُس نے جواب میں مجھے بتایا کہ وہ اکثر اَن پڑھ لوگوں کے خط لکھا اور پڑھا کرتا ہے، لیکن خود خیالات قلمبند کرنے کی اُس نے کبھی کوشش نہیں کی۔ در اصل وہ یہ کر ہی نہ سکتا تھا وہ یہ معلوم نہ کر سکتا تھا کہ پہلے کون سی بات لکھے۔ وہ اس کا متحمل ہی نہ ہو سکتا تھا، اور اس پر ہجوں کا خیال رکھنا اُس کے لئے ایک اور مشکل تھی۔

میں نے سنا ہے کہ ایک دفعہ ایک ممتاز ادیب نے اس سے سوال کیا "کیا تم دنیا میں تبدیلی ہوتی دیکھنا پسند کرتے ہو"۔ اس پر وہ کچھ حیران سا ہو گیا اور یہ خیال کر کے کہ یہ سوال اس سے پیشتر کبھی کسی سے نہیں پوچھا گیا۔ جواب دیا "ہاں میں اسے پسند کرتا ہوں"۔ کسی فلسفی کے دل میں یہ جواب سن کر کیا کچھ خیال نہ گزرتے۔ اگر کوئی ناآشنا اسے پہلی مرتبہ دیکھتا تو خیال کرتا کہ یہ شخص عام باتوں کے متعلق کوئی خاص واقفیت نہیں رکھتا، لیکن میں تو بعض اوقات اُس میں ایسی خصلتیں موجود پاتا جن کا پہلے کبھی اس نے مظاہرہ نہ کیا ہو۔ میں اپنے دل میں یہ فیصلہ نہ کر سکتا کہ اسے ارسطو کا ہم پلہ سمجھوں یا ایک بچے جیسا نادان خیال کروں، آیا اسے ایک شاعرانہ دل و دماغ کا مالک کہوں یا کند ذہن تصور کروں۔ قصبہ کے ایک باشندہ نے مجھے بتایا کہ جب ایک دن وہ اسے اپنی چپٹ ٹوپی پہنے اور ہونٹوں سے سیٹی بجاتے ہوئے گاؤں میں سرگشت کرتا ملا تو وہ ایک شہزادہ معلوم ہوتا تھا جس نے بھیس بدل رکھا ہو۔ اس کا کتاب خانہ صرف ایک ریاضی کی کتاب اور ایک جنتری پر مشتمل تھا۔ ریاضی پر اسے کافی عبور حاصل تھا۔ دوسری کتاب اس کے لئے ایک مجمع العلوم تھی جس میں تقریباً ہر قسم کی قیمتی معلومات درج تھیں۔

جاڑے میں ایک دن جب کہ سردی شدت کی پڑ رہی تھی یہ خیال کرتے ہوئے کہ اسے معاشرت کا کوئی عمدہ سابق سکھاؤں گا میں نے اُس سے سوال کیا کہ کیا وہ اپنی حالت پر ہمیشہ مطمئن رہتا ہے؟ اُس نے جواب دیا "بالکل مطمئن بعض لوگ ایک بات پر قناعت کرتے ہیں، بعض کسی دوسری پر۔ ایک ایسا شخص جس کے پاس وصن دولت کافی ہو غالباً تمام دن کھاتے پیتے رہنے اور انگیٹھی کے گرد بیٹھ کر آگ تاپتے رہنے سے خوش رہے گا"۔ غرض میں کسی حکمتِ عملی سے بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ شاید وہ اپنی اسی حالت پر قانع رہنے میں مصلحت سمجھتا تھا۔ اور اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو ہم بہت سے انسانوں کے متعلق یہ حقیقت درست پائیں گے۔ اگر میں کبھی اس کے رہنے سہنے کے طریقہ میں اصلاح کی کوشش کرتا اور اُس کے سامنے کوئی تجویز پیش کرتا تو وہ بغیر افسوس کے کہتا کہ اب کوئی وقت نہیں رہا۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ دیانت داری اور راست بازی جیسی بیش بہا دولت سے مالا مال تھا۔

(مشورو)

عبدالکریم سرادپوری

راہ میں

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلی جا
چڑیاں اپنے گھروں کو لوٹ چلی ہیں اور سیاہ رات جھانک رہی ہے
لیکن دُور درختوں میں ایک شوخ ستارا ہنس رہا ہے
جتنا بھی تو چاہے اس راستہ میں ٹھہر ٹھہر کر اپنا جی بھرلے
آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلی جا

اس پُرسکون ماندگی میں تیرے پیروں کی کڑیاں گونگی ہو گئی ہیں
اور تیرے چہرے پر محنت کے پانی کے قطرے چھلک اُٹھے ہیں
ایسے میں تُو اپنے گھر کی دہلیز تک کیوں کر پہنچ سکے گی
آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلی جا

اے سکھی یہ جنگل آدمی سے خالی ہے اور ملّاح ابھی اُس پار ہے
میں مرلی بجاتا ہوں تو میری سانجھی بن جا
اپنے پیروں کی دھن پر مجھے گیت گانے دے
آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلی جا

جب تو اُس نگری کی چھاؤں میں اوجھل ہو جائے گی
اور تیرے اِس نیلے لباس کی جھلک باقی نہ رہے گی
تب میں بھی پُرنم آنکھوں کے ساتھ دنیا سے منہ موڑ لوں گا
آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلی جا

ہندی

بزم خرابات

(۱)

بیدار ہو آ کہ ہوں سحر شناس اے ساقی
ہاں بادۂ تلخ سے بجھا پیاس اے ساقی
یہ وقت ہے جب رخ سے عروس ایام
نکلی ہی اتری ہے مٹھاس اے ساقی

(۲)

کیا جام و پیالہ میں ہے متصل اے ساقی
اب مست ہے کیوں تیرہ آب و گل اے ساقی
میں ذرہ تھا جب بھیجتا تھا نہیں
پی پی کے جو مٹے ہوئے دل اے ساقی

(۳)

ہشیار کہ دل میں تاب و تب باقی ہے
آغوش میں لیلائے طرب باقی ہے
ساقی ابھی عمر صبح و فرداں نہ گنا
دنیا ہے تو دے جام کہ شب باقی ہے

(۴)

فردوس بریں ہے کہ فضائے ہشیار
صد ساز غرور دل کی ادائے ہشیار
جبیں خاطرہ ہو جس کی بنیاد
سرزمیں ایک مسکرائے ہشیار

جوش
ملیح آبادی

جامِ صہبائی

(۱)

آزادِ طلسمِ رنگ و بو ہی نہ ہوا
نیرنگِ جہاں کا راز جو ہی نہ ہوا
دنیا سے عبث شکایتِ بے مہری
افسوس کہ اپنا دوست تو ہی نہ ہوا!!

(۲)

جویائے رموزِ رازِ فطرت تو ہے
آگاہِ حقیقت ہو، حقیقت تو ہے
اسباب و علل میں کیوں ہے غلطاں پیچاں
اِس عالمِ اسباب کی غایت تو ہے!!

(۳)

صہبائے نشاط کی تمنا نہ سہی
جب تلخیِ زہرِ غم گوارا نہ سہی
ہم جرعہ و جام سے طلبگارِ حیات
بے نیشِ غمِ زندگی کا پروا نہ سہی

(۴)

تو اپنے ہی جوہر سے شناسا نہ ہوا
ہنگامۂ زیست سے بیگانہ نہ ہوا
پوشیدہ ہیں تجھ میں بھی ہزاروں عالم
افسوس کہ تو ان سے شناسا نہ ہوا

عبدالسمیع پال اثرؔ صہبائی

دو خط

پیاری

جس طرح تم ایک شاندار نظم ہو اسی طرح میں ایک بے سروپا کہانی ہوں۔ جس طرح تم سے دنیا کی توقع یہ ہے کہ بجائے نظم بنے رہنے کے تم ایک کامیاب روحانی جاروب کش بن جاؤ اسی طرح مجھ پر گلہ یہ ہے کہ میں ایک کارآمد بوریا کیوں نہیں؟

دنیا کا جوجی چاہے سوچے، جوجی چاہے بنے، لاکھ طرح سے بنے اور کروڑ طرح سے بگڑے تم پیاری اس کے فریب میں نہ آنا۔ کچھ نہ کہنا، کچھ نہ سننا، کچھ نہ کرنا۔ بغیر کہنے، سننے، کرنے کے یہ حال ہے تو اگر خدانخواستہ تم نے دنیا کو کوئی نیک مشورہ دے دیا تو ستم ہو جائے گا۔

اچھا! کیا وہ بات نہیں یاد ہے کہ ایک بھری مجلس میں تم نے ایشیائی تہذیب (یا عدمِ تہذیب) کا مرقع ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔ تم کہہ رہی تھیں کہ ایشیائی تہذیب جہاں تک اس کا صنفِ نازک سے تعلق ہے یہ ہے کہ بھولی بھالی لڑکیوں کو اس طرح سے پالا جائے کہ بڑے ہو کر اگر ان میں دل لبھانے کی کوئی ادا باقی رہ جائے تو خود انہیں تعجب ہو۔ تم اپنے لطیف طنزیہ پیرائے میں کہہ رہی تھیں

عشق کی بات بیسوا جانیں ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ کسی نے شاہزادی زیب النسا، کا ذکر شروع کر دیا اور اس پر مجھے موقع مل گیا کہ زیب النسا کا وہ مشہور شعر پڑھ دوں

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نہ شد
کور بہ چشمے کہ لذت گیرِ دیدارے نہ شد

اس سے بات پھر وہیں پلٹ آئی جہاں سے شروع ہوئی تھی یعنی یہ کہ مسلمان خاتونیں خشک نیکی کی ایسی بے دام لونڈیاں بنی ہیں کہ اُن کی ہر حرکت ہر بات، اُن کی نشست برخاست سب پکار پکار کر کہہ رہی ہیں

"خدا نہ کرے کہ کوئی ہمیں چاہے"

اور واقعی اس تربیت نے یہ کرامت کر دکھائی ہے کہ بہت کم صورتیں نظر آتی ہیں جن میں چاہے جانے کے قابل

بنانے والی کوئی ادا باقی رہی ہو۔ لڑکیاں تو لڑکیاں خود میرے حلقے میں ایک نوجوان اس مرض میں مبتلا ہے کہ حسن سے چھپتا پھرے۔ عجب تہذیب ہے کہ ہراس چیز سے گریز ہو جس سے زندگی کی گدڑی میں کہیں کہیں جو بیش بہا لعل اٹکا ہؤا ہے وہ بھی نظر نہ آئے۔ اماں باوا بھی یہاں کے نرالے ہیں، اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کی اولاد چاہے جانے کے قابل نہیں بن سکتی۔

ہاں تو جو بات تمہیں لکھنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ تمہاری اس گفتگو کا بعض دائروں میں ضرورت سے زیادہ چرچا ہو رہا ہے۔ تم نے تو یونہی ایک چلتی سی بات کہہ دی تھی مگر اب اُس کا بتنگڑ بنایا جا رہا ہے۔ کہنے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ لڑکیوں کو تعلیم دینے کا اگر یہ نتیجہ ہے کہ وہ آبائی طرز خیال کو چھوڑ کر دنیا کے نیک و بد کی نسبت خود شخصی رائے قائم کریں تو اس تعلیم کو دور سے ہی سلام ہے۔ پیاری تم سمجھیں کہ تعلیم سے قومی لیڈروں کا اصل مطلب کیا ہے؟ وہ مطلب یہ ہے کہ تعلیم تو تم پا جاؤ مگر کہو وہی جو بزرگ کہتے آئے ہیں۔ پڑھو لکھو سب کچھ مگر چلو نانی دادی کے نقش قدم۔ اَور جگہ تو تعلیم حالاتِ حاضرہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہے مگر ہمارے ہاں تعلیم اس لئے دی جا رہی ہے کہ ہم زمانے کا مقابلہ کریں۔ زمانہ ہمیں اگر دو قدم آگے کی طرف لے جانا چاہے تو ہم تعلیم کے زور سے چار قدم پیچھے ہٹیں۔ میرے خیال میں کیا ہی اچھا ہو جو کوئی خاتون ایک انجمن "ترکِ تعلیم نسواں" کے نام سے قائم کر دے۔ کسی اچھے سے چلتے پرزے پیر کو اس مجلس کا مربی قرار دے دے اور اس کے مریدوں اور مریدنیوں سے خوب ترکِ تعلیم نسواں کے متعلق چندے جمع کرے۔ یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ پنجاب میں پیروں کا کال نہیں۔ اس سرزمین نے تو نبی پیدا کر دیئے پیر کس گنتی میں ہے۔

یہ خط شیطان کی آنت ہوگیا۔ لکھنا کچھ چاہتا تھا لکھ کچھ گیا جو نہیں لکھا وہ سمجھ لو جو لکھا ہے وہ بھول جاؤ - تمہارا

مکرر یہ کہ خط کو جب دوبارہ پڑھنے بیٹھا تو تعجب ہؤا کہ یونہی رواروی میں کیا ایک لاجواب بات میرے قلم سے نکلی یعنی یہ خیال کر نسوانی تحریکوں کے متعلق پیروں سے کام لیا جائے۔ یہ لوگ واقعی بہت کام آ سکتے ہیں۔ کسی زمانے میں ان کے اردگرد عورتوں کے ٹھٹھ ہوتے تھے اگر کوئی زباں آور ساڑھی کسی مقبولِ عام پیر کو اپنا مرید کرے تو کئی نسوانی یونیورسٹیاں قائم ہو جائیں مگر تم سے یہ ذکر ہی فضول ہے۔ تم تو چاہتی ہو کہ طبقۂ اناث اپنی مدد خود آپ کر کے مردوں کو نیچا دکھائے اور دنیا پر یہ ثابت کرے کہ ہندوستان کی عورتیں مردوں سے کم ناقص العقل ہیں۔ تمہارا

سہ کر یہ کہ جس دن تمہاری یہ رائے کہ شادی ایک قسم کی خباثت ہے جس سے کسی شریف عورت کو سروست اس ملک میں مفر نہیں تبدیل ہو تو مجھے سب سے پہلے مطلع کرنا۔ ہاں اور مہربانی کر کے یہ بھی لکھنا کہ تم اس ملک میں پیدا کیوں ہوئیں؟

جواب

ڈیر مسٹر ـــــ

آپ کا خط کچھ ایسا ضروری تو نہیں کہ جواب جلدی تحریر کیا جائے مگر کیا آپ کے لئے یہ بہت تکلیف دہ امر ہے کہ آپ اپنے بیش قیمت مشورے بے طلب پیش نہ کیا کریں؟ یوں تو آپ کو بہت دانشمندی کا دعوےٰ ہے مگر نہ آپ میری گفتگو سمجھے نہ لوگوں کے اس پر بہتان۔

میں تو دل سے چاہتی ہوں کہ مردوں کی مجالس میں عورتوں کا ذکر شد ومد سے ہو۔ اس بات کی ہمیں ذرہ برابر بھی پروا نہیں کہ کتنے چینیاں ہونگی۔ کیا لوگ ابھی سے بھول گئے کہ وہ دن کچھ بہت پرانے نہیں ہوئے جب ہمارا ذکر ہی مفقود تھا۔ بہت کوئی کمبخت مجبور ہوتا تھا تو یوں ذکر کرتا تھا "گھر میں طبیعت اچھی نہیں"۔ مہربانی کر کے اپنے سب دوستوں سے ضرور کہئے کہ بیباک خاتونوں کی ایک فوج تیار ہو رہی ہے۔ اور یہ بات ذرا نمک مرچ لگا کر کہئے یعنی اس طرح کہ یورپ میں عورتوں نے مردوں کو وہ ناچ نہیں نچایا جو عنقریب ہندوستان میں رائج کیا جائے گا۔ ہاں اور یہ بات ذرا وضاحت سے کہئے کہ ہمارے آئندہ عظائم ان کے لئے نہیں جو ہمارے کھلم کھلا مخالف ہیں بلکہ اُن بزدل کنارہ کشوں کے لئے جن میں ہمارے دوست بننے کی ہمت نہیں صنفِ نازک کے سب سے بڑے دشمن وہی ہیں جو ہمیں نہایت رقت آمیز خلوص سے کہتے ہیں "بیویو ذرا سوچ کر قدم بڑھاؤ"۔ اور کیا لکھوں۔ کاش کہ آپ کسی زنانہ مدرسے کے تعلیم یافتہ ہوتے۔ پھر شاید آپ کے خط میں کچھ دلیری کی جھلک ہوتی۔

فلک پیما

*

گولکنڈے میں چند لمحے

اک شکستہ سنگِ در پر سرنگوں بیٹھا ہوں میں
سرحدِ احساس سے کوسوں نکل آیا ہوں میں

چھا رہا ہے ذرہ ذرہ پر اداسی کا گداز
وہ اداسی جس سے حاصل ہو دلوں کو سوز و ساز

جو دریچے کھول دے اگلے مناظر کے تمام
روح کو ایامِ رفتہ سے جو کر دے ہم کلام

نوکِ غم سے جو تخیل کی رگوں کو چھیڑ دے
نشترِ ماضی سے خوابیدہ دلوں کو چھیڑ دے

عہدِ پیشیں نے الٹ کر اپنے چہرے سے نقاب
اس لطافت سے سنایا مجھ کو ماضی کا رباب

گوش پیدا ہو گئے اگلے فسانوں کیلئے
چونک اُٹھا سامعہ پچھلے ترانوں کیلئے

ایک لمحے میں حجاباتِ نظر سب ہٹ گئے
مطلعِ اسرار کے تاریک بادل چھٹ گئے

یوں تو معمولی کھنڈر ہیں گر بظاہر دیکھئے
ہاں اگر گہری نظر سے یہ مناظر دیکھئے

ایک عالم پھر نظر آئے گا ان ذرات میں
واہمہ بھر دے گا ایسا رنگ محسوسات میں

جتنی دھندلی یادگاریں ہیں ابھر آئیں گی سب
مٹ گئے ہیں جو نشاں وہ بھی نظر آئیں گے سب

ان شکستہ پتھروں میں دفن ہے وہ داستاں
جس کا اک اک حرف ہے درسِ بصیرت کا جہاں

حسن کا گہوارہ تھی جس بزمِ رنگیں کی فضا
جس میں چلتی تھی سرور و کامرانی کی ہوا

نغمۂ عشرت اُٹھا جس کے در و دیوار سے
گونجتی تھی روز و شب جو ساز کی جھنکار سے

مدتوں جس میں رہی مصروفِ جنگِ خودسری
عشق کی جانبازیوں سے حسن کی افسوں گری

آج وہ نوحہ کناں ہے گردشِ ایام پر
عبرتیں منڈلا رہی ہیں اُس کے سقف و بام پر

پھر رہا ہے میری آنکھوں میں وہ تختِ زرنگار
جلوہ فرما جس پہ روز و شب تھا شاہوں کا وقار

شاہ بھی کیسے کہ جن کا دبدبہ رستم فگن
جن کی دارائی تھی ہیبت آفریں گردوں شکن

جن کے پائے خسروی پر خم تھا اک عالم کا سر
جن کی سطوت سے ہلے سینوں میں دل کانپے جگر

وقت کا سیلاب گو اُن کو بہا کر لے گیا
دہر کی آغوش سے اُن کو چھڑا کر لے گیا

زندگی پر گرچہ اُن کی پڑ گئے صدہا نقاب
کارنامے دفن ہیں اُن کے حجاب اندر حجاب

گو زمانہ کی کشاکش نے مٹا ڈالے نشاں
بُعد صدیوں کا ہے اب اُن کے ہمارے درمیاں

پھر بھی دنیا اُن کی ہستی محو کر دے کیا مجال
ہڈیاں مٹ جائیں لیکن اُن کا مٹ جانا محال

گردشیں کتنی ہی بدلے وقت کا موہوم جام
صفحۂ عالم پر اُن کا ثبت ہے نقشِ دوام!

ذوقی

غیر فانی انسان

بقا یہیں اور ابھی سے موجود ہے اور اس کا وجود قبر کی سرحد سے پرے کسی وہمی یا خیالی سرزمین میں نہیں یہ شعور کی ایک اعلیٰ اور روشن کیفیت ہے جس میں جسم کے احساسات، قلب کی متغیر اور ناسکوں شناس حالتیں اور زندگی کے حالات و واقعات ایک گزرتے ہوئے اور اس لئے ایک پُر فریب بادل کی طرح نظر آتے ہیں۔

بقا کا تعلق وقت سے نہیں ہے اور اس کا وجود ہمیں کبھی وقت میں نہ ملے گا۔ اس کا تعلق سرمدیت سے ہے اور جس طرح وقت اب اور یہاں ہے سرمدیت بھی اب اور یہاں موجود ہے، اور ایک انسان اِس سرمدیت کو ہر وقت حاصل کر سکتا اور اپنے آپ کو غیر فانی بنا سکتا ہے اگر وہ اُس نفس پر غلبہ پائے جو وقت کے اطمینان سوز اور فانی لمحوں سے زندگی حاصل کرتا رہتا ہے۔

جب تک کوئی شخص محسوسات، خواہشات اور شب و روز کی زندگی کے گزشتنی حادثات میں منہمک رہتا ہے، اور ان محسوسات، خواہشات اور رفتنی واقعات کو روحِ حیات جانتا ہے وہ بقا کا مفہوم نہیں سمجھ سکتا جو چیز اس نوع کا انسان چاہتا ہے اور جس کو وہ غلطی سے بقا خیال کرتا ہے در اصل "ثبات" ہے یعنی وقت کے دائرے کے اندر محسوسات و واقعات کا تسلسل۔ اُن چیزوں میں رہ کر اور ان سے دل لگا کر جو اُس کی وقتی خواہشات کو پورا کرتی اور تقویت دیتی ہیں اور اس سے بالاتر اور آزاد کیفیتِ شعور کا احساس نہ کر کے وہ اپنے قیام و استقلال کے لئے ترستا ہے، اور اس خیال کو اپنے دل سے مٹانے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے آخر کار اُس دنیاوی آرام و آسائش کو چھوڑنا پڑے گا جس کا وہ غلام ہو چکا ہے اور جسے وہ اپنے لئے ایک جزوِ لاینفک سمجھے ہوئے ہے۔

ثبات اور بقا دو متضاد باتیں ہیں اور ثبات کی تلاش میں کھو جانا موت کے ہم معنی ہے۔ اس کی فطرت ہی تغیر ہے، فنا ہے۔ یہ ایک مسلسل زیست اور موت ہے۔

جسم کی موت انسان کو کبھی غیر فانی نہیں بنا سکتی۔ روحیں اجسام سے کوئی مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ انہیں بھی اپنی پُر سوز و گداز شکستہ شعور زندگی کی منازل طے کرنی پڑتی ہیں اور تغیر اور فنا میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ فانی انسان جو اپنے عیش پسند وجود کے ثبات کے لئے سرگرداں رہتا ہے موت کے بعد بھی فانی رہتا ہے اور اسی قسم کی ایک زندگی بسر کرتا ہے جس کی ایک ابتدا اور ایک انتہا ہوتی ہے اور اسے گزشتہ اور آئندہ کا کوئی علم نہیں ہوتا۔

غیر فانی انسان وہ ہے جس نے اپنے آپ کو وقت کی قیود سے آزاد کرلیا ہے اور وہ شعور کے اُس بلند درجہ پر پہنچ گیا ہے جہاں تزلزل اور تغیر کا وجود نہیں ہے اور جہاں گزشتنی واقعات و احساسات اس پر اثر نہیں کرسکتے۔ انسانی زندگی واقعات کی ایک کبھی نہ تھمنے والی رَو ہے اور اس رو میں فانی انسان مل جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بہنے لگتا ہے اور اس بہاؤ میں اسے خبر تک نہیں ہوتی کہ پیچھے کیا ہے اور آگے کیا۔ غیر فانی انسان وہ ہے جو اس رو سے نکل جاتا ہے اور چپ چاپ الگ کھڑے ہوکر اس کا تماشا دیکھتا ہے، اور اپنی مقررہ جگہ سے آگے پیچھے سامنے اس متحرک شے کا معائنہ کرتا ہے جسے زندگی کہتے ہیں۔ وہ شخصیت کے احساسات اور چڑھاؤ اتار سے یا اُن بیرونی تغیرات سے جو زندگی کو وقت کے دائرے میں محدود کردیتے ہیں رشتہ توڑ کر اپنی قسمت اور دوسرے انسانوں اور قوموں کی قسمت کا ایک ایسا ناظر بن جاتا ہے جس پر کسی حادثہ کا اثر نہیں ہوتا۔

فانی انسان کی مثال ایک یہ بھی ہے کہ جیسے کوئی سو رہا ہو، اور وہ نہ جانتا ہو کہ وہ اس سے پہلے جاگ رہا تھا یا پھر جاگے گا۔ وہ بس ایک بے ہوش سونے والا ہے۔ غیر فانی انسان ایسا ہے جیسے کوئی نیند سے بیدار ہوچکا ہو، اور وہ جانتا ہو کہ اُس کا خواب کوئی حقیقتِ باقیہ نہیں تھا بلکہ ایک مٹنے والا سراب تھا۔

فانی انسان شعور کی وقتی اور دنیاوی کیفیت میں رہتا ہے جو شروع ہوتی ہے اور ختم ہوتی ہے۔ غیر فانی انسان ایک جاودانی اور آسمانی حالتِ شعور میں بستا ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اور جو ایک سرمدی اب ہے۔ ایسا انسان ہر تغیر کے ماتحت مضبوط و مستحکم رہتا ہے اور اُس کے جسم کی موت بھی اُس کے شعورِ بقا میں مخل نہیں ہوسکتی۔ ایسے ہی انسان کی نسبت کہا گیا ہے کہ "وہ موت کا ذائقہ نہ چکھے گا"، کیونکہ وہ موت کی ندی سے باہر نکل چکا ہے اور حقیقت کے مسکن کو اپنا مسکن بنا چکا ہے۔ اجسام، شخصیتیں، قومیں اور دنیائیں فنا ہوجاتی ہیں لیکن **حقیقت** باقی رہتی ہے اور اُس کی عظمت و شوکت کو وقت گھٹا نہیں سکتا۔ پس غیر فانی انسان وہ ہے جس نے اپنے نفس کو زیر کرلیا ہو، جو شخصیت کی خود پسند قوتوں کو مغلوب کرچکا ہو، لیکن جس نے ان قوتوں کو ایک استادانہ انداز سے سدھا لیا ہو، اور یوں اُس حقیقی توانائی سے اُن کا رشتہ مواصلت قائم کردیا ہو جو سب چیزوں کا منبع و مصدر ہے۔

زندگی کے غم و الم کی آگ بجھ چکی، شک اور خوف جاچکا، اور موت اُس کے لئے نہیں ہے جس نے اپنے دل و دماغ کو ابدی و سرمدی صداقتوں سے آشنا کرکے حقیقت کے نہ بجھنے والے نور کی جھلک کو دیکھ لیا۔

ایلن منصور احمد

نواہائے راز

آرزوئے اثر نہ ہو جائے
درد دل دردِ سر نہ ہو جائے

شبِ غم کی سحر نہ ہو جائے
زندگی مختصر نہ ہو جائے

آپ کا اہتمامِ پردہ کہیں
عشق کا پردہ در نہ ہو جائے

جوشِ سجدہ میں سر کہیں میرا
آپ کا سنگِ در نہ ہو جائے

حسن کی بدگمانیاں توبہ
عاشقی معتبر نہ ہو جائے!

نگہِ شوق اس قدر بھی نہ دیکھ
اُن کو اپنی خبر نہ ہو جائے

منزلِ دوست کا تمنائی
نقش سرِ رہگذر نہ ہو جائے

ضبطِ الفت کی تاب ہے مجھ میں
بدگماں تُو اگر نہ ہو جائے

میرے یمنِ قدم سے ویرانہ
کہیں ویرانہ تر نہ ہو جائے

سروری وہ اگر کرم نہ کرے
عیب میرا ہنر نہ ہو جائے

اکبر سروری لکھنوی

۲

کون ہوں میں کس کو میرا درد ہے
کون کرتا ہے مری غمخواریاں

کر رہا ہوں دیدۂ خونبار سے
دامنِ الفت پہ لالہ کاریاں

مٹ گئے نقش و نگارِ حسن سب
عشق کی باقی ہیں آہ و زاریاں

اے نگاہِ نازِ پروردِ حیا
کس سے سیکھیں تو نے عشوہ کاریاں

بڑھ گئیں کچھ اور غم کی شورشیں
ہیں قیامت آپ کی غمخواریاں

سرور اکبری لکھنوی

سُہراب

پہلا ایکٹ

پیران کا خیمہ

پیران تاتاری فوج کا سالار ایک قالین کے فرش پر آنکھیں بند کئے لیٹا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ ادھر اُدھر پڑے ہیں۔

سہراب داخل ہوتا ہے، پیران آہٹ پا کر بیدار ہو جاتا ہے۔

پیران (ایک ہاتھ کے سہارے اُٹھتے ہوئے) کون ہے؟ اور اس وقت یہاں کیوں آیا ہے؟ ابھی افق پر صبح کی سپیدی بھی اچھی طرح ظاہر نہیں ہوئی —— بول کوئی نئی خبر لایا ہے یا کسی خطرہ سے آگاہ کرنے آیا ہے؟

سہراب (کچھ اضطراب لہجہ میں) پیران گھبراؤ نہیں میں سُہراب ہوں۔ تم مجھے جانتے ہو۔

(سہراب، پیران کے قریب پہنچ جاتا ہے)

پیران (کسی قدر متفکرانہ انداز سے) سہراب تم ہو؟ میرے بچے اس وقت تم یہاں کیوں آئے ہو؟

سہراب۔ کیا بتاؤں پیران —— میں یہ سب جانتا ہوں کہ ابھی سورج نہیں نکلا، اور غنیم کی فوج پر بھی نیند موت کی طرح طاری ہے۔

پیران (محبت آمیز انداز سے) پھر تم کیوں نہیں سوئے؟

سہراب۔ ہاں میں نہیں سویا۔ پیران مجھے نیند نہیں آتی۔ رات بھر جاگتے اور کروٹیں بدلتے گزری ہے۔

پیران۔ کیوں؟ میرے بچے تم اس قدر بے چین کیوں ہو؟

سہراب۔ پیران میری بے چینی بے سبب نہیں۔ میں اس وقت ایک ضرورت سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔

پیران۔ کہو کیا بات ہے؟

سہراب۔ پیران، افراسیاب نے سمرقند میں مجھ سے چلتے وقت کہا تھا کہ میں تمہیں اپنے باپ کی طرح سمجھوں اور بیٹے کی طرح تمہاری خدمت اور حفاظت کروں، اور ہر معاملہ میں تم سے مشورہ کر لیا کروں، اس وقت ایک امر میں تمہارے

مشورہ کی ضرورت ہے۔

پیران۔ میرے بچے سہراب! مجھے اچھی تدبیر بتانے اور مفید مشورہ دینے میں کوئی عذر نہیں۔ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو بے تکلف کہو۔ میں بغور سننے کو تیار ہوں۔

سہراب۔ (پیران کے سامنے بیٹھتے ہوئے) تم جانتے ہو کہ جب آذربائیجان سے آکر میں پہلے پہل تاتاریوں میں شامل ہؤا اور ہتھیار اٹھائے اُس وقت سے آج تک میں نے شاہِ افراسیاب کی خدمت نہایت جانفشانی اور ایمانداری سے کی ہے اور میں نے اپنے لڑکپن کے زمانے ہی میں ایک جوان سورما کی سی شجاعت کا ثبوت دیا ہے۔

پیران۔ ہاں تمہاری دلیری شجاعت اور جوانمردی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

سہراب۔ اور پیران تم یہ بھی جانتے ہو کہ اب بھی جب کہ میں تاتاریوں کی فتح وظفر کا جھنڈا دنیا کے ہر گوشے میں اُٹھائے پھرتا ہوں، اور ایرانیوں کو ہر معرکہ میں شکست دیتا ہوں میں ایک آدمی کو تلاش کر رہا ہوں، پیران ایک آدمی کو۔ وہ رستم میرا باپ ہے، جو مجھے امید ہے کہ ایک دن ضرور اپنے شجاع اور جوانمرد بیٹے سے کسی میدانِ جنگ میں مل کر خوش ہو جائے گا۔ میں مدت سے اُس کی ملاقات کی تمنا میں آوارہ پھر رہا ہوں، لیکن آہ پیراؔن وہ مجھے کہیں نہیں ملتا۔

پیران۔ (متاثر ہو کر) سہراب کیا اسی لئے تم بے چین ہو؟ رستم سے ملنے کے لئے اتنے بے قرار ہو؟ —— ہاں تمہیں ضرور ہونا چاہئے —— مگر سہراب اس وقت اس قدر بے تاب اور پریشان نہ ہو۔ ابھی تمہیں غنیم کی فوج سے مقابلہ کرنا ہے۔ جنگ کے بعد دیکھا جائے گا۔ اگر تم اتنے بدحواس اور مضطرب رہو گے تو لڑائی کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا۔ سنتے ہو سہراب؟

سہراب۔ نہیں، پیران، ذرا غور سے سنو اور میری التجا کو فضول سمجھ کر نہ ٹھکراؤ —— آج دونوں فوجوں کو آرام کرنے دو لیکن میں اب یہ اعلان کرنے والا ہوں کہ ایران کے سب سے بہادر اور نامور سردار یکے بعد دیگرے تنِ تنہا مجھ سے مقابلہ کریں۔ اگر میں جیت گیا تو یقیناً رستم میری اس فتح کی خبر سنے گا —— اگر میں ہار جاؤں تو پیران پھر مجھے رستم کی تلاش اور اُس کا بیٹا بننے کی خواہش بھی نہ رہے گی —— مردے کسی کو اپنا رشتہ دار نہیں بنا سکتے۔ سنا تم نے؟ —— کیونکہ جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر ہوتی ہیں تو کسی ایک شخص کی شجاعت اور دلیری کا حال نہیں معلوم ہوتا اور بہت سے جوانمردوں کی شجاعت پر تاریکی کا پردہ پڑ جاتا ہے لیکن اکیلے لڑنے سے دلیری اور شجاعت کا مظاہرہ کامل طور پر ہو سکتا ہے۔

(پیران سہراب کا ہاتھ محبت سے پکڑ لیتا ہے)

پیران (آہ بھرتے ہوئے) تمہارے محبت سے لبریز سینے میں ایک سیماب کا دریا موجزن ہے جس سے تمہیں کسی پہلو قرار نہیں ملتا ـــــــ کیا تم تاتاری سرداروں میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتے؟ کیا تم ہماری فوجوں کے پہلو بہ پہلو لڑکر فتحمندی، اور دلیری کی شہرت حاصل نہیں کر سکتے؟ ـــــــ سہراب ہم سب کو تم سے محبت ہے تنہا لڑنے میں صرف اپنی اکیلی جان کا خطرہ ہوتا ہے اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ تمہاری اکیلی جان کو، تم جیسے جوانمرد اور ہر دلعزیز انسان کو خطرہ میں ڈال دیں۔

سہراب۔ پیران تم سچ کہہ رہے ہو۔ میں بھی اس خطرہ سے واقف ہوں، مگر میں اپنے دل کو کیا کروں۔ میں اپنے جذبات کو کس طرح ضبط کروں۔ وہ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں تنہا لڑوں ـــــــ اور مجھے یقین ہے پیران کہ اس طرح میں اپنے باپ کو ڈھونڈھ لوں گا۔

پیران۔ ایسے باپ کو جسے تم نے کبھی دیکھا تک نہیں ہے تم لڑائی اور جنگ میں تلاش کرنا چاہتے ہو، کیسے تعجب کی بات ہے! میرے لڑکے سہراب میں تمہاری بہتری اسی میں سمجھتا ہوں کہ تم قسمت پر بھروسا کر کے، جب تک جنگ جاری ہے، ہمارے ساتھ خیموں میں رہو، اور جب صلح ہو جاتے تو چل کر افراسیاب کے شہروں میں آرام کرو۔ لیکن اگر اپنے باپ رستم سے ملنے کی خواہش تمہیں چین سے نہ بیٹھنے دیتی ہو تو اُسے لڑائی اور جنگ میں تلاش نہ کرو اُسے امن وصلح کے وقت جاکر ڈھونڈو اور اس کی آغوش ـــــــ او سہراب اُس کی آرزومند آغوش سے ایک تندرست بیٹے کی طرح ملو۔

سہراب۔ پیران، یہ نہ کہو۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس لڑائی میں اپنے باپ کو پالوں گا۔ پیران، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم مجھے منع کر رہے ہو؟

پیران۔ تم نادان ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ رستم یہاں نہیں ہے ـــــــ وہ یہاں سے منزلوں دور ہے کیونکہ اب وہ زمانہ نہیں ہے جب میں جوان تھا اور وہ وقت نہیں ہے جب میں رستم کو ہر لڑائی میں سب سے آگے دیکھتا تھا، بلکہ اب وہ ان تمام لڑائی جھگڑوں سے دست کش ہو گیا ہے اور اپنے گھر، سیستان میں اپنے باپ کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ تمہیں وہیں ملے گا۔

(سہراب سر اٹھا کر پیران کو اس انداز سے دیکھتا ہے جس سے انکار کا اظہار ہو)

پیران۔ سہراب (آہ سرد بھرتے ہوئے) میرا دل ڈرتا ہے۔ مجھے خوف معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ میں موت یا کوئی خطرہ ضرور تمہارے لئے موجود ہے۔

سہراب (بہ اضطراب ظاہر) پیران ـــــ پیران کیا کہہ رہے ہو؟ سہراب کو موت اور خطرات سے ڈر نہیں لگتا۔

پیران۔ سہراب تم نہ ڈرو، مگر مجھے ضرور خوف معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں محفوظ اور اچھا دیکھ کر ہم سب بہت خوش ہونگے خواہ تم ہم سے جدا ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ ہم تمہیں نہایت مسرت سے صلح کے بعد اپنے باپ کی تلاش کے لئے روانہ کردیں گے، لیکن اس جنگ کے وقت نہیں۔ سہراب اپنے باپ کو تنہا لڑائی میں پالینے کی بے کار کوشش نہ کرو۔

سہراب (سراٹھا کر پیران کو ملتجی انداز سے دیکھ کر) پیران ـــــ ؟

پیران۔ تم نہیں مانتے؟ ہاں شیر کے بچے کو گرجنے سے کون منع کرسکتا ہے۔ اور رستم کے بیٹے پر کون فتح پا سکتا ہے؟ سہراب میرے بچے رنجیدہ نہ ہو۔ جاؤ آرام کرو۔ جو تم چاہتے ہو وہی ہوگا۔

سہراب۔ پیران میں تمہاری اس عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(پیران سہراب کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ سہراب آہستہ آہستہ خیمہ سے نکل کر چلا جاتا ہے۔ پیران بستر سے اٹھتا ہے اور ادنی کپڑے پہن لیتا ہے۔ آواز دیتا ہے۔ ایلچی حاضر ہوتا ہے اور پیران اپنا عصائے حکومت لے کر اس کے ہمراہ خیمہ سے باہر چلا جاتا ہے)

دوسرا ایکٹ

رستم کا سرخ خیمہ

رستم کھانے سے فارغ ہوکر دسترخوان ہی پر بیٹھا ہے۔ دسترخوان پر ایک طرف ہرن کے کباب اور روٹیاں ہیں اور دوسری طرف بہت بڑے بڑے شوخ سبز رنگ کے تربوز رکھے ہیں۔ رستم کے ہاتھ پر ایک باز بیٹھا ہے اور وہ اس سے کھیل رہا ہے۔

(گودرز ایرانی فوج کا ایک اعلیٰ سردار خیمہ میں داخل ہوتا ہے۔ رستم باز کو علیحدہ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ گودرز کے پاس آتا ہے اور اس سے مصافحہ کرتا ہے)

رستم۔ خوش آمدید۔ میری آنکھیں اس سے زیادہ خوشگوار منظر اور کیا دیکھ سکتی تھیں کہ وہ تمہیں دیکھ رہی ہیں۔ کہو گودرز کیا خبر لائے ہو، لیکن پہلے بیٹھ جاؤ، کچھ کھاؤ کچھ پیو۔

(گودرز خیمے کے دروازے ہی پر کھڑا رہتا ہے)

گودرز۔ ابھی نہیں۔ رستم! کھانے پینے کے لئے ایک دن ضرور آئے گا لیکن آج نہیں۔

رستم (کسی قدر استعجاب سے) کیوں گودرز آج کیوں نہیں ؟

گودرز۔ آج ہم کو کچھ اور کرنا ہے۔

رستم۔ کوئی مہم درپیش ہے؟

گودرز۔ ہاں مہم درپیش ہے۔ رستم بہت بڑی مہم۔ تاتاری اور ایرانی فوجیں میدانِ جنگ میں آمنے سامنے ڈیرے ڈالے پڑی ہیں۔ تاتاریوں نے یہ دعویٰ پیش کیا ہے کہ ایرانی سرداروں میں سب سے بہادر سردار منتخب کئے جائیں جو تاتاریوں کے نوجوان اور ممتاز عالم ہیرو سے تنِ تنہا مقابلہ کریں ——— اور تم اس کا نام جانتے ہو لوگ اسے سہراب کہتے ہیں۔

رستم۔ سہراب؟ ——— سہراب؟ ہاں میں نے یہ نام سنا ہے ——— مجھے اس کی دلیری اور شہرت کا حال بھی معلوم ہوا ہے۔ مگر گودرز یہ سہراب کس کا بیٹا ہے۔

گودرز۔ مجھے معلوم نہیں۔ اس کی پیدائش ایک راز ہے جس سے تمام ایرانی سردار بھی ناواقف ہیں۔ رستم تمہاری طاقت کی طرح اس میں بھی بلا کی قوت ہے، اس کی ٹانگوں میں صحرائی بارہ سنگھے کی سی تیزی ہے اس کا دل شیروں کے مانند ہے اور وہ بالکل جوان ہے ——— ایرانی سردار سب ضعیف اور کمزور ہیں اور اس لئے اب سب کی آنکھیں تمہاری طرف لگ رہی ہیں۔ رستم تم چل کر ہماری مدد کرو۔ ورنہ ہم کو اس جنگ میں فتح نصیب نہ ہوگی

رستم (ایک ہلکے تبسم سے) جاؤ گودرز! اگر ایرانی سردار بڈھے ہیں تو میں ان سے زیادہ ضعیف ہوں۔ اگر جوان سردار کمزور ہیں تو کوئی ہرج نہیں۔ خود بادشاہ بڑی جوانمردی سے لڑتا ہے۔ بادشاہ کیخسرو خود جوان ہے اور جوانوں کی قدر و عزت کرتا ہے۔ گودرز اُس سے جاکر کہو۔

گودرز (مصنوعی انکسار کے ساتھ) نہیں رستم انکار نہ کرو۔ ہماری آخری امیدیں اب صرف تم اور تمہاری ذات سے وابستہ ہیں۔ ہماری امیدوں کا خون نہ کرو۔

رستم۔ (بہ اندازِ تمکنت) گودرز میں سب جانتا ہوں۔ اب زیادہ باتیں بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کیخسرو کی حالت، وہ اب صرف جوانوں کا زیادہ خیال کرتا ہے، رستم کے لئے اب اُس کے سینے میں کوئی احترام اور محبت باقی نہیں۔ وہ صرف جوان سرداروں کا طالب ہے اور جوان سردار ہی سہراب کے مقابلہ پر جائیں گے میں نہ جاؤنگا

گودرز۔ رستم، رستم۔ تم اب پہلے سے رستم نہیں معلوم ہوتے ہمیں تمہارے اخلاق اور تمہاری جرأت سے ہرگز یہ امید نہ تھی

ہمیں ایسے سخت الفاظ تمہاری زبان سے سننے کا گمان بھی نہ تھا۔

رستم۔ گمان نہیں تھا تو میں اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا۔ گودرز مجھے اس کی فکر بھی نہیں ہے کہ سہراب ایک نہایت دلیر اور بہادر جوان ہے ـــــ آہ میری تو یہ تمنا ہے کہ کاش سہراب جیسا میرا کوئی لڑکا ہوتا ـــــ آہ ایک ایسا بہادر، شجاع اور ممتازِ عالم لڑکا جسے میں جنگ پر بھیجتا۔ اور وہ بدبخت لڑکی نہیں جو گھر میں پڑی ہوئی ہے اور میں اپنے نحیف و نزار، سفید سر والے باپ کے ساتھ مکان پر رہتا ـــــ میں اپنے عزیز باپ کے ساتھ جس کے بھیڑ بکری کے گلوں کو افغانی ڈاکو بھگا لے جاتے ہیں اور جسے لوگ ستاتے رہتے ہیں اسی باپ کے ہمراہ سیستان میں آرام کرتا۔ اور اس کی حفاظت کرتا کیونکہ وہ اب اکیلا ہے، اور کوئی اس کے پاس نہیں جو اسے ڈاکوؤں کی ایذا رسانی سے بچا سکے۔

گودرز۔ ہاں یہ درست ہے لیکن رستم، اس جنگ کے بعد تم چلے جانا۔ اس وقت ضرور ہماری مدد کرو۔

رستم۔ نہیں اب میں کسی جنگ میں حصہ نہ لوں گا۔ میں سیستان چلا جاؤں گا، اپنا زرہ بکتر اتار کر رکھ دوں گا اور صرف اپنی شہرت اور اپنے نام سے اپنے بڈھے باپ زال کی حفاظت کروں گا جو مال او رخزانے میں نے جمع کئے ہیں انہیں اطمینان سے گھر میں بیٹھ کر صرف کروں گا ـــــ سہراب کی دلیری اور بہادری کے راگ سنا کروں گا اور احسان فراموش بادشاہ کی فوج کو موت کے گھاٹ اترتے ہوئے دیکھ کر ذرا بھی رنج اور افسوس نہ کروں گا ـــــ گودرز گودرز تم جاؤ اور کیخسرو سے کہو۔ وہ جا کر سہراب کا مقابلہ کرے میں اب ان خونی ہاتھوں سے (دونوں ہاتھ گودرز کی طرف اٹھا کر) کبھی تلوار نہ اُٹھاؤں گا۔

(رستم مسکرانے لگتا ہے)

گودرز (طعن آمیز لہجے میں) رستم تمہارا خیال بجا ہے۔ تم اپنے نقطۂ نظر سے سب کچھ ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مگر رستم دنیا کی طرف بھی دیکھو۔ سہراب نے ہماری فوج کے سب سے بہادر شخص سے مقابلہ کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ اُسے سب سے زیادہ تم سے لڑنے کی خواہش ہے اور وہ صرف تمہاری تلاش میں پھر رہا ہے جب لوگ دیکھیں گے کہ رستم سہراب کے مقابلہ سے منہ چھپاتا ہے تو وہ کیا کہیں گے؟

رستم۔ (کسی قدر برہم ہو کر) گودرز کیا کہیں گے؟ رستم کی شان کے خلاف کوئی ایک لفظ زبان سے نہیں نکال سکتا۔ اس نے اپنے حیرتناک کارناموں سے بچے بچے کو اپنا مدح خواں اور گرویدہ بنا لیا ہے ـــــ گودرز دنیا نے جس زبان سے میری تعریف کے راگ گائے میری شجاعت اور طاقت کے تذکرے کئے، کیا اسی زبان سے اب مجھے بُرا بزدل اور کمزور بھی کہے گی؟

گودرز۔ تم جہاں دیدہ آدمی ہو۔ رستم تم سے میں کیا کہہ سکتا ہوں، لیکن یہ وقت ایسا ہی نازک آپڑا ہے کہ تم اس مرتبہ نہ گئے تو لوگ ضرور کہیں گے کہ رستم نے ایک بخیل کی طرح اپنی شہرت اور ناموری کو محفوظ کرلیا ہے اور وہ اب اُس کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

رستم۔ (نہایت غصہ میں آکر) گودرز تو ایسی باتیں کیوں اپنی زبان سے نکال رہا ہے۔ تو ان سے بہتر الفاظ جانتا ہے اور کہہ سکتا ہے۔ میرے سامنے ایک یا بہت، کم یا زیادہ، مشہور یا گمنام، شجاع یا بزدل، جوان یا بڈھا، کسی کی کوئی حقیقت نہیں، کیا وہ مرنے والے نہیں ہیں؟ کیا میں وہی رستم نہیں ہوں جس نے اُن جیسے سینکڑوں اور بے شمار انسانوں کو شکست دے کر تہِ تیغ کیا۔ (لہجہ بدلتے ہوئے) لیکن احسان فراموش بادشاہ کے لئے کون مفت اپنا سر کھپائے۔

گودرز۔ یہ میں مانتا ہوں کہ کیخسرو نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ لیکن رستم اس وقت کوئی حقیقت کو جاننے کی کوشش نہ کرے گا، بلکہ سب تمہاری بزدلی پر ہی لعنت ملامت کریں گے۔

رستم۔ (غصہ سے) اچھا جا گودرز اور دیکھ رستم کس بخیل کی طرح اپنی شہرت کو پوشیدہ رکھتا ہے ——— سن میں گمنام بن کر لڑوں گا اور سادہ زرہ بکتر پہن کر، تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ رستم ایک نوجوان سے تنِ تنہا لڑا ——— جا گودرز اور میرا انتظار کر۔

(گودرز وہاں سے شادان و فرحاں چلا جاتا ہے۔

رستم تالی بجاتا ہے۔ دو ملازم داخل ہوتے ہیں اور رستم کو ایک سادہ زرہ بکتر پہنا دیتے ہیں۔ اور خود میں ایک طرہ بھی لگا دیتے ہیں۔

رستم خیمے سے باہر نکل جاتا ہے)

تیسرا ایکٹ

دریائے آمور کے کنارے ایرانی اور تاتاری فوجوں کے خیمے نظر آرہے ہیں۔ تاتاری فوج داہنی جانب اور ایرانی فوج بائیں جانب صف بستہ کھڑی ہے

بیچ میدان میں سہراب اپنے گھوڑے پر استادہ ہے رستم خیمے سے نکل کر آہستہ آہستہ آتا ہے اور سہراب کے قریب پہنچ جاتا ہے اور سہراب کو نہایت متحیر و معنی خیز نگاہوں سے تکنے لگتا ہے۔

تھوڑا عرصہ گذر جاتا ہے۔

رستم (اپنا ایک ہاتھ سہراب کی طرف اُٹھاتے ہوئے رحم کے انداز سے) اے جوان انسان، زندگی بہت زیادہ خوشگوار، پُر لطف اور آرام دہ ہے۔ لیکن موت بے حد خوفناک، خونی اور تکلیف دہ چیز ہے۔ سوچ لے کہ زندگی موت سے بہتر ہے!

سہراب۔ ہاں، اے جسیم انسان! تُو سچ کہتا ہے، مگر اس سے تیرا کیا مطلب ہے؟

رستم۔ میرا مطلب پوچھتا ہے؟ پہلے مجھے دیکھ کہ میں کس قدر قوی ہیکل، اور کتنا طاقتور اور جسیم انسان ہوں۔ میرا تمام جسم فولادی زرہ بکتر سے ڈھکا ہؤا ہے میں بے انتہا خونی جنگوں میں حصہ لے چکا ہوں اور میں نے بے شمار دشمنوں کو موت کا راستہ دکھا دیا ہے۔ کبھی نہ کوئی دشمن مجھ سے بچ کر جا سکا اور نہ کبھی کسی نے مجھے شکست دی، اے سہراب! پھر تو کیوں اپنے آپ کو موت کے منہ میں گرانا چاہتا ہے؟ تاتاری فوج سے نکل کر تو میرے ساتھ ایران چل اور میرا لڑکا بن کر میرے ساتھ رہ، اور میرے جھنڈے کے نیچے رہ کر میری موت تک لڑتا رہ۔ تیری طرح کا بہادر اور دلیر جوان ایران میں ایک بھی نہیں ہے۔

(سہراب رستم کے دیو جیسے جسم کو متحیر نگاہوں سے دیکھتا رہتا ہے اور خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہتا ہے پھر وہ دوڑ کر رستم کے پاس آتا ہے اُس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے اور اُس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ارمان بھری نگاہوں سے رستم کو دیکھنے لگتا ہے)

سہراب۔ (محبت آمیز لہجہ میں) آہ تمہیں اپنے باپ کی قسم، تمہیں اپنی جان کی قسم، سچ بتاؤ کیا تم رستم نہیں ہو۔ بولو، کیا تم وہ نہیں ہو۔؟

رستم (مشکوک نگاہوں سے سہراب کو دیکھنے لگتا ہے (دور ہٹ کر دل میں) ہاں میں سمجھ گیا اس جوان کی مکاری کو اگر میں کہہ دوں کہ رستم میں ہی ہوں تو یہ لڑنے سے انکار کر دے گا اور تاتار جا کر شیخی مارے گا کہ میرے دعوے پر صرف رستم ہی آیا اور کسی میں جرأت نہ ہوئی، اور یہ کہ میں نے اس سے صلح کر لی۔ اس سے ایرانی فوج کی کتنی بڑی بدنامی ہوگی (سہراب سے مخاطب ہو کر سخت لہجہ میں) او جوان لڑکے تو رستم کے متعلق کیوں فضول سوالات کرتا ہے۔ میں یہاں تیرے سامنے موجود ہوں، اور تیرے دعوے پر تیرے مقابلے کو آیا ہوں۔ مجھ سے مقابلہ کر یا شکست کا اقبال کر لے ـــــ کیا تو صرف رستم سے لڑنا چاہتا ہے؟

سہراب۔ ہاں صرف رستم سے۔

رستم۔ (برہم ہو کر) او شریر لڑکے! لوگ رستم کے چہرے کو دیکھ کر خوف کھاتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ مجھے

اچھی طرح معلوم ہے کہ آج رستم تیرے سامنے موجود ہوتا اور تجھے معلوم ہوجاتا کہ رستم یہی ہے تو تُو ہرگز لڑنے کا خیال نہ کرتا۔ تو اُن باتوں کو اپنے دل پر نقش کرلے۔ آج تو اپنی بہادری اور شیخی کو برقرار رکھے گا، یا شکست کھائے گا اور تیری ہڈیاں اس ریت کے ذروں میں مل کر ناپید ہو جائیں گی۔ یا دریائے آمور کے طوفان انہیں بہالے جائینگے؟

سہراب۔ (دلیرانہ لہجہ میں) کیا تُو اس قدر خوفناک ہے؟ نہیں لیکن تیری ان دھمکیوں سے میں ڈرنے والا نہیں ہوں۔ میں کوئی لڑکی نہیں کہ صرف تیری باتوں سے خوفزدہ ہوجاؤں مگرہاں یہ تُو سچ کہتا ہے کہ اگر رستم اس وقت موجود ہوتا تو یہ لڑائی ہرگز نہ ہوتی ـــــ لیکن آہ رستم یہاں سے کوسوں دور ہے اور ہم دونوں یہاں ایک دوسرے کے مقابلہ پر موجود ہیں۔ تو اب لڑنے کو تیار ہوجا۔ میں جانتا ہوں کہ میں ایک ناتجربہ کار اور جوان آدمی ہوں اور تو مجھ سے بہت زیادہ طاقتور، دیو جثہ اور خوفناک انسان ہے۔ تو مجھ سے بہت تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہے لیکن فتح اور شکست خدا کے قابو میں ہیں۔ گو تجھے یقین ہے کہ میں ضرور ہار جاؤں گا لیکن یہ تو بالکل یقینی طور سے نہیں جان سکتا کیونکہ ہم دونوں قسمت کے سمندر میں تیر رہے ہیں اور ایسی موجوں کی سطح پر ہیں کہ ہمیں خبر نہیں وہ کس طرف جائینگی دائیں یا بائیں۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ ہمیں خشکی پر لے جاکر ڈال دیں گی یا سمندر کے اندر بہت دور سمندر کے اندر موت کے گھاٹ کے قریب گھسیٹ کر لے جائیں گی۔ ہم نہیں جانتے اور کوئی ہمیں نہیں بتا سکتا صرف واقعات سے ہم انجام کا پتہ لگا سکتے ہیں

(رستم یہ سن کر اپنا بھالا سہراب پر مارتا ہے سہراب فوراً ہٹ جاتا ہے اور بھالا زمین پر گر پڑتا ہے۔
سہراب اپنے بھالے سے رستم پر وار کرتا ہے لیکن وہ رستم کی ڈھال میں پھنس کر ٹوٹ جاتا ہے۔
رستم اپنا بہت بھاری گرز، جسے صرف وہی اٹھا سکتا ہے اٹھالیتا ہے اور سہراب پر حملہ کرتا ہے۔
سہراب اس وار کو بھی خالی جانے دیتا ہے گرز زمین پر گر پڑتا ہے اور اس کے جھونک میں رستم بھی زمین پر آجاتا ہے۔ سہراب پیچھے ہٹ کر متبسم انداز سے رستم کو دیکھنے لگتا ہے۔

(رستم سے مخاطب ہوکر) تو نے اے طاقتور انسان بہت خوفناک حملہ کیا تھا تیرا گرز میری کمر اور ہڈیوں کو پیسنے کی بجائے اب دریائے آمور میں بہتا ہوا نظر آئے گا، لیکن اب تو اُٹھ اور غصہ نہ ہو، کیونکہ میں بھی برہم نہیں ہوں ـــــ آہ جب میں تجھے دیکھتا ہوں تو غصہ میرے سینے سے یک لخت مٹ جاتا ہے ـــــ تو کہتا ہے کہ تو رستم نہیں ہے۔ خیر ایسا ہی سہی ـــــ لیکن پھر تو کون ہے جس کی طرف میرا دل آپ ہی آپ کھنچا جاتا ہے میں لڑکا ہوں مگر میں نے بھی جنگ آزمائی کی ہے، میں بھی خون کی ندیوں میں چلا ہوں، میں نے بھی زخمیوں کی

چیخ و پکار سنی ہے، لیکن آج سے قبل کبھی میرے دل میں رحم کا احساس نہیں ہوا، نہ مجھے کبھی کسی دشمن پر ترس آیا کیا یہ کیفیتیں قدرتاً میرے دل میں پیدا ہوگئی ہیں؟ —— اے بڈھے بہادر انسان ہمیں اب انجام کو خدا کے حوالے کر دینا چاہیئے —— آ اب ہم اپنے خونی بھالے یہاں ریت میں گاڑ دیں۔ اور آپس میں صلح کر لیں۔ اس ریت پر بیٹھ جائیں اور دوستوں کی طرح ایک دوسرے کی صحت کا جام نوش کریں۔ اور تو مجھ سے رُستم کی شجاعت کے تذکرے کر۔ ایرانی فوج میں کافی سردار ہیں جن سے میں لڑ سکتا ہوں، ان کو مار سکتا ہوں اور مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی، مگر ہم دونوں کو آپس میں صلح کر لینی چاہیئے۔

(سہراب چپ ہو جاتا ہے۔ رستم کھڑا ہو جاتا ہے اور غصہ سے تھر تھر کانپنے لگتا ہے اور اپنا برچھا سنبھال لیتا ہے)

رستم۔ (غصہ سے چلا کر) او مکار لڑکی صرف تیری ٹانگوں میں رقص کرنے والی چھوکریوں کی سی تیزی اور نزاکت ہے، تیرے بازوؤں میں کوئی قوت نہیں۔ تُو صرف ایک معشوقہ، ایک رقاصہ اور ایک باتونی چنچل عورت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا —— آ میرے سامنے اب میں تیری نفرت انگیز آواز سننا نہیں چاہتا تو اس وقت افراسیاب کے باغ میں، حسین تاتاری لڑکیوں کے ساتھ نہیں ہے جس کا تو عادی ہے۔ بلکہ دریائے آمور کی ریت پر، لڑائی کے رقص میں مصروف ہے اور میرے ساتھ، جو لڑائی کو کھیل نہیں سمجھتا —— مجھ سے اب زیادہ صلح و شراب کا تذکرہ مت کر، تو اب جنگ کے تمام فنون اچھی طرح یاد کرلے، اور اپنی تمام جرات اور دلیری سے میرا مقابلہ کر۔ میرے دل میں تیرے لئے جو رحم اور درد تھا سب جاتا رہا، کیونکہ تو نے مجھے اپنی عیاریوں اور لڑکیوں کی سی مکاریوں سے دونوں فوجوں کے سامنے ذلیل کیا ہے۔

(سہراب رستم کی اس توہین اور طعن آمیز تقریر کو سن کر اپنی تلوار میان سے کھینچ لیتا ہے۔

رستم اور سہراب ایک دوسرے پر اس طرح حملہ کرتے ہیں جیسے دو گرسنہ عقاب کسی ایک شکار پر جھپٹیں دونوں کی تلواروں اور زرہوں کی جھنکاریں فضا میں گونجنے لگتی ہیں۔

لڑائی کا منظر اس قدر خوفناک ہو جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے سورج اور ستارے بھی اس میں شریک ہیں۔

یکایک آسمان پر بادل چھا جاتا ہے۔ بہت اندھیرا ہو جاتا ہے اور آندھی کے طوفان زور زور سے چلنے لگتے ہیں آندھی میں رستم اور سہراب چھپ جاتے ہیں)

رستم (زور سے چلا کر) رستم رستم۔

(رستم کا نام سن کر سہراب پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ رستم کو غور سے دیکھنے لگتا ہے اور اپنی تلوار اور ڈھال پھینک دیتا ہے،

رستم کا برچھا اُس کے سینے میں پیوست ہو جاتا ہے اور سہراب زخمی ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد آندھی بند ہو جاتی اور آسمان بھی صاف ہو جاتا ہے)

رستم۔ (نفرت انگیز تبسّم سے) سہراب تیرا خیال تھا کہ آج تو ایک ایرانی سردار کو شکست دے کر قتل کر ڈالے گا، اور افراسیاب کے خیموں میں جا کر اپنی بڑائی کا تذکرہ کرے گا۔ تیرا خیال تھا کہ خود رستم تجھ سے لڑنے آئے گا، اور تیری مکاریاں ایک تحفہ قبول کرنے پر اُسے مجبور کر دیں گی اور وہ تجھے یوں ہی چلا جانے دے گا۔ اور پھر تمام تاتاری فوجیں تیری اس شجاعت کی تعریف کریں گی اور تیری شہرت تمام دنیا میں پھیل جائے گی اور اس طرح تُو اپنے ضعیف باپ کو بے حد مسرور کر سکے گا۔ بیوقوف لڑکے اس وقت ایک گمنام شخص نے تجھے شکست دے کر زخمی کیا ہے اور اب تو اپنے باپ اور رشتہ داروں کو عزیز ہونے کی بجائے بھیڑیوں اور درندوں کی غذا بنے گا۔

سہراب۔ (اطمینان کے ساتھ) تُو ایک گمنام انسان سہی لیکن تیری یہ تمکنت اور شیخی فضول ہے۔ اے مغرور شخص "تُو" نے مجھے قتل نہیں کیا بلکہ "رستم" کے نام نے مجھے زخمی کیا ہے۔ اور اِس باپ کی محبت سے بھرے ہوئے دل" نے۔ اگر میں تجھ جیسے دس آدمیوں سے بھی مقابلہ کرتا تو وہ سب یہاں مردہ پڑے ہوتے اور میں تیری جگہ پر کھڑا ہوتا لیکن آہ اس پیارے نام نے مجھے ساکت کر دیا، اور میرے ہوش و حواس گم کر دیئے۔ میری سانسیں روک لیں۔ وہ نام ——— اور کوئی اَن دیکھی چیز جو تجھ میں ہے ——— میں اعتراف کرتا ہوں ——— کوئی ان دیکھی چیز جو ہر وقت میرے دل کو بے قرار رکھتی ہے اُسی نے مجھے ڈھال اور تلوار پھینک دینے پر مجبور کیا، اور تیرا برچھا ایک غیر محفوظ انسان کے قلب میں پیوست ہو گیا۔ اب تو شیخی مار رہا ہے اور میری قسمت پر ہنس رہا ہے، لیکن او خوفناک انسان سن اور اپنے کانوں سے سن اور سن کر کانپ اٹھ کہ رستم میری موت کا انتقام تجھ سے ضرور لے گا۔ رستم میرا باپ، جسے میں تمام دنیا میں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ وہ اپنے بیٹے کی اس موت کا بدلہ تجھ سے ضرور لے گا اور اچھی طرح تیری سرزنش کرے گا۔

(رستم سہراب کی باتیں سن کر قدرے متحیر ہو جاتا ہے اور اس راز کو نہ جانتے ہوئے خاموشی سے دیکھتا رہتا ہے)

رستم (سخت اور کرخت لہجہ میں) یہ باپ اور انتقام کا کیا فضول تذکرہ ہے۔ رستم کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔

سہراب:۔ (نحیف آواز میں) آہ ——— ہاں اُس کا ایک بیٹا تھا اور میں وہی کھویا ہوا بیٹا ہوں۔ یقیناً ایک روز یہ خبر

اس کے کانوں تک بھی پہنچ جائے گی۔ وہیں جہاں وہ اس وقت بیٹھا اطمینان سے دن گذار رہا ہے۔ کسی جگہ ـــــ معلوم نہیں کہاں ـــــ لیکن یہاں سے منزلوں دور ـــــ اور یہ اُس کے دل میں تیر کی طرح جاکر لگے گی ـــــ یہ خبر سن کر وہ تڑپ اُٹھے گا، اور تجھ سے انتقام لینے کا فلک شگاف نعرہ مارنے لگے گا ـــــ اے خوفناک انسان ـــ خیال کر، صرف ایک ہی بیٹے کے لئے، اُس کا غم کس قدر محشر خیز اور اس کا انتقام کتنا آسمان کو لرزہ براندام کرنے والا ہوگا ـــــ آہ کاش میں اُس کے اس غم کو دیکھنے تک زندہ رہ سکتا ـــــ تاہم مجھے اپنے باپ کے غم والم کا اتنا خیال نہیں جتنا ماں کا۔ میری بیچاری ماں، جو اپنے ضعیف باپ کے ساتھ جو کرد پر حکمرانی کرتا ہے آذر بائیجان میں رہتی ہے ـــــ ہاں اسی ماں پر مجھے بہت ترس آتا ہے، اُس کی مجبور حالت پر، جواب اپنے بیٹے سہراب کو تاتاری فوج سے مع مال و متاع اور وقعت و احترام کے ساتھ دوبارہ لوٹتے ہوئے نہ پائے گی ـــــ ایک غمناک خبر، ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں پھیلتی رہے گی اور آخر کار اس کے کانوں میں بھی پڑے گی اور تب اس بیچاری عورت کو معلوم ہوگا کہ اب سہراب اس کی آنکھوں کو روشن کرنے کے لئے کبھی واپس نہ آئے گا، بلکہ ایک گمنام انسان سے لڑائی میں ہار کر دریائے آمو کے کنارے زخمی پڑا ہے۔

(سہراب چپ ہو جاتا ہے اور اپنی موت اور ماں کی مفارقت کا خیال کرکے رونے لگتا ہے

رستم غور سے اس کو دیکھتا رہتا ہے اور ایک گہرے خیال میں ڈوب جاتا ہے کیونکہ آذر بائیجان سے اُس کو ایک لڑکی پیدا ہونے کی خبر آئی تھی۔

سہراب کی موجودہ حسرتناک زندگی اور حالت دیکھ کر اس کی نگاہوں میں اپنے خسر کی محبت، اس کے محل اور اپنی پُرلطف زندگی کا منظر سما جاتا ہے۔ وہ نہایت بے تابی سے سہراب کو دیکھنے لگتا ہے اور اب اس کے قلب میں ایک انتہائی غم کا سمندر اُبلنے لگتا ہے)

رستم۔ (دردآگین لہجہ میں) سہراب درحقیقت تو ایسا ہی لڑکا ہے جیسے رستم بہت پیار کرتا ـــــ کاش تُو اس کا لڑکا ہوتا ـــــ تاہم اس وقت تو اپنے آپ کو رستم کا بیٹا بتلا رہا ہے سہراب تجھے لوگوں نے غلط باور کرا دیا ہے ـــــ تُو رستم کا بیٹا نہیں ہے۔ کیونکہ رستم صرف ایک کمزور لڑکی کا باپ ہے، جو اب اپنی ماں کے ساتھ نسوانی زندگی اور خانہ داری کے کاروبار میں مصروف ہوگی۔

(سہراب رستم کی باتیں سن کر برافروختہ ہو جاتا ہے اور اُس کی تکلیف میں اضافہ ہو جاتا ہے وہ اپنے جسم سے برچھا نکالنے کا ارادہ کرتا ہے تاکہ خون آسانی سے بہ جائے اور اس کی روح بھی عالمِ بالا کی طرف صعود کر جائے)

سہراب (خود سے ایک ہاتھ کے سہارے اُٹھتے ہوئے) لیکن میں مرنے سے پہلے اپنے دشمن کے سامنے اپنے آپ کو رستم کا بیٹا ثابت کردوں گا (رستم سے مخاطب ہوکر) آہ تو کون ہے جو میری باتوں کو جھوٹ سمجھتا ہے۔ایک مرنے والے انسان کی زبان سے سچے الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا اور میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔میں تجھ سے کہتا ہوں کہ میرے اس بازو پر رستم کی وہ مہر لگی ہوئی ہے جو اُس نے میری ماں کو یہ کہتے ہوئے دی تھی کہ جب کوئی بچہ پیدا ہو تو یہ اُس کے بازو پر ثبت کردے۔

(رستم سہراب کے ان الفاظ کو سن کر بیتاب ہوجاتا ہے۔اور اس کی ٹانگوں اور عام اعضا میں ایک رتعاش پیدا ہوجاتا ہے۔

وہ اپنے زرہ بکتر سے ملفوف ہاتھوں کو اپنے سینے پر مارنے لگتا ہے جس سے ایک نہایت پُرسوز گونج پیدا ہوتی ہے۔وہ اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے اپنے دل کو اس طرح ملنے لگتا ہے جیسے کوئی اس کی روح اس کے جسم سے کھینچ رہا ہو)

رستم (انتہائی حسرت و یاس کے لہجہ میں) سہراب یہ ایک ایسا ثبوت ہے جس میں شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں اگر تو وہ مہر دکھا دے تو یقیناً تو رستم کا بیٹا ہے۔

(سہراب آہستہ آہستہ اپنا بازو کھولتا ہے اور کندھے کے قریب بازو پر لگی ہوئی رستم کی مہر، رستم کو دکھاتا ہے اور پھر اسے حسرتناک نگاہوں سے دیکھتا ہے)

سہراب۔(مہر کو اپنے کمزور ہاتھوں سے چھوتے ہوئے) تو کیوں جھوٹ سمجھتا ہے؟ یہ دیکھ یہ رستم کی نشانی ہے یا کسی اور کی؟

(رستم نہایت بے قراری سے مہر کو دیکھنے لگتا ہے)

رستم۔(شدتِ غم سے دیوانہ ہوکر) اے بیٹے میں رستم ہی تیرا باپ ہوں۔

(رستم کی آواز رک جاتی ہے اُسے چکر آتا ہے اور بے تحاشا ریت پر بے ہوش ہوکر گر پڑتا ہے۔

سہراب ریت پر گھسٹتا ہوا اپنے باپ کے قریب پہنچ جاتا ہے، اپنے دونوں ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال دیتا ہے، اُس کے لبوں کو بوسے دیتا ہے اور پھر اسے ہوش میں لانے کے لئے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں کو اس کے چہرے پر پھیرنے لگتا ہے۔تھوڑی دیر گذر جاتی ہے۔

رستم ہوش میں آتا ہے اور اپنی آنکھیں کھول دیتا ہے۔دونوں ایک دوسرے کو متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔رستم اپنے دونوں ہاتھوں میں ریت اٹھا کر اپنے سر پر ڈالنے لگتا ہے اور زور زور سے اپنے آپ کو

برا بھلا کہنے لگتا ہے۔ پھر تلوار نکال کر خودکشی کرنا چاہتا ہے۔ سہراب اُس کا ارادہ سمجھ لیتا ہے اور اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

سہراب۔ (باپ کو تسکین دیتے ہوئے) میرے پیارے باپ، صبر کیجیے کیونکہ کاتب ازل نے جو کچھ میری پیشانی پر لکھ دیا تھا وہ آج پورا ہو رہا ہے ـــــ آپ خدا کے وہ نامعلوم ہاتھ ہیں جو اس فرض کی تکمیل کے لئے مقرر کئے گئے۔ آپ کو پہلی ہی نظر میں دیکھ کر، بلاشبہ میرا دل یہ بول اٹھا تھا کہ آپ رستم ہیں۔ اور آپ کا دل بھی یہی کہہ رہا تھا ـــــ میں جانتا ہوں لیکن قسمت نے ان نازک احساسات کو اپنے فولادی پنجوں سے روند ڈالا ـــــ روند ڈالا اور پیس کر بالکل فنا کر دیا۔ آہ صرف قسمت اور اسی قسمت نے مجھے اس لڑائی میں شریک ہونے پر مجبور کیا اور آخر مجھے اپنے باپ کی برچھی کا نشانہ بنا دیا ـــــ لیکن اب ہمیں اس کے متعلق کچھ خیال نہ کرنا چاہئے ـــــ جو کچھ گذر گیا بھول جائیے ـــــ سب کچھ، اور میں بھی بھلا دوں گا ـــــ میں اب اپنے باپ کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یہ اطمینان کر لینے دیجئے کہ میں نے اپنے باپ کو پا لیا ـــــ آئیے میرے پاس ریت پر بیٹھ جائیے۔ میرا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیجئے، میرے گرد آلود چہرے کو بوسے دیجئے اور اس کو اپنے محبت بھرے آنسوؤں سے دھونے کی کوشش کیجئے اور کہئے "میرا بیٹا میرا پیارا سہراب" میں آپ کی زبان سے یہ پیارے اور دلکش الفاظ سننے کے لئے بے چین ہوں ـــــ جلد بہت جلد ـــــ دیر نہ کیجئے۔ اب میری زندگی کے صرف چند لمحے اور باقی ہیں۔ جلدی کیجئے، کیونکہ میں بجلی کی طرح اس میدان میں نازل ہوا تھا اور اب آندھی کی طرح جا رہا ہوں ـــــ ہاں ایک بہت تیز رو آندھی کی طرح میں چلا جاؤں گا کیونکہ کاتب ازل نے یہ واقعہ بھی ہمارے صفحۂ تقدیر پر غیر فانی حروف میں نقش کر دیا تھا۔

(رستم سنتا رہتا ہے اور پھر بے ساختہ رو پڑتا ہے۔ پھر سہراب کو اپنے دونوں بازوؤں میں لے لیتا ہے اور چلا چلا کر رونے لگتا ہے۔ اور سہراب کو پیار کرتا جاتا ہے۔ یہ دلخراش منظر دیکھ کر دونوں فوجوں پر ایک حسرتناک خاموشی اور غم طاری ہو جاتا ہے)

رستم۔ (نہایت غم انگیز اور جگر سوز لہجہ میں) آہ سہراب میں چاہتا ہوں کہ دریائے آمو کے طوفان آ کر مجھے بہا لے جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس کی خوفناک اور بلند موجیں ہمیشہ کے لئے مجھے اپنے اندر سما جانے دیں۔

سہراب۔ (نقاہت سے) آہ ایسی تمنا نہ کیجئے۔ ابھی آپ کو زندہ رہنا چاہئے، کیونکہ کچھ لوگ بڑے بڑے کارناموں کی تکمیل کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور بعض کی تخلیق بہت جلد فنا ہو کر گمنام ہو جانے کے لئے ہوتی ہے۔ اب آپ اپنی زندگی میں ایک نئی شہرت حاصل کیجئے ـــــ آپ میرے باپ ہیں۔ اور آپ کی شہرت اور نیک نامی،

میری اپنی شہرت اور عزت ہے ــــ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں اس فوج کو جو میرے ساتھ آئی ہے۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اس میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہ کیجئے۔ میں ان کے لئے سفارش کرتا ہوں اُن کی اس میں کوئی خطا نہیں ہے۔ انہوں نے میرا ساتھ دیا ہے ــــ میری امیدوں کا ــــ میری شہرت کا ــــ میری قسمت کا ــــ ابا جان ان سب کو دریائے آمو کے پار اطمینان اور بلا کسی خوف اور ضرر کے گذر جانے دیجئے۔ لیکن مجھے آپ خود لے جائیے۔ اور سیستان لے جاکر مجھے ایک بستر پر لٹا دیجئے۔ اور میرے لئے ماتم کیجئے۔ آپ کا سفید بالوں والا باپ زال۔ اور آپ کے دوست ــــ سب مل کر ماتم کریں آپ مجھے وہاں کی پیاری اور مقدس خاک میں دفن کیجئے اور میری ہڈیوں کے اوپر ایک قبر بنا دیجئے۔ اور اس کے قریب ایک بہت بلند مینار بنائیے جو میلوں کے فاصلہ سے بھی نظر آسکے تاکہ جب کوئی فوجی سردار ادھر سے گذرے تو دیکھ کر کہے۔

"سہراب، رستم کا بیٹا یہاں راحتِ ابدی کی نیند لے رہا ہے جس کو اُس کے بہادر باپ نے دھوکے اور نادانی سے قتل کر ڈالا"

رستم۔ (پُر درد آواز سے) میرے پیارے بیٹے سہراب جیسا تُو نے کہا ہے ویسا ہی ہوگا۔ تُو اس کی فکر نہ کر۔ پیارے سہراب میں تجھے اپنے ہمراہ سیستان لے جاؤں گا۔ تجھے ایک بستر پر لٹا دوں گا اور آہ وزاری کروں گا۔ میرے ساتھ میرا بڈھا باپ اور تمام دوست اور عزیز بھی اس ماتم میں شریک ہونگے۔ میں تجھے وہاں کی بے حد پیاری اور پاک زمین میں دفن کروں گا، اور ایک بہت اونچا مینار بنواؤں گا، اور لوگ تجھے اور تیری قبر کو کبھی نہ بھولیں گے میں تیری فوج کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچاؤں گا۔ میں اُسے دریائے آمو کے پار اطمینان سے اور بے خوف و خطر گذر جانے دوں گا ــــ آہ اب میں ان میں سے کسی کو مار کر کیا کروں گا ــــ کاش وہ سب جن کو میں نے قتل کیا ہے ایک مرتبہ اور زندہ ہو جاتے میرے خونخوار دشمن جو اپنے زمانہ کے ہیرو کہلاتے تھے اور جن کو شکست دے کر میں نے موجودہ شہرت حاصل کی ہے، وہی سب زندہ ہوتے اور میں صرف ایک ادنیٰ درجے کا آدمی ہوتا ــــ ایک بہت معمولی، ایک غریب ایک کمزور اور گمنام سپاہی۔ آہ شاید اُس وقت۔ میرے پیارے بیٹے ــــ میرے پیارے سہراب۔ اُس وقت تو زندہ رہ سکتا ــــ کاش اس وقت تیرے حملے سے زخمی ہو کر میں خود ہی اس خونی ریت پر پڑا دم توڑ رہا ہوتا، مگر تو میرے حملے سے نہیں۔ کاش اس وقت میں مر رہا ہوتا مگر تو نہیں۔ اور میں سیستان لے جایا جاتا، مگر تو نہیں۔ اور زال میری قبر پر روتا، مگر تیری قبر پر نہیں۔ اور کہتا۔ "اے بیٹے میں تیری موت کا غم ضرور کر رہا ہوں لیکن اس اطمینان کے ساتھ کہ تو نے خود ہی ایسے انجام کی آرزو کی تھی"۔ اب

تک میری زندگی جنگی اور خونی مناظر میں گذری ہے، اور میں شاید اب یہ خونریز زندگی کبھی ختم نہ کرسکوں گا۔

سہراب۔ (انتہائی ضعف سے) بیشک او شیر دل انسان ایک خونی زندگی —— لیکن اب تجھے آرام حاصل ہونے والا ہے اب تجھے سکون مل جائے گا —— اس وقت نہیں —— ابھی نہیں —— لیکن ہاں اُس دن جب تو ایک بلند اور سفید بادبان والے جہاز میں سفر کرے گا۔ اور صرف تو نہیں بلکہ کیخسرو کے اور تمام سردار بھی تیرے ساتھ ہونگے —— نیلے سمندر کو پار کر کے گھر پہنچ کر اور اپنے عزیز بیٹے کو قبر میں سلانے کے بعد —— ہاں اُس وقت تجھے سکون مل جائے گا ——

رستم۔ (سہراب کو ارمان بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے) میرے بیٹے۔ خدا وہ دن جلد لائے اور وہ گہرا نیلا سمندر۔ اُس وقت تک اگر خدا کی مصلحت یہی ہے تو مجھے یہ صدمہ برداشت کرنا پڑے گا۔

(سہراب رستم کے چہرے کو دیکھ کر مسکراتا ہے پھر برچھی اپنے جسم سے علیحدہ کرتا ہے اور خون ندی کی طرح اس کے زخم سے بہنے لگتا ہے۔

سہراب اپنی نگاہیں باپ کے چہرہ پر جما دیتا ہے۔ رستم اپنی آنکھیں اپنے بیٹے کے معصوم اور حسرت نصیب چہرہ پر گاڑ دیتا ہے۔

سہراب کی روح پرواز کر جاتی ہے رستم بیٹھا آنسو بہاتا رہتا ہے۔ دونوں فوجیں اپنے اپنے خیموں کی طرف آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگتی ہیں)

آرنلڈ

محشر عابدی

صرف اپنے پر بھروسا رکھ پھر اور کوئی تجھے دھوکا نہ دے گا۔

قوت مطیع کرے لیکن رام صرف محبت ہی کرسکتی ہے۔ جس نے پہلے محبت کی وہ بازی لے گیا۔

اگر تو باپ بن کر حکم منوانا چاہتا ہے تو پہلے بیٹا بن کر حکم ماننا سیکھ۔

دیہات کی دنیا میں خدا کے کارخانے ہیں شہروں کی دنیا میں انسان کے۔

تعریف کی خواہش نہ کرو بلکہ صرف نیکی کی پھر تعریف خود بخود تمہاری طرف کھچی چلی آئے گی۔

خیرات کی کئی صورتیں ہیں لیکن اُس کی ہر صورت خوبصورت ہے۔

گلچیں

پرستیدۂ خیال!

میری آنکھوں میں نہاں، اک پیکرِ تنویر ہے   میرے دل میں جلوہ گر، اک حسن کی تصویر ہے!
میرے خوابِ شعر کی اک دل نشیں تعبیر ہے

رات دن میری فضائے روح میں رہتی ہے وہ   دل کی ہم آغوشیوں کی آفتیں سہتی ہے وہ!
اور مجھ سے داستانیں عشق کی کہتی ہے وہ!

میری نیندوں کی فضاؤں میں وہی ہے جلوہ گر!   میری راتوں کی دعاؤں میں وہی ہے جلوہ گر!
میرے شعروں کی اداؤں میں وہی ہی جلوہ گر!

میرے اشکِ شبنمیں میں یہ اُسی کا نور ہے!   میری وارفتہ نگاہوں میں وہی مستور ہے!
اُس کے جلووں سے مری دنیائے دل معمور ہے!

جب کبھی راتوں کو مل جاتی ہے تنہائی مجھے   پاس لے جاتا ہے ذوقِ سجدہ فرسائی مجھے!
اور تصور میں وہ کر جاتی ہے سودائی مجھے!

اُس کی الفت کی خلش سینے میں جب پاتا ہوں میں   جھوم کر پُردرد نغمے عشق کے گاتا ہوں میں!
سازِ حسرت کی فضا میں، سوز برساتا ہوں میں!

جی میں آتی ہے کہ اُس کی یاد میں کھو جاؤں میں   اس تصور میں ہمیشہ کے لئے سو جاؤں میں!
یعنی مٹ کر اُس کے جلووں میں فنا ہو جاؤں میں!!

"آوارہ"

ذرّاتِ مُضطرب

میں اور میرے چند عزیز اور رشتہ دار پوجا کے سفر سے واپس کلکتہ جا رہے تھے کہ ہماری اُس شخص سے گاڑی میں ملاقات ہوئی۔ وضع و لباس سے تو پہلے ہم یہ سمجھے کہ وہ کوئی شمالی علاقہ کا مسلمان ہے مگر جب ہم نے اُس کی باتیں سنیں تو ہم حیران رہ گئے۔ ہر موضوع پر وہ اس تیقن کے ساتھ گفتگو کرتا تھا کہ اگر کوئی اس کو سنے تو یہی سمجھے کہ شاید دنیا جہان کو آراستہ و منظم کرنے والا خدا بھی ہمیشہ اور ہر بات میں اس شخص سے مشورہ لے کر کام کرتا ہوگا۔ ادھر اب تک ہم ہر قسم کے فکر و غم سے آزاد تھے، کیونکہ ہمیں علم ہی نہ تھا کہ دنیا میں کون کون سی نادیدہ و ناشنیدہ طاقتیں کارفرما ہیں۔ ہمیں خبر نہ تھی کہ روسی بڑھتے بڑھتے ہمارے قریب آ گئے ہیں، انگریزوں کی گہری اور پُر اسرار چالوں سے ہم ناواقف تھے اور ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دیسی ریاستوں کی تباہی و بربادی کا زمانہ قریب آ پہنچا ہے۔ ہمارے نئے دوست نے مسکراتے ہوئے حرافانہ انداز سے کہا "میرے دوست! آسمان اور زمین میں بعض ایسی باتیں بھی ظہور میں آتی ہیں جن سے تمہارے اخبارات کے صفحات بے بہرہ رہتے ہیں"۔ چونکہ ہم اس سے پہلے کبھی اپنے گھر سے باہر نہ نکلے تھے اس لئے اُس شخص کی وضع و گفتگو نے ہماری زبانوں پر مہرِ سکوت لگا دی۔ کتنا ہی عام اور معمولی سے معمولی موضوع کیوں نہ ہو، وہ اس پر مختلف علوم کی رو سے بحث کرتا، ویدوں سے حوالے دیتا یا کسی ایرانی شاعر کی رباعیات پڑھتا اور چونکہ ہمیں ان علوم اور کتبِ مقدسہ کے جاننے کا یا اپنی فارسی دانی کا کوئی دعویٰ نہ تھا اس لئے ہمارے دلوں میں اس کی بزرگی کا نقش گہرا ہوتا چلا گیا۔ میرے عزیزوں میں ایک جنہیں تصوف سے شغف تھا یہ سمجھنے لگے کہ اس شخص کے قبضہ میں ضرور کوئی غیر معمولی روحانی قوت ہے۔ وہ ہمارے اس عجیب و غریب ہم سفر کے فرسودہ سے فرسودہ خیالات کو نہایت توجہ سے سنتے اور پوشیدہ طور پر اس کی گفتگو کے بعض فقرات قلمبند بھی کرتے جاتے۔ میرا خیال ہے کہ اُس نے ان کی یہ حرکت دیکھ لی اور اس پر کسی حد تک مسرور بھی ہوا۔

جب گاڑی مقامِ اتصال پر پہنچی تو ہم تبدیلی کے لئے ویٹنگ روم جمع ہو گئے۔ رات کے دس بج چکے تھے، اور چونکہ لائنوں کی خرابی کی وجہ سے ہماری گاڑی کے دیر میں آنے کا احتمال ظاہر کیا جا رہا تھا اس لئے میں نے میز پر اپنا بستر پھیلا دیا اور لیٹنے کے قریب ہی تھا کہ اس حیرت انگیز انسان نے اپنی کہانی شروع کر دی۔ بلاشبہ میں اس رات آنکھ نہ جھپک سکا۔

جب چند انتظامیہ مسائل پر اختلاف ہوجانے کی وجہ سے میں نے اپنی جوناگڈھ کی ملازمت ترک کردی اور نظامِ حیدرآباد کی ملازمت میں شامل ہوگیا تو انہوں نے مجھے مضبوط اور نوجوان دیکھ کر جھٹ بیرچ میں کپاس کے محصول کی کلکٹری پر متعین کردیا۔

بیرچ ایک خوبصورت مقام ہے۔ یہاں ایک ندی تنہا پہاڑیوں کے نیچے جنگلوں کے پتھریلے راستوں سے شور مچاتی اور کنکروں کو بجاتی اس طرح چلتی ہے جیسے کوئی طرار رقاصہ سبک خرامی کر رہی ہو۔ دریا سے کوئی ڈیڑھ سو سیڑھیوں کی بلندی پر اور پہاڑی کے دامن میں سنگِ مرمر کا ایک تنہا محل کھڑا ہے۔ اس کے آس پاس کوئی انسان نہیں رہتا ——— بیرچ کا گاؤں اور کپاس کی منڈی یہاں سے فاصلہ پر واقع ہیں۔

تقریباً ڈھائی سو سال گزرتے ہیں کہ شہنشاہ محمود ثانی نے یہ تنہا محل یہاں اپنے عیش و عشرت کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ اُس کے عہد میں یہاں فواروں میں سے گلاب کی دھاریں اچھلتی تھیں، اور پانی کی ہلکی ہلکی موجوں سے دھوئے ہوئے کمروں کے ٹھنڈے ٹھنڈے فروش پر نوخیز ایرانی لڑکیاں نہانے سے پہلے اپنے بال کھول کر بیٹھتی تھیں، اور اپنے نرم نرم برہنہ پیروں سے شفاف پانی کے حوضوں میں چھینٹے اڑاتی تھیں اور بربط کی دھن پر اپنے تاکستانوں کے نغمے گاتی تھیں۔

فوارے اب نہیں اچھلتے، نغمے خاموش ہوچکے ہیں، وہ برف جیسے سفید پاؤں بھی اب اس برفانی مرمر کو اُس انداز و ادا سے نہیں چھوتے۔ یہ جگہ اب ہم جیسے "تنہائی کے ماروں اور بیوی بچوں کی صحبت سے محروم محصولیوں کی قیام گاہ بنی ہوئی ہے۔ کریم خاں جو ہمارے دفتر کا ایک محرر ہے مجھے ہمیشہ اس مقام کو اپنا مسکن بنانے سے منع کیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا "دن تم شوق سے یہاں گذارو لیکن رات کبھی بسر نہ کرنا۔" میں ہنسی میں بات ٹال دیا کرتا۔ ملازمین نے کہا ہم گھری شام تک تو کام کیا کریں گے لیکن رات کو چلے جایا کریں گے۔ میں نے اسے جھٹ منظور کرلیا۔ یہ مکان ایسا بدنام ہوچکا تھا کہ اندھیرا چھا جانے کے بعد چوروں کو بھی یہاں ٹھہرنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

پہلے پہل اس سنسان محل کی تنہائی کابوس کی طرح مجھ پر سوار رہی۔ میں دن بھر باہر رہتا اور بڑی محنت سے کام کرتا، پھر رات کو تھک ٹوٹ کر گھر آتا اور آتے ہی سو جاتا۔

ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ محل کا پُرہول سحر مجھ پر چھانے لگا۔ یہ بات بیان سے بھی باہر ہے اور لوگوں کو اس پر یقین دلانا بھی مشکل ہے لیکن مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہ تمام مکان ایک زندہ جسم ہے جو مجھے آہستہ آہستہ اور ایک نامعلوم طریقہ سے ہضم کر رہا ہے۔

شاید یہ عمل اسی وقت شروع ہو گیا جب میں نے گھر میں قدم رکھا لیکن مجھے وہ دن بہت اچھی طرح یاد ہے جب میں پہلی مرتبہ اس سے آگاہ ہوا۔

موسم گرما کی ابتدا تھی اور چونکہ تجارت کا بازار سرد تھا اس لئے میرے پاس کوئی کام نہ تھا۔ غروب آفتاب سے کچھ پہلے میں سیڑھیوں کے نیچے دریا کے کنارے ایک آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ ندی کا پانی اترا ہوا تھا۔ دوسری طرف ریت کا ایک چوڑا سا قطعہ شام کے رنگوں سے چمک رہا تھا۔ کہیں سے ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ آتا تھا، اور پرسکون فضا اُن جھاڑیوں کی گراں بار خوشبو سے لدی ہوئی تھی جو پاس کی پہاڑیوں پر اگ رہی تھیں۔

سورج پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا تو دن کے چہرے پر ایک لمبی سیاہ نقاب پڑ گئی، اور حائل پہاڑیوں نے اُن لمحات کو مختصر کر کے کاٹ ڈالا جن میں غروب کے وقت روشنی اور سایہ آپس میں ملتے ہیں میں نے گھوڑے پر سوار ہو کر باہر سیر کو جانے کا خیال کیا اور اب اُٹھنے ہی کو تھا کہ پیچھے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

میں اسے دھوکا سمجھ کر پھر بیٹھ گیا تو سیڑھیوں پر مجھے کتنے ہی پاؤں پڑتے ہوئے سنائی دیئے، جیسے بہت سے آدمی ایک ساتھ نیچے اتر رہے ہیں۔ مسرت کی ایک عجیب تھرتھری جس میں کچھ کچھ خوف بھی ملا ہوا تھا میرے بدن میں دوڑ گئی، اور گو میری نظروں کے سامنے کوئی شکل نہ تھی تاہم مجھے خیال ہو گیا کہ ہنستی کھیلتی دوشیزہ لڑکیوں کی ایک ٹولی ندی میں نہانے کے لئے سیڑھیوں سے اتر رہی ہے۔ وادی میں، دریا میں، محل میں ذرا سا کھٹکا بھی نہ ہوتا تھا کہ سکوت اُس سے ٹوٹے، لیکن لڑکیوں کی اُس مسرور اور خوش آیند ہنسی کو جو کسی سینکڑوں جھرنوں میں سے بہنے والے نغمہ ریز چشمے کی طرح پھوٹ رہی ہو میں نے صاف سُن لیا جب وہ میری موجودگی کا احساس کئے بغیر شوخی سے ایک دوسرے کا تعاقب کرتی میرے پاس سے گزر گئیں۔ جس طرح وہ مجھ کو نظر نہ آتی تھیں اسی طرح میں بھی ان کو نظر نہ آتا تھا۔ دریا میں کامل سکون تھا، لیکن مجھے یوں معلوم ہوا جیسے اس کے ساکن، پایاب اور صاف پانی میں چوڑیوں سے کھنکھناتی ہوئی باہوں کے ہلنے سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے، جیسے لڑکیاں ہنستی ہیں اور ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے اڑاتی ہیں اور جیسے ان حسین تیراکوں کے پاؤں ننھی ننھی لہروں کو ابھار ابھار کر ان میں سے موتی اچھال رہے ہیں۔

میرا دل کانپ گیا ——— میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیفیت خوف کی وجہ سے طاری ہوئی یا خوشی سے یا تعجب سے۔ میرے دل میں ان باتوں کو اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ دیکھنے کی خواہش تھی مگر مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ

اگر میں اپنے کانوں پر ذرا زور ڈالوں تو میں اُن کی تمام گفتگو سمجھ لوں گا، اور میں نے بہت زور ڈالا مگر جنگل کے جھینگروں کی آواز کے سوا مجھے کچھ سنائی نہ دیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ڈھائی سو برس کا ایک تاریک پردہ میرے سامنے لٹک رہا ہے، اور میں کانپتے ہوئے اس کا ایک کونہ ہٹا کر نظارے کو جھانک لوں گا، گو دوسری طرف کا مجمع پورے طور پر تاریکی میں لپٹا ہوا تھا۔

شام کا سکوتِ گراں یکایک ہوا کے ایک جھونکے سے ٹوٹ گیا، اور ندی کی ساکن سطح پر کسی دریائی پری کے گھنگریالے بالوں کی سی لہریں اُٹھنے لگیں، اور شام کی تیرگی میں لپٹے ہوئے جنگلوں میں سے ایک مسلسل سنسناہٹ سنائی دینے لگی جیسے وہ کسی خوابِ سیاہ سے بیدار ہو رہے ہوں۔ اس کو حقیقت کہو یا خواب، وہ غیر مرئی لمحاتی جھلک جس کا انعکاس اڑھائی سو سال کی پرانی دنیا سے ہو رہا تھا ایک پل میں میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ پُراسرار شکلیں جو غیر جسمانی رفتار اور بلند بے آواز قہقہوں کے ساتھ جلد جلد میرے پاس سے گزر گئی تھیں اور دریا میں کود پڑی تھیں اب اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ اسی راستے واپس نہ گئیں بلکہ جس طرح خوشبو ہوا میں مل کر غائب ہو جاتی ہے اسی طرح وہ بھی ہوا کے ایک ہی جھونکے سے منتشر ہو گئیں۔

اب حقیقۃً مجھ پر ایک خوف ساطاری ہو گیا یہ شاید سرسوتی دیوی تھی جس نے مجھے اکیلا دیکھ کر مجھ پر غلبہ پا لیا تھا ——— آہ، اس ساحرہ نے یہ نہ دیکھا کہ اُس کم بخت کو تباہ کرنے سے کیا حاصل ہے جو کپاس کا محصول اکٹھا کر کے اپنی روزی کماتا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج نہایت اچھا کھانا کھاؤں گا کیونکہ جب پیٹ خالی ہوتا ہے تو بہت سے امراض اسے اپنی آماجگاہ بنا لیتے ہیں۔ میں نے اپنے باورچی کو بلایا اور اُسے نہایت اعلیٰ درجہ کا مغلئی کھانا تیار کرنے کو کہا۔

دوسری صبح مجھے اس تمام واقعہ کی حقیقت وہم و خیال سے زیادہ نظر نہ آتی تھی۔ میری طبیعت ہلکی ہو چکی تھی میں نے صاحب بہادروں کی سی ٹوپی پہنی اور اپنے کام کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اُس روز مجھے اپنی سہ ماہی رپورٹ لکھنی تھی اس لئے میرا خیال تھا کہ دیر تک واپس نہ آسکوں گا، لیکن ابھی اندھیرا نہ ہوا تھا کہ میرا دل عجیب و غریب طریقہ سے گھر کی طرف کھنچنے لگا ——— مجھے محسوس ہوا کہ وہ سب میرا انتظار کر رہے ہیں اور اب مجھے زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے۔ رپورٹ کو ختم کئے بغیر میں اُٹھ کھڑا ہوا، ٹوپی پہنی اور تاریک، سایہ دار سنسان راہ کے سکوت میں اپنی گاڑی کی گڑگڑاہٹ سے رخنہ اندازی کرتا ہوا اُس وسیع اور خاموش محل میں پہنچ گیا جو پہاڑیوں کی تاریک فضا میں تنہا کھڑا تھا۔

پہلی منزل میں ایک نہایت فراخ کمرہ تھا اُس کی چھت خوشنما محرابوں کے اوپر موٹے موٹے ستونوں کی تین قطاروں پر پھیلتی چلی گئی تھی، اور دن رات شدید تنہائی کے بوجھ تلے دب کر کراہتی رہتی تھی۔ دن ابھی ابھی ختم ہوا تھا اور چراغ ابھی روشن نہیں کئے گئے تھے۔ جب میں نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا تو ایسا معلوم ہؤا کہ اندر بڑی ہل چل سی پڑگئی ہے، اور انسانوں کا ایک بہت بڑا مجمع درہم برہم ہو رہا ہے اور وہ سب کے سب روزنوں سے، کھڑکیوں سے، برآمدوں سے اور کمروں سے بسرعت تمام نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

چونکہ مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا میں حیران پریشان کھڑا رہا۔ ایک قسم کی پُرکیف مسرت میں میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے اور عطر کی ہلکی ہلکی خوشبو جسے امتدادِ زمانہ نے نابود کر کے برابر کر دیا تھا میرے دماغ میں سما رہی تھی۔ اس وسیع اور خالی ایوان کی تاریکی میں ان قدیم ستونوں کی قطاروں کے درمیان کھڑے ہو کر فواروں کے نغموں کو، سنگِ مرمر کے فرش پر اُن کے گرنے کو، بربط کے ایک عجیب سُر کو، زیوروں کی کھن کھن کو اور پایلوں کی آواز کو، گھڑیال کی منادی کو، ہوا سے ہلتے ہوئے جھاڑوں کے بلوروں کی ٹن ٹن کو، پنجروں میں بند بلبلوں کے ترانوں کو اور باغ میں سارس کے نالوں کو میں سن رہا تھا اور یہ سب میرے آس پاس ایک عجیب غیرارضی موسیقی پیدا کر رہے تھے۔ پھر مجھ پر ایسا جادو ہو گیا کہ یہ غیر محسوس، غیر مرئی اور غیر ارضی نظارہ مجھے دنیا کی تنہا حقیقت معلوم ہونے لگا اور باقی ہر چیز ایک خواب نظر آنے لگی۔ میں یعنی سری جبت اور فلاں ابنِ فلاں جو کپاس کے محصول کے محصّل کی حیثیت سے چارسو پچاس روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا اور اپنی ٹمٹم میں بیٹھ کر چھوٹا کوٹ اور انگریزی ٹوپی پہن کر ہر روز دفتر جاتا تھا اپنے آپ کو اس قدر حیرت انگیز طور پر مضحکہ خیز سراب سمجھنے لگا کہ اس وسیع خاموش ایوان کی تاریکی میں کھڑے کھڑے بے اختیار ہنس پڑا۔

اسی وقت میرا ملازم ہاتھ میں ایک جلتا ہؤا لمپ لے کر اندر داخل ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ اُس نے مجھے دیوانہ سمجھا یا کیا، لیکن اُس کی آمد سے مجھ پر یہ پھر نمایاں ہو گیا کہ میں سری جبت فلاں ابن فلاں ہوں اور یہ جو ہمارے چھوٹے بڑے شاعر کہا کرتے ہیں کہ اس دنیا میں یا اس دنیا سے باہر ایک سرزمین ایسی بھی ہے جہاں نادیدہ چشمے ابل کر اور سریلے بربط کے تار غیر مرئی انگلیوں سے مس ہو کر سرمدی نغمے پیدا کرتے ہیں بہرحال یقینی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ میں بیرچ کی روئی کا محصول جمع کر کے چارسو پچاس روپے ماہوار تنخواہ پاتا ہوں۔ وفورِ مسرت میں اپنے ان نادر اور عجیب تصورات پر ہنستے ہوئے میں اپنی میز پر بیٹھ گیا اور اخبار پڑھنے لگا۔

جب میں اخبار ختم کر چکا اور اپنا مغلئی کھانا کھا چکا تو میں نے چراغ گل کر دیا اور ایک بغلی کمرے میں اپنے

بستر پر جا لیٹا۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے پہاڑیوں کے اوپر اور اُن کے جنگلوں کی تاریکی میں محیط ایک چمکتا ہوا ستارہ آسمان کی کروڑوں میل کی دوری سے مسٹر کلکٹر کو ایک غریبانہ بستر میں غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں متحیر تھا اور اس خیال سے خوش تھا۔ اور میں نہیں جانتا کہ کب مجھے نیند آئی اور کتنی دیر میں سوتا رہا، لیکن یکایک میں چونک کر اٹھا، گو کوئی آواز میرے کان میں نہ آئی اور کسی خلل انداز کو میں نے نہ دیکھا ـــــ صرف پہاڑی کی چوٹی پر چمکنے والا وہ روشن ستارہ غروب ہو چکا تھا، اور چاند کی دھیمی روشنی کھلی ہوئی کھڑکی میں سے چپکے چپکے اندر داخل ہو رہی تھی جیسے وہ اس مداخلت سے محجوب ہو رہی ہو۔

مجھے کوئی نظر نہ آیا مگر میں نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی مجھے آہستہ آہستہ ہلا رہا ہے۔ جب میں جاگا تو اُس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا، بلکہ انگوٹھیوں سے چمکتی ہوئی پانچ انگلیوں کے اشارہ سے مجھے باحتیاط پیچھے آنے کو کہا۔ میں دبے پاؤں اُٹھا اور گو میرے سوا کوئی ایک متنفس بھی اس خوابیدہ آرزوؤں اور بیدار صداؤں والے سنسان محل کے بے شمار ایوانوں میں موجود نہ تھا تاہم میں ہر ہر قدم پر ڈرتا تھا کہ کوئی جاگ نہ اُٹھے۔ محل کے اکثر کمرے ہمیشہ بند رہتے تھے اور میں ان میں کبھی داخل نہ ہوا تھا۔

میں دم بند کئے، پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اس غیر مرئی رہنما کے پیچھے چلا جا رہا تھا ـــــ میں اب نہیں بتا سکتا کہ کہاں۔ کتنے لمبے تھے وہ تاریک اور تنگ راستے، کتنی طویل تھیں وہ غلام گردشیں اور کیسے خاموش اور پُر رعب تھے وہ مجلسی ایوان اور خاص کمرے جن میں سے میں گزرا۔

گو میں اپنی حسین پیش رو کو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اُس کی شکل میرے دل کی آنکھوں سے پوشیدہ نہ تھی ـــ وہ ایک عرب لڑکی تھی، جس کی مرمر جیسی سخت اور ملائم باہیں اس کی ڈھیلی ڈھالی آستینوں میں سے نظر آ رہی تھیں ایک باریک نقاب تھی جو اس کی ٹوپی کے کناروں سے اسکے رُخ پر پڑ رہی تھی اور ایک خم دار خنجر تھا جو اُس کی کمر سے لٹکا ہوا تھا۔ میں سمجھا کہ الف لیلہ کی ایک رات رومانی دنیا سے اڑ کر میرے پاس آگئی ہے اور میں آدھی رات کے وقت محوِ خواب بغداد کی تنگ و تاریک گلیوں میں سے گزر کر کسی پُر خطر موعودہ و مقررہ مقام پر جا رہا ہوں۔

آخر وہ حسینہ یکایک ایک گہرے نیلے پردے کے سامنے کھڑی ہو گئی، اور نیچے کسی چیز کی طرف اشارہ کرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہاں کچھ نہ تھا مگر ایک فوری خوف نے خون کو میرے قلب میں منجمد کر دیا ـــــ میں سمجھا کہ میں پردے کے دامن میں زمین پر ایک ہیبت ناک حبشی غلام کو دیکھ رہا ہوں جو زربفت کی ایک قیمتی پوشاک پہنے، اپنی ٹانگیں پھیلائے

بیٹھا ہی بیٹھا اونگھ رہا ہے اور ایک ننگی تلوار اس کی گود میں پڑی ہے۔ وہ حسینہ آہستہ سے اُس کی ٹانگوں کو طے کرکے آگے بڑھی اور پردے کا ایک کنارہ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے کمرے کے صرف ایک حصہ کی خفیف سی جھلک نظر آئی جہاں ایک ایرانی قالین بچھا تھا ——— اندر پلنگ پر کوئی خاتون بیٹھی تھی ——— میں اُسے دیکھ نہ سکا، مگر دو نازک اور خوبصورت پاؤں مجھے نظر آئے جن میں دو زرنگار جوتیاں تھیں اور جو زعفرانی رنگ کے پائنچوں میں سے نمایاں ہوتے ہوئے عجب بے پروایانہ انداز سے نارنجی رنگ کے مخملی قالین پر پڑے تھے۔ ایک طرف ایک ہلکے نیلے رنگ کا بلوریں تاش تھا جس میں چند سیب ناشپاتیاں سنگترے اور بہت سے انگوروں کے گچھے، دو چھوٹے پیالے اور ایک سنہری رنگ کی صراحی یہ سب چیزیں کسی مہمان کا انتظار کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ کمرے میں ایک ایسی کیف آور خوشبو جل رہی تھی جس نے میرے حواس کو مدہوش کر دیا۔

جونہی کہ کانپتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے غلام کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کو پھلانگنا چاہا وہ چونک کر اٹھا اور تلوار اُس کی گود سے ایک تیز جھنکار کے ساتھ سنگِ مرمر کے فرش پر گر پڑی۔

ایک چیخ سنائی دی اور میں اچھل پڑا، اور میں نے دیکھا کہ میں اپنے بستر پر بیٹھا ہوں اور میرے جسم سے پسینے کے فوارے چھوٹ رہے ہیں، اور چاند کا چہرہ ایک تھکے ہوئے شب بیدار مریض کے چہرے کی طرح صبح کی روشنی میں زرد نظر آ رہا ہے، اور ہمارا اسودائی کریم خاں سنسان سڑک پر سے گزرتے گزرتے اپنے روزمرہ کے قاعدے کے مطابق پکار پکار کر کہہ رہا ہے "خبردار! خبردار!!"

یوں اچانک میری الف لیلہ کی ایک رات ختم ہوئی لیکن ابھی ایسی ہزار راتیں باقی تھیں۔

اس کے بعد میرے دنوں اور راتوں کے درمیان کوئی مناسبت نہ رہی۔ دن کو میں افسردہ و مضمحل اپنے کام پر جاتا اور سحر کن رات اور خالی خولی خوابوں کو صلواتیں سناتا رہتا، لیکن جب رات آتی تو مجھے اپنی پابندیوں اور ذمہ داریوں سے بھری ہوئی زندگی ایک حقیر، بے اصل، مضحکہ خیز دھوکا معلوم ہوتی۔

رات کی تاریکی چھا جانے کے بعد مجھ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اُس وقت میری ہستی گزرے ہوئے زمانے کی کسی نامعلوم شخصیت میں تبدیل ہو جاتی جس کے کارنامے بن لکھی تاریخ کے صفحات میں منضبط ہو رہے ہوں، اور چھوٹا انگریزی کوٹ اور چست برجس مجھے اپنے لئے قطعاً ناموزوں معلوم ہوتے۔ سر پر ایک مخملی ٹوپی، ڈھیلا پاجامہ، ایک کامدار واسکٹ، ایک لمبا لہراتا ہوا چغہ اور عطر میں بسے ہوئے رنگین رومال میری پُرتکلف پوشاک کی تکمیل کرتے۔ سگریٹ کی بجائے میرے سامنے گلاب سے بھرا ہوا ایک پیچ دار حقہ ہوتا اور میں ایک نرم

گدیلوں والی عمدہ چوکی پہ یوں بیٹھ جاتا جیسے کوئی اپنے محبوب کی ملاقات کے شدید انتظار میں ہو۔

میں اُن حیرت انگیز واقعات کے بیان کی اپنے اندر طاقت نہیں پاتا جو رات کی تاریکی کے بڑھنے کے ساتھ ہی اپنے آپ کو منکشف کرنے لگتے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اس وسیع محل کے عجیب و غریب کمروں میں ایک خوبصورت کہانی کے اجزا بادِ بہاری کے ایک ناگہانی جھونکے سے اڑنے لگے ہیں۔ یہ ایک ایسی کہانی تھی جس کا ایک حد تک تو میں مطالعہ کر لیتا لیکن جس کا انجام مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکتا۔ تاہم میں تمام تمام رات ان اجزا کے تعاقب میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرتا رہتا۔

اِن خوابناک اجزا کے بھنور میں، حنا کی خوشبو اور بربط کے نغموں میں فواروں کی مہکتی ہوئی پھوار سے لدی ہوئی ہواؤں میں برق کی چشمک کی طرح مجھے ایک نازنین کی جھلک دکھائی دے جاتی۔ یہ وہی تھی جس کا پاجامہ زعفرانی رنگ کا تھا جس کے سرخ و سپید نرم پیروں میں خمدار نوک والی زرنگار جوتی تھی جس نے ایک چست سونے کے کام والی انگیا اور ایک سرخ ٹوپی پہن رکھی تھی جس کے سنہری تار اُس کی روشن پیشانی اور گورے گالوں پر پڑتے تھے اُس نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اُس کی تلاش میں میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا تھا اور دنیائے خواب کی مسحور سرزمین میں پیچ در پیچ گلیوں کی بھول بھلیاں کو جادہ بہ جادہ طے کرتا پھرتا تھا۔

بعض دفعہ شام کے وقت جب میں اُس بڑے آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر جس کے دونوں جانب دو مومی شمعیں جل رہی ہوتیں اپنے آپ کو بڑے انہماک کے ساتھ ایک شاہزادے کے سے لباس میں آراستہ کر رہا ہوتا مجھے ناگہاں اپنے پہلو پر اس فسوں ساز ایرانی حسن کا عکس نظر آ جاتا۔ اُس کا تیزی سے پلٹنا، اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں درد اور محبت سے چھلکتی ہوئی ایک مضطرب نگاہ، اُس کے سرخ ہونٹوں پر بول اُٹھنے کی سی کیفیت، اُس کا خوبصورت اور نازک شباب پرور قد و قامت جیسے ایک پھولوں سے بھری ہوئی بیل پر کیف انداز میں بلند ہوتی چلی گئی ہو، ارمان، آرزو اور امنگ کی ایک خیرہ کن جھلک، ایک تبسم، ایک نگاہ اور اس کے جواہرات اور لباس کی ایک بھڑک پیدا ہوتی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ پہاڑیوں اور جنگلوں کی تمام خوشبو سے لدا ہوا ہوا کا ایک وحشی جھونکا آ کر میری روشنی کو گل کر جاتا اور میں اپنی پوشاک کو ایک طرف پھینک کر اپنے بستر پر لیٹ جاتا۔ میری آنکھیں بند ہوتیں اور میرا جسم نشاط سے کانپ رہا ہوتا —— میرے آس پاس ہوا میں جنگلوں اور پہاڑیوں کی خوشبو کے درمیان خاموش تاریکی میں بہت سی ہم آغوشیاں اور بہت سے بوسے اور نرم نرم ہاتھوں کے لمس تیرتے تھے۔ میں ہلکی ہلکی سرگوشیوں کو سنتا تھا اور کسی کی معطر سانسیں اپنی پیشانی پر محسوس کرتا تھا یا بھینی بھینی

خوشبو میں بسا ہوا رومال بار بار میرے رخساروں پر ہلایا جاتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک پُر اسرار ناگن اپنے ہوشربا پیچوں سے مجھے جکڑنے لگتی، اور میں ایک بوجھل آہ بھر کر بے خبری کے عالم میں کھو جاتا اور پھر مجھ پر گہری نیند طاری ہو جاتی۔

ایک شام میں نے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر باہر جانے کا ارادہ کیا ـــــ میں نہیں جانتا کہ کون بہ اصرار رہ جانے کی مجھ سے التجائیں کر رہا تھا ـــــ مگر اُس دن میں نے کسی التجا کو نہ سنا۔ میری انگریزی ٹوپی اور کوٹ ایک کھونٹی پر لٹک رہے تھے۔ میں ان کو وہاں سے اتارنے ہی کو تھا کہ یکا یک ندی کی ریت اور پہاڑی کے خشک پتوں کا ایک بگولا سا اٹھ کر اُن پر جھپٹا اور اپنے چکر میں ان کو لے کر گھمانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کسی کے پُر مسرت قہقہوں کی آواز لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگی جس نے سازِ طرب کے ایک ایک تار کو چھیڑ ڈالا، یہاں تک کہ آخر کار وہ غروبِ آفتاب کی سرزمین میں گم ہو گیا۔

میں سواری کے لئے باہر نہ جا سکا، اور دوسرے دن میں نے انگریزی کوٹ اور ٹوپی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی۔

اُس دن آدھی رات کے وقت پھر میں نے کسی کی دل خراش سسکیاں سنیں ـــــ جیسے بستر کے نیچے، اس رفیع الشان محل کی سنگین بنیادوں کے نیچے کسی مرطوب اور تاریک قبر میں ایک آواز، مستر حمانہ میری منتیں کر رہی ہے: "آہ، مجھے چھڑا لو! اس شدید فریب، اس موت نما نیند، ان بے ثمر خوابوں کے دروازے توڑ کر میرے پاس آؤ، گھوڑے پر سوار ہو کر مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لو، مجھے اپنے سینے سے لگا لو اور پہاڑیوں جنگلوں اور دریا میں سے ہوتے ہوئے مجھے اپنے روشن کمروں کی گرم فضا میں لے آؤ!"

میں کون ہوں؟ آہ میں تجھے کیونکر چھڑا سکتا ہوں؟ اے غارت گرِ حسن اور اے سراپا عشق تو کون ہے جسے میں خواب کے وحشی بھنور میں سے نکال کر ساحل پر لاؤں؟ اے دل کو موہ لینے والی اثیری پری! تو نے کہاں نشو و نما پائی؟ کس ٹھنڈے چشمے کے کنارے کس نخلستان کے سائے میں تو پیدا ہوئی ـــــ کس بے خانماں بادیہ گرد ماں کی گود کو تو نے زینت دی؟ وہ بدوی کون تھا جس نے تجھے تیری ماں کی آغوش سے جدا کیا، ایک کھلتی ہوئی کلی کو ایک صحرائی بیل سے توڑ لیا، تجھے ایک برق رفتار گھوڑے پر رکھ کر جلتی ہوئی ریت کو طے کرتا ہوا وہ تجھے کس شاہی شہر میں لایا؟ اور وہاں، بادشاہ کے کس اہلکار نے تیری اٹھتی ہوئی پرچیا جوانی کی شان و شوکت کو دیکھ کر سونے کے بدلے تجھے خرید لیا، ایک زریں پالکی میں تجھے بٹھایا اور اپنے آقا کے محل کی زینت کے لئے تجھے

تحفتہً پیش کردیا؟ اور آہ، اسے اس محل کی سرگزشت! آہ وہ سارنگ کی موسیقی، پایلوں کی جھنکار، خنجروں کی چمک اور شیرازی شراب کی تندی اور تیزی! آہ وہ بے پایاں جاہ وجلال اور وہ بے حساب اطاعت وخدمت! تیرے دائیں بائیں کنیزیں چمر ہلاتی تھیں تو اُن کے سینوں پر ہیرے چمکتے تھے، بادشاہ وہ حاکموں کا حاکم دست بستہ تیرے برف جیسے سفید پاؤں میں بیٹھتا تھا، اور باہر وہ خطرناک حبشی غلام جس کی شکل موت کے قاصد کی طرح اور جس کا لباس ایک فرشتے جیسا ہوتا تھا ہاتھ میں ایک برہنہ تلوار لئے کھڑا رہتا تھا! پھر اے وہ صحرا کے پھول جسے عظمت وشوکت کا وہ تاباں و درخشاں خون آلود سمندر بہا کر لے گیا جس میں رشک اور حسد کا کف اور فریب وسازش کی چٹانیں اور ٹیلے ہیں مجھے بتا کہ تجھے اُس نے ظالم موت کے کس ساحل پر جا ڈالا، یا کس غدار تر اور ظالم تر سرزمین پر جا پھینکا؟

یکایک اس وقت وہی مجنون مہر علی پکارا "خبردار! خبردار!! سب مایا ہے! سب مایا ہے!!" میں نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ صبح کی روشنی نمودار ہو چکی تھی۔ میرا چپڑاسی آیا اور اُس نے مجھے کچھ خطوط دیئے اور غائبانہ سلام کر کے میرے احکام کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے کہا "سنو میں اب یہاں نہیں رہوں گا" اسی دن میں نے اپنا اسباب باندھا اور دفتر میں منتقل ہو گیا۔ بوڑھا کریم خاں مجھے دیکھ کر ذرا مسکرایا۔ اُس کی مسکراہٹ مجھے کانٹے کی طرح چبھ گئی مگر میں نے کچھ نہ کہا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

جب شام ہوئی تو میرا دل اُڑنے لگا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اپنا کوئی وعدہ پورا کرنا ہے، اور حساب کی پڑتال کا کام مجھے بالکل بے فائدہ معلوم ہونے لگا، یہاں تک کہ نظام کی نظامت بھی مجھے ہیچ نظر آنے لگی۔ جس چیز کو بھی حال کے ساتھ تعلق تھا جو چیز بھی روٹی کے لئے حرکت کر رہی تھی یا سرگرم عمل تھی مجھے بے حقیقت بے معنی اور حقیر دکھائی دینے لگی۔

میں نے اپنا قلم رکھ دیا، کھاتے بند کر دیئے، اپنی گاڑی میں بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ گاڑی غروب آفتاب کے وقت خود بخود محل کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ میں جلد جلد زینے کو عبور کر کے کمرے میں داخل ہوا۔

محل میں شدید خاموشی محیط تھی۔ تاریک کمرے رنجیدہ نظر آ رہے تھے جیسے وہ ناراض ہو گئے ہوں میرا دل پشیمانی سے لبریز ہو گیا مگر وہاں کوئی نہ تھا جس کے سامنے میں اسے کھول کر رکھ سکوں یا جس سے میں معافی مانگ

سکوں۔ میں ان تاریک کمروں کے پاس بے فکر ہوکر پھرتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے پاس ایک بربط ہو اور میں اُس پر اُس نامعلوم کے لئے گاؤں کہ "اے آگ، غریب پروانہ جس نے اُڑ بھاگنے کی بے کار کوشش کی تھی تیرے پاس پھر واپس آگیا ہے! بس اس دفعہ اسے معاف کردے، اس کے پروں کو جلا اور اسے اپنے شعلے میں بھسم کر ڈال!"

یکایک اوپر سے آنسوؤں کے دو قطرے میری پیشانی پر گرے۔ اس دن پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سیاہ بادلوں کے دل چھارہے تھے۔ تاریک جنگل اور ندی کا تاریک پانی ہولناک امید و بیم میں ساکن پڑا تھا۔ یکایک زمین پانی اور آسمان کانپ گیا، اور ایک تیز و تند طوفانی جھونکا دور بے راہ جنگلوں میں سے شور مچاتا ہوا اور اپنے برق پاش دانت نکالتا ہوا لپکا جیسے کوئی دیوانہ زنجیریں تڑا کر بھاگا ہو۔ محل کے خالی ایوانوں کے دروازے زور زور سے بجنے لگے، اور درد و کرب میں کراہنے لگے۔

نوکر تمام دفتر میں تھے اور وہاں کوئی نہ تھا جو چراغ روشن کرے۔ رات ابر آلود اور بے ماہ تھی محل کی شدید تاریکی میں میں صاف طور پر محسوس کرتا تھا کہ ایک عورت پلنگ کے نیچے قالین پر منہ کے بل لیٹی ہے اور اپنے کھلے ہوئے لمبے بالوں کو نوچ رہی ہے۔ اُس کی خوبصورت پیشانی سے خون بہ رہا تھا۔ کبھی وہ ایک ناگوار کرخت اور ناشاد ہنسی ہنستی اور کبھی روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ جاتی اور کبھی وہ اپنا گریباں چاک کر کے اپنی چھاتی پیٹتی۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے ہوا چیخ چیخ کر داخل ہوتی اور مینہ کے دھارے اندر آ آکر اُسے تر بہ تر کر جاتے۔

تمام رات نہ طوفان تھما اور نہ اُس کی دل گداز گریہ وزاری ختم ہوئی۔ میں بھی اندھیرے ہی میں اپنے بے حاصل غم کو لئے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرتا رہا۔ میں کس کی ڈھارس بندھاتا جب مجھے کوئی نظر ہی نہ آتا تھا؟ یہ کس کے غم و اندوہ کا کرب و اضطراب تھا؟ یہ تسکین ناپذیر غم و الم کہاں سے امنڈ رہا تھا؟ اتنے میں اُس دیوانے نے آوازہ لگایا: خبردار! خبردار! سب مایا ہے! سب مایا ہے!!

میں نے دیکھا کہ صبح ہو چکی ہے، اور اس خوفناک موسم میں بھی مہر علی محل کے اردگرد چکر کاٹ رہا ہے اور اپنی مقررہ صدا لگا رہا ہے۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ شاید وہ بھی کبھی اس محل میں رہا ہے، اور اگرچہ وہ اب دیوانہ ہو چکا ہے تاہم وہ اس مرمر کے دیو کے جادو سے مسحور ہو کر یہاں آتا ہے اور اس کا طواف کرتا ہے۔

طوفان اور بارش کے باوجود میں اُس کے پاس پہنچا اور میں نے کہا: او مہر علی، کیا مایا ہے؟"

اُس نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ مجھے ایک طرف ہٹا کر اپنے طواف میں مصروف رہا اور وہی مجنونانہ آوازہ لگاتا گیا، جیسے کوئی مسحور پرندہ کسی سانپ کے منہ پر منڈلا رہا ہو، اور یہ کہہ کہہ کر اپنے آپ کو ہوشیار کرنے کی پوری

کوشش کر رہا ہو: خبردار! خبردار! سب مایا ہے! سب مایا ہے!!"

اس بے پناہ بارش میں ایک سودائی کی طرح بھاگتا ہوا میں دفتر پہنچ گیا۔ اور میں نے کریم خاں سے کہا "مجھے بتاؤ یہ کیا ماجرا ہے؟"

جو کچھ مجھے اُس نے بتایا اُس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک وقت تھا جب بے حساب ناشاد ارمانوں ناکام آرزوؤں اور عیش و عشرت کی مسرتوں کے گسستہ عنان شعلے اس محل میں بھڑکتے تھے، اور دل کی ٹیسوں اور امید کی شکستوں کی نحوست نے اس کے ایک ایک ذرے کو ایک بھوکی ڈائن کی طرح بنا رکھا تھا، اور اگر اتفاقاً یہاں کوئی شخص آجاتا تو یہاں کا کونہ کونہ اُسے پھاڑ کھانے کے لئے مضطرب ہوجاتا۔ جس نے بھی یہاں مسلسل تین راتیں بسر کیں وہ ضرور اس کے خونخوار چنگل کا شکار ہوگیا، لیکن مہر علی اپنی عقل و دانش کے بل پر یہاں سے بچ نکلا۔

میں نے پوچھا "کیا میری رہائی کی کوئی تدبیر ہوسکتی ہے؟" بوڑھے کریم خان نے کہا صرف ایک تدبیر ہے اور وہ بہت مشکل ہے۔ میں یہ تمہیں بتادوں گا مگر پہلے تم ایک ایرانی دوشیزہ کی سرگذشت سن لو جو کبھی اس عشرت گاہ میں رہتی تھی۔ اس سے زیادہ عجیب اور اس سے زیادہ دل گداز واقعہ دنیا کی آنکھ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔"

اتنے میں قلیوں نے شور مچایا کہ گاڑی آگئی۔ ہم نے جلد جلد اپنا اسباب باندھا، گاڑی اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک انگریز جو بظاہر ابھی بیدار ہوا تھا اسٹیشن کا نام پڑھنے کی کوشش میں ایک اول درجہ کی گاڑی سے باہر جھانک رہا تھا۔ جونہی اس کی نظر ہمارے ہمراہی پر پڑی وہ بولا "ہیلو" اور اس نے اسے اپنے کمرے میں بٹھالیا۔ چونکہ ہم دوم درجہ کی گاڑی میں بیٹھے اس لئے ہمیں یہ معلوم کرنے کا موقع نہ ملا کہ وہ کون تھا اور اُس کی کہانی کا انجام کیا تھا۔

میں نے کہا "اُس نے ہمیں بے وقوف سمجھ کر ہم سے خوب مذاق کیا ہے۔ کہانی شروع سے آخر تک محض گھڑت تھی۔" اس پر جو بحث ہوئی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مجھ میں اور میرے صوفی عزیز میں عمر بھر کشیدگی رہی۔

ٹیگور　　　　منصور احمد

سعیِ حیات

پروا نہیں خوشی کی کہ غم مجھ کو راس ہے
دُنیا اگر ہے دُور خدا میرے پاس ہے

بے اعتنائیوں کا محبّت میں ذکر کیا!
سعیِ حیات ہو تو مشقّت کی فکر کیا!

چل دے جو چل دیا ہے کوئی منہ کو موڑ کر
چل دیں گے ہم بھی عیش کی دنیا کو چھوڑ کر

اپنے ہی ہم خیال کی دنیا بسائیں گے
اپنے ہی قیل و قال کی دنیا بسائیں گے

رنگینیِ جمال کی دنیا بسائیں گے
گلچینیِ کمال کی دنیا بسائیں گے

تدبیر کی سوال کی دنیا بسائیں گے
سب کچھ بھلا کے حال کی دنیا بسائیں گے

دنیا میں ہم بسائیں گے دنیا اک اَور ہی
سارے جہاں سے جس کا نرالا ہو طور ہی

راحت ہو اپنے واسطے اَوروں کا جور ہی
یوں زندگی کٹے کہ رہیں محوِ غور ہی

دیکھیں سبھی کچھ آنکھ سے منہ سے نہ کچھ کہیں
خالق بھی مرحبا کہے دنیا میں یوں رہیں

د ۔ ب

بقا

جب ہوائیں چلنا بند ہو جائیں تو سمندر ساکن ہو جاتا ہے یہی حالت ہماری ہے!

جب خواہشات کے تندو تیز جھونکے گزر جاتے ہیں تو ہمارے بحرِ زندگی پر بھی سکون طاری ہو جاتا ہے!

پہلے پہل ہم اپنی چیزوں کا ذکر کس قدر فخریہ لہجہ میں کرتے تھے، وہ چیزیں جن کی تقدیر فنا تھی + اب ہمیں معلوم ہوا کہ کس قدر جاہلانہ تھیں ہماری لن ترانیاں!

عہدِ شباب میں ہم ان چیزوں پر اس قدر فریفتہ ہو جاتے ہیں کہ ان کی حقیقت سے اندھے ہو جاتے ہیں — اُس حقیقت سے جس کو زمانہ کی آنکھیں بغور دیکھ رہی ہیں۔

جس طرح مکین اپنے مکان کے کونے کونے سے واقف ہوتا ہے یونہی ہماری روح بھی ہمارے جسم کی رگ رگ سے واقف ہے!

آندھیوں کے طوفانوں سے اور وقت کی سختی سے مکان کی دیواریں خستہ ہو جاتی ہیں۔ ان میں جا بجا درزوں کا ظہور ہوتا ہے۔ سورج کی کرنیں ان میں سے مکان کے اندر آتی ہیں اور یہی درزیں وجہ تخلیقِ ضیا بن جاتی ہیں!

جسم کی کمزوری روح کے لئے طاقت ہے!

جوں جوں ہم دنیا سے راہ و ربط زیادہ کئے جاتے ہیں۔ ہماری عقل و دانش بڑھتی چلی جاتی!

جو لوگ وقت اور سرمدیت میں حائل شدہ حد کو پار کرنے والے ہیں مڑ کر ذرا اُس دنیا کو بھی دیکھ لیں جسے وہ الوداع کہنے کو ہیں اور اُس کو بھی جس میں انہیں داخل ہونا ہے!

(والر) امین

محفلِ ادب

جرمن شاعر رلکے کی دو نظمیں

فقیر کا ترانہ

دروازے دروازے پھرنا، صدائیں دینا، آندھی ہیں، پانی میں چلچلاتی دھوپ میں، اکبارگی تھک کر کہیں بیٹھ جانا، کسی کونے میں، کسی چوکھٹ پر، اپنا داہنا کان اپنے داہنے ہاتھ پر رکھ لینا، اور چلانا ——— چلانا' چلانا، چلانا۔

اور پھر، مجھکو خود اپنی آواز ایک غیر کی سی آواز لگتی ہے، پھر مجھ کو نہیں معلوم ہوتا کہ یا الٰہی یہ کون حلق پھاڑ پھاڑ کر چلاتا ہے؟ میں یا کوئی اور؟

میں چلاتا ہوں تو ایک ذرا سی چیز کے لئے، لیکن شاعر؟ ایک جلوۂ عالمِ خیال کی خاطر، اور آخر کار میں اپنا چہرہ اپنی دونوں آنکھوں سے ڈھانپ لیتا ہوں اور اپنے سر کا سارا بوجھ دونوں ہاتھوں پر ٹیک دیتا ہوں جس میں اس کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے آرام کی۔

ہاں! یہ نہ سمجھیں راہ گزرنے والے، کہ مجھ آفت نصیب کے سر کو تکیہ تک نصیب نہ تھا۔

فریاد

کیسی ہر چیز دور اور بے بو باس ہے، اور مدت کی گزری ہوئی سی ———

شاید وہ ستارہ جس پر میرے کسبِ نور کا انحصار ہے ہزارہا سال ہوئے مر چکا ہے ———

شاید اس کشتی میں جو ابھی ادھر سے گزری کسی نے کسی سے کان میں ڈر کر کچھ بات کہی ———

گھر میں ایک گھڑی ٹن ٹن بجی ...... کس گھر میں؟

الٰہی توبہ! جی چاہتا ہے کہ دل کے اندر سے نکل کر کہیں بھاگ جاتا، فضائے آسمان میں قرار لیتا ——— جی چاہتا ہے کہ سجدے کرتا ———

اور! ستاروں میں سے ایک شاید اب تک برقرار ہو،

جی کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے (ان میں سے) کون، یکہ و تنہا، ہنوز آشنائے حیات ہے، کون ایک شہر نور کی طرح شعاعوں کی منزل پر آسمانوں میں روشن ہے۔

"جامعہ"

روح کے پر

ننھی صغرا چوزوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ اتنے میں ایک چڑیا اڑتی ہوئی چوزوں میں آ بیٹھی اور بڑی دیر تک وہیں بیٹھی رہی۔

صغرا بولی "اے ہے، کیا چھوٹی سی چڑیا ہے یہ یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتی۔

اتنے میں چوزوں کی ماں بی مرغی مٹکتی ہوئی ادھر آ نکلی۔ اور چڑیا کو ٹھونگ مار کر بولی "جاؤ جی کیا باوا کا مکان ہے"؟

اتنے میں گھر کی بلی نے اسے دور سے بھانپا۔ اور بی مرغی سے یہ کہتی ہوئی کہ آپا تم چکی ہو رہو مہمان آئے تو اُس کی خاطر تواضع کرنی لازم ہے" اس کی طرف لپکی۔

بیچاری چڑیا تھر تھر کانپنے لگی۔ اُسے بلی کی آنکھوں میں موت نظر آئی۔ ڈر کر طاق میں جا بیٹھی۔

تب ایک بڑا سا ہیبت ناک کتا لنگڑاتا ہوا ادھر آ نکلا۔ اس کے دائیں طرف کے کان پر کھجلی نکلی ہوئی تھی۔ اور کان کے بال جھڑ گئے تھے۔ وہ اپنی لال لال انگارہ سی آنکھوں سے چڑیا کو گھورنے لگا۔ چڑیا دم بخود ہو کر طاق میں بیٹھی رہی۔ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ اللہ میاں مجھے اس بلا سے نکال۔ اور جو نہیں نکالتا تو مجھ پر بجلی ہی گرا دے۔

دن بھر ننھی چڑیا طاق میں بیٹھی کانپتی رہی۔ اور اس کا دل اس زور سے دھک دھک کرتا رہا کہ معلوم ہوتا تھا۔ اب بند ہوا کہ اب بند ہوا۔

رات ہو گئی آسمان پر ستارے جھلملانے لگے۔ لیکن چڑیا ڈر کے مارے اُسی طاق میں بیٹھی رہی۔ اسے سخت پیاس بھی لگ رہی تھی۔ کہنے لگی "اے کاش، مجھے پانی کا ایک قطرہ ہی مل جاتا لیکن اگر میں اس طاق سے باہر نکلی تو بلی مجھے نوالہ ہی کر لے گی"۔

تب گھر کا ملازم لڑکا جھمن کڑوے تیل کا چراغ جلا کر اس طاق میں رکھنے آیا۔ چڑیا دبک کر کونے میں بیٹھی رہی۔ اور رات بھر "اے اللہ میں کیا کروں"۔ "اے اللہ میں کیا کروں"۔ اپنے دل ہی میں کہہ کر روتی رہی۔

آخر دوسرا دن نکل آیا۔ کسان کا لڑکا ادھر آنکلا اور اُسے چڑیا پر بہت ترس آیا۔ بولا "ارے ہے، بیچاری چڑیا کا کوئی پر ٹوٹ گیا ہے جو اڑتی نہیں۔ یہاں دبکی بیٹھی ہے۔"

یہ سن کر چڑیا کی زبان سے خوشی کی ایک چیخ نکل گئی۔ دفعتاً اُسے اپنے پروں کا خیال آگیا۔ اور وہ بے تحاشا آسمان کی طرف اڑتی ہوئی آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اسی طرح ہم بھی کبھی کبھی بھول جایا کرتے ہیں کہ ہماری روح کے بھی پر ہوتے ہیں جو ہمیں غم سے دور اُڑا کر لے جا سکتے ہیں۔

"مخزن"

محبّت

سمندر کو اپنے بے شمار موتیوں پر ناز ہے؛ آسمان کو اپنے درخشاں ستاروں پر فخر ہے، لیکن میرا دل! میرا دل محبت میں سرشار ہے۔ آسمان اور سمندر اپنی حیثیت میں عظیم ہیں، لیکن میرا دل ان سے عظیم تر ہے۔ گو ستارے اور موتی خوبصورت ہیں، لیکن میرے دل کی پُر نور شعاعیں ان سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔

محبت کیا ہے؟ "مشغلۂ بے کاری" دانشمندوں کا یہ ناصحانہ جواب ہے۔ کیا میں بھی اس جواب کی ہم نوائی کروں۔ فطرتِ صحیح کا جواب ہے "نہیں"۔ اے دانشمندو! احمقانہ وعظ ختم کرو، زمانہ نے تمہارے دلوں کو برف کی طرح شل کر دیا ہے۔ کیا تمہاری نصیحتیں مفید ہو سکتی ہیں؟ فطرت صحیح کا جواب ہے "ہرگز نہیں!!"

میں نے اپنے محبوب کے دل کا دروازہ کھٹکھٹایا، آواز آئی "کون ہے"؟ میں نے جواب دیا "میں ہوں"، لیکن دروازہ بند رہا، میں یاس وغم میں تڑپتا رہا۔ میں نے دوبارہ دروازہ پر دستک دی۔ صدا آئی "کون ہے"؟ میں نے کہا "تو ہے" اور دروازہ کھل گیا۔

"مکتبہ"

میرے بچّے کی قبر کہاں ہے

نپولین کی شجاعت پیوندِ خاک ہو چکی تھی لیکن اس کی ماں کی ممتا اس کو ڈھونڈ رہی تھی اور اس کے دل کی تڑپ کہہ رہی تھی کہ اے صحرا کے درختو! بتاؤ کہ میرے بچے کی قبر کہاں ہے۔ اُس نے بلند پہاڑیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس کی فوجوں نے مدتوں تمہارے سینہ کو پامال کیا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ نپولین کی قبر کہاں ہے۔ میرے بچے کی قبر کہاں ہے؟

زمانہ کا نشیب و فراز دیکھنے والے بلند پہاڑوں نے کہا کہ تو کس نپولین کو پوچھتی ہے۔ نپولین کی ماں نے کہا کہ میں اُس نپولین کو پوچھتی ہوں جس نے دنیا کو شجاعت کا درس دیا ہے جس کی تلوار نے مشرق و مغرب میں ایک کہرام مچا دیا ہے جس نے بڑی بڑی سلطنتوں کی حکومتوں کو پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ کوہستان کے ذرات نے خاک میں اُڑ کر کہا۔ ہم تیری گفتگو کا مطلب نہیں سمجھے۔ نپولین کی ماں نے کہا کہ کیا تم اس نپولین کو نہیں جانتے جس کی تلوار سے دنیا کی زمین کا چپہ چپہ آشنا ہے اور جس کی شجاعت کا جواب دنیا نہیں پیش کر سکتی۔

کوہستانی فضا میں بوڑھی عورت کی اس بات کے جواب میں قہقہہ بلند ہوا اور کسی نے کہا کہ ایسے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں نپولین اس دنیا میں دفن ہیں اور اس سے زیادہ بہادر اور جری جس کی تو تعریف کر رہی ہے ہمارے لئے اس کا پتہ چلانا دشوار ہے لیکن اگر تو یہ چاہتی ہے تو کسی ایسے مکان میں جا کر دعا کر جہاں آج تک کوئی نہ مرا ہو۔ ممتا کی ماری ماں نے ساری دنیا چھان ماری لیکن اسے ایسا کوئی گھر نہ ملا جہاں آج تک کوئی نہ مرا ہو۔ اور زمین کا کوئی حصہ اسے ایسا نہ ملا جہاں کسی کی لاش دفن نہ ہوئی ہو۔ وہ مایوسی سے تھک کر جنگل کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئی اور اُس نے کہا کہ نہ جانیں کتنی جانیں اولاد کے غم میں تڑپ رہی ہونگی اور کہہ رہی ہونگی کہ میرے بچے کی قبر کہاں ہے۔ لیکن اس کا سراغ چلنا نپولین کی فتح سے زیادہ دشوار کام ہے، کیونکہ دنیا سرائے فانی ہے۔

"دین و دنیا"

کبیر کے دوہے

جب تک زندگی ہے حق کی خواہش کرو۔ علم حاصل کرو، غور کرو کیونکہ زندگی ہی میں نجات کا حصول ممکن ہے اگر زندگی میں قیدیں نہ ٹوٹیں تو موت کے بعد نجات کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ روح محض اس وجہ سے

خالق کے ساتھ مل کر ایک ہو جائے گی کہ وہ جسم سے علیحدہ ہو چکی ہے۔ اگر حق اب نہ ملا تو مرنے کے بعد کب ملے گا اگر تم میں اور ذاتِ باری میں اس وقت اتحاد ہے تو آئندہ زندگی میں بھی اتحاد رہے گا۔ حقیقت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالو سچے رہبر کو پہچانو اور حقیقی نام پر ایمان رکھو۔ کبیر کہتا ہے کہ تلاش ہی مدد دیتی ہے اور میں تو اُس کا غلام ہوں جو جویائے حق ہے۔

اے دوست پھولوں کی کیاری میں نہ جا ہرگز نہ جا۔ خود تیرے جسم میں پھولوں کی کیاری ہو۔ پھول پھل کے لئے لگتا ہے اور جب پھل ظاہر ہوتا ہے تو پھول مرجھا جاتا ہے۔ مشک ہرن کی ناف میں ہوتا ہے لیکن وہ اسے اپنے پاس نہیں تلاش کرتا بلکہ گھاس کی فکر میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔ کنول کی ہزاروں پنکھڑیوں پر بیٹھ اور وہاں غیر محدود حسن کو دیکھ۔

اے بھائی مجھے بتا کہ دنیا کیونکر چھوڑوں۔ جب میں نے آرائش ترک کر دی تب بھی کپڑے استعمال کرتا رہا جب میں نے لباس ترک کیا تب بھی جسم کو اس کی تہوں میں چھپاتا رہا۔ اسی طرح جب میں جذبات کی قید سے آزاد ہوں تو دیکھتا ہوں کہ غصہ باقی رہتا ہے۔ اور جب غصہ بھی چھوڑ دیتا ہوں تو حرص باقی رہتی ہے۔ دل جب علیحدہ ہو جاتا اور دنیا کو تج دیتا ہے تب بھی اُس کے باطن سے ملا رہتا ہے۔ کبیر کہتا ہے میری بات سُن کہ اے پیارے عابد سچا راستہ کم ملتا ہے۔

"نیرنگ"

نیکی کی جانچ

کسی شے کو بغیر جانچ کے اچھا سمجھ لینا گویا خدا پر الزام لگانا ہے نیک آدمیوں کی جانچ ہمیشہ بذریعہ تکالیف اور مصائب ہوا کرتی ہے

اور وہ جو اپنی شہوتوں کو روک سکتا ہے اس کا دامن دوسری بدکاریوں سے پاک ہے عقل وقتاً فوقتاً اِس یا اُس برائی کا مقابلہ کرنے کے بجائے ایک ہی قوت میں پورا حملہ کر کے سب کو پسپا کر دیتی ہے۔

ایسا شخص بدنامی کا کیا خیال کرے گا۔ جو اپنی وقعت کسی کے کہنے سے نہیں بلکہ صرف اس روشن دل کی وجہ سے کرتا ہے جو اس کے سینہ کے اندر ہے۔

سینیکا

"مخزن"

مطبوعاتِ جدیدہ

تاریخ اخلاقِ یورپ جلد اول۔ یہ ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی کی مشہور کتاب "ہسٹری آف یورپین مارلس" کا ملخص اور آزاد اردو ترجمہ ہے جس میں فلسفہ، معاشرت، تمدن، مذہب اور اخلاق کے باہمی تعلقات پر قدیم یورپ کی تاریخ کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ لیکی کو حیاتِ اجتماعی کا مصور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں اُس نے بے حد وسعتِ نظر اور تلاش و تفحص سے کام لے کر قدیم یورپ کی اخلاقی زندگی کے جزئیات کا استقصا کرکے نہایت اہم نتائج نکالے ہیں، رومہ کی حیاتِ اخلاقی میں عہد بہ عہد جو تغیرات ہوتے رہے ہیں ان کے اسباب و علل کی بکمال دقتِ نظر تحقیق کی ہے اور ہر عاملِ موثر سے جو جو اثرات پیدا ہوئے ہیں انہیں تفصیل سے دکھایا ہے۔ حجم چار سو صفحات سے ہے اور قیمت تین روپے مقرر کی گئی ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن) سے طلب فرمائیے۔

اردو کہانیاں۔ مصنفہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم۔ ۴۲ صفحے کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں سولہ ننھی ننھی کہانیاں ہیں۔ یوں تو یہ کہانیاں زبان زد خاص و عام ہیں لیکن قاضی صاحب نے سید انشا مرحوم کی تقلید میں انہیں "ٹھیٹ ہندوی میں" لکھا ہے۔ تمام تحریر میں عربی یا فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا اس کے باوجود زبان نہایت پُرلطف ہے۔ قیمت فی جلد ۲ر۔ پتہ، قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم ہمکان مولوی فیض الدین صاحب وکیل، محلہ عابد شاپ، حیدرآباد (دکن)

پتھر سے ہیرا۔ ایک دلچسپ تبلیغی افسانہ ہے جسے ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی نے لکھا ہے جناب مصنف کا قول ہے کہ یہ ایک یتیم بچے کی سچی سرگزشت ہے جس میں نام تبدیل کردیئے گئے ہیں۔ والدین کے لئے بچوں کی تربیت کے معاملہ میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ حجم ۱۱۲ صفحات ہے قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ، مینیجر نظام المشائخ" پوسٹ بکس نمبر ۱۵ دہلی۔

"رسالہ کیمیکل سوسائٹی"۔ یہ رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے جاری ہوا ہے اس کے اجرا کی غرض یہ ہے کہ عوام الناس میں علم کیمیا سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ دوسرا نمبر ہمارے سامنے ہے۔ صفحات سو سے زائد ہیں جن میں نصف کے قریب اردو اور نصف انگریزی زبان کے مضامین ہیں۔ اس کے چند قابلِ ذکر مضامین یہ ہیں۔ بیماریوں کے جراثیم، دودھ کا امتحان، حقیقتِ مادہ، ہاضمہ اور کیمیائی تعامل۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین ہمایوں اسے دلچسپی سے پڑھیں گے اور [illegible] رسالہ سہ ماہی ۱۲ر ہے اور سالانہ چندہ دو روپے مقرر کیا گیا ہے۔

مشرقی لٹریچر مغرب میں کیونکر پہنچا

(سر ڈینی سن راس کے ایک مضمون کا ترجمہ)

اس امر کا تصور دلچسپی سے خالی نہیں کہ پندرھویں صدی میں یورپ کا ایک تعلیم یافتہ اور خواندہ آدمی ایشیا کی کیا خیالی تصویر قائم کئے ہوئے ہوگا، اور چین وہند کے متعلق اس کا مبلغ علم کیا ہوگا۔ ایشیائی جغرافیہ کے متعلق تو اس کے نظریے محض تخمیناً درست ہونگے مگر ایشیائی ممالک کے لوگوں کے متعلق اس کی واقفیت سرے سے صفر ہوگی، اُسے ہندومت اور بدھ مت کا کوئی علم نہیں ہوگا اور اس نے کنفیوشس یا راماین کا نام تک نہیں سنا ہوگا، چنانچہ مشرق کے متعلق جو عدم واقفیت یورپ پر مسلط تھی اُس کی تائید میں واقعۂ ذیل کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ جب پرتگیز راس امید کا چکر کاٹ کر ۱۴۹۸ء میں سرزمینِ ہند میں اترے تو اُن کا خیال تھا کہ ہندوستان میں واحد غیر عیسائی مذہب صرف اسلام ہے، چنانچہ اپنے ورود پر وہ ایک ہندو معبد میں داخل ہوگئے، اور اپنے مع الخیر پہنچنے پر خدائے برتر کا شکریہ اس خیال کے ماتحت ادا کیا کہ وہ ایک عیسائی گرجا میں ہیں جس کے پادری بظاہر راہِ رشد سے کسی حد تک منحرف ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں کی اسلام سے واقفیت بالکل طبعی تھی بالخصوص اس لئے کہ سرزمینِ سپین سے آخری مور صرف دس سال پیشتر دیس بدر ہوئے تھے۔ مگر مشرق سے وہ کلیتہً ناآشنا تھے۔ اس کے باوجود مشرق اس وقت سے کہیں پیشتر اپنے افسانوں کا انمول تحفہ مغرب کی نذر کرچکا تھا، جو ہندوستان سے دو بڑی بڑی قسطوں میں وارد ہوئے، ایک تو وہ جو لقمان نے سنہ عیسوی سے پیشتر مرتب کئے، اور دوسرے وہ جو تراجم کی وساطت سے، ازمنۂ وسطیٰ میں عربی سے عبرانی، یونانی، اور ہسپانوی زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ مگر ان زبان زد افسانوں کے ہندی الاصل ہونے کا احساس اُس وقت کیا گیا جب کہ لافان ٹین نے ۱۶۷۸ء کے ایڈیشن میں اس امر کی وضاحت کی کہ اس کی جدید نظموں کی اکثریت بیدپائے ہندی افسانوں پر مبنی ہے۔

تاہم جب ہم مغربی لٹریچر پر مشرق کے تشقیقی اثرات کا ذکر کرتے ہیں تو کوئی دوسری ایسی خصوصیت نہیں پائی جاتی جو یہودی کتبِ مقدسہ کے اثرات کے مقابلہ پر آسکے، جو زبان و معانی میں بالکل مشرقی ہیں۔ یورپ میں بائیبل سب چیزوں سے بڑھ کر پڑھی جاتی ہے، اور یہ ایک خاص بات ہے کہ انگریزوں کے ہاں کوئی اپنے اساطیر نہیں، کوئی ایسی شے نہیں جو بس اوثان و اصنام کی جانب منسوب کرے۔ ان کے ہاں زیادہ سے زیادہ شاہ آرتھر اور اس کی گول میز کا افسانہ ہے

جس میں یقیناً فوق العادۃ امور داخل ہوگئے ہیں۔ مگر دوسرے شمالی لوگوں مثلاً اہلِ سکنڈے نیویا اور اہلِ جرمنی کے اپنے باضابطہ اور خصوصی اساطیر ہیں جیسا کہ ان سے پیشتر یونانیوں اور رومنوں کے ہاں موجود تھے۔ ان اساطیر کی نمائش پہاڑیوں، وادیوں، اور دریاؤں پر ہوتی ہے جن سے کہ یہ لوگ مانوس ہیں، لیکن حکایات جن پر انگریز بچوں کی تربیت ہوتی ہے تو وہ عہد نامۂ قدیم کی کہانیاں ہیں جن کا تعلق محض تمدنی اور اقلیمی حالات سے ہے اور جو اُن حالات سے بالکل مختلف ہیں جن سے کہ انگریز اپنے ملک میں مانوس ہیں۔ چنانچہ ہر حکایت کی تشریح بطور واقعۂ دخیل کے کرنی پڑتی ہے اور ایسے لوگوں کی تصاویر دکھانی پڑتی ہیں جو غیر مانوس مشرقی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ امر محض فطرتی ہے کہ بائبل نے ان جزائر کی زبان اور لٹریچر کی تشکیل میں خاص طور پر بڑا کام کیا ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ مشرق نے مغرب پر اپنے ادب و فنون کا اظہار نہایت تمہل سے کیا، اور یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ ایشیائے مشرقی کی صدہا سالہ تجارت مشرقی تثقیف و تہذیب کا کوئی حصہ اپنے ہمراہ نہیں لائی، اور نہ ہی مشرق و مغرب کے شخصی اختلاط میں خواہ وہ سیاسی ہو یا فوجی یا کاروباری، کوئی ایسا قرینہ پایا جاتا ہے جس نے مہذب دنیا کے ان دو نصفوں میں کوئی باہمی تشخص پیدا کیا ہو۔ قدیم ترین زمانوں سے چین اپنا ریشم تجارتی راہوں سے ایران میں بھیجتا رہا جہاں سے پھر وہی ریشم یورپ میں جاتا، مگر یورپ کو چین کے متعلق تیرہویں صدی کے وسط تک عملی طور پر کوئی علم نہیں تھا، سوائے اس کے کہ چین ایک ایسا ملک ہے جہاں سے ریشم آتا ہے۔

ساتویں صدی میں فتحمند عربوں نے یورپ پر حملہ کیا اور اس حملہ کا نتیجہ ایک حیرت انگیز کیفیت تھی، جس کی رو سے یورپ کے اکثر لوگ اسلامی حکومت کے تحت میں آگئے، یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے مشرق و مغرب کے عام مفہوم کے ضمن میں، اور موجودہ سیاسیاتِ یورپ پر ترکی اثرات کی ذیل میں، ہم بیشتر فراموش کر دیتے ہیں۔

قسطنطنیہ پر عربوں کا پہلا حملہ ۶۶۸ء میں واقع ہوا یعنی حضرتِ محمد کی ہجرتِ مکہ کے صرف چھیالیس سال بعد۔ آٹھویں صدی کے وسط سے پیشتر عربوں نے تمام کا تمام سپین اور پرتگال فتح کر لیا، اور یہ صرف چارلس مارٹل کی ذات تھی جس نے اُن کی پیش قدمی کا سلسلہ ٹورز اور پاٹیرز کے مابین روک دیا۔ سرزمینِ یورپ میں عربوں کی موجودگی کی اہمیت جو اپنی مادی اور دماغی طاقتوں کے کمال پر پہنچے ہوئے تھے، ہم ایسے وقت میں قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتے جب کہ یونان و روما کی تہذیب قریب قریب کالعدم ہو چکی تھی، اور جنوبی یورپ میں اُن کی جگہ نئی اقوام لے رہی تھیں۔ پانچویں صدی کے خاتمہ سے پیشتر روما کی سات پہاڑیوں پر قائم شدہ سلطنت کی مستحکم تعمیر آخر کار مغربی یورپ کے گوشہ گوشہ میں شمال کی غیر مہذب اقوام کے ہاتھوں منہدم ہو چکی تھی، جن کی غیر معمولی طاقت اور ان گنت تعداد کا مقابلہ محض محال تھا۔ مذکورہ حملہ آور اپنے

ہمراہ سوائے جسمانی طاقت کے تحفہ کے اور کچھ نہ لائے، اور یہ امر خلافِ توقع تھا کہ وہ مفتوحہ علاقوں کے علم و فن یادگاروں کی قدر شناسی کا کوئی ثبوت پیش کرتے، چنانچہ ۸۰۰ء تک ہمارے سامنے کوئی ایسی نمایاں شخصیت نہیں آتی جس نے ماسبق کی اہمیت کا اندازہ کیا ہو۔ شمالی اقوام کے مابین اشاعتِ عیسائیت نے جس کا آغاز پانچویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ ہوا کلیسائی طبقہ کے علاوہ ان فاتح طبقات پر کوئی خوشگوار اثر پیدا نہیں کیا، اور یہ صرف چارلی مین کی ذات تھی جس نے پہلے پہل اپنے لوگوں کی وحشیانہ عادات اور طبعی بغاوت کو قومی اصلاح کے نظریوں سے مانوس کرنے کی سعی کی۔

بلاشک و شبہ، مشرق کا انگلستان پر اولین براہِ راست اثر، اہلِ انگلستان کا حروبِ صلیبیہ میں اشتراک تھا، جس نے یورپ کی آنکھیں اُس تہذیب پر وا کر دیں جس کا اہلِ یورپ کو خیال تک نہیں تھا۔ مشرقِ ادنیٰ و متوسط کی وہ تصویر جو عام لوگوں کے ذہن میں بارھویں صدی میں محفوظ تھی غالباً سرے سے غلط تھی۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ لٹریچر کی وساطت سے اسے مصر و ایران اور ہندوستان جیسے ممالک کے ناموں سے واقفیت تھی اور بائبل کے ذریعہ سے اُسے فلسطین اور عراق و عرب کے متعلق کچھ نہ کچھ علم تھا مگر اُن واقعات کے متعلق جو ان ملکوں میں سلطنتِ روما کے زوال کے بعد رونما ہوئے اُسے غالباً کوئی علم نہیں تھا، سوائے اس مزعومہ امر کے کہ ساتویں صدی میں ایک جھوٹا (نعوذ باللہ من ذالک) پیغمبر محمد نام کا پیدا ہوا ہے جو ان دنوں عیسائیوں اور یہودیوں کے مقاماتِ مقدسہ پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ اس وقت عام طور پر لوگوں کا گمان اغلباً یہ تھا کہ محمد کے پیرو کار وحشی عرب ہیں، جن کے ہاں بہت کم یا سرے سے کوئی تہذیب و شائستگی نہیں۔ انہیں یقیناً کسی ایسے دربار کا خیال نہیں تھا جس کا صدر الصدور ایک بہادر اور مہذب حاکم ہے اور جس کے ہاں اکثر ممالک کے اہلِ علم و فن بکثرت آتے جاتے ہیں چنانچہ اُس حیرتِ مطلق کا تخیل محض محال ہے جو اولین صلیبی جنگ آزماؤں کو اُس وقت لاحق ہوئی جب کہ انہیں ان برائے نام جاہلوں کی اہلیت کا علم و احساس ہوا۔ اس قسم کے جو جنگ آزما یونان و اٹلی کی سرزمین سے گذرے انہوں نے محسوس کیا کہ ان ملکوں کی پہلی شان و شوکت جا چکی ہے، مگر جب انہوں نے سرزمینِ شام میں قدم رکھا تو ایک ایسی طاقت کو اپنے جوبن پر پایا جس کا انہیں خواب و خیال تک نہیں تھا۔

درحقیقت یورپ میں مشرق کے متعلق ذخیرۂ معلومات لانے کا ذریعہ صلیبی جنگجو ہی تھے، مگر یہ ذخیرہ محض محدود تھا جو جغرافی حیثیت سے صرف فلسطین، شام اور مصر تک مفید تھا، اور تنقیدی حیثیت سے اُس کی اہمیت یا تو بہت کم تھی، یا سرے سے تھی نہیں۔ صلیبی جنگ آزماؤں کو بادیہ نشینوں سے تعلم کی کوئی خواہش نہ تھی، بلکہ وہ صرف انہیں یروشلم سے خارج کرنا چاہتے تھے، اور حتی الامکان انہیں ملیامیٹ کر دینے کے متمنی تھے۔

سرزمین سپین پر متمکن ہونے کے بعد باقی یورپ پر عربوں کا فوری اثر مقابلتہً خفیف تھا، چنانچہ نویں اور دسویں صدی میں ہمیں ایسی بہت کم شخصیتوں کا علم ہے جن کا علمی مشغلہ عربی زبان کی تحصیل ہو اولین مثالوں میں سے نہایت مشہور مثال پوپ سلوسٹر ثانی (گربرٹ، رہیمس کے اسقفِ اعظم) کی ہے، جس نے دسویں صدی کے خاتمے اور گیارھویں صدی کے آغاز میں بحیثیت ایک عالم و فاضل کے خاصی شہرت حاصل کی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسے عربی اور عبرانی زبانوں میں زبردست مہارت حاصل تھی۔ پوپ سلوسٹر کے بعد فریڈرک ثانی کا نام ہے جو ۱۲۵۰ء میں فوت ہوا۔ فریڈرک ثانی باربروسا اعظم کا پوتا تھا، اور اسے ازابلا دخترِ شاہِ جان کا خاوند ہونے کی حیثیت سے انگلستان سے گہرا تعلق تھا" فریڈرک نے عربی تصانیف کے مطالعہ اور ترجمہ کی ترویج کے لئے بہت سا کام کیا۔ وہ میکائیل سکاٹ کا مربی تھا جس نے بوعلی سینا کی "نیچرل ہسٹری" کا ترجمہ کیا۔ یہ امر تو ظاہر نہیں ہوتا کہ قرطبہ یونیورسٹی کے بہت سے فضلا نے باقی یورپ کا سفر کیا ہو، مگر اس قدر یقینی ہے کہ بہت سے یورپین فضلاء بالخصوص ڈینٹے کے استاد برونیٹو لیٹنی جیسے مورش سپین کے عربوں اور یہودیوں کے زیرِ نگرانی تعلم کے لئے گئے مگر ان تمام امور کے باوجود یہ صرف صلیبی جنگ آزماؤں کی ذات تھی جس نے پہلے پہل یورپ کو اسلام سے حقیقی طور پر روشناس کرایا۔ جب پیٹر راہب نے ۱۰۹۶ء میں پہلی صلیبی جنگ کی تبلیغ کی تو وہ تثقیف جو براہِ راست عیسائیت سے منسوب ہو سکتی ہے اُس وقت تک صرف کلیسا تک محدود تھی، اور عیسائی یورپ ابھی بچپن کے ابتدائی زمانہ میں خیال کیا جاتا تھا، بحالیکہ اسلام جو ۶۰۰ برس پیشتر منصۂ شہود پر آیا، اس وقت سے قبل اپنے سیاسی عروج پر پہنچ چکا تھا، اور لٹریچر کا ادبی دور گزار چکا تھا۔ سنہ عیسوی کی ابتدائی دس صدیوں میں خلافتِ عربیہ کے ارتقا کی سرعت اور ترقیٔ عیسائیت کی سست عنصری کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں کیونکہ اس مقابلہ سے اس امر کی توضیح ہوتی ہے کہ کیونکر ہزار سالہ عیسائی ملوکیت کی نمایندہ امارت نے، ایسی شان و تہذیب سے محیط امارتِ اسلام کا مشاہدہ کیا جس کی نظیر انہیں اپنے گھروں میں نہیں ملتی تھی +

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صلیبی جنگ آزما جو انگلستان واپس آئے کس قسم کے اثرات اپنے ہمراہ لائے اولاً تو ہم یہ امر تسلیم کر سکتے ہیں کہ اُن کی ذہنی کیفیت بہت حد تک وسعت پذیر ہو چکی تھی، اور وہ محسوس کرنے لگ گئے تھے کہ بادیہ نشین گو منکرِ عیسائیت ہیں لیکن دوسرے پہلوؤں سے وہ ایسے ہی اچھے انسان ہیں جیسے کہ وہ خود۔ بہادری میں اُن کے برابر، اسلحہ میں ان کے ہم پلہ اور عشرت و امارت پسندی میں اُن سے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک عجیب امر ہے کہ صلیبی لڑائیاں جو ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ تک جاری رہیں، بطورِ خود ملک گیری کے کسی مزید اقدام کا موجب نہ بنیں اس لئے کہ اہلِ انگلستان نے مشرق میں اٹھارہویں صدی کے وسط سے پیشتر کسی قسم کی فوجی پیش قدمی شروع

نہیں کی۔ یہاں تک کہ مذہبی مقاصد کی جگہ تجارتی اغراض نے لے لی۔ علاوہ ازیں راس امید کی مشرقی راہ کے انکشاف کے وقت تک بحیرۂ متوسط سے باہر تجارت کا کوئی عندیہ نہیں تھا۔ لہٰذا ہم اس امر کا دعوی کر سکتے ہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے انگلستان کے مشرق سے تعلق کا نتیجہ محض عیش وعشرت، نمایش اور امارت کا اظہار تھا۔ چنانچہ اس دور میں انگلستان پر کسی تشقیقی اثر کا نشان نہیں ملتا کیونکہ چند ابتدائی تراجم کے قطع نظر (مثلاً میکائیل سکاٹ کی بو علی سینا کی نیچرل ہسٹری) یہ صرف علوم وفنون کی عام تجدید کے بعد تھا کہ عربوں کا سائنس او فلسفہ لاطینی زبان کی وساطت سے اہل تدریس کے علم میں آیا۔ تاہم یہ امر طبعی ہے کہ مسلمانوں کے تشقیقی پہلو نے صلیبیوں پر کوئی اثر پیدا نہیں کیا، اس لئے کہ ان کے ہاں مذہبی اشتعال سے قطع نظر سوائے جنگ آزمائی کے اور کوئی مقصد نہیں تھا،

بارھویں صدی کے وسط میں یورپ میں افواہ اڑی کہ کہیں اسلامی سلطنت کی حدود سے باہر ایک عیسائی شہر آزما مسمی پیر سٹر جان رہتا ہے جس نے بادیہ نشینوں کو تباہ کن شکست دی ہے۔ اس افواہ نے اس امر کی امید دلائی کہ صلیبیوں کو ایک ایسا اتحادی مل گیا ہے جو مخالفین پر دوسری جانب سے حملہ کرے گا مگر اس امید نے عملی جامہ کبھی نہ پہنا اس لئے کہ یہ افواہ مغالطہ پر مبنی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۱۴۱ء میں سلجوق حکمران کو ایک ترکی شہزادہ کے ہاتھوں جس کی فوج میں بہت سے عیسائی ترک تھے شکست ہوئی، مگر ان ترکوں کو صلیبی جنگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، جن کے متعلق بہت ممکن ہے کہ انہیں کبھی کوئی اطلاع نہ ہوئی ہو +

یہ صرف تیرھویں صدی کے وسط میں مغلوں کا مشرقی یورپ پر حملہ تھا، اور اپنے وسط ایشیا کے گھروں میں ان کی فوری واپسی تھی جس کا نتیجہ مشرق ادنیٰ سے اتر کر ایشیا کا حقیقی انکشاف ہوا، اور جس نے چین کا خشکی کا راستہ کھول دیا۔ اُس وقت مشنری پادری لوگوں اور تاجروں نے اس امر کے انکشاف کی خاطر سفر کرنا شروع کیا کہ یہ عجیب و غریب اور ناقابل شمار مغل حملہ آور کہاں سے آتے در آنحالیکہ ساتھ ہی انہیں پیر سٹر جان سے ملنے کی امید بھی تھی۔ چنانچہ جو بیانات یہ لوگ اپنے ہمراہ لاتے، نہایت اشتیاق سے پڑھے جاتے تھے، اور ان میں سے سب سے زیادہ مطلع نہیں تو کم از کم سب سے زیادہ مشہور ومعروف مارکوپولو کا بیان ہے۔

مارکوپولو وینس کا شہری تھا جو قبلا خاں کے عہد میں شہر پیکنگ میں پہنچا اور کئی سال تک چین میں اقامت پذیر رہا اور اسی دوران میں مغل شہنشاہ کے زیر حکومت اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ بالآخر وہ ایران کی راہ اپنے اصلی وطن کو مراجعت کر گیا جہاں وہ سمندر کے راستے ۱۲۹۵ء میں پہنچا۔

وینس پہنچنے پر مغل لباس میں ملبوس نو وارد کو اُس کے ہم وطن پہچان نہ سکے، یہاں تک کہ اُسے خود اپنے مکان

میں بدقت داخلہ نصیب ہوا۔ مارکو پولو کے "اسفار" ہمیشہ غیر معمولی ہر دلعزیزی کا باعث بنے رہے ہیں، اور چین کے متعلق یورپین استعجاب کی ابتدا بمقابلہ کسی دوسری کتاب کے صرف اسی سفرنامہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

مگر مشرقی "اسفار" کے متعلق کوئی تصنیف ہر دلعزیزی میں اُس کہانی کا مقابلہ نہیں کرسکی جو سر جان منڈیول نے تالیف کی ہے اور جو مارکو پولو کے تقریباً پچاس سال بعد معرضِ ظہور میں آئی۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب کا نفسِ مضمون صرف مشرقِ ادنیٰ تک محدود ہے مگر بوجہ اپنے انتہائی غلو کے اُسے مطالعہ کرنے والے پسند کرتے تھے اور صدیوں تک اُسے حالات کا حقیقی مرقع خیال کیا جاتا تھا۔ مگر جدید تحقیق کی روشنی میں یہ امر مشکوک ہے کہ آیا منڈیول فلسطین سے آگے بڑھا بھی یا نہیں، اور یہ محض اسی نوعیت کی کتابوں کی وجہ سے کہ قدیم نقشہ کاروں کو اس بات کی ترغیب ہوئی کہ وہ ممالکِ غیر منکشفہ کے نقشوں میں خیالی باشندے دکھائیں ـــــ ایسے باشندے جن کے دو سر ہوں یا تین ٹانگیں اور علیٰ ہذا القیاس، یا اژدہاؤں کے سے خوفناک درندے۔ غلط افواہ کے برقی خرگوشوں پر حقیقت کے سکھاتے صید افگن کا غلبہ شاذونادر ہی ہوتا ہے، اور اگر ایسے خرگوش گرفت میں آ بھی جائیں تو خرگوش وسگ ہر دو کو حرمان و یاس اور رنج والم کا سامنا ہوتا ہے۔ بہرحال اس وقت سے آگے مشرقی "اسفار" کی کتابیں پڑھی جانے لگیں اور پرتگیزوں کی ہندوستان اور ابی سینیا میں ابتدائی پیش قدمیاں بے شمار نفیس و غریب بیانات کا موجب بنیں۔ چنانچہ ڈاکٹر جانسن کی پہلی شائع شدہ کتاب اب پولو کے اسفارِ ابی سینیا کا ترجمہ تھا جس پر بعد میں سیلاز کی کہانی کی تعمیر ہوئی۔

لیکن مشرق کے حقیقی حکایت نامہ کا انکشاف یورپ پر "الف لیلیٰ" کے ترجمہ کی وساطت سے ہوا۔ یہ ترجمہ جس کا اظہار پہلے پہل فرانسیسی میں اور عین بعد انگریزی میں ہوا بعض کو الف میں یورپ کے لٹریچر کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ تھا۔ ہمارے لئے جو بچپن سے "دریش نیلگوں" "علی بابا اور چالیس چور" کی حکایات سے مانوس ہیں اُس استعجاب کا اندازہ لگانا مشکل ہے جس سے یورپ والوں نے ان مسرت آمیز کہانیوں کا استقبال کیا۔ انہیں کہانیوں نے ان لوگوں کا خلفا، شیوخ، جنات اور عفاریت کی ایک نئی دنیا اور اس قسم کے محلات اور ضیافتوں سے تعارف کرایا جن کا انہیں خواب و خیال تک نہیں تھا۔ ان حکایات نے بغداد و مصر کو محبت و نفاق اور عجائبات کے کرشموں سے ازسرِ نو زندہ کر دکھایا۔

ان حکایات کی عربی اصل کو اول اول ایک فرانسیسی مسمی گیلنڈ نے جو محکمۂ سیاسیات کا ملازم تھا دمشق میں پایا، اور بعد میں اُن کا ترجمہ بھی شائع کیا جو متعدد انساط میں ۱۷۰۴ء اور ۱۷۱۷ء کے مابین اشاعت پذیر ہوا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد لندن میں ایک گمنام انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ ان حکایات کو فوری کامیابی حاصل ہوئی چنانچہ سر جیمس سٹیورٹ، سکاٹ لینڈ

کے لارڈ ایڈووکیٹ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے ایک ہفتہ کی شام کو اپنی لڑکیوں کو "الف لیلیٰ" پڑھتے دیکھا سر جمیس نے اُن سے کتاب چھین لی، مگر دوسری صبح خود لارڈ ایڈووکیٹ اپنی لائبریری میں اس حالت میں سوتے پائے گئے کہ کتاب اُن کی بغل میں تھی، یعنی یہ کہ وہ اس کتاب کو سبت کے دن طویل عرصہ تک پڑھتے رہے تھے۔

تاہم اُس زمانہ تک جب وارن ہیسٹنگز ہندوستان کے گورنر جنرل بنے اس سرزمین کی قدیم زبان اور لٹریچر نے مغربی اہلِ علم کی خاص توجہ حاصل نہ کی۔ وارن ہیسٹنگز کا یہ خیال صحیح تھا کہ ہندوستانیوں پر انصاف و ہمدردی سے حکومت کرنے کے لئے ان کے اپنے قوانین اور رسوم سے واقفیت حاصل کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ سنسکرت لٹریچر کی تشریح کے بلند پایہ کام کے ضمن میں دو ممتاز نام سر ولیم جونز اور کول برک ہیں۔ سر ولیم جونز تو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا بانی ہے، اور کول برک نے سنسکرت کے کئی متون شائع کئے۔ ان انگریز فضلا نے جس کام کی ابتدا کی فرانس اور جرمنی کے فضلا انہماک سے اُس کے درپے ہو گئے، اور علم الالسنہ (فلالوجی) کی بنیاد ڈالی گئی۔ تاہم یہ صرف ایف ڈبلیو میکس ملر کتبِ شرقیہ کا ایڈیٹر تھا، جس نے عہدِ وکٹوریا میں سنسکرت لٹریچر اور فلالوجی کی ترویج کی خاطر ہر دوسرے فاضل سے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔

جونہی کہ لوگوں نے سنسکرت زبان میں ضبط شدہ لٹریچر کی فراہمی اور مطالعہ کا کام شروع کیا، انکشافات کے وسیع اور جدید میدان کھل گئے، اور مذہب و فلسفہ کے علوم میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ ہمارے لئے یہ امر مشکل ہے کہ ہم اُس اثر کی تشخیص کریں جو یورپ کے فضلا پر ایک قدیم ثقیف و تہذیب کے انکشاف سے مترتب ہوا ——— ایسی ثقیف و تہذیب جس کے وجود کا انہیں علم تک نہیں تھا، جو بلند پایہ ادبی اور فلسفیانہ نوعیت کی بے شمار تصانیف پر مشتمل تھی اور جو اعلیٰ صنف کی شاعری اور ڈراما کے علاوہ، دماغی اور اخلاقی علوم اور فنون و قانون سے متعلقہ وسیع تصانیف پر حاوی تھی، چنانچہ بعض پہلوؤں میں اُس کی کامیابی یونانیوں کی کامرانی سے حقیقۃً پیش پیش تھی۔

متقابل فلالوجی کا باقاعدہ مطالعہ جس کا حصول سنسکرت کے انکشاف سے ممکن ہو گیا اُن تمام مروّج نظریوں کے مکمل اعادہ کا موجب بنا، جو بنی نوعِ انسان کی اصل سے متعلق تھے یعنی ایسے نظریے جو اس وقت تک شہرِ بابل میں اختلافِ السنہ کے افسانہ پر مبنی تھے۔ اس طرح پر مشرق نے، جس نے خود کو مغرب پر اس تمہل سے منکشف کیا، آخر الامر اپنے سب سے گراں مایہ راز یعنی ہندوستان کو عیاں کیا۔

فیض احمد

نشاطِ رُوح

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

ہوں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی
جلووں کے اژدحام نے حیراں بنا دیا

یُوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یُوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

کچھ شورشوں کی نذر ہوا خونِ عاشقاں
کچھ جم کے رہ گیا اُسے حرماں بنا دیا

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن
آج اُس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انہیں انساں بنا دیا

ہم اُس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی
جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا

کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہلِ ہوش کے
ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا

اِس طرح کی جنوں میں یہاں زندگی بسر
خود زندگی کو میں نے پشیماں بنا دیا

اصغر گونڈوی

نوا ہائے راز

تم مونس و غمخوارِ دل و جانِ حزیں ہو
ہوتا ہے فلک مجھ سے اگر بر سرِ کیں، ہو

اُس رُخ کے تصوّر سے فراغت نہیں اک دم
تم دُور ہو آنکھوں سے مگر دل کے قریں ہو

ہر چند نہیں ربط مرے جسم کو جاں سے
تم ہی ہو مری جان، مری جان تمہیں ہو

بستے ہو مرے دل میں کم آمیز ہو پھر بھی
رہتے ہو مری آنکھ میں اور پردہ نشیں ہو

الفت ہے مرا دیں، وفا ہے مرا ایماں
تم ہی ہو مرا دیں، مرا ایمان تمہیں ہو

تم زینتِ گیتی ہو، تم آرائشِ جنّت
بے شبہ تمہیں خاتمِ ہستی کا نگیں ہو

گھر گھر میں ہے چرچا مری وارفتہ دلی کا
اے کاش تمہیں بھی مری الفت کا یقیں ہو

حامد علی خاں

ڈارون

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم

موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم گر نہ روم نیستم

یوں تو جس کے بدن میں روح ہے زندہ کہلاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی عمل کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ اگر کالبدِ خاکی اور روح کی عارضی مصاحبت ہی کا نام زندگی ہو، تو ایسی زندگی کو دور سے ہمارا اسلام! عمل ہی کی جاودانی ضیا پاشی ہے جس نے صدہا ہستیوں کو موت کی "تاریکیٔ غفیر" میں بھی روشن سے روشن تر بنا دیا ہے اور آج ہم نہایت احترام کے ساتھ اُن کا نام لیتے ہیں اور اُن کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں۔ جو لوگ مستقل مزاجی سے جادۂ جد و جہد پر گامزن رہتے ہیں، یقیناً کامیابی و فتح انہیں کا حق ہے "من جد وجد" پر دل سے یقین رکھنے والے ہمیشہ شادمانی و کامرانی سے دوچار ہوتے ہیں اور اپنی مساعیٔ پیہم سے منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔ عمل ہی کے خوشگوار نتائج ہیں کہ نپولین، شیکسپئر، فردوسی، غزالی، فاروق، نیوٹن، سرسید، کالیداس وغیرہ ہزاروں ہستیاں حیاتِ جاوید حاصل کر چکی ہیں۔ فی الواقع کوشش، گو اس کے نتیجے تیر بہدف نہ ہوں، ایک مستحسن مشغلہ ہے۔ ڈارون نے اپنی تمام عمر علمی تحقیقات میں صرف کر دی، اپنے جدید نظریہ سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور گو سائنس کے ماہرین اس کے نظریۂ "ارتقا" کو غلط ثابت کر رہے ہیں تاہم وہ قابلِ وقعت ہے کہ اُس نے اپنی ان تھک کوششوں کی ایک درخشاں مثال قائم کر دی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ عمل کے ذریعہ سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے۔

انگریزی مدارس کے طلبہ ڈارون اور اس کے نظریۂ ارتقا سے ضرور آشنا ہونگے آج ہم بر سبیلِ اختصار ڈارون کے حالاتِ زندگی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

ڈارون ۱۲۔ فروری ۱۸۰۹ء کو بمقام شروزبری پیدا ہوا تھا۔ اس حساب سے ڈارون کو پیدا ہوئے ایک سو بیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کا باپ مقامِ مذکور میں طبابت کیا کرتا تھا۔ ڈارون میں جو قابلِ توصیف ذہانت اور اشتیاقِ تحصیل تھا، وہ دراصل اسے میراث میں ملا تھا۔ والد کی جانب سے وہ شہرۂ آفاق عالم ارزمس ڈارون کی اولاد میں سے تھا اور والدہ کی طرف سے اُسے جوشیا وجوڈ کی ذریات میں ہونے کا فخر حاصل تھا۔ یوں تو علم و فن کے ہر شیدائی کو صدقِ شوق کی وجہ سے مقصد برآری میں سہولت بہم پہنچ جاتی ہے مگر قلیل وقت میں بہت کچھ

حاصل کرلینا بسا اوقات گرد و پیش کے ماحول کا مرہونِ منت ہوا کرتا ہے۔ اسی شاندار ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی وجہ سے اُسے اپنے علمی کارناموں کے اظہار کے لئے اور تحقیق و تفتیش کے شوق کو پروان چڑھانے کے لئے کافی مواقع بہم پہنچ گئے تھے۔ پس اس کے فطری شوق نے فطری ماحول کے زیرِ اثر وہ کر دکھایا کہ باید و شاید۔

اُس نے ابتدائی تعلیم اپنے ہی قصبے میں حاصل کی۔ خوش نصیبی سے ڈارون کو قابل مصنف و لائق عالم بشپ بٹلر کا سایہ نصیب ہوگیا، بدیں سبب وہ اپنی جوانی کے تشویشناک و تغیر خیز زمانہ میں بھی جادۂ اخلاق سے نہ ہٹا۔ اس کے علاوہ بری صحبت کے زہریلے اثر سے بھی وہ مامون رہا۔ ۱۸۲۵ء میں ڈارون مزید تعلیم کے حصول کی خاطر جامعۂ ایڈنبرا میں داخل ہوگیا۔ یہ وہی یونیورسٹی ہے جہاں اس کے فاضل دادا اریزمس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ڈارون یہاں ۱۸۲۶ء کے آخر تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ یہاں ڈارون نے اپنے فطری کمالات کا بدرجۂ اتم اظہار کر کے بہت بڑی ناموری حاصل کرلی۔ ۱۸۳۱ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۸۳۷ء میں ایم اے کا ڈپلوما نہایت سرفرازی کے ساتھ حاصل کرلیا۔ بی اے اور ایم اے کے درمیان جو مدتِ مدید حائل نظر آتی ہے، اسے ڈارون نے رائگاں نہیں جانے دیا، بلکہ اسی عرصہ میں اُس نے وہ اہلیت و مہارتِ تامہ بہم پہنچائی جس پر اس کی آیندہ کی حیرت انگیز و انقلاب زا شہرت و ناموری کی مستحکم عمارت بشان و جلال قائم ہوئی۔ اسی زرّیں وقت میں اُس نے علمی تحقیقات میں ایسی نمایاں جدوجہد کی کہ علمی مسائل کے عقدہائے لاینحل اس کے سامنے کھل گئے۔ اور وہ مسرت آگین و امید افزا کوششوں کے ساتھ اپنے علمی کارناموں کی جلا میں منہمک ہوگیا۔

ڈارون کو لومڑی کے شکار کا بڑا شوق تھا۔ بعض کا قول ہے کہ انہیں شکارگاہوں نے اس کی قوتِ مشاہدہ میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ پیش آیا: اس سال آنجہانی ملکہ وکٹوریا کا جہاز "بیگل" کپتان فشز رائے کی زیرِ نگرانی ساری دنیا کی سیاحت کے لئے تیار ہوا۔ کپتان موصوف نے جہاز کا ایک کمرہ اس شخص کے لئے مقرر کردیا تھا جو ماہرِ فطرت ہو۔ بھلا ایسے موقع پر ڈارون کے سوا کون سی ہستی میدانِ مقابلہ میں آسکتی تھی؟ جہاز مذکور ۲۷ دسمبر ۱۸۳۱ء کو انگلستان سے روانہ ہوا اور ۲۸ اکتوبر ۱۸۳۶ء میں واپس آپہنچا۔ اس عرصہ میں ڈارون نے تحقیقِ فطرت و مشاہدۂ قدرت کے شعبوں میں جو جو تحیر خیز کارنامے انجام دیئے وہی درحقیقت اسے حیاتِ جاوید بخشنے کے ذمہ دار ہوتے۔ ڈارون سے پہلے اسی غرض کی تکمیل کے لئے بہت سی سیاحتیں ہوئیں، مگر ڈارون کی انفرادی مساعی سب پر سبقت لے گئیں۔

اتنے گرانبہا تجربات حاصل کرنے کے بعد ڈارون نے ایک نہایت مفید کتاب Nationalist's Voyage Round the World لکھ کر سائنس کی دنیا میں ایک زبردست گھماگھمی پیدا کردی۔ منجملہ دیگر خوبیوں کے کتاب مذکور کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس میں سائنس ایسے یابس مضمون کو ایسا دل کش و دلچسپ جامہ پہنایا ہے کہ ایک شوقین طالب علم ڈارون کے کمالات کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈارون نے اپنی کتاب میں سائنس کی اصطلاحات سے حتی الامکان اجتناب کیا ہے اور یہی خوبی اس کی دوسری کتابوں میں جلوہ گر ہے۔

مذکورالصدر سفر کے اہم ترین نتائج میں اول نمبر اس کے نظریۂ ارتقا کا ہے۔ پہلے پہل یہ نظریہ ڈارون کے دادا کے حاشیۂ دماغ میں رونما ہوا تھا، مگر یہ ڈارون ہی تھا جس نے اسے حدِ کمال پر پہنچا کر سائنس کے کیمپ میں ہلچل ڈال دی۔

۱۸۳۹ء میں اُس نے اپنی ماموں زاد بہن ایما وجوڈ سے شادی کرلی اور ۱۸۴۲ء میں کینٹ میں بود و باش اختیار کی اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔

اس کے اخلاق و عادات نہایت معصومانہ سادگی پر مشتمل تھے۔ ان میں ایسا جادو بھرا تھا کہ ہر کس و ناکس اس کا گرویدہ نظر آتا تھا۔ اس کی رفتار، خیالات اور گفتگو میں لطافت، نفاست، جہااور پاکیزگی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ باوجودیکہ وہ عالمِ متبحر تھا، اسے اپنے فضل و کمال کا ذرہ برابر بھی گھمنڈ نہ تھا اور در اصل انہیں خوبیوں کی وجہ سے اس نے ہر شخص کا دل موہ لیا تھا۔ ڈارون ہر ایک کی بات بخندہ پیشانی سنتا اور ہر ایک کی امداد کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔

باوجودیکہ ڈارون کا نظریہ غلط ثابت کیا جا رہا ہے، اس کے نظریہ نے تحقیقات و تفتیشات کا راستہ صاف کردیا ہے اور سائنس کے متعدد اہم اور دقیق مسائل کو حل کرکے صدہا عوائق کا سد باب کردیا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس پر ڈارون کی تحقیقات کا اثر نہ پڑا ہو: مذہب، اخلاق، تعلیم، قانون وغیرہ۔ ڈارون کا سب سے زیادہ اثر جرمنی پر پڑا ہے، جہاں اس کے نام لیواؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

ڈارون آج دنیا میں نہیں ہے، مگر اس کے کارنامے زندہ ہیں اور ایک رعب پاش صدا کے ساتھ نغمہ سرا ہیں کہ

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

وحید

اکبر آبادی

تم میرے دل میں ہو

وہ پہاڑوں پر زعفران کے مہکتے ہوئے کھیتوں کے پاس رہا کرتی تھی ——— اُس کی جھونپڑی کے نزدیک ایک چھوٹی سی ندی متبسم نغمہ پیدا کرتی، ——— اور قدیم درختوں کے سایہ میں سے گذر کر بہتی تھی۔ عورتیں وہاں اپنے مشکیں پانی سے بھرنے آتیں، اور مسافر وہاں بیٹھ کر سستاتے۔ وہ ندی کے نغموں کے ساتھ سُر ملاتی، اور اس کی ہم آہنگی میں محوِ خواب ہو جاتی،

ایک شام اجنبی برف آلود چوٹیوں میں سے گزر کر آیا۔ اس کے لمبے لمبے بال مست سانپوں کی طرح بل کھاتے ہوئے تھے ——— ہم نے تعجب سے پوچھا "تم کون ہو؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا ——— وہ پُرشور ندی کے کنارے بیٹھ گیا اور خاموشی سے اُس کی جھونپڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ ہمارے دل خوف و ہراس سے کانپ اُٹھے ——— اور جب رات کی تاریکی نے چمکدار برف کے تودوں کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا، تو ہم اپنے اپنے گھر واپس آ گئے۔

دوسرے دن جب علی الصباح عورتیں دیودار کے درختوں میں سے بہنے والی ندی پر پانی بھرنے آئیں، تو اس کی جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا ——— مگر اس کی قمری کی مانند شیریں آواز جا چکی تھی اور اس کا روشن چہرہ کہیں بھی نہ تھا۔ اُس کی خالی بالٹی ایک کونے میں رکھی تھی، اور اس کا چراغ ایک طاق میں پڑا دم توڑ رہا تھا ——— کوئی نہیں جانتا کہ صبح ہونے سے قبل وہ اجنبی کے ساتھ کہاں چلی گئی تھی۔

جیٹھ کا مہینہ آ گیا ——— سورج تیز ہو گیا اور برف پگھلنے لگی۔ ہم چشمے کے کنارے بیٹھ گئے اور روتے رہے ہم نے کہا "آہ! کیا کوئی ایسا ہی چشمہ اُس سرزمین میں بھی ہے جہاں وہ چلی گئی ہے اور جہاں وہ اپنے خالی برتن سرد اور پاک پانی سے بھر سکتی ہے؟" ہم نے ایک دوسرے سے مایوسی کے لہجہ میں پوچھا "کیا ان پہاڑوں سے پرے بھی کوئی دنیا ہے؟"

گرمی کی رات تھی، ٹھنڈی ہوا جنوب کی طرف سے آ رہی تھی؛ میں اس کی کٹیا میں بیٹھا اس کے بے جلے چراغ کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک میرے سامنے سے پہاڑ کپڑے کے پردوں کی طرح اٹھ گئے ——— آہ یہ تو وہی چلی آ رہی ہے ——— "میری بچی تم اچھی تو ہو؟ ——— مگر تم اس کھلے ہوئے آسمان کے نیچے سوتی کہاں ہو گی؟ اور آہ! ہماری ندی اب تمہاری پیاس نہیں بجھا سکتی"

"یہاں وہی آسمان ہے" اُس نے کہا "صرف یہاں اس کو محبوس کرنے کے لئے پہاڑوں کے سلسلے نہیں ہیں۔ یہاں ہی ندی ہے مگر فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بڑھ کر دریا بن گئی ہے۔ زمین بھی وہی ہے صرف پھیل کر میدان ہو گئی ہے"

"وہاں سب کچھ ہے بس ہم نہیں ہیں" میں نے آہ بھر کر کہا۔ وہ ایک غمزدہ طرز سے مسکرائی "تم میرے دل میں ہو" ——— میں چونک کر جاگ اٹھا ندی کی آواز اور دیودار کے درختوں کی سرسراہٹ میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

(ترجمہ)

معین الحق حقی

پیرانِ سالوس

(۱)

کیا پیٹ ہے شیخ کی فراوانی ہے
ناقابلِ شرح دل کی حیرانی ہے
سینے میں ہے گنبدِ سود و زیاں ہوتے شیخ
زندہ بھی ہے اور شکل بھی انسانی ہے

(۲)

عشاق کریں ضعف سے آہیں کیونکر
بیٹھا ہو جو دل اٹھیں نگاہیں کیونکر
حیرت ہے کہ ہو گرم تعاقب ان پر
کھل جاتی ہیں پیرِ فرتوت کی آنکھیں کیونکر

(۳)

پیرولو اک شکم پرورِ عیش سینے والو
خوں قوم غریب کی دوست کا پینے والو
سمجھے ہو غرور سے کیوں رخ رکھ کے عناد
امداد پہ اوروں کی جھٹکوں کے جینے والو

(۴)

ہم دیکھ کے مست و شوخ کو کیا کہتے ہیں
اتنا ہی کہ بس صلِّ علیٰ کہتے ہیں
لیکن یہ علمائے ارباب ریش دراز
مشغوف ہو کر بت کو خدا کہتے ہیں

جوش ملیح آبادی

جامِ صہبائی

(۱)

مسجد میں یہ تزئین ہے، خدائی کی ہے تاب!
[illegible] بندگی کی ہے تاب!
اندیشۂ زہر ہے، ہستی میں ہیں بیکل
زندہ ہے تو کارزارِ ہستی کی ہے تاب!
پیکار ہے، وہ کامرانی کی ہے تاب!

(۲)

ناکامیِ زندگی سے ڈرنا کیسا!
ہے آگہی، بن آ کے کیسا!
ہنگامہ ہے، ہستی کی پہچان ہے!
زندہ ہے اگر تو [illegible]
پیوست ہے پیری میں [illegible] نا کیسا!!

(۳)

غم دوراں سے ہے سبق تو بیکلی ہے
اک عمرِ حیات میں گھڑی ہے
اک عمرِ حیات ایک غم کا دوراں
ہر آہ ہے اک غم کا [illegible] ہے
دنیا میں بھی کسی کے غم کا ہونا کوئی ہے

(۴)

ہر رشتہ سلاسل، مکافات بھی ہیں
ہر کوشش فتحِ حالات بھی ہیں
سب کچھ ہے وجود، بے ثبات بھی ہیں
پیدا ہے خود بھی عدم ہے [illegible] بھی ہیں
دنیا میں ہے سب کچھ الفاظ [illegible] بھی ہیں

اثرؔ

زیتا

زندگی کی ناقابلِ ملامت جفاؤں میں سے ایک یہ ہے کہ چاء پیو، کیک کھاؤ اور ہاں میں ہاں ملاؤ۔ یہ ایک مذہب ہے اور اس کی نماز یہ ہے کہ چار گول کمرے میں (چاہے وہ چوکھونٹا ہی کیوں نہ ہو) پی جائے اور اُس وقت کا بے تابی سے انتظار کیا جائے جب اس نماز کی امام مسکرا کر پوچھے کہ مصری کی ڈلیاں ایک کہ دو؟

جو لوگ اس مذہب کے پکے نمازی ہیں انہیں شاید ایک جماعت کی سوانح عمری کے ایک جزو میں کچھ دلچسپی ہو۔ وہ سوانح عمری یہ ہے۔

ایک کمرے میں چاء تھی، میزیں تھیں، سامانِ آرائش بہتر سے بہتر، چند لیڈیز، ایک پرکالۂ لیاقت زیتا اور کچھ غیر ضروری بھتنے۔ بھتنوں کو معاشرتی اصطلاح میں جنٹلمین کہا جاتا ہے مگر ایک کی ٹکٹائی گریزاں تھی (آپ ایمان اُمید کے مداحوں میں سے تھے) ایک حضرت کے استرے اور ٹھوڑی میں روزانہ ناتمام بحث کے آثار نمایاں تھے۔ ایک نوخیز شباب کے نشے سے لڑکھڑا رہے تھے۔ ایک کاہل الوجود کو سفید بالوں کے لئے سیاہ بوٹ پالش میسر نہ ہوا تھا۔ غرض یہ کہ ان بھتنوں کو جنٹلمین کہنا اس لفظ کی آبرو کھونا ہے مگر چونکہ جنٹلمینوں کے بغیر یہ نماز ادا نہیں ہو سکتی یہ تھے اور ضرور تھے۔ یہ تھا وہ مجمع یا جماعت جس میں ایک شخص نے زیتا کی لیاقت سے تنگ آ کر اُسے یہ دھمکی دی تھی کہ "کسی رسالے میں تمہاری خبر لوں گا"

زیتا نے اُس وقت تو کچھ نہ کہا مگر دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ آخر یہ شخص کیا لکھ سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ میری زبان اسکو سبق آموز ہے یا یہ کہ میرے جذبات میرے ماحول سے ایک صدی مستقبلانہ ہیں یا یہ کہ میں اسی کم سنی میں زندگی کے بہترین انعاموں کو پرکھ کر رد کر چکی ہوں! لکھ دے، ایک دفعہ نہیں بلا سے سو دفعہ لکھ دے۔ اول تو کوئی شائع نہیں کرے گا اور کرے گا تو پڑھنے والے کیا خاک سمجھیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے زیتا نے اس گفتگو کو دل سے محو کر دیا۔

(۲)

جس شخص نے زیتا کو مذاق مذاق میں یوں دھمکایا تھا اُس کا اس وقت تک تو خیال صرف یہ تھا کہ گول کمرے کی چلتی چلاتی باتوں میں زیتا کے علمی تیر و تفنگ بے محل ہیں۔ اس لیاقت کی پتلی کو چاہئے کہ اپنے ہم پلہ

کسی پروفیسر سے بحث کرے۔ خواہ مخواہ ہم واجبی واجبی پڑھے لکھوں سے نہ لڑ پڑا کرے مگر بعد میں جب اُس نے غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ معجزہ جس کا نام زیتا ہے تنقید سے بالاتر ہے۔ اگر ہندوستان کے نصیب نیک ہیں تو یہ کراماتی شعلہ بھبھوکا ہزاروں دقیانوسی اوہام کو خاک سیاہ کر دے گا۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر یہ شخص بھی اس گفتگو کو بھول گیا۔

(۳)

...... نے بھی یہ دھمکی سنی۔ اس کا لطف بھی اٹھایا مگر عمیق ندیوں میں زمانہ کی ہوائیں شور نہیں پیدا کر سکتیں۔

اوروں کو زیتا سے صرف محبت ہے ..... کو زیتا سے عشق ہے اور ان کی دنیا بھر کی اچھی خواہشیں زیتا کے لئے وقف ہیں۔ وہ زیتا کی لیاقت پر نازاں بھی ہیں اور اس سے ترساں بھی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگیں کہ کاش زیتا کی لیاقت بجائے شعلہ بن کر بھڑکنے کے پھول بن کر کھلے۔ یہ دعا مانگ کر وہ بھی اس بات کو بھول گئیں۔

(۴)

گول کمرے میں (جیسا گول کمروں کی زندگی کا تقاضا ہے) دھیمی دھیمی سے آوازیں سنائی دیں کہ آؤ تاش کھیلیں میز کھسکنے لگے، کرسیاں وقار سے جمنے لگیں، بکس میں سے تاش نکلے۔ اِدھر اُدھر سے پتے تراشنے کے لئے ہاتھ بڑھے اور جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ کون کس کا آڑی ہو تو پتوں کی تقسیم کی طیاری ہوئی۔

(۵)

پتوں کی سرسراہٹ کی آواز سن کر تین فرشتے (وہ سماوی مہمان جو مسلمان گھروں میں اب تک آتے جاتے رہتے ہیں) گول کمرے سے نکل کر باہر چمن میں گلگشت کرنے لگے (مسلمان فرشتوں کو اب تک تاش کے پتوں سے نفرت ہے) اور یوں باتیں کرنے لگے۔

ایک فرشتہ۔ تم نے زیتا کی بے نیازی ملاحظہ کی؟ یوں سمجھتی ہے گویا زندگی کی تمام طاقتوں پر حکمران ہونا اور رہنا اس کے اپنے بس کی بات ہے۔

دوسرا فرشتہ۔ ہاں اور ...... کی زیر لب دعا سنی؟ بچاری یہ تصور کئے بیٹھی ہیں کہ نیک ہونا، ہمدرد خدمت گذار ہونا گویا قسمت کو خرید لینا ہے۔

تیسرا۔ اور اس خود پرست کو نہ دیکھا ؟ عجب انسان ہے۔ یہ خیال کرتا ہے کہ کسی بات کی ماہیت کو سمجھ لینا گویا افعال پر حاوی ہونا ہے۔

دوسرا۔ سچ پوچھو تو وہ بچارا سب سے زیادہ قابلِ رحم ہے سمجھ اس میں ہے مگر قدرت نہیں۔ اس کے سارے جسم میں صرف آنکھیں تعلیم یافتہ ہیں اور جدھر وہ چل نکلیں وہیں حضرت کا دل و دماغ بھی حاضر ہے ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ میں ماہر حسن ہوں۔

پہلا۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ کیا ہم زینا کی کچھ مدد کر سکتے ہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو کیا ہمیں مدد کرنی چاہئے ؟

دوسرا۔ ہاں ضرور کرنی چاہئے۔

تیسرا۔ اچھا میں یہ کروں گا کہ وہ سو رہی ہوگی تو میں چپکے سے اس کی روح کو شفق کی ندی میں دھولاؤں گا بہتر سے بہتر گلرنگ روح میں اُسے لپیٹ دوں گا۔

پہلا۔ شاباش، مگر دوست کیا تمہیں بنی آدم کی اس حماقت پر ہنسی نہیں آتی کہ سب کے سب یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ روح انسان کے اندر ہوتی ہے عجب الو ہیں۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جسم روح کا جامہ نہیں بلکہ روح جسم کا جامہ ہے میلے ہاتھوں، ناپاک نگاہوں سے اس لباس کو چاک کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ روح تو اندر ہے اور مامون ہے۔

دوسرا۔ پھر تم نے وہی انسانوں پر تنقید شروع کی، یہ کہو کہ زینا کے لئے تم کیا کرو گے ؟

پہلا۔ دوست کچھ سمجھ میں نہیں آتا کسی انسان کی مدد کرنا عذاب خریدنا ہے۔ انسان کو تو اگر خدائی دے دو تو اسے بھی خوار کر دے گا۔

تیسرا۔ اب تم باتیں نہ بناؤ۔ یا تو ہمارے ساتھ نہ آنا تھا یا آئے ہو تو کچھ کر کے دکھاؤ۔ خود ہی تو تم نے مدد کا سوال نکالا تھا۔

پہلا۔ سچی بات یہ ہے کہ میری زینا کی نسبت اتنی بلند رائے ہے کہ میں اسے لیاقت اور نیکی کے زہر سے بچانا چاہتا ہوں۔ اس کی بہترین مدد یہ ہے کہ میں اسے شک دے دوں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ خوشی کے موقع پر بھی وہ شک سے آزاد نہ ہو۔ کبھی کبھی خود اپنے آپ پر شک کرنے لگے۔ اپنے شک پر شک کرنے لگے۔ اس قسم کے اضطراب اور کشمکش میں گرفتار رہے کہ یہی کشاکش اُس کا نغمہ ہو۔ موسیقی زندگی کا بہترین عکس ہے دیکھے بعد دیگرے سروں کا پیدا ہونے کے ساتھ ہی مرنا اس فوری زیست و موت کے سلسلۂ لا علم کا تمام راگ ہے) میں چاہتا ہوں کہ زینا کے شکوک کا ایک دوسرے کو قتل کر کے پھر پیدا ہوتے رہنا اس انداز سے ہو کہ میرا دیا ہوا شک وہ گر ہو جو زینا کی دلربا سے ناز کے سُر پیدا کرتا ہے۔

دوسرا۔ تم اسے شک دو گے تو میں اسے امید کی توسِ قزح دوں گا۔ اس میں جھول جھول کر وہ تمہارے تمام شکوک کو پھینک دے گی۔

(ایک افسر فرشتہ آتا ہے اور گہری آواز میں کہتا ہے کیا تم لونڈوں کا کھیل ابھی ختم نہیں ہؤا؟ کچھ کام بھی کرو گے یا یونہی دن عید رات شب برات! سب فرشتے چلنے لگتے ہیں)

(۶)

گول کمرے میں تاش کا کھیل ختم ہؤا۔ وہ شخص جس نے زیتا کو دھمکایا تھا کہ کسی رسالے میں تمہاری خبر لوں گا عین اس وقت باہر نکلا جب کہ فرشتے چلنے پر تیار تھے۔ پھولوں میں عجب طرح کی خوشبو تھی۔ ان کا رنگ بھی کچھ نرالا تھا۔ یہ شخص کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا مگر ایک بڑے سے پھول کے پاس جا کر انتہائے آرزو سے کہنے لگا۔ "زیتا کے لئے یہ کچھ، اور میرے لئے؟" پھول نے مسکرا سا دیا گویا یہ کہہ رہا ہے کہ مانگنے کے قابل تو بنو۔

فلک پیما

یادگار

نغمہ ــــ جب مدہم سُر ختم ہو جاتے ہیں،

حافظہ کی گود میں جھولتا رہتا ہے۔

خوشبوئیں ــــ جب کہ خوبصورت پھول مرجھا جاتے ہیں،

حیات میں پنہاں زندہ رہتی ہیں۔

گلاب کی پنکھڑیاں ــــ جب کہ گلاب کملا جاتا ہے،

محبوب کی آرام گاہ پر برسادی جاتی ہیں۔

اسی طرح ــــ تیرے تصور میں جب کہ تو یہاں سے چلی جائے گی،

میری محبت ہمیشہ سوتی رہے گی۔

(شیلی)

محسن عبداللہ

یعنی مَیں؟

ساون میں ایک دن باہر جانے لگا تو ترشح ہو رہا تھا۔ کہا چھتری لیتا چلوں۔ ساون کا کیا اعتبار نہ جانے یہ تقاطر کب موسلادھار بارش بن جائے۔ لپک کر گیا۔ تو کھونٹی سے ایک چھوڑ پانچ لٹک رہی تھیں مگر سب کی سب مرمت کے قابل۔ میں نے کہا لے چلوں لگے ہاتھوں مرمت ہو جائے۔ چنانچہ پانچوں کو بغل میں داب چل پڑا۔ ایک قدم ڈیوڑھی کے اندر اور ایک باہر تھا۔ آواز آئی، اور میں انہیں قدموں پر ٹھیر گیا +

"اچھی! یہ نگوڑی چھتریاں کہاں جا رہی ہیں آج"

"یونہی خیال آیا ذرا مرمت ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ نہیں تو"

"خیر، تم جانو۔ مجھے شام کو چھتری چاہیئے۔ یہ دھیان رہے"

اس گفتگو نے چھتریوں کے مضمون کو میرے دل پر نقش کر دیا۔ اس لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ میں انہیں مشترکاً یا منفرداً حسبِ معمول کہیں بھول جاتا یا انہیں لوہار کی دوکان سے لا کسی اور دن پر اٹھا رکھتا۔ میں نے لوہار سے صاف کہہ دیا کہ شام کو لوٹتے وقت میں چھتریاں ضرور لے جاوں گا۔ اور جو اس میں تساہل ہوا تو جو مجھ سے ہو گا اس سے زیادہ کر گزروں گا +

پھرتے گھومتے دوپہر ہو گئی مگر بارش کا تار نہ ٹوٹا۔ ویسی ہی رم جھم برس رہی تھی۔ اور پھر مجھے چھتریوں کا خیال آیا۔ نزدیک ہی ایک قہوہ خانہ تھا وہاں گیا اور ایک میز پر بیٹھ گیا۔ یوں ہی سی دیر ہوئی تھی کہ ایک دوشیزہ آئی اور میرے بالمقابل اسی میز پر بیٹھ گئی۔ وہ ہنوز کھا رہی تھی کہ میں بل ادا کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی دروازے تک نہ پہنچا تھا کہ اُس نے مجھے آواز دی۔ میں ٹھیر گیا تو اُس نے مجھ سے کہا کہ جو چھتری میرے ہاتھ میں ہے وہ اُس کی ہے۔ ندامت سی ندامت۔ پسینہ چھوٹ گیا۔ باچھیں کھلانا، دانت نکالنا، آئیں بائیں شائیں کرنا، غرض خفت آمیز معذرت کے جملہ لوازم بجا لا کر میں ہوٹل سے نکلا +

اس حادثہ نے چھتریوں کے بارے میں ان کی تاکید کو تازہ کر دیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر پھرتا رہا، مگر چھتری شام سے پہلے پہنچانے کا کچھ ایسا دھڑکا لگا تھا کہ باقی سب کام چھوڑ کر لوہار کی دوکان پر جا بیٹھا۔ اور اٹھا تو

چھتریاں لے کر اٹھا۔ ایک اخبار خریدا اور ٹریم میں بیٹھ کر ایسا محو ہوا کہ گرد و پیش کی خبر نہ رہی۔ مگر پھر بھی میرا ایک ہاتھ چھتریوں کے گٹھے پر پڑا تھا۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے اخبار سے اپنا سر نکال کر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ہوٹل والی نیک بخت میرے سامنے والی نشست پر "حاضر و ناظر" تھی۔ اس کے چہرے کے عرض و طول پر ایک بسیط تبسم رقص کر رہا تھا۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال رازدارانہ انداز سے کہا "آج کس کا منہ دیکھ کر نکلے تھے، خوب مال مارا ہے"۔ سوا اس کے کہ ایک آنکھ سے چھتریوں کو دیکھتا اور دوسری سے اس کافرہ کو اور فرمائیے میں کیا کر سکتا تھا۔ کتنا جان کش خیال ہے۔ توبہ توبہ۔

یعنی میں .... ؟

ڈرامی

نغمۂ محبت

(۱)

اور میں نے کہا —— میرے اعضا ضعیف تھے
اور میں نے کہا —— میرا خون سرد تھا
اور میں نے کہا —— میرا دل افسردہ تھا
اور میں نے کہا —— میرے جذبات خفتہ تھے
اور میں نغمۂ محبت نہ چھیڑ سکتا تھا۔ اور میں محبت کا نام بھی نہ لے سکتا تھا
اور میں اپنے بربط کے تاروں میں محبت کے راگ نہ نیرا سکتا تھا۔

(۲)

امن و صلح کے وقت محبت چرواہے کی بانسری میں سمائی رہتی ہے۔
جنگ کے وقت محبت دلیر اور بہادر سوار کے گھوڑے پر سوار ہوتی ہے
خوشیوں کے وقت محبت بیش بہا ملبوسات اور زیورات میں آراستہ باغوں اور محلوں میں نظر آتی ہے
محبت عدالت، فوج اور قبرستان پر حکومت کرتی ہے
محبت نیچے انسانوں پر حکمران ہے اور اوپر اولیا اور انبیا پر
کیونکہ محبت فردوس ہے اور فردوس محبت۔

(ترجمہ)

محشر عابدی

تجلّیات

طبعِ نازک کسی کی ہو نہ ملول
شکوۂ غم کو دے نہ اے دل طول

حُسن ہے اور تغافلِ بسیار
عشق ہے اور جنونِ حُسنِ قبول

جانے لے جا کے کس جگہ مارے
مجھ کو گم کردہ راہ شوقِ فضول

ہر دو عالم ہیں ہیچ میرے لئے
ہوں محبت میں اس قدر مشغول

ہے متاعِ وفا مری ناقص
پھر بھی کر لے جو تیرا لطف قبول

واعظوں کی یہ ہرزہ گفتاری
ناصحوں کی یہ پندِ نامعقول

مجھ پہ کوئی اثر نہیں کرتی
ق
کہ محبّت ہے میرا اصلِ اصول

نغمۂ گل طرازِ اکبر سے
ہیں بساطِ سخن پہ پھول ہی پھول

اکبر
سروری لکھنوی

دمِ واپسیں

یک جا اُن دونوں کی عمر ایک سو پچاس برس تھی۔ اُن کی الگ الگ عمریں ؟ اُن میں سے ایک کو بھی معلوم نہ تھیں۔ مدت ہوئی انہوں نے اپنی عمروں کو علیحدہ علیحدہ شمار کرنا چھوڑ دیا تھا، اور اب وہ بلا تکلف ہر سال اپنی مشترکہ عمر میں دو برس بڑھا دیا کرتے تھے۔

اُس پست سے دیہاتی مکان میں جس کی چھت کسی پرندے کے پروں کی طرح پھیلتی ہوئی دیواروں سے آگے بڑھ گئی تھی انہیں ایک رہتے ہوئے کتنے ہی دن، کتنے ہی موسم اور کتنے ہی سال ہو گئے تھے۔ اگر آج ان سے کوئی کہتا کہ تم ہمیشہ سے میاں بیوی نہیں تھے تو وہ کچھ دیر کے لئے حیران رہ جاتے۔ اُن کے چہروں پر ایامِ گذشتہ کی ایک ہلکی سی جھلک باقی تھی اور اُن کی شکلوں میں بہن بھائیوں سے بڑھ کر مشابہت تھی۔ جب گاؤں کے لوگ اُن کے اس درجہ ضعف کے باوجود اُن کی اس قدر شدید والہیت کو دیکھتے تھے تو وہ یہ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ عنقریب جب اُن میں سے ایک اس دنیا سے چل بسا تو دوسرے کے لئے یہاں کی تنہائی ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔

دونوں بوڑھی جانوں کے لئے موسمِ سرما مہربان ثابت ہوا۔ اُس نے اُن کے حلقوم پر ذرا درشتی سے ہاتھ ڈالا۔ اُن کی کمر کو کسی قدر توڑ دیا اور اُن کے گالوں میں گڑھے ڈال دیئے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایک دھندلا سا پردہ دیکھنے لگا اور وہ غنودگی کے حملوں کا شکار ہونے لگی۔ جب بہار آئی تو چھاؤں کی فرحت انہیں کم محسوس ہونے لگی اور دھوپ کی شگفتگی انہیں بے کیف نظر آنے لگی۔ زندگی اُن کے لئے ایک بارِ گراں ہو گئی۔ صبح سے شام کرنا ایک جاں کاہ مشقت سے کم نہ رہا۔

ایک دن جب وہ روزِ گذشتہ کی بہ نسبت زیادہ مضمحل ہو کر اپنے مکان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اُس کی بیوی خرگوشوں کے لئے گھاس لانے کے لئے باہر نکلی۔ جونہی کہ اُس نے جنگلے کے پھاٹک کو طے کیا اُس کے سانس کا آنا جانا بند ہو گیا۔ یہ سفر کی پہلی منزل تھی۔ پھر وہ آگے بڑھی۔ اُس مقام سے جہاں وہ ایک شریف بچے کی طرح بیٹھا تھا بڈھے کی دھندلی آنکھیں اپنی بیوی کو نہ دیکھ سکیں۔ مگر اُس نے اُس کے قدموں کی آواز سن لی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ اپنے تصورتیں اُسے جاتے ہوئے دیکھ لے۔

جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچی تو اُس نے اپنی آنکھیں ایک دفعہ زور سے کھولیں اور پھر یک لخت گر پڑی اُس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اور اُس نے کوئی حرکت نہ کی۔

ایک راہرو آ کر وہاں ٹھہر گیا، ایک لڑکی اچھلتی کودتی پاس آ کھڑی ہوئی۔ پہلے ایک اور پھر ایک اور عورت آئی۔ لوگ اُٹھا کر اُسے

دوکان میں لے گئے انہوں نے دیکھا کہ وہ مر چکی ہے۔

گھر خالی ہو گئے۔ دوکان اور اُس کے اطراف پر سوادِ ہجوم چھا گیا تین کرسیاں جوڑ کر بڑھیا کو ان پر لٹا دیا گیا۔ اُس کا زرد اور قدرے بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر ڈر آرہا تھا۔

کسی نے کہا "بڈھے کو ضرور بتا دینا چاہیئے"

ایک اور آواز آئی "نہیں! اُسے نہیں، پہلے اُس کی بہو کو بتانا چاہیئے۔ وہ سامنے کھڑی ہے۔ او مارگیرٹ!"

وہ آگئی، بدصورت اور باولی سی۔ اُس کے جھکے ہوئے کندھوں سے اُس کا ڈھیلا لباس لٹک رہا تھا اور اس کے رخسار خشک اور سوکھی روٹی کی طرح بے رونق تھے۔ وہ دھوبن تھی اور پانی کے اثر سے اُس کے ابھرے ہوئے ہاتھ دو بغچوں کی طرح لٹک رہے تھے۔

جب اُس نے اپنے اُس شوہر کی ماں کی نعش کو دیکھا جسے مرے اب ایک زمانہ گزر چکا تھا اور جسے اب وہ تقریباً بھول چکی تھی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اُس کے ہونٹ سفید ہو گئے اور اُس کے چوڑے چپکلے چہرے میں اُس کی آنکھیں گردش کرنے لگیں اُس نے ناک کو سکوڑتے ہوئے اپنی آستین سے اُسے پونچھا اور آہستہ سے کہا "آہ! اس کا بیچارہ خاوند!"

کسی کی طرف دیکھے بغیر وہ عجب بے ڈھنگے پن سے ہجوم کی طرف مڑی اور کہنے لگی "بڑھیا کی موت کی خبر اُسے کوئی نہ سنائے میں اُسے خود بتاؤں گی"۔ اور اُس نے اپنے چہرے کو ایک ملتجیانہ انداز سے حرکت دی۔

اس کے بعد ایک ایک کر کے لوگوں نے جانا شروع کیا یہاں تک کہ ذرا سی دیر میں سارا مجمع منتشر ہو گیا۔

مارگیرٹ نعش کو اٹھوا کر اپنے بستر پر لے گئی۔ پھر جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر کے بڈھے کے پاس پہنچی۔ اپنے گھر کے سامنے چھت کی اُسی بے نُما افزائش کے نیچے وہ بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔

لکڑی کا پھاٹک کھلا تو اُس کی آواز سے چونک کر اُس نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا۔

مارگیرٹ نے کہا "میں ہوں بابا!" وہ پھر ایک بت کی طرح بے حرکت ہو گیا "آؤ اب گھر چلنے کا وقت ہے"

اُس نے ایک آہ کی اور اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر ایک آہ کی۔ اُس نے ہاتھوں کو آگے کی طرف پھیلا کر ہلانا شروع کیا۔ اُس کے چہرے میں کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

مارگیرٹ نے کہا۔ "کیوں کیا ہے بابا؟"

اُس نے جواب دیا "مجھے نظر نہیں آتا، مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی!"

"آہ!" مارگیرٹ نے کہا۔ اور بلا شبہ یہ اُس کی روح کی سادگی تھی جس نے اُسے اتنے بڑے بڑے حادثوں کے لئے تیار کر دیا کہ اس کی زبان سے اس ایک لفظ کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ اُس نے اُس شخص کا ہاتھ تھام لیا جس کی آنکھیں اپنے ازلی رفیق کے چھپ جانے کے بعد اب دیکھنا ہی نہ چاہتی تھیں۔

اپنے پاؤں کو گھسیٹتا ہوا وہ نعمت خانے میں پہنچ گیا۔ اُس نے ایک کرسی کی پشت کو چھوا اور اس پر بیٹھ گیا۔ مگر اس کی سانس سختی سے چل رہی تھی۔ وہ آہیں بھرتا کراہتا اور جونہی وہ اُسے بتانے کے لئے منہ کھولتی وہ چلّانے لگتا۔

"یہ اب بس ہو چکی ہیں۔ میری آنکھیں! آہ ابھی یہ دکھ باقی تھا!"

گھنٹوں تک وہ غم و الم میں ڈوبا رہا۔

ایک لمحہ کے لئے جب اسے ذرا ہوش آیا تو اُس نے پوچھا "وہ کہاں گئی؟ خدا کے لئے، وہ کیا کر رہی ہے؟" تالم کے دو ادوار کے درمیان مارگیرٹ نے دیکھا کہ اُس نے اپنے حواس مجتمع کئے اور وہ اپنی بیوی کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر وہ شکایتیں کرنے لگا۔ اتنے میں پھر ایک حملہ ہوا۔

بہت سے لوگ آئے بعض اندر پہنچے اور بعض کھڑکیوں ہی میں سے دیکھ کر چلے گئے مگر کسی کو اس سے کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

سارا دن یوں ہی گزر گیا اور یہ جاں کاہ خبر اُس کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ اب کسی کو اُس کے قریب آنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

وقتاً فوقتاً مارگیرٹ اُس کے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے آنسوؤں سے بھرے ہوئے چہرے کو صاف کرتی ہوئی اُٹھ دوڑتی۔ وہ بار بار بڑھیا کو دیکھنے کے لئے جاتی تھی جو باوجود دو شمعوں کی روشنی کے رات کی تاریکی میں نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ پھر وہ تجہیز و تکفین میں مصروف ہو گئی۔ ہر طرف اُس کا خیال تھا۔ وہ تھک کر چور ہو رہی تھی مگر برابر بھاگ دوڑ میں مصروف تھی۔ وہ دلیرانہ مصیبت کا مقابلہ کر رہی تھی اور اُس کی شدت سے مغلوب نہ ہوتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اُسے کیا کیا کرنا چاہیئے۔ وہ جو مجسم سوگ تھی۔ وہ جسے پس ماندگی کی اب عادت ہو چکی تھی!

شام اور رات کے درمیان وہ ایک مرتبہ پھر اُس کے پاس پہنچی۔ اب اُس کی طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہو چلا تھا۔ مارگیرٹ نے ایک چھوٹا سا لیمپ جلا کر انگیٹھی پر رکھا اور دل میں سوچا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اسے بتا دیا جائے کہ وہ جو ہمیشہ تیرے ساتھ رہتی تھی آج تجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ نحیف و ناتواں کانپتی ہوئی وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اُس کا سر اس طرح جھک رہا تھا جیسے وہ اپنے کسی جرم پر نادم ہو۔ اُس نے اپنی ساری قوت کو یوں مجتمع کیا جیسے وہ چلّانے لگی ہے مگر اُس کی زبان لڑکھڑا گئی اور اُس نے کہا "وہ اب کبھی ۔۔۔۔ واپس نہ آئے گی ۔۔۔۔ کبھی نہیں ۔۔۔۔ وہ چلی گئی"

بڈھا خاموش رہا۔ مارگیرٹ نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا ۔۔۔ اور سو رہا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گئی اور نہایت احتیاط سے کمرے کی اشیا کو درست کرنے لگی۔ یکایک بڈھے نے حرکت کی اور اُس کو بلایا۔ وہ اُس کے اس قدر قریب جا کھڑی ہوئی کہ وہ اپنی انگلیوں سے اُس کے ہاتھ کو چھو سکتا تھا۔

سنو میری بیٹی" اُس نے کہا "یہاں آؤ اور سنو۔ وہ واپس آگئی ہے۔ وہ یہیں ہے۔ میں نے اُسے ابھی وہاں دیکھا ہے جہاں اس وقت تم کھڑی ہو۔ میں سو رہا تھا اور یکایک مجھے معلوم ہوا کہ وہ یہیں ہے۔ اُس نے کمرے کی چیزوں کو ترتیب دیا اور پھر چلی گئی۔ میں جان بوجھ کر بے حرکت اور خاموش ہو رہا۔ سنو، میں نہیں چاہتا اُسے معلوم ہو کہ میں دیکھ نہیں سکتا۔ میں نہیں چاہتا ـــــــ اس سے اسے بڑا صدمہ ہوگا۔ مجھے یہ منظور نہیں۔ اُسے اُس وقت تک مجھ سے دور رکھو جب تک میں پھر اچھا نہ ہو جاؤں۔ کسی تدبیر سے، میری بیٹی"۔

اُس نے ذرا پہلو بدلا تو پرانی کرسی میں سے کراہنے کی سی آواز اُٹھی۔

"اُسے لے جاؤ۔ ایک یا اگر ضرورت ہو تو ایک سے زیادہ دنوں کے لئے اسے کہیں لے جاؤ اُس سے کہو ـــــ اُسے لے جاؤ"

"اچھا بابا، میں اُسے لے جاؤں گی۔ بس سمجھتی ہوں اُسے تمہاری بیماری کا علم نہ ہوگا ـــــــ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں اُسے علم نہ ہوگا"

بڈھے آدمی پر قسم کا بڑا اثر ہوا اور اُس نے کہا "تو بہت اچھی لڑکی ہے" پھر وہ خاموش ہو گیا۔

دوسرے دن مارگیرٹ نے ایک جھوٹی کہانی بنا کر سنا دی کہ بڑھیا کو اُس کے رشتہ دار اپنے ساتھ گھر لے گئے ہیں پہلے وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح حیرت آمیز دلچسپی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ جب اُس نے بات ختم کرلی تو وہ کہنے لگا "مگر وہ پھر واپس آگئی ہے۔ گزشتہ شب میں نے سوتے میں اُس کی آواز سنی تھی"

مارگیرٹ نے نرمی سے کہا "ہاں ہاں وہ آگئی تھی"

اسی طرح دو دن گزر گئے۔ بڑھیا کو دفن کرنے کے بعد دوسرے دن جب ڈاکٹر بوڑھے وکٹر کو دیکھنے آیا تو اُس نے خلافِ توقع کہا کہ "حالت بہت اچھی ہے۔ بخار تقریباً اتر چکا ہے اور گرمی کم ہو رہی ہے۔ کل وہ دیکھنے لگے گا"

وہ مخبوط الحواس ہو کر ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔

"ہاں۔ کل ـــــ کل ـــــ"

اپنی تاریک روح کی گہرائی میں مارگیرٹ نے بھی ایک مرتبہ اس لفظ کو دہرایا "کل"!

کل وہ اپنی آنکھیں کھولے گا، اور پھر آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اُسے نہ دیکھ سکے گا! کل مارگیرٹ کے دل میں اپنی خاموشی پر اُس کے اُس لوبدے ہمیشہ کو بھی ایک جھٹکا لگے گا جو شاید اُس کے بول اُٹھنے پر بھی محفوظ نہ رہ سکتا۔ یہی زندگی کا قانون ہے۔ زندگی میں ہمیشہ ایک کل ایسی آتی ہے جس کا انجام بخیر نہیں ہوتا، اور امن اور امید کی وہ صبح جو کبھی کسی ایک کو حاصل ہوتی ہے ہمیشہ کسی دوسرے کے لئے شام کا پیغام لاتی ہے۔

(ترجمہ)

منصور احمد

غزل

مجھ سے حالِ دلِ فگار نہ پوچھ
سختیٔ جورِ روزگار نہ پوچھ

غرق ہے کیف میں جہانِ وفا
بیخودی ہائے انتظار نہ پوچھ

کیا ستم ڈھا رہی ہے رندوں پر
مستیٔ ابرِ نوبہار نہ پوچھ

رنگِ ناکامیٔ مراد نہ دیکھ
بے کسی ہائے بے شمار نہ پوچھ

دل میں اک حشرِ آرزو ہے بپا
شوخیٔ حسنِ فتنہ کار نہ پوچھ

کیوں کسی کو کسی کی باتوں پر
آہی جاتا ہے اعتبار نہ پوچھ

جی بھر آتا ہے حالِ دل کہتے
مجھ سے مضطرؔ تو بار بار نہ پوچھ

رام رتن مضطر

پُراسرار قیدی

(۱)

قیدی جس وقت کٹہرے کے پیچھے اپنی جگہ پر کھڑا ہوا تو تمام عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ اُس نے مقدمہ کی پیروی شروع کردی۔

وہ ایک نحیف البجثہ آدمی تھا، جس کی بے رونق آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں اور زرد چہرہ اس کے جذباتِ غم کی پوری ترجمانی کر رہا تھا، مقدمہ کی سماعت سے معلوم ہوا تھا کہ یہ شخص کبھی صوفیوں کے مقدس گروہ میں شامل تھا مگر ایک سخت جرم کے ارتکاب کی وجہ سے اسے یہ زندگی ترک کرنی پڑی۔ قیدی پانچ دن سے اپنے مقدمہ کی پیروی کر رہا تھا اور اس دوران میں اُس نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ تعلیم کا کافی ثبوت دیا تھا۔

اُس کے لئے یہ معاملہ موت اور زیست کا معاملہ تھا مگر اس کی تقریر کا ایک ایک لفظ اس کے خلاف ثبوت دے رہا تھا، اور عام عدالت میں کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جسے اُس کا خوفناک انجام نظر نہ آرہا ہو، اُس نے ہر قسم کی قانونی امداد حاصل کرنے سے قطعی انکار کردیا تھا، اور خود ہی پیروی کرنا چاہتا تھا۔ جج، جیوری، سرکاری وکیل، تماشائی، عدالت کے ملازمین غرض سب اطمینان کے ساتھ قیدی کی تقریر سُن رہے تھے، مگر ہر شخص نے پہلے ہی سے فیصلہ کرلیا تھا کہ قیدی کو بے عزتی اور بدنامی کی تکلیف دہ موت کا سامنا کرنا پڑے گا، اور وہ اپنے تحفظ کے متعلق کتنا بھی کہے وہ بالکل بے وقعت سمجھا جائے گا۔

"مائی لارڈ اور حضراتِ جیوری ——————"

جونہی کہ یہ الفاظ لوگوں کے کانوں میں پہنچے، تمام عدالت میں خاموشی چھاگئی، اور تماشائیوں کی نگاہیں کٹہرے کے پیچھے قیدی کے چہرے پر جم گئیں۔ اُس کی صورت سے ناامیدی اور ہراس کے آثار نظر آرہے تھے۔

قطع نظر اس سے کہ اس کا جرم کس قدر خوفناک تھا یا یہ کہ اس نے مقدمہ کی کارروائی کے دوران میں کتنی سنگ دلی کا ثبوت دیا تھا، انسانوں کے اس انبوہِ کثیر میں قیدی کے ساتھ عام ہمدردی اظہار کیا جارہا تھا۔

اب شام کے ساڑھے پانچ بج چکے تھے اور بیچ کے ایک قلیل وقفہ کے علاوہ عدالت کا اجلاس صبح سے اس وقت تک برابر ہو رہا تھا۔

خود قیدی کے چہرے سے تکان کے آثار نمایاں تھے، مگر اُس نے تمام نا امیدیوں اور بے چینیوں کو نظر انداز کر کے اپنا سر اونچا کیا اور تن کر کھڑا ہو گیا، پھر کامل عزم و استقلال کے ساتھ تقریر شروع کر دی۔ وہ اپنی زندگی کے ایک ایک قابلِ بیان واقعے کو نہایت بلاغت کے ساتھ بیان کر رہا تھا۔ وہ تقریر کے دوران میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ رکا بلکہ مسلسل فرلاٹے بھرتا چلا گیا۔

شروع شروع میں جج رحم آمیز حیرت کے ساتھ قیدی کی تقریر سنتا رہا۔ وہ افسوس کر رہا تھا کہ کتنا قابل اور تعلیم یافتہ آدمی ایک خوفناک جرم کے ارتکاب کی وجہ سے انسانیت کے ذلیل ترین گڑھے میں گر پڑا ہے اور اب ——

اب سات بج چکے تھے مگر قیدی بغیر کسی تکان یا دماغی اضمحلال کے برابر بول رہا تھا اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس میں کہیں سے نئی طاقت برابر چلی آ رہی ہے۔

"نہیں حضراتِ جیوری، اس کا کوئی علاج نہیں ہے، قیدی کو اپنی صفائی کے لئے بہت سے معاملات پر روشنی ڈالنی ہے، اُن پر زور دینا ہے، اور جب تک اُس کی تقریر معقول اور متعلق باتوں پر مشتمل ہے اُس کو دنیا کا کوئی قانون بند نہیں کر سکتا خواہ وہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے ——"

عدالت دوسرے دن صبح گیارہ بجے تک کے لئے ملتوی کر دی گئی، اور جیوری کے آدمی اپنے اپنے ہوٹلوں کی طرف چل دیئے۔ قیدی کے دبلے پتلے چہرے پر بھی مسکراہٹ کے آثار نمایاں ہوئے اور وہ بھی اپنی کوٹھڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۲)

صبح ہوئی مگر ناخوشگوار اور افسردہ۔ جج کے داخل ہونے سے پہلے ہی اجلاس کا کمرہ تماشائیوں سے بھر گیا تھا۔ قیدی کو اندر لایا گیا جس نے گھستے ہی جیوری اور جج کی طرف جھک کر مودبانہ سلام کیا اور لوگوں کی قطار پر ایک حیرت آمیز نظر ڈالی، مجمع کی بے قراری پر مسکرایا اور کل شب کی بقیہ تقریر پھر شروع کر دی۔

ڈیڑھ بجے کے قریب ایک قلیل وقفہ ہوا جس میں قیدی نے نیچے جا کر کچھ شربت وغیرہ پیا اور جب عدالت کا اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو وہ بالکل تازہ دم اور مستعد نظر آ رہا تھا۔

جیوری کے ارکان اونگھ رہے تھے، اور ہل ہل کر اور بار بار جمائیاں لے لے کر گھنٹے کی طرف بے چینی کے ساتھ دیکھتے تھے۔ جج بھی مضمحل ہو چکا تھا، اور اس لئے اُس کے چہرہ سے ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا، جونہی کہ پانچ بجے

جج طیش میں آکر اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ ہلا کر کہنے لگا "خاموش"!

قیدی نے تقریر بند کر دی۔

جج نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "مجھے تمہارے مقدمہ سے کوئی تعصب یا بغض نہیں ہے مگر عدالت کا وقت بھی بے کار ضائع نہ کرنا چاہئے"

"مائی لارڈ ——————"

جج نے ہاتھ ہلا کر اُسے خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔

اُس نے پھر کہا "میں آپ کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں"

جج نے گھنٹے کی طرف دیکھ کر کہا "بہت اچھا اب عدالت کا اجلاس اُس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک تمہاری تقریر ختم نہ ہو جائے۔ اس میں خواہ آدھی رات ہی کیوں نہ لگ جائے"

جیوری کی طرف سے اس فقرہ پر عجیب عجیب چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔ مگر قیدی کے چہرے پر مسرت کی ایک عجیب لہر دوڑ گئی۔

قیدی نے جھک کر مودبانہ عرض کیا "مائی لارڈ! آپ جیسا بھی مناسب خیال فرمائیں"

دس بجے کے قریب جج نے دوستانہ لہجے میں قیدی سے شکایت کی کہ وقت حد سے زیادہ گزر گیا ہے اور اب اسے اپنی تقریر بند کرنی چاہئے مگر قیدی نے کہا "مائی لارڈ! مجھے ان لوگوں کی تکلیفوں کا خوب احساس ہے اور صد درجہ افسوس بھی مگر کیا کروں یہ معاملہ میری موت وحیات کا سوال ہے" جیوری کے ارکان کی طرف مخاطب ہو کر کہا "حضرات آپ کو جو زحمت اٹھانی پڑی اُس کا مجھے صد درجہ افسوس ہے مگر میرا یہ بھی ایک فرض ہے کہ اپنی جان کی حفاظت کروں اور آپ جانتے ہیں جان سب چیزوں سے اعلیٰ وارفع ہے اور اس کے آگے ہر چیز ہیچ ہے۔ چنانچہ میں آپ لوگوں کی اجازت سے پھر تقریر شروع کرتا ہوں ——————"

جج نے غصہ میں کھڑے ہو کر کہا "عدالت کا اجلاس کل گیارہ بجے تک کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے۔

(۳)

ساتویں دن کی صبح کو جیوری کی طرف سے ایک شکایت نامہ موصول ہوا جس میں مذکور تھا کہ وہ لوگ جنہیں اپنے کاروبار اور اپنے بال بچوں کی فکر ہے چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس لامتناہی تقریر کی مصیبت سے انہیں نجات دلائی جائے۔

عرضی کا خلاصہ یہ تھا کہ "قیدی کو پھانسی دے دو"۔ بہت ممکن تھا کہ جج اس پر برضا و خوشی عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتا مگر اُس نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور کہا کہ انہیں ابھی قدرے توقف کرنا چاہئے۔

قیدی پہلے سے زیادہ تازہ دم اور مستعد کٹہرے میں داخل ہوا، اور اس نے بغیر کسی تمہید کے اپنی سابقہ تقریر کے بقیہ حصے کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس حرکت پر تمام عدالت میں ایک قہقہہ پڑا۔

جج نے کہا "خاموش" ملازموں نے بھی یک زبان ہو کر کہا "خاموش" (تمام مجمع اور چند بیرسٹروں کو اس خاموش" پر بڑی ہنسی آئی"

لنچ کے بعد جج نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "تمہیں اپنا بیان مختصر کر دینا چاہئے کیونکہ تم دو دن سے برابر بول رہے ہو، اور میں اپنی ذمہ داری کو کافی طور پر محسوس کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ تمہاری تقریر کا ایک ایک لفظ معاملہ کو بد سے بدتر بنا رہا ہے"

قیدی نے گردن جھکالی اور کہا "مائی لارڈ! میں آپ کی اس تکلیف کے لئے جو آپ نے میری تقریر اطمینان قلب کے ساتھ سننے میں اٹھائی ہے، معافی چاہتا ہوں۔ چونکہ اب تک میں نے اپنی صفائی کے اصل معاملہ کو بالکل نہیں چھیڑا اور صرف چند تمہیدی باتوں پر زور دیا ہے اس لئے ــــــــــ"

آخر کار جج بھی مجبور ہو کر کرسی میں لیٹ گیا۔

قیدی نے پھر کہنا شروع کیا "مجھے پھانسی کیوں دینی چاہئے اس کے لئے صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے مگر پھانسی کیوں نہیں دینی چاہئے اس کے لئے میرے پاس ہزاروں دلیلیں موجود ہیں، چنانچہ میں ان دلیلوں کو ترتیب کے ساتھ بیان کرتا چلا جاؤں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کا اور معزز حضراتِ جیوری کا قیمتی وقت صرف ہوگا مگر خیر، اب میں شروع کرتا ہوں ــــــــــ"

جج نے چلا کر کہا "میں ہرگز اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ عدالت کا قیمتی وقت اس طرح بے کار ضائع کیا جائے"

"مائی لارڈ"

قیدی کی آواز بہت درد انگیز اور شکستہ معلوم ہو رہی تھی، وہ آزردہ خاطر ہو کر اپنے کٹہرے میں بیٹھ گیا اور کہنے لگا "آپ مجھے پھانسی دے دیں یہ اور بات ہے مگر یہ یاد رہنا چاہئے کہ مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا کافی موقع نہیں دیا گیا"

تمام عدالت میں خاموشی چھا گئی جو بالآخر کتابوں اور کاغذوں وغیرہ کے اٹھانے، رکھنے کی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ جج اور وکلا حکامِ اعلیٰ سے مشورہ کر رہے تھے۔

بالآخر جج نے کھڑے ہو کر کہا "عدالت کل صبح تک کے لئے ملتوی کی جاتی ہے"

یہ کہہ کر وہ نہایت شان و شوکت کے ساتھ جو ایسے وقت مناسب تھی، کمرۂ عدالت سے باہر چلا گیا۔ جیوری کے بکس کی طرف سے غصہ میں بھری ہوئی لعنت ملامت کی آوازیں آرہی تھیں مگر قیدی کے چہرے پر ایک عجیب مسرت اور لبوں پر تبسم تھا۔

(۴)

جب جج آٹھویں دن عدالت میں آیا تو بیٹھتے ہی بولا "میں نے سرکاری افسرانِ قانون سے مشورہ کر لیا ہے، اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قیدی کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کافی موقع دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اُسے انہیں واقعات سے سروکار رکھنا چاہیے جن کا مقدمہ سے براہِ راست تعلق ہو، وہ غیر متعلق باتیں چھیڑ کر خواہ مخواہ طوالت نہ پیدا کرے"

قیدی نے پھر اپنی لاانتہا ہی تقریر کا سلسلہ شروع کر دیا، مگر اب اُس نے اپنے طریقے میں کسی قدر تبدیلی کر دی تھی، چنانچہ روئے سخن میں بھی ایک خاص فرق نظر آرہا تھا۔ ـــــ اب وہ نہایت آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور اس کی تقریر پہلے کی طرح غیظ آلود نہ تھی بلکہ اس سے نہایت متانت کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ بہت ہوشیاری کے ساتھ ایک ایک بات پر زور ڈال رہا تھا، اور برابر مستند آدمیوں کے واقعات بیان کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ نہایت چرب زبانی کے ساتھ مختلف کتابوں، مقدمات کی کارروائیوں، شہادتوں کے قانون اور صحتِ واقعہ کے مشتبہ ہونے کے متعلق سینکڑوں کتابوں کے حوالے دے دے کر اپنے مافی الضمیر کو واضح کر رہا تھا۔

متعدد مرتبہ اسے خاموش ہونے اور جوش کو قابو میں رکھنے کے لئے کہا گیا مگر ایسی تنبیہوں کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک بالکل غیر متعلق اور طویل بحث چھڑ جاتی تھی اور پھر افسروں کو بار بار مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ آج جج نے بھی تمام دن مقدمہ کی کارروائی اونگھ اونگھ کر سنی۔ جیوری کے لوگ مسکرا مسکرا کر قیدی کی طرف کسی قدر ترش روئی کے ساتھ گھور رہے تھے۔ تماشائیوں کے مجمع میں بھی اس لاانتہا ہی اور تکلیف دہ تقریر کے سننے کی تاب نہ رہی تھی اور اب اس کی طرف بے التفاتی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ بہر حال اس طرح یہ دن بھی گزر گیا۔ اور سات بجے عدالت کا قدرتی التوا یقینی امر تھا

(۵)

دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا، مگر قیدی برابر بول رہا تھا۔ تقریر کے دوران میں ایک دفعہ جج نے کچھ مداخلت کی

تو اس کے جواب میں قیدی نے کہا "جناب عالی، یہاں تک میں نے صرف اُس معاملہ پر زور دیا ہے جو جسم کے قریب چاقو پڑا پانے کے متعلق ہے، حالانکہ ابھی مجھے بہت سی باتیں (اس پر تمام عدالت میں کامل خاموشی چھا گئی اور تمام لوگوں نے ایک تھرتھری سی محسوس کی) خود جسم کے متعلق عرض کرنی ہیں پھر اس کے بعد ٹوٹا ہوا گلاس، سفید سفوف، ماہرین کیمیا کے تجزیے، ارتکاب جرم کا وقت، موسم، اس رات کو چاند کی خاص ہیئت، پولیس اور ہوم آفس کی شہادتیں، اُن کی صحت و عدم صحت اور پھر سب سے بڑھ کر خودکشی کا مسئلہ، غرض ابھی تو سینکڑوں مسائل تشنۂ تکمیل ہیں۔ مثلاً وقوعہ کی شب کو میں ایک نیم سرکاری جلسہ میں مدعو تھا، اور اب اس جلسے کے حاضرین کی فہرست مجھے مل گئی ہے۔ چنانچہ میرا ارادہ ہے کہ آٹھ سو سات گواہوں کو جو میری عدم موجودگی کا ثبوت دیں گے یکے بعد دیگرے عدالت میں پیش کروں، جن کے متعلق میں چند تعارفی الفاظ بھی کہتا جاؤں گا، اور پھر ——"

جج نے اس جملۂ معترضہ کو روکتے ہوئے کہا "اچھا حضرت آگے بیان کیجئے، خدا کے لئے کہو! آگے کیا کہنا چاہتے ہو۔"

قیدی نے وہ دن بھی اعتراضات کے جوابات میں گزار دیا جو چاقو کے متعلق کئے گئے تھے، اور آخر میں اس نے کہا کہ "حضراتِ جیوری میں کل اُن اعتراضات کے جواب دوں گا جو پولیس کی اُس رپورٹ کے متعلق ہیں جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ میرا جسم بے حس پڑا ہوا پایا گیا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر ایک بات ——"

جج نے قطع کلام کر کے غصہ میں بھری ہوئی آواز سے کہا "اجلاس ملتوی کیا جاتا ہے۔"

(۶)

نویں ہفتہ کی صبح کو جب کہ قیدی نے کامل دو گھنٹے اپنے آٹھ سو سات گواہوں میں سے چند کو پیش کرنے میں گزار دیئے تھے ارکانِ جیوری نے جج سے چند منٹ کے لئے رخصت چاہی تاکہ اُس سوال کے متعلق جو جج نے اُن سے کیا تھا غور و فکر کر سکیں۔

چنانچہ انہیں تھوڑی دیر کے لئے چلے جانے کی اجازت فوراً مل گئی، اور اس اثنا میں جج نے شاہی مشیر سے ایک مختصر مشورہ کرنا شروع کر دیا۔

مشیر نے پوچھا "تو کیا مائی لارڈ! اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا؟"

جج نے ایک لمبی سانس لے کر کہا "کچھ نہیں"

مشیر نے دریافت کیا "کیا اُسے جب تک وہ چاہے تقریر کرنے کی اجازت دی جائے گی اور اس کے سوا

کوئی مفر نہیں ہے"

ارکانِ جیوری عدالت کے کمرے میں آہستہ آہستہ داخل ہوئے۔ جج نے پوچھا "کیا آپ حضرات اپنے فیصلہ پر متفق ہو گئے ہیں؟"

جو شخص سب سے آگے تھا اُس نے کہا "ہاں، بیشک، جنابِ والا، ہم نے اس قیدی کو بالکل بے گناہ پایا"

کھچا کھچ بھری ہوئی عدالت میں سناٹا چھا گیا اور لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

جج نے کہا "مسٹر جان تمہارے ملک کی جیوری نے تمہیں اُس الزام سے جو تم پر لگایا گیا تھا بالکل بری پایا ہے اور تمہیں آزاد کر دینے کے سوا اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تم نے اپنی صفائی کی تقریر میں (یہاں تک پہنچ کر اُس کی آواز رک گئی) غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ دماغی جوہر کا ثبوت دیا ہے۔ اس لئے میں نہایت زوردار الفاظ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی خداداد قابلیتوں کو کار آمد کاموں میں صرف کرو، نہ یہ کہ ایک قابلِ نفرت جرم کے ارتکاب کی تردید میں مشغول رہو۔ جان اب تم آزاد ہو اور جا سکتے ہو"

"مائی لارڈ مجھے ابھی چند الفاظ اور کہنے ہیں ۔۔۔۔۔۔"

فقرہ ختم ہونے سے پہلے ایوانِ عدالت میں سے مجمع منتشر ہونا شروع ہو گیا اور ایک منٹ کے بعد کمرے میں سوائے قیدی کے اور کوئی نہ رہا۔

قیدی کے چہرے پر ایک عجیب مسرت نمایاں تھی۔

"میرے "چند الفاظ" اُن کے تمام اعتراضات کا ایسا مسکت جواب ہوتے کہ اُن سب کے دانت کھٹے ہو جاتے۔ مگر، خیر ۔۔۔۔۔۔"

یہ کہہ کر وہ بھی کاروبار میں مصروف بازار میں ایک طرف کو چل دیا۔

ظفر قریشی دہلوی

بچپن کی یاد

بچپن کا راز کیا ہے اے دل ذرا بتا دے
بچھڑے ہوئے دنوں سے اک بار پھر ملا دے

جس سے دلِ حزیں کو بچپن کی یاد آئے
تو اے ربابِ ہستی وہ راگ پھر سنا دے

آئے نئے نئے تھے جب وقت ہم جہاں میں
وہ عافیت کا منظر اک بار پھر دکھا دے

دنیا کی کلفتوں سے دل تنگ آگیا ہے
گودی میں عاطفت کی تو پھر مجھے لٹا دے

کیا بات ہے جو ایسا خاموش ہو گیا ہے
اک بار پھر پرانے نغموں سے دل ہلا دے

شورِ جہاں ہے مجھ کو مانندِ شورِ محشر
پیاری سی دھن سنا کر تو مست پھر بنا دے

ہستی کی راہ میں ہے ہر ہر قدم پہ ٹھوکر
مہرِ پدر کی انگلی پھر راہبر بنا دے

محفوظ ہوں سدا میں آشوب سے جہاں کے
آغوشِ مادری میں تو پھر مجھے سلا دے

اے سازِ زندگانی مدت سے منتظر ہوں
تو زخمۂ ازل سے تاروں کو پھر بجا دے

آواز جن کی اب تک کانوں میں گونجتی ہے
وہ بے خودی کی تانیں ناشاد پھر سنا دے

رام پرشاد کھوسلا
ناشاد

چیتوا

افراد

چیتووں[1] کا ایک گروہ جس میں ایک بڈھا، اُس کا جوان بیٹا، بیٹے کی بیوی، سات برس کا ایک بچہ، ایک بے باپ کی بچی، اُس کی ماں اور دو اور نوجوان ہیں۔

دو پڑھے لکھے مالدار نوجوان، ایک سرکاری اہل کار، اُس کی بیوی اور گاڑی بان۔

پہلا سین

سنسان راستہ۔ موسم سرما کی ایک شام۔ عورتیں اور مرد بیٹھے ہیں۔ لڑکا اور لڑکی سردی سے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ بڈھے کے پاس صرف ایک چادر ہے۔ جوانوں کے ہاتھ میں پوٹلیاں ہیں۔ لڑکا ننگے سر ننگے پیر ہے اور آدھی باہوں کی کرتی پہنے ہے۔ لڑکی کے بدن پر ہاتھ بھر کا ایک کپڑا ہے۔ عورتوں کے پاس اوڑھنے کو کچھ نہیں۔

نوجوان (اپنے باپ سے) بابا یہاں کیوں بیٹھ رہے ہو، آگے چلو۔

بڈھا۔ آگے کہاں چلیں؟

نوجوان۔ کہیں چلو۔

بڈھا۔ چلتے چلتے دن بھر تو ہو گیا۔ اب پاؤں کام نہیں کرتے۔

نوجوان۔ کہیں ٹھکانا ملے تو اچھا ہے۔ یہاں نہ کنواں ہے، نہ کوئی بستی ہے۔

بڈھا۔ یہاں بستی کہاں رکھی ہے ہم نے تو کہا تھا کہ اسی گاؤں میں ٹھہر جائیں، مگر تو نے نہ مانا۔ یہاں سے دوسرا گاؤں نہ جانے کتنی دور ہوگا۔

---

[1] چیت کی فصل کاٹنے والے مزدور۔ فصل کے مہینے میں ان کے گروہ کے گروہ مزدوری کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

دوسرا نوجوان۔ مگر بابا یہاں تو سردی سے ٹھٹھر جائیں گے۔ کہیں گھام میں چلو۔
بڈھا۔ چلو، گھام میں چلو۔ اس سے تو ٹھٹھر جائیں سو اچھا۔ اس جنجال سے تو پران بچیں گے۔
(دو نوجوان گھوم کر واپس آ رہے ہیں۔ دونوں اوورکوٹ پہنے ہوتے ہیں۔ آپس میں باتیں کر رہے ہیں)
بڈھا۔ بھیّا، یہاں سے گاؤں کتنی دور ہوگا؟

(دونوں رک جاتے ہیں)

پہلا نوجوان۔ یہاں سے دو کوس ہے۔
بڈھا۔ تب تو بڑی دور ہے۔
نوجوان۔ تم لوگ کہاں جاؤ گے؟
بڈھا۔ کہاں بتائیں، جہاں جگہ ملے۔
کسان نوجوان۔ مہاراج، ہم چپتوا ہیں۔ سنا تھا کہ اپنے یہاں چیت کٹنے لگا ہے مگر ابھی تو یہاں لگا بھی نہیں لگا۔
نوجوان۔ تم لوگ چپتوا ہو؟ کہاں سے آ رہے ہو؟
بڈھا۔ مہاراج سیاوری سے آ رہے ہیں۔ کل دوپہر کو چلے تھے۔ ساتھ میں جو کچھ تھا وہ ختم ہوگیا۔ اب کیا کھائیں؟ کہاں جائیں؟
نوجوان۔ سیاوری تو بہت دور ہے۔ یہاں سے ساٹھ میل ہوگی۔ تم لوگ برابر چلتے آئے ہو؟
بڈھا۔ اور کرتے کیا مہاراج!
نوجوان۔ مگر تم لوگوں نے بڑی بھول کی۔ پیچھے جو بستی تھی وہاں کیوں نہ ٹھہر گئے؟
بڈھا۔ ٹھہر کر کیا کرتے؟ جتنا آگے نکل جائیں سو اچھا۔ یہی سوچ کر چل پڑے۔ ابھی ایک آدمی ملا تھا۔ کہتا تھا سیمری میں چیت کٹنے لگا ہے۔ لیکن مہاراج فصل تو ستیاناس ہوگئی، ہم لوگ کاٹیں گے کیا۔ اس آدمی کے پاس ایک گٹھری تھی۔ کہتا تھا، آدھ سیر دانے نہیں نکلے۔ پھر ہم سیمری جا کر کیا کریں گے؟ (رک کر) مہاراج، سیمری کتنی دور ہوگی؟
نوجوان۔ سیمری یہاں سے آٹھ میل ہے۔ تم ایسی سردی میں اب آگے کہاں جاؤ گے۔
بڈھا۔ مہاراج، کھانے کے لئے تو کچھ ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔ سویرے ایک مٹھی چنوں سے پانی پی کر چلے تھے دن بھر پانی کے سہارے ہی یہاں تک چلے آئے۔ مگر اب تو بھوک سے پیٹ جل رہا ہے آنکھیں مندی جا

رہی ہیں۔ اپنی کچھ نہیں۔ پیٹ باندھ کر سو رہیں گے۔ مگر یہ لڑکا ہے، چھوٹی لڑکی ہے بھگوان کی دیا سے اُن کے لئے کچھ مل جاتے تو اچھا ہے۔

دوسرا نوجوان (اوورکوٹ میں سردی سے کانپتے ہوئے) کیوں جی، تمہارے اور کپڑے کہاں ہیں؟

پہلا نوجوان ۔ دیکھتے نہیں۔ بیچاروں کے پاس اور کپڑے کہاں رکھے ہیں؟ جو کچھ ہیں سو یہی ہیں۔

بڈھا ۔ مہاراج آپ دیکھ تو رہے ہیں۔ انہیں کپڑوں سے کسی طرح رات کٹ جائے گی۔ بھگوان سب کا مالک ہے۔

نوجوان (اوورکوٹ کی جیب ٹٹول کر اپنے ساتھی سے) انہیں کچھ پیسے دے دیں۔

دوسرا نوجوان ۔ اچھی بات ہے۔

پہلا نوجوان (پریشان ہوکر) میری جیب تو خالی ہے۔

دوسرا ۔ پھر چلو۔

پہلا ۔ چلتے ہیں۔ ذرا اپنی جیب دیکھ لو۔ کچھ ہو تو اِن بیچاروں کو دے دیں۔

دوسرا ۔ میری جیب میں سگریٹ کی ڈبیا ہے۔

پہلا ۔ تو کیا وہ سگریٹ کھائیں گے؟

دوسرا ۔ کیا ہوا، پی تو سکتے ہیں۔

پہلا ۔ چُپ رہو۔ (پھر پریشان ہوکر بڈھے سے) بھائی اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں۔ نہیں تو تمہاری کچھ مدد کر دیتے۔

بڈھا ۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں، مہاراج۔ نہیں ہیں تو جانے دو۔

(دونوں نوجوان آگے بڑھتے ہیں)

پہلا نوجوان ۔ تمہیں ان لوگوں پر ترس نہیں آتا؟

دوسرا ۔ آتا کیوں نہیں۔ مگر جیسی حالت ہماری ہو ویسی ان کی۔ ہم اور وہ ایک سے ہیں۔

پہلا ۔ تم تو وحشی ہو۔

دوسرا سین

(دھوبی چینوؤں کا گروہ۔ لڑکا ماں کی گود میں منہ چھپائے بیٹھا ہے۔ بڈھا چپ چاپ ہے)

پہلا نوجوان ۔ بابا، اب تو بھوک سے بُرا حال ہے۔ پانی پی پی کر کہاں تک پیٹ بھریں۔ منہ سوکھ رہا ہے آنکھوں کے سامنے تلکے چھوٹ رہے ہیں۔ ہم سب تو سہہ لیں گے، مگر پتن نے سویرے سے کچھ نہیں کھایا۔ وہی چنے کھاتے تھے۔

بڈھا ۔ نہیں کھایا تو کیا کریں۔ کسی نے کچھ نہیں کھایا، بتاؤ کیا کریں، مرجائیں؟ تو ہی سب کو گھیر کر یہاں لے آیا ہے۔ کہتا تھا چیت کٹنے لگا۔ اب بتا، یہاں چیت کہاں ہو۔ گیہوں میں جان نہیں رہی چنا اوپر سے دیکھو تو پیلا ہے، اندر سے اینٹھ کر کالا پڑ گیا ہے۔ پھر آدمیوں کا کیا ہو؟ بس کھا کر جئیں گے۔

(ساتھ کے دو نوجوان الگ باتیں کر رہے ہیں)

پہلا نوجوان ۔ جی چاہتا ہے یہ کالی مٹی کھا جائیں۔

دوسرا نوجوان ۔ لگتی تو بڑی اچھی ہے۔ تم نے کبھی کھائی ہے؟

پہلا (تھوڑی سی مٹی اٹھا کر منہ میں رکھتا ہے) ارے یہ تو بڑی اچھی لگتی ہے۔ سوندھی سوندھی باس آتی ہے۔

دوسرا ۔ تو پھر چلو اسی مٹی سے پیٹ بھر لیں اور سو جائیں۔ سویرے دیکھا جائے گا۔

پہلا ۔ پاگل اس طرح نیند آجائے تو سب جھگڑا ابھی نہ چک جائے۔ بھوک سے آنتیں سکڑ رہی ہیں نیند کہاں آئے گی!

دوسرا ۔ یہاں بیری کے پیڑ بھی نہیں۔ کسی پیڑ کی جڑ ہوتی تو اسی کو کھاتے۔

پہلا ۔ جڑیں تو بہت سی ہیں۔ کھاؤ نا۔

دوسرا ۔ تم تو ہنسی کرتے ہو۔ آج دوپہر کو میں نے سچ مچ ہی پیپل کی جڑ توڑ کر کھائی تھی۔ بڑی مزے دار تھی۔

پہلا ۔ چلو، اسی کو کھودیں۔

(دونوں جاتے ہیں)

(ایک طرف لڑکی اپنی ماں کی گود میں اوں اوں کر رہی ہے)

ماں ۔ ٹھنکی تو منہ توڑ دوں گی۔

لڑکی ۔ اُوں اُوں، ابھی دے دے۔

ماں ۔ کیا دے دوں؟

لڑکی ۔ وہی کھونٹ میں جو چنے بندھے ہیں۔

ماں ۔ (ایک گھونسا مار کر) ہلا کرتی ہے۔ کہہ دیا چپ بیٹھی رہ۔ تھوڑی دیر میں کھا لینا۔ ابھی دیکھ ——— (کان میں کچھ کہتی ہے) ——— سمجھی!

بڈھا (لڑکی کو روتے دیکھ کر) ارے اسے مار کیوں دیا۔ آ بیٹی میرے پاس بھاگ آ، پتن کے ساتھ کھیل۔

لڑکی (اونچی آواز سے فریاد کرتے ہوئے) مجھے — مجھے بھوک لگی ہے۔ باؤ چنے نہیں دیتی۔

بڈھا۔ بیٹی اب اُس کے پاس چنے کہاں ہیں۔ سویرے سب نے اپنے اپنے حصے کے کھائے تھے۔

لڑکی۔ رکھے تو ہیں۔ باؤ نے کون کھائے تھے۔ کھونٹ میں بندھے ہیں۔

ماں (اُسے پیٹتے ہوئے) بندھے ہیں، تیرے لئے۔ کیوں اور میں کیا کھاؤں گی! بڑی لاڈلی آئی کہیں کی۔

بڈھا۔ ارے، کیوں مارتی ہے! ابیں تو دے دے۔ سکھیا، میرے پاس کیوں نہیں آجاتی؟

(لڑکی بڈھے کے پاس جاتی ہے۔ وہ اسے پچکار کر گود میں بٹھا لیتا ہے)

بڈھا۔ (اپنی بہو کو سردی سے ٹھٹھرتا دیکھ کر) ہردسا کہاں چلا گیا؟ (اپنے بیٹے سے) اور تو بھی بیٹھا بیٹھا کیا کرتا ہے، جا کر لکڑیاں چن لا اور تھوڑی سی آگ ہی بنا۔ سردی سے بڈیاں کانپ رہی ہیں۔

نوجوان۔ میں کہاں سے چن لاؤں۔ ان کو سلگانے کے لئے آگ بھی ہے؟

(بڈھا چپ ہو جاتا ہے۔ بہو تھوڑی دور آگے سڑک پر آگ جلتی دیکھتی ہے)

بہو۔ (دھیمی آواز میں) وہ دیکھو آگ جل رہی ہے تھوڑی سی لے آؤ۔

(سب اسی طرف دیکھنے لگتے ہیں جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں ایک کھلی ہوئی گاڑی اور تین آدمی بیٹھے کھائی دیتے ہیں)

نوجوان۔ بابا چلو، وہیں چل کر بیٹھیں۔ گاڑی کھڑی ہے۔ تمباکو پینے کو مل جائے گا آگ بھی جل رہی ہے۔

(سب اُٹھتے ہیں)

بڈھا (اِدھر اُدھر دیکھ کر) ارے ہردسا چل، ہم لوگ گاڑی کے پاس جاتے ہیں۔

(ہرداس اور اُس کا ساتھی کچھ چباتے ہوئے آتے ہیں)

(سب کا جانا)

تیسرا سین

(گاڑی کھڑی ہے سڑک کے کنارے گھاس کا ڈھیر جل رہا ہے۔ ایک سرکاری اہلکار بیوی کو لے کر اپنے گاؤں جا رہا ہے۔ رات کا کھانا کھانے کے لئے وہاں ٹھہرا ہے۔ آگ کے سامنے اہلکار، اس کی بیوی اور گاڑی والا بیٹھے ہیں)

گاڑی والا۔ آج تو بڑی سردی ہے۔

اہلکار۔ ہے تو پر ہم لوگوں کو کیا کرنا ہے۔ گاڑی پر پال تنا ہے۔ یہاں سے چار کوس جگہ اور ہوگی۔ دس گیارہ بجے گھر پہنچ جائیں گے۔ نہیں تو رات بھر یہیں رہنا پڑے گا۔

(بیوی نعمت خانہ میں سے کھانا نکال کر شوہر کے سامنے رکھتی ہے، گاڑی والے کو دیتی ہے اور خود بھی لیتی ہے سب کھانے لگتے ہیں)

(چینتوا آتے ہیں)

بڈھا (آگے بڑھ کر) مہاراج، ذرا ہم لوگ تاپ لیں؟ بیٹھ جائیں؟

اہلکار۔ (ذرا ہٹ کر) ہاں ہاں بیٹھ جاؤ۔

(سب چکر باندھ کر بیٹھتے ہیں)

اہلکار۔ (کھاتے ہوئے) تم لوگ کہاں جارہے ہو؟

بڈھا۔ کہیں نہیں۔ ہم لوگ چینتوا ہیں۔

اہلکار۔ ابھی سے نکل پڑے ابھی تو فصل آئی بھی نہیں۔

بڈھا۔ گھر بیٹھے بیٹھے کیا کرتے؟ باہر تو کچھ کام بھی مل جاتا ہے۔ سنتے تھے ادھر کہیں چیت کٹنے لگا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہوگا

اہلکار۔ ادھر تو ابھی دیر ہے۔ مگر کونچ کی طرف فصل کٹنے لگی ہے۔

بڈھا۔ (خوش ہوکر) آپ کو کیسے معلوم ہے؟

اہلکار۔ معلوم ہے۔ اُدھر تو بازار میں نیا اناج بھی آگیا۔

بڈھا۔ کونچ یہاں سے کتنی دور ہوگا، مہاراج۔

اہلکار۔ پندرہ کوس ہوگا۔

بڈھا۔ تب تو بہت دور ہے۔

اہلکار۔ کوئی دور نہیں۔ ابھی سے چلو گے تو دوپہر تک پہنچ ہی جاؤ گے۔

بڈھا۔ (مایوسانہ لہجے میں) دیکھو۔

اہلکار (آگ بجھتی دیکھ کر، گاڑی والے سے) ارے کھلبل تھوڑی سی گھاس اور لا۔ آگ بجھ رہی ہے۔

(کھلبل اٹھتا ہے)

بڈھا۔ اے مہاراج گھاس کاہے کو جلاتے ہو۔ بیلوں کو تو ملتی نہیں۔ ہم تھوڑا سا ایندھن اکٹھا کرلاتے ہیں۔

اہلکار۔نہیں، نہیں، ضرورت نہیں۔ہم لوگ ابھی چلے جائیں گے ۔

بڈھا۔ایسی ٹھنڈ میں!

اہلکار۔کچھ ٹھنڈ نہیں۔گاڑی پر پال تنا ہے۔کپڑے بھی کافی ہیں۔چلے جائیں گے۔

بڈھا۔لیکن مہاراج، بیلوں کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔

اہلکار۔ٹھنڈ کیا لگے گی! کون سارات بھر چلنا ہے۔ابھی دس بجے پہنچ جائیں گے۔

(اہلکار کی پوریاں ختم ہوجاتی ہیں۔بیوی اُس کے سامنے دو پوریاں اور رکھ دیتی ہے۔چارگاڑی والے کو دیتی ہے۔کسان لڑکا اور لڑکی اب تک برابر اہلکار کا منہ تک رہے تھے۔

لڑکا۔(بے صبر ہوکر اور ماں کے اوپر گر کر) بائی، لچئی، اُوں، اوں لچئی۔

ماں (اسے دھکیل کر) بڑا انوکھا ہے۔لچئی کہاں سے لاؤں!

لڑکا۔(اہلکار کی طرف دیکھ کر) وہ ہے۔

ماں۔(خفا ہوکر) تو کھالے۔

(لڑکا رونے لگتا ہے)

بڈھا۔(اہلکار سے) مہاراج، ایک لچئی ہو تو اس لڑکے کو دے دو، بھوکا ہے۔

اہلکار۔اب تو کچھ نہیں بچا۔

بیوی۔ہے تو۔ایک پوری بچی ہے۔تم تو نہیں لوگے؟

اہلکار۔نہیں۔

(بیوی پوری لڑکے کے سامنے پھینکتی ہے۔اُسے کھانے کے لئے لڑکے کے ساتھ لڑکی بھی جھپٹتی ہے۔پوری لڑکے کے ہاتھ میں پڑتی ہے۔یہ اُسے جلدی سے منہ میں ٹھونس لیتا ہے۔اہلکار ہنستا ہے)

(لڑکی پل بھر تک کھڑی رہتی ہے۔پھر جھپٹ کر پوری پر منہ مارتی ہے۔تب تک لڑکا اُسے صاف کر چکتا ہے۔)

لڑکی۔(اپنی ماں کے پاس جاکر) لچئی اُوں اُوں (روتی ہے)

ماں (اہلکار کی طرف دیکھ کر) مہاراج، ذرا سا ٹکڑا ہو تو اور دے دو۔

(اہلکار کھانا ختم کر کے چلنے کی تیاری کر رہا ہے)

اہلکار۔اب تو ہم لوگ کھا چکے۔

(عورت چپ ہو کر لڑکی کو گود میں چھپا لیتی ہے۔ لڑکا اب بھی اہلکار کی طرف دیکھ رہا ہے)

لڑکی۔ (ماں سے چمٹ کر) بائی، پُچی۔

ماں۔ مجھے کھالے۔ پُچی کہاں سے لاؤں۔

چوتھا سین

(وہی جگہ۔ اندھیری رات۔ آگ بجھی پڑی ہے۔ گاڑی چلی گئی ہے۔ بڈھا راکھ کے پاس لیٹا ہے۔ اس کے پاس اور لوگ لیٹے ہیں۔ دو نوجوانوں کے سوا سب سو رہے ہیں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چلتا ہے)

نوجوان۔ (کانپ کر) اُف!

دوسرا نوجوان۔ بڑی سردی ہے۔

بڈھا۔ میری ہڈیاں تک کانپ رہی ہیں۔

(بغل میں لیٹے ہوئے لڑکے کو اپنے اور قریب کر لیتا ہے)

نوجوان۔ بابا ایسی سردی تو آج تک نہیں دیکھی۔ انگلیوں میں چنچنی چھوٹ رہی ہے۔ منہ کا خون جم رہا ہے۔

بڈھا۔ اس سے اچھا تو یہی تھا کہ اس گاڑی کے ساتھ ہی چلے چلتے۔

نوجوان۔ تمہیں بیٹھے رہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ چلو۔

بڈھا۔ آگ کے آسرے سے بیٹھا رہا۔ اب وہ بھی بجھ گئی۔ چلو کچھ ایندھن اکٹھا کر لائیں۔

نوجوان۔ رات بھر ایندھن ہی اکٹھا کرتے رہیں گے۔ کچھ سوجھتا تو ہے نہیں۔ ایندھن سسرا کہاں ملے گا۔

(اُٹھ کر گھاس پھوس اکٹھا کرتا ہے۔ اُسے آگ پر رکھ کر پھونکتا ہے۔ دھواں)

بڈھا۔ سویرا جانے کب ہوگا۔

نوجوان۔ ابھی تو دیر ہے۔

(اتنے میں لڑکی روتی ہے۔ وہ اپنی ماں سے چمٹی پڑی ہے۔ ماں کا ایک آنچل اُس کے بدن پر ہے اور اُس کے بدن کا آدھا حصہ کھلا ہے)

ماں (لڑکی کو پچکار کر، نیند بھری آواز میں) سو جا بیٹی!

(لڑکی پھر روتی ہے)

ماں (اس پہ ہاتھ رکھ کر) لے تو کہاں چلی گئی، ادھر کھسک آ۔ (اُسے اپنی چھاتی سے لگا کر آنچل سے اچھی طرح ڈھکتی ہے)
لڑکی (اچانک چونک کر) بائی، لچھی۔
ماں (اُسے تھپکی دے کر) سوجا، سوجا۔ سویرا ہونے پر تجھے لچھی اور جلیبی دوں گی۔
لڑکی (اٹھ کر چلاتے ہوئے) اوں اوں، ابھی دے دے ——— ابھی۔
(سب کی آنکھ کھل جاتی ہے)

ایک نوجوان۔ یہ کیا آفت ہے؟
بڈھا۔ سکھیا کی ماں، کیا ہے؟
سکھیا کی ماں۔ کچھ نہیں بابا لچھی کے لئے روتی ہے۔ بتاؤ لچھی کہاں سے لاؤں؟ (رونے لگتی ہے)
بڈھا۔ ارے روتی کاہے کو ہو؟
لڑکی۔ (روتے روتے اچانک سردی سے کانپ کر) اُوہُو، اُوہُو، اُوہُو، جاڑا لگتا ہے۔
ماں۔ یہاں آجا بیٹی یہاں، جاڑا لگتا ہے تو کیا کروں۔
(اُٹھ کر آگ کے پاس جاتی ہے)

لڑکی۔ اُوہُو، اُوہُو، جاڑا، جاڑا۔
ماں۔ (بڈھے کی طرف دیکھ کر) ذرا اپنی چادر دے دو۔
(بڈھا چادر دیتا ہے۔ ماں لڑکی کو اُس میں لپیٹ کر سلانے کی کوشش کرتی ہے۔ ادھر دونوں نوجوان ایندھن اکٹھا کرتے ہیں)
لڑکی۔ (ایک لخت اٹھ کر) ماں!
ماں۔ کیا ہے بیٹی؟
لڑکی۔ اُوہ!
ماں۔ (پریشان ہو کر) کیا ہے؟
لڑکی۔ (کانپتے ہوئے) ڈر لگتا ہے۔
ماں۔ ڈر کاہے کا بیٹی! دیکھو سب بیٹھے ہیں۔
لڑکی۔ ماں، ماں، وہ دیکھو میری لچھی ——— لچھی چھین رہا ہے۔

نوجوان (جو پاس ہی بیٹھا ہے) اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو مرنے والوں کی طرح بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔

ماں۔ جانے بھیا! دیکھو تو کیسی صورت بنا رہی ہے۔ (آنسو پونچھتی ہے)

نوجوان (لڑکی کو گود میں لے کر اور اس کا بدن ٹٹول کر) ارے، اس کا بدن تو بڑا گرم ہے۔ ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔

بڈھا۔ تاپ تو نہیں چڑھی؟

نوجوان۔ تاپ ہی تو چڑھی ہے۔

ماں۔ تاپ! ہائے رام!

لڑکی (بے ہوشی میں) اوہ ماں، ماں، وہ دیکھو میری لچھی ـــــــ لچھی

(ماں کی گود میں جانے کے لئے تڑپتی ہے)

ماں۔ لاؤ، بھیا مجھے دے دو۔ یہ تمہارے پاس نہیں رہے گی۔

(اچانک لڑکی چپ ہو جاتی ہے، ماں اسے گود میں لیتی ہے)

ماں۔ (چونک کر) ارے، اس کا بدن تو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تم تو کہتے تھے گرم ہے؟ بیٹی! بیٹی!! او سکھیا!

لڑکی (آنکھیں کھول کر) ماں، ماں بھوت! وہ دیکھو ـــــــ میری ـــــــ

ماں۔ بابا ذرا تم تو دیکھو۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔ ہاتھ پیر اولے سے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔

بڈھا گھبراؤ نہیں۔ باہر میدان کی جگہ ہے۔ کہاں کیا ہے، کون دیکھ آیا ہے۔ کچھ ہو گیا ہوگا۔ سویرا ہونے دو۔ ماں درگا کا نام لو۔ اُن کے نام سے سب دکھ دور ہوتا ہے۔

ماں۔ ماں درگا میری سدھ لو۔ ہائے! بیٹی، بیٹی، تو بولتی کیوں نہیں! جانے سویرا کب ہوگا۔ (روتی ہے)

(ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ پتے کھڑکھڑاتے ہیں)

لڑکی۔ ماں! وہ بھوت۔ میں نے کہا تھا، مجھے مت لے چل۔ وہ دیکھ ـــ وہ آیا ـــ ارے رے رے! دانت نکال رہا ہے ـــ مجھے کھا جائے گا ـــ ہائے رے ـــ لے ـــ میری لچھی رے ـــ مجھے مت کھا ـــ لے ـــ لے ـــ

(تڑپ کر جان دے دیتی ہے)

ماں۔ ہائے بیٹی! (چھاتی پیٹتی ہے)

(سب حیران بیٹھے رہ جاتے ہیں)

ہندی

محفلِ ادب

پہلی شام

بالآخر فضا میں خاموشی چھاگئی، اور دھندلی شفق نے ہر شئے کو اپنے رنگ میں رنگ لیا، پرندے اور چوپائے خاموشی کے ساتھ بسیرا لینے کے لئے اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے۔ صرف ایک بلبل باقی رہ گئی جو تمام رات طرح طرح کے خوش آئند نغمے الاپتی رہی، رفتہ رفتہ آسمان زندہ جواہرات سے جگمگا اٹھا۔ زہرہ اپنے ستاروں کی بے شمار فوج پر حکمران سب سے علیحدہ جگمگا رہی تھی۔

یکایک چاند ایک شاہانہ پندار کے ساتھ نکلا اور اس نے اپنے عدیم المثال حسن کو بے نقاب کردیا، تاریکی پر اب اس کی سیمیں شعاعوں کی حکومت تھی۔

آدم نے اس حال میں حوّا سے کہا "میری رفیقہ! رات آگئی، اور ہر چیز آرام کی خواہشمند ہے، ہمیں جسمانی آسائش کا خیال رکھنا لازم ہے، اس لئے کہ خدا نے راحت و مشقت ساتھ ساتھ تخلیق کئے ہیں اور آئندہ نسل انسانی کے لئے ان کا مفہوم "شب و روز" سمجھا گیا ہے ـــــ اب نیند کی اوس ہماری پلکوں کو خواب کے خوشگوار بوجھ سے جھکائے دیتی ہے۔ خدا کی دوسری مخلوق تمام دن بیکار، غیر ذمہ دارانہ طور پر پھرتی رہتی ہے اس لئے انہیں آرام کی ضرورت کم ہے، انسان اپنا روزمرہ کا معینہ دماغی یا جسمانی کام کرنے کے لئے بنایا گیا ہے جو خدا کی نظروں میں اسے دوسری مخلوق سے علیحدہ اور بہر لحاظ ممتاز بنائے ہوئے ہے برخلاف اس کے اور حیوانات بے کار گھومتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کے اعمال پر خدا بھی متوجہ نہیں۔ حوّا اس طرح مخاطب ہوئی۔

"میرے آقا! میری تخلیق کے راز، تیرا حکم بلا دلیل ماننا میرا فرض ہے، خدا کی یہی مرضی ہے۔ خدا تیرا قانون ہے اور تو میرا اس سے زیادہ نہ جاننا ہی عورت کی بہترین علمیت اور اعلیٰ ترین صفت ہے میں جب تجھ سے مصروفِ گفتگو ہوتی ہوں تو تمام موسمی تبدیلیوں کو بھول جاتی ہوں اور میرے لئے ہر لحہ پیغامِ راحت ہوتا ہے۔ صبح کا خوشگوار تنفس، طلوع کی دلکش کیفیت پرندوں کے سہانے نغمے، سورج کی بے شمار جھاڑیوں، درختوں، پھلوں، پھولوں پر چمکنے والی نورانی مشرقی شعاعیں، بذاتِ خود میرے لئے ایک ناقابلِ اظہار مسرت ہیں۔

بارش کی ہلکی پھواروں کے بعد بیش بہا شبنمی موتیوں میں جگمگاتی ہوئی معطر اور زرخیز زمین، اس کے بعد سہانی خوشگوار شام کی آمد، پھر خاموش رات کا نزول اور اُس میں بلبل کے دلکش راگ، چاندنی کی قرمزی شعاعیں، ستاروں کے آسمانی جواہرات غرض ہر چیز مسرت ہی مسرت ہے۔

لیکن پرندوں کے سحر آفرین نغمات میں صبح کا خوشگوار تنفس، سورج کی سطح زمین پر جگمگاتی ہوئی باصرہ نواز شعاعیں، شبنمی موتیوں میں چمکتی ہوئی نوخیز جھاڑیاں اور پھل پھول، ہلکی پھواروں سے نکلتی ہوئی بھینی بھینی خوشبوئیں، شام کی خوشگواری، رات کا سکون، بلبل کے نغمے، چاند کی قرمزی شعاعیں۔ ستاروں کی جواہراتی چمک دمک ۔۔۔۔۔ ہر شے میرے لئے بے معنی ہے،

اگر تو میرے پاس نہیں ہے"

"عالمگیر"

کتاب خانۂ اسکندریہ کے لائبریرین کا خط

ڈی مٹ ری ایس شاہِ والاتبار کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ جب تو نے کتابوں کی فراہمی اور تنظیم و نگرانی کی خدمت میرے سپرد کی تو میں نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اب عرض ہے کہ اور کتابوں کے ساتھ ساتھ ہمیں یہودیوں کی کتب شریعت بھی درکار ہیں - یہ عبرانی حروف اور اس قوم کی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہمارے دائرۂ علم میں نہیں آسکتیں۔ اس کے علاوہ ان کی کتابت بھی مناسب احتیاط سے نہیں کی گئی کیونکہ اب تک اُن کو شاہانہ لطفِ توجہ نہیں حاصل ہوا۔ اب یہ ضروری ہے کہ تو اس کے مستند اور صحیح نسخے تیار کرائے۔ یہ شریعت حکمت و دانش سے معمور ہے کیونکہ یہ قانونِ الٰہی ہے۔ اور اسی بنا پر جیساکہ ہکٹیس باشندۂ ابدرا کا خیال ہے، مورخین اور شعرا کے ہاں اُن کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا اور نہ خود ان لوگوں نے اس کا کچھ حال لکھا جو اس شرع کے پابند ہیں کیونکہ یہ مقدس قانون ہے اور ناپاک زبانوں سے اس کی اشاعت نہیں ہوسکتی۔ لہذا التماس ہے کہ تو یہودیوں کے سردار کاہن سے ہر قبیلہ کے چھ چھ ممتاز افراد اور دیگر ماہرانِ شرع کو طلب کرتا کہ ان کی مدد سے ہم ان صحائف کی روح کو پائیں اور ان کے مضامین کی حقیقی تعبیر و تفسیر سے واقف ہوں۔ اس طرح تیرے کتب خانہ میں خاطر خواہ ذخیرۂ کتب جمع ہو سکے گا۔

"تاریخ"

ایرانی ماں کا گیت

اُٹھ ماں تجھ پہ قربان! اُٹھ کہ اب تو بہت سو چکا! اُٹھ کہ اب تجھ پر سونا حرام ہے! اٹھ کہ تیرا باپ آزادی کی راہ میں مارا گیا اور اپنی جگہ تیرے سپرد کر گیا۔ اُٹھ کہ میرا دودھ تیرے لئے حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو! تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے! تو اپنے باپ کی یادگار ہے!

اُٹھ! کہ میں تیرے باپ کی یہ تلوار تیری کمر سے باندھ دوں اور تجھے میدانِ جنگ میں بھیج دوں۔ اُٹھ کہ دشمن گھر کے دروازے تک پہنچ چکا ہے اپنے باپ کی جگہ کھڑا ہو اور اس کا بدلہ لے! اُٹھ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو اور میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے۔ اُٹھ! میری دونوں آنکھوں کے چراغ تیرے باپ کے بعد تیری ماں بےکس ہے بیدادرس ہے اور تیرے سوا اس کے لئے کوئی امید گاہ اور پشت و پناہ نہیں۔ دشمن دروازے کی چوکھٹ پر پہنچ چکا ہے۔ اُٹھ اور اپنی ماں کے ناموس کی حفاظت کر! اٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے دل کا ٹکڑا ہے! اور اپنے باپ کی یادگار ہے! اٹھ میرے دل کے پرتو اُٹھ! اپنی آنکھیں کھول کہ میں تیری آنکھوں میں غیرت و شجاعت کے وہ نشان دیکھوں جو تیرے باپ کی نگاہ میں موجود تھے! آہ تیری آنکھیں تیرے باپ کی آنکھوں کے کس قدر مشابہ ہیں! اُٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو! میری جان تجھ پہ فدا ہو! تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے۔

اُٹھ! میری جان کی روح اُٹھ! کیا تو ناقوس کی آواز اور اپنے بھائیوں کی فریاد نہیں سنتا۔ تیرے رفیق تیرا انتظار کر رہے ہیں اور تجھے مدد کے لئے بلا رہے ہیں اٹھ! اور میدانِ جنگ کی طرف دوڑ! یا تو سربلندی اور فیروزی کے ساتھ واپس آ یا اپنے باپ کی جگہ آزادیٔ وطن کی راہ میں اپنے باپ کی طرح جان قربان کر۔ اُٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے!

"ادبی دنیا"

قافیہ

قافیہ نظم میں آبشار کا کام دیتا ہے۔ خیال کا تسلسل اور الفاظ کا ترنم قافیہ کی چٹان سے ٹکرا کر ابھرتا اور بلند ہوتا ہے، اور اگر قافیہ کو غزل کی طرح خیال کے بہاؤ کی روکنے والی دیوار بنا دیا جائے تو پھر خیال قافیہ پر سے ابل کر کھلکھلاتا اور ترنم کی دھواں دھار بوچھاڑ کرتا، دوسرے مصرع میں سریلی ہلچل ڈال دیتا ہے اور پھر اس مصرع کے ترنم کو ساتھ لے کر

فہرستِ مضامین

جلد ۱۲ — نمبر ۴

بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۲۹ء

تصاویر:- ۱- کوہِ سہسرام کا ایک دلکش منظر - ۲- حکیم عمر خیام

خلوت و جلوت

اپنی خلوت میں الگ بیٹھا ہؤا اپنی ہی چار دیواری میں گھرا ہؤا میں دنیا و عقبیٰ اور حیات و ممات کی الجھنوں کے سلجھانے میں مصروف ہوں۔ دنیا کو کس نے بنایا اور پھر اس کے پیچھے عقبیٰ کیوں ہوئی اور اس کے پہلے کیا تھا اور نہ تھا تو کیوں نہ تھا؟ اس سب کچھ کے اندر زندگی کی روح کیسے پھنکی اور پھنکی تو پھر اک ہوا کے جھونکے کی طرح کس لئے اس چمن زار میں اُدھر سے آئی اور ادھر سے چل دی؟ یہ زندگی جس نے بیل بوٹوں کو اگایا پرند چرند کو اڑایا دوڑایا یہ مجھ میں آکر کیوں نری سانس لینے والی چلنے پھرنے والی کھانے پینے بولنے چالنے والی جان نہ بنی رہی؟ میرے اس دیس کے خاکی و ارضی جسم میں آکر یہ پردیسن کس سوچ بچار میں پڑ گئی؟ دیکھتی ہے سنتی ہے سوچتی ہے اور سر بگریباں ہو جاتی ہے! کیا یہ اس چھوٹے سے قید خانے میں بند کر دی گئی جس کی کھڑکیاں آنکھیں ہیں جو ہزاروں اور کروڑوں میل کے نظاروں کا پل کے پل میں عکس اتار لیتی ہیں جس کی غلام گردش دماغ ہے جو ایک چشم زدن کے ہزارویں حصے میں اُس دور دراز حریم ناز کے دروازے پر جا دستک دیتا ہے جس کا رہنے والا شاید اسی سبک رفتار کے ساتھ کائنات کی وسعتوں میں کوئی آنکھ مچولی سی کھیل رہا ہے؟

اپنے گھر میں اس گھر والی سے یہ باتیں پوچھتا ہوں تو یہ اندر ہی اندر ایک کرب سا ایک بے چینی سی پھیلا دیتی ہے۔ میں اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہوں اور میری نگاہ اُن چند کتابوں پر جا پڑتی ہے جو میری الماری کی سچی زینت اور میری ہستی کی ایک چھوٹی سی شیخی کا موجب ہیں۔ اپنی بے تابی میں یکے بعد دیگرے میں اُن کو اٹھاتا ہوں۔ ایک کہتی ہے کائنات کا بنانے والا! اچھا تو پھر اُس کا بنانے والا؟ اور پھر اُس بنانے والا کا بنانے والا؟ فضول لغو بے معنی! دوسری کہتی ہے رحیم و رحمٰن، عالم و عادل، نیک و پاک؟ اور اس پر یہ برائیاں اور یہ بدبوسیاں یہ چھوٹے بڑے کے جھگڑے یہ کمزوروں پر طاقتوروں کے ظلم یہ تکلیفیں اور مصیبتیں؟ بے عقلی کج فہمی خوش گمانی!

جاہل مریدوں کم عقل صوفیوں اور بے علم انسانوں کو طعن و تشنیع کرتا ہؤا اپنے نفس سے باغی و بیزار ہو کر میں گھر سے نکل پڑتا ہوں لیکن اپنی خلوت سے یوں پہلو بچاتا ہؤا میں کسی کی جلوت سے دوچار ہو جاتا ہوں! اب محض اک میں ہی وہاں نہیں بلکہ یہاں تو مجھ سے کروڑوں اور بھی ہیں اور یہ پھیلتی ہوئی زمین اور یہ اُٹھتے ہوئے پہاڑ اور یہ سورج کی کرنیں اور یہ بادلوں کے پرے اور دور دور وہ سمندر اور وہ صحرا اور وہ غار اور وہ چوٹیاں اور پھر وہ چاند اور تارے اور اُن کی درمیانی مسافتیں اور اور کوئی مانے نہ مانے لیکن اَور اَن دیکھی اَن سنی اور اَن بوجھی خدا ہی جانے کیا کیا کچھ!!!

"خلوی"

جہاں نما

جرمنی اور انگلستان کا لٹریچر

جریدۂ "لونگ ایج" کے بہرۂ ادبیات میں جرمنی اور انگلستان کے لٹریچر پر ایک دلچسپ مضمون شائع ہؤا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ

"برلنر ٹیجبلیٹ" اور "مانچسٹر گارڈین" نے جرمنی اور انگلستان کے موجودہ ادب پر نہایت دلچسپ روشنی ڈالی ہے۔ جرمن اخبار لکھتا ہے کہ ۱۹۲۸ء کے دوران میں ہماری مطبوعات کی تعداد میں کمی واقع ہوگئی ہے اور انگریزی اخبار نے یہ قیافہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ اب سے ایک سو سال بعد موجودہ برطانی افسانہ نویسوں میں سے کون کون سے بہت زیادہ مقبول ہونگے۔

جنگِ عظیم سے پہلے اور اُس کے بعد بھی جرمنی برابر کتابوں کی پیداوار میں سب قوموں سے بڑھا ہؤا تھا۔ صرف ۱۹۱۹ء میں وہاں ۱۵۸۷۶ کتابیں شائع ہوئیں، لیکن ۱۹۲۲ء میں اُن کی تعداد ۲۲۶۱۴ تک پہنچ گئی۔ دو سال بعد تعداد گر کر ۱۸۰۰۳ رہ گئی، لیکن ۱۹۲۵ء میں پھر ۲۴۸۶۰ کتابیں طبع ہوئیں اور ۱۹۲۶ء میں ۲۶۹۵۱ ۱۹۲۷ء میں نئی اور پرانی جتنی کتابیں طبع ہوئیں اُن کا میزان ۳۱۰۲۶ تھا اور ۱۹۲۸ء میں ۲۷۷۹۴۔ ہمارے اپنے ملک (امریکا) میں سالانہ اوسط دس ہزار سے کچھ کم ہی رہتی ہے اور برطانیہ عظمٰی میں اس سے ذرا بڑھ کر۔

گزشتہ سال کی جرمن مطبوعات کا تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ ادبِ لطیف کی کتابیں دوسری اصنافِ کتب سے تقریباً دوگنی شائع ہوئیں۔ ان کی تعداد ۵۰۰۰ کے قریب تھی، دوسرے درجے پر مدرسے کی کتابیں اور تیسرے درجے پر صنعیات اور دینیات کی کتابیں تھیں۔ گزشتہ سال کی بہ نسبت دو ہزار سے اوپر کتابیں معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی مضامین پر نکلیں۔ اگرچہ رومن حروف کا رواج ہر جگہ بڑھ رہا ہے لیکن جرمنی میں اب تک نصف سے زیادہ کتابیں گوتھک حروف میں چھپتی ہیں۔ تراجم کی مانگ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال ان کی تعداد ۱۶ فیصدی سے متجاوز ہوگئی۔ پانچ سو سے زائد کتابیں انگریزی زبان سے ترجمہ ہوئیں۔ ۲۸۰ فرانسیسی سے اور ۱۷۶ روسی سے۔

انگلستان کے ادبی کوائف ماضی کی بجائے مستقبل کے متعلق ہیں۔ "مانچسٹر گارڈین" میں یہ معلوم کرنے کے لئے ایک مقابلہ جاری تھا کہ ۲۰۲۹ء میں عہدِ حاضر کے کون کون سے برطانی افسانہ نویس سب سے زیادہ مقبول سمجھے جائیں گے۔ مقابلہ میں شامل ہونے والے ہر شخص کو چھ افسانہ نویسوں کے نام تحریر کرنے کی اجازت تھی جن کی تصانیف اُن کی رائے میں آج سے سو سال بعد سب سے زیادہ پڑھی جائیں گی۔ کسی فہرست میں وہ چھ نام یکجا موجود نہ تھے جو آخر مقبول ترین ثابت ہوئے، لیکن اول درجے کا انعام اُس شخص کو ملا جس نے ویلز، بینٹ، جارج مور، گالزورذی، شیلا کے سمتھ، اور آر ایچ مائرم کے نام لکھے تھے۔ پہلے بیس ناموں کی فہرست یہاں درج ہے، اور ساتھ ہی اُن آرا کی تعداد بھی دی گئی ہے جو ہر ایک کے لئے موصول ہوئیں۔

گالزورذی	۱۱۸۰
ویلز	۹۳۳
بینٹ	۶۵۴
کپلنگ	۴۵۵
بیری	۲۸۶
وال پول	۲۳۳
کے سمتھ	۱۹۸
جارج مور	۱۶۵
برنارڈ شا	۱۱۰
کانن ڈائل	۱۰۱
آر ایچ مائرم	۷۹
جان بوشن	۶۳
ڈی ایچ لارنس	۶۱
چسٹرٹن	۶۰
الڈوس ہکسلے	۵۰
ہال کین	۴۸
ہیئر نیلڈ	۴۶

عمرِ خیّام

اس دنیا میں ہر شخص مسرت طلب پیدا کیا گیا ہے۔ آدمی پر جو کچھ آلام و مصائب گزرتے ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے، اور ان میں تا بمقدور تخفیف کرنے کی دلی خواہش قلبِ انسان میں ہمیشہ مستور رہتی ہے۔ آج جو چیز نئی ہے کل پرانی ہو جائے گی۔ جو آج پیدا ہوا ہے وہ کل مر جائے گا، جہاں آج بہار ہے وہاں کل خزاں ہوگی۔ انہیں مشاہدات کی بنا پر آدمی کے دل میں اس وقت خود بخود سوالات پیدا ہونے لگتے ہیں جب اس کی عمر ذرا بھیگ جاتی ہے اور وہ عہدِ شباب سے نکل کر پیری میں قدم رکھتا ہے۔

یہ دنیا کیا چیز ہے؟ روح کیا چیز ہے؟ موت کیا چیز ہے؟ زندگی کیا چیز ہے؟ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ اور کہاں جائیں گے؟ زندگی کا اعتصام کیا ہے اور اختتام کیا ہوگا؟

ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک ان سوالات کا تشفی بخش جواب کسی نے نہیں دیا ہے۔ مشہور ہیئت دان اور فلسفی شاعر عمر خیام نے ان رموز و نکات کو اپنی لطیف رباعیات میں حل کرنے کی جو سعی کی ہے، وہ قابلِ داد ہے اور اس بنا پر آج وہ دنیا سے خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے۔

بقول اس کے روح ایک جنسِ لطیف ہے جس کا علاقہ جسم سے سوا ذاتِ باری سے براہِ راست ہے۔ اس کا پیغام ہے کہ روح کو دنیا کی تمام کشمکشوں سے پاک رکھو۔ طبیعت پر کبھی غم، تردد، افسوس، فکر اور طمع کا بار نہ ڈالو۔ ہمیشہ بے نیاز رہو۔ ایثار اور قربانی کی حقیقی روح اپنے اندر پیدا کرو۔ اگر تم میں ایثار کا جذبہ موجود نہ ہوگا تو تمہاری روحانیت تباہ ہو جائے گی۔

عمر خیام کسی ایک خاص مذہب و مسلک کا پیرو نہیں ہے۔ اس کے لئے عام مذہبی معتقدات بہت اچھے ہیں، اور عالمگیر مذہب کا وہ قائل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ صداقت ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ وہ کسی خاص مذہب و ملت کے لئے وقف نہیں ہے۔ خدا نے تمہیں جو دل دیا ہے وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تم حق و باطل کی تصویر من و عن دیکھ سکتے ہو۔ "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے" اس کا خیال نہیں ہے بلکہ وہ اس امر کا قائل ہے کہ جو کچھ واقعاتِ حیاتِ انسانی میں گزرتے رہتے ہیں وہ سب تقدیرِ الٰہی کے ماتحت ہوتے ہیں۔ بغیر خدا کی مرضی اور حکم کے پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ لہٰذا ہمیں جب کوئی تکلیف پہنچے، یا راحت و کامرانی نصیب ہو تو یہی تیقن ہماری تسکینِ قلب کا ضامن ہوگا کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے اور اس کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔

انسانی زندگی ایسی ہے جیسے کنول کے پھول کی پنکھڑیوں پر قطرہ ہائے آب ہوتے ہیں۔ ذرا ہوا کا جھونکا آیا، قطرہ پھسل کر دریا میں مل گیا، اور پھر وہاں کچھ بھی نہیں رہا۔ لہٰذا انسان کی قابلیت، حسن، شجاعت، دولت، حشمت، سب فانی اور چند روزہ ہے، اگر بقائے دوام حاصل ہے تو صرف اس کی روح کو۔ عمر خیام کو خدا پر انتہائی توکل ہے۔ وہ اپنے گناہوں کا ہمیشہ معترف رہتا ہے اور توبہ کرتا رہتا ہے۔

عمر خیام کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ باوجودیکہ تنگ خیال اور متعصب ملاؤں کے درمیان اس کی پرورش اور تربیت ہوئی، تاہم وہ تعصب اور مذہبی امتیاز سے بالکل مبرا اور منزہ رہتا ہے۔

تخیل کی رفعت اس کے کلام کی ایک خاص شان ہے۔ اس کے جامِ سفالی کے ایک ایک ذرے میں ہزاروں خوبصورت چہرے، خندہ ہائے گل مسرت و کامرانیٔ حیات ملے ہوئے ہیں، جو کبھی خاک میں مل گئے اور پھر کمہار نے اُن کی خاک کا جام تیار کیا! اسی طرح خیام کے کاشانے کی ایک ایک اینٹ میں غرور و تمکنت اور شاہانہ اقتدار والے تاج داروں کے سر کی خاک ملی ہوئی ہے۔

عمر خیام باوجودیکہ فضل و علم میں کامل ہے، تاہم اپنے آپ کو انتہائی کسرِ نفسی سے جاہلِ مطلق تصور کرتا ہے۔ اُس کا مقولہ ہے۔

تمہارا آخری مقصد خدا کی ذات ہونی چاہیئے

حسن عزیز جاوید

ذوقِ شاعری

تھوڑی دیر کے لئے شاعری کی بحث سے بالکل الگ ہٹ کر سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ "مذاق" یا "ذوق" جسے انسان کی دماغی خوبیوں میں "جمالی" نقطۂ نظر سے سب سے بہتر تصور کیا جاتا ہے در اصل ہے کیا چیز؟ مختصر الفاظ میں یہ تعریف پیش کی جا سکتی ہے کہ "ذوق اُس قوت کا نام ہے جس کے ذریعہ ہم خوبصورت چیزوں کے حسن سے متاثر ہوتے ہیں"۔ قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ذوق کوئی "اندرونی حاسّہ" ہے جو حسن کے اثر کو قبول کرنے کا کام انجام دیتا ہے یا اس قوت کا تعلق عقلی براہین اور خارجی دلائل سے ہے؟ یعنی ذوق کا تعلق وجدانِ قلب سے ہے یا تعقل سے ہے؟ اس بات کی تہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں اپنے تجربہ سے دریافت کرنا پڑے گا کہ جب ہم کسی خوبصورت چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم پر اُس کے حسن کا اثر کیونکر اور کس طرح کام کرتا ہے؟ آیا اس قلبی اثر کے لئے ہم اپنے فطری وجدان کے ممنون احسان ہوتے ہیں یا عقل اور تمیز کی عقدہ کشائی کے؟ جب ہم کوئی روح افروز منظر دیکھتے ہیں یا کوئی تڑپا دینے والا گیت سنتے ہیں تو کیا ہم پر ان چیزوں کا محض اس لئے اثر ہوتا ہے کہ چند مخصوص دلائل کی بنا پر وہ منظر قابلِ ستائش قرار پاتا ہے اور گیت سے محظوظ ہونے کے لئے ہمارے پاس متعدد عقلی وجوہ موجود ہوتی ہیں۔

ہمارا تجربہ ان سوالات کا یہ جواب دیتا ہے کہ خوبصورت مناظر یا سامعہ نواز صداؤں سے اثر پذیر ہوتے وقت ہمارا دماغ کبھی کسی منطقی استدلال کی ادھیڑ بن میں الجھا ہوا نہیں رہتا، نہ ہمارا ذہن اس وقت دلائل اور براہین کے ذریعہ ہمیں کسی عقلی نتیجہ کی راہ دکھانے میں مصروف ہوتا ہے بلکہ ہم بالکل وجدانی طور پر غیر محسوس طریقے سے حسن کا فوری اثر اس طرح قبول کر لیتے ہیں کہ بسا اوقات حسن کے بہت گہرے اثر کے باوجود ہم یہ تک بتانے سے بالکل قاصر رہتے ہیں کہ اس شدید اثر کی کونسی کھلی ہوئی اور نمایاں وجہ ہے؟ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ "ذوق" کا تعلق "وجدان" سے ہے جو تمام تر ایک اندرونی قوت ہے۔ ذوق کے وجدانی ہونے کا ایک دوسرا ثبوت یہ بھی ہے کہ حسن سے متاثر ہونے کے معاملے میں فطرتاً کائنات کے تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ نیچر کے حسین نظاروں اور نغمہ و موسیقی کی دل کش صداؤں سے جہاں ایک طرف حقائقِ عالم کا رمز شناس فلسفی لطف اٹھاتا ہے وہاں دوسری طرف بل

چلانے والا کسان اور بھیڑیں پالنے والا چرواہا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عمدہ خوشبوؤں اور خوشنما رنگوں سے جس طرح ایک پڑھا لکھا جوان آدمی محظوظ ہوسکتا ہے اسی طرح ایک مدرسہ کے ناتجربہ کار لڑکے کے لئے بھی یہ چیزیں اثر اور لطف سے خالی نہیں۔ خوبصورتی سے محظوظ ہونے کے لئے بچے اور بوڑھے، تعلیم یافتہ اور جاہل، امیر و غریب کی کوئی قید نہیں،

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ "جمال" کا اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا یعنی کسی پر کم ہوتا ہے اور کسی پر زیادہ لیکن بہرحال خواہ کم ہو خواہ زیادہ لیکن ہوتا ضرور ہے ـ یہاں پر سوال صرف "کم اور بیش" یا مقدار کا رہ جاتا ہے لیکن اس میں ذرہ برابر شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ حسن سے متاثر اور محظوظ ہونے کی طبیعت تمام بنی نوعِ انسان میں مشترک ہے۔ ظاہر ہے کہ جو وصف تمام انسانوں میں مشترک ہو وہ کبھی کوئی خارجی چیز نہیں ہو سکتی بلکہ لازمی طور پر اُسے اندرونی اور فطری ہونا چاہئے۔ بس یہ امر ثابت ہوگیا کہ "ذوق" بلاشبہ ایک وجدانی قوت کا نام ہے۔

ذوق کی اصلی بنیادیں تو دراصل اُس اندرونی حاسہ پر ہوتی ہیں جسے وجدانِ قلب کہتے ہیں لیکن اگر ہم ایک ترقی یافتہ ذوق کا تجزیہ کرنے بیٹھیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوگی کہ ذوق کے اندر جو عناصر شامل ہیں اُن کا پہلا اور بنیادی حصہ تو "وہبی" ہے اور دوسرا اضافہ حصہ "اکتسابی" ہے۔ ذوق کا وجود ہوتا تو تمام انسانوں میں فطری طور پر ہے لیکن سب کا ذوق یکساں اور ایک ہی حالت پر نہیں رہتا بلکہ اکتسابی ذرائع سے ارتقا اور بالیدگی حاصل کرتا رہتا ہے اور یہیں سے تمام انسانوں میں ذوق کی کمی بیشی کا یا اچھے اور بُرے مذاق کا اختلاف شروع ہوجاتا ہے

بعض لوگوں میں ذوق کی قوت بہت ہلکی اور کمزور ہوتی ہے۔ وہ حسین چیزوں سے زیادہ شدت کے ساتھ متاثر ہونے کی استعداد نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں میں صرف حسن کی بہت موٹی موٹی اور نمایاں خوبیوں سے لطف اٹھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ جمال کے لطیف پنہاں اور غیر نمایاں پہلوؤں سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے اس کے برخلاف بعض لوگوں میں ذوق اس قدر قوی ہوتا ہے کہ حسن کے باریک سے باریک اور نازک سے نازک رخ بھی اُن کی نگاہِ جستجو سے پوشیدہ نہیں رہتے۔

اگر ہم ذوق کی اس کمی و بیشی اور مقدار کی عدم یکسانیت پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ اس اختلاف کے عموماً دو بڑے اسباب ہوتے ہیں:-

(۱) داخلی -

(۲) خارجی

۱۔ داخلی اسباب سے میری مراد یہ ہے کہ تمام انسان اپنی دماغی ساخت اور ذہنی قویٰ کے لحاظ سے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اور چونکہ وجدان کی عمدگی کا دماغی قوتٰی پر بہت کچھ انحصار ہے اس لئے فطرتاً بعض لوگوں میں حسن سے متاثر ہونے کا مادہ زیادہ ہوتا ہے بعض میں کم۔

۲۔ خارجی اسباب سے میرا یہ مطلب ہے کہ چونکہ اکتسابی ذرائع سے ذوق کی ترتیب کی جاسکتی ہے۔ اس لئے جن لوگوں کو اپنے ذوق کی بالیدگی کے لئے موافق حالات میسّر آتے ہیں۔ اُن کا مذاق دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ ظاہری حالات اور تعلیم و تمدن کے فرق کی وجہ سے ذوق میں عدم یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد کہ ذوق پر تعلیم اور تربیت کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے یہ حقیقت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ ذوق ایک ایسی قوت ہے جس میں نشو و نما اور بالیدگی کی صلاحیت موجود ہے۔ آئیے اب ہم یہ دریافت کریں کہ ہم کون کون سے طریقوں اور ذریعوں سے مذاق کو بالیدہ کر سکتے ہیں اور نشو و نما کے ارتقائی مدارج طے کرنے میں مذاق کے لئے کون سی تدابیر معین اور مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ انسانی قوتوں کو ترقی دینے کی سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ اُن سے مسلسل اس کثرت سے کام لیا جائے کہ یہ کثرتِ استعمال اُن قوتوں کے لئے ورزش کا سامان بہم پہنچا دے۔ جس طرح جسم کو تندرست حالت میں رکھنے اور بدن کی قوت بڑھانے کے لئے جسمانی ورزش نہایت ضروری چیز ہے ٹھیک اسی طرح ذہنی قوتوں کو نشو و نما بخشنے کے لئے بھی لازمی ہے کہ ہم انہیں استعمال کی کثرت سے برابر طاقت پہنچاتے رہیں۔ ورزش جس طرح جسمانی قوتوں کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح دماغی اور ذہنی قوتوں کے لئے بھی فائدہ رساں ہے۔ اور تو اور خود ہمارے حواسِ خمسہ کا یہ حال ہے کہ ان پر استعمال کی کمی اور زیادتی کا پورا پورا اثر پڑتا رہتا ہے۔ جن لوگوں کو اپنے پیشہ کے لحاظ سے روزمرہ کی زندگی میں کسی مخصوص حس سے زیادہ کام پڑتا رہتا ہے اُن کی وہ حس دوسرے حواس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی بصارت جو مشین کے باریک کل پرزوں کا کام کرتے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر قوی ہوتی ہے جس گھڑی کے پرزوں میں ہمیں باوجود غور کے کوئی خرابی یا بے ترتیبی نہیں دکھائی دیتی اس میں ایک مشاق گھڑی ساز کی آنکھ بیک نظر نازک سے نازک نقص کی گرفت کر لیتی ہے۔ اسی طرح جو لوگ عطر کے کارخانوں میں ملازم ہوتے ہیں اور جنہیں روزانہ مختلف قسم کے عطروں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اُن

کا شامہ اس درجہ تیز ہوتا ہے کہ وہ ایک لمحہ میں خوشبوؤں کے باریک سے باریک فرق کو بھی پہچان جاتے ہیں۔
جب حواس کو مشق اور کثرت استعمال سے اس قدر قوت پہنچائی جاسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ذوق کو اس قسم کے خارجی ذرائع کی مدد سے ترقی نہ دی جاسکے۔
مثال کے طور پر موسیقی کے ذوق کو لے لیجئے۔ ہمارا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ ذوق حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ارتقا کے مدارج سے گذرتا رہتا ہے۔ بالیدگی اور نشو ونما کی استعداد جس قدر اس مذاق میں ہوتی ہے کسی دوسری قوت میں نہیں۔ بلندی کو شروع شروع میں صرف سیدھی سادی اور عامیانہ چیزوں میں مزہ آتا ہے۔ اس منزل میں اُسے فن کی بلند چیزوں سے مطلق لگاؤ نہیں ہوتا۔ ایک عرصہ تک کثرت کے ساتھ گانا سنتے سنتے وہ راگ راگنیوں کے سطحی فرق سے واقف ہوجاتا ہے۔ اس منزل سے بھی گزرنے کے بعد اُسے پست اور بلند چیزوں میں امتیاز ہونے لگتا ہے اب ادنیٰ درجہ کی عامیانہ چیزیں جنہیں وہ کچھ عرصہ پیشتر اس قدر دلچسپی سے سنا کرتا تھا اُسے محظوظ نہیں کرتیں اُسے بلند تر چیزوں کی تلاش پیدا ہونے لگتی ہے۔ غزل سے بتدریج ٹھمری اور دادرا، پھر دادرا سے ٹپہ اور ترانہ کی نوبت آتی ہے یہاں تک کہ جب ان چیزوں سے سابقہ پڑتے پڑتے مذاق میں اور زیادہ بالیدگی پیدا ہوجاتی ہے تو ان سے بھی تسکین نہیں ہوتی۔ ذوق کی بلندی اس منزل پر پہنچ کر دھرپد اور خیال کی سی نازک فنی چیزوں کی طلبگار ہوجاتی ہے۔
جو لوگ فنِ مصوری کے مبصر ہوتے ہیں انہیں ابتدائے شعور ہی سے اس صنعت میں دخل نہیں ہوتا۔ مذاق کے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے کے لئے انہیں بھی بالکل اسی طرح صدہا منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، جس طرح موسیقی کے اہلِ نظر کو۔

یہاں تک جو بحث ہوئی وہ مجموعی حیثیت سے اس ذوق کے متعلق تھی جس کے ذریعہ سے ہم ہر قسم کے حسن سے متاثر ہوتے ہیں۔ اب ہم اپنی بحث کو صرف اُس ذوق تک محدود کریں گے جس کا تعلق محض شعر شاعری اور سخن فہمی سے ہے۔
اب ہمیں یہ بات دریافت کرنا چاہئے کہ ذوقِ شاعری کو سدھارنے اور ترقی دینے کے کیا ذرائع ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذوقِ شاعری چونکہ "مجموعی ذوق" ہی کی ایک شاخ ہے اس لئے اس کو ترقی دینے کے جو طریقے ہیں اُن کی شاہراہیں بھی بالکل وہی ہیں جن سے مجموعی ذوق کو ارتقائی مدارج میں گذرنا پڑتا ہے، شاعری کے بہترین شاہکاروں کے مطالعے سے اُن کے باہمی موازنہ اور مقابلے اور مختلف قسم کے کلام کو کثرت کے ساتھ پڑھنے سے ٹھیک اسی طرح مذاق کو درست کیا جاسکتا ہے جس طرح نغمے کے شوقین باکمال استادوں کا گانا سُن سُن کر موسیقی کے ذوق کو سنوارتے ہیں۔

ابتدا میں جب کوئی شخص پہلی مرتبہ شاعری کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اس کا وجدان حد درجہ کند اور ضعیف الحس ہوتا ہے۔ اول اول شعر کی لطافت اس پر بہت خفیف اثر کرتی ہے۔ اُسے عموماً عامیانہ قسم کے اشعار محظوظ کرتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہوتی ہے جس میں اُسے اعلیٰ درجہ کے شعر اور ادنیٰ درجہ کے شعر میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ وہ صاف صاف یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ جس کلام کا وہ مطالعہ کر رہا ہے اس میں کون کون سی نمایاں خوبیاں یا کون کون سے کھلے ہوئے عیوب ہیں۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ کلام کو جانچنے کے لئے وہ کس چیز پر اپنے فیصلے کا انحصار رکھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ بتا سکتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے اسے حظ اور انبساط حاصل ہؤا یا نہیں۔ لیکن اس شخص کو اگر شاعری سے کثرت کے ساتھ سابقہ پڑتا ہے تو اس کے مطالعہ کے پہلو بہ پہلو اُس کے مذاق میں بھی ترقی پیدا ہوتی جائے گی۔ جوں جوں اس کا مطالعہ وسیع ہوتا جائے گا اُس کا ذوق بھی سدھرتا جائے گا۔ تھوڑے دنوں کی مشق اُسے اس قابل بنا دے گی کہ وہ کسی نظم کو پڑھ کر اُس کے متعلق نہ صرف یہ فیصلہ کر سکے کہ وہ اچھی ہے یا بُری بلکہ وہ نظم کے تمام پہلوؤں کو جزواً جزواً پیشِ نظر رکھ کر اُس کی خوبیوں کو سمجھ سکے۔

مندرجہ بالا امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوقِ شاعری کو بالیدہ کرنے کے لئے مطالعہ بہت ضروری چیز ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس مخصوص قوت کی نشو و نما کے لئے ہمیں اپنے دماغ کو ادبی ورزش بہم پہنچانا ضروری ہے۔

ذوق کو بالیدہ کرنے کا ایک دوسرا اہم طریقہ اور بھی ہے۔ اس کا تعلق براہِ راست انسان کی عقلِ سلیم اور قوتِ تمیز سے ہے۔ ہم کسی کلام کے محاسن کو اُس وقت تک حقیقی طور پر نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم اپنی عقلِ سلیم اور قوتِ تمیز کی مدد سے اچھائی اور برائی میں فرق محسوس کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم اپنی سمجھ کے ذریعہ آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُس کو اچھا یا بُرا سمجھنے کے ہمارے پاس کیا وجوہ ہیں؟

اس بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ذوق ایک ایسی قوت ہے جسے دو طریقوں پر بالیدہ کیا جا سکتا ہے

(۱) کلام کے متواتر مطالعہ کے ذریعہ دماغ کی ورزش سے۔

(۲) کلام کو عقلِ سلیم اور قوتِ تمیز کے ذریعہ پرکھنے سے۔

اگر ہم مذاقِ شاعری کی مکمل ترین نوعیت پر غور کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ مذاق میں عموماً دو بہت نمایاں اور اہم خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اول لطافتِ مذاق۔ دوئم صحتِ مذاق۔

لطافتِ مذاق اور صحتِ مذاق میں بہت نازک اور لطیف لیکن نہایت اہم فرق ہے۔ لطافتِ مذاق کا تعلق تمام تر اُس فطری وجدان کی عمدگی پر ہے جس پر ذوق کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں۔ وجدان کی عمدگی کا معیار یہ ہے کہ کلام کی وہ خوشنمائیاں بھی جو بے حد نازک اور غیر نمایاں ہونے کی وجہ سے ظاہر بین نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں ہمیں اپنی

تمام دلفریبیوں کے ساتھ اپنے اصلی رنگ میں عریاں نظر آجائیں۔

مذاق میں لطافت اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اعلیٰ درجہ کے وجدان کے ساتھ انسان میں حسّاسیت بھی بدرجہ اتم ہو "حسّاسیت" سے میری مراد "حواس کے ذریعہ خارجی چیزوں سے متاثر ہونے کی قوت" ہے۔ جن لوگوں میں حسّاسیت کی قوت مضمحل ہوتی ہے وہ کبھی حسن سے صحیح طور پر متاثر نہیں ہوسکتے۔ نیچر اور آرٹ کی خوبصورتی سے پورا پورا لطف وہی اٹھاسکتا ہے جس کی بصارت، سماعت، لمس، شامہ اور ذائقہ اپنا اپنا فعل پوری مستعدی کے ساتھ انجام دیں۔

صحتِ مذاق کا تعلق اُس بالیدگی سے ہے جو سمجھ اور عقلِ سلیم کے ذریعہ ذوق کو حاصل ہوتی ہے۔ صحیح المذاق شخص وہ ہے جو کلام کی نقلی خوبیوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ جس کے پیشِ نظر کلام کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ہمیشہ عقلِ سلیم کا معیار ہوتا ہے۔ وہ کلام کا باہمی موازنہ کرکے اس بات کا پتہ لگالیتا ہے کہ کونسی خوبی کس پایہ کی ہے؟ اور کلام کا کون سا پہلو عمدگی کے لحاظ سے کیوں قابلِ ستائش ہے؟ ایسا شخص کبھی شعر کے ظاہری محاسن پر نہیں جاتا۔ اس کو الفاظ کی بھڑک اور فقروں کا انوکھا پن اُس وقت تک ہرگز نہیں رجھا سکتا جب تک وہ شعر کو اپنی سخن سنجی کی کسوٹی پر کس کر اُس کے حقیقی محاسن کا اندازہ نہ کرلے۔

اس میں شک نہیں کہ صحتِ مذاق اور لطافتِ مذاق دونوں لازم اور ملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ اور پیوستہ ہیں کہ کسی طرح انہیں علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ صحیح المذاق اُس وقت تک صحیح المذاق قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ اُس کے ذوق میں صحت کے پہلو بہ پہلو "لطافت" بھی موجود نہ ہو۔ اسی طرح لطیف المذاقی کے لئے صحیح المذاقی لازمی چیز ہے۔

اس تمام بحث کے بعد اب یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم اچھّے اور بُرے ذوق کے درمیان تمیز کرسکیں؟

اس سوال کا جواب زیرِ نظر بحث کا وہ حصہ ہے جس میں ہمیں سب سے زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ اس بات کا ایمان داری کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دماغِ انسانی کی کوئی قوت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس قدر لوچدار، تغیر پذیر، اور جلد جلد رنگ بدلنے والی نہیں ہے جتنی کہ ذوق مختلف زمانوں اور مختلف حالات کے تحت دنیا میں ہمیشہ مذاق میں اس قدر کثرت اور سُرعت کے ساتھ انقلاب اور تغیر رونما ہوتا رہا ہے کہ بعض اوقات تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ واقعی مذاق کوئی مستقل بالذات شئے ہے بھی یا محض اعتباری اور ظنی شئے ہے؟

آیا اس کی بنیاد یں کسی ٹھوس حقیقت پر قائم ہیں یا یہ چیز فطرتِ انسانی کے تلوّن پذیر رجحانات اور ذہن کے رنگا رنگی میلانات کے زیرِ اثر ہے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ چیز جو آج سے پچاس برس پیشتر صنعتی خوشنمائی اور فنی حسن کا بہترین شاہکار قرار دی جاتی تھی آج جدید روشنی کے دور میں اس قدر پامال اور غیر دلکش سمجھی جاتی ہے کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہونا بھی اپنے مذاق کی توہین سمجھتے ہیں۔

مثال کے طور پر ناسخ کی شاعری کو لیجیے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ناسخ استادِ روزگار تصور کئے جاتے تھے۔ ہندوستان کے اِس گوشے سے اُس گوشے تک اُن کی شاعری کی دھوم تھی۔ اور سخن فہموں کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جہاں اُن کے کمالِ شاعری کے گیت نہ گائے جاتے ہوں۔ لیکن آج ناسخ کے رنگ کا پسند کرنے والا مشکل سے ہندوستان کی تمام آبادی میں کوئی ایک آدھ ملے گا۔ انصاف سے بتائیے موجودہ زمانہ کے اردو دان حلقے میں آپ کتنے ایسے اربابِ فہم دیکھیں گے جو ناسخ کی شاعری سے لطف اُٹھا سکتے ہوں؟ "مثنوی گلزارِ نسیم" جو ایک زمانہ میں سخن سنجوں کی آنکھ کی سرمہ بنی ہوئی تھی، جو اپنے عہد کی بہترین شاعری کا بہترین شاہکار تصور کی جاتی تھی آج کیوں بے توجہی اور فراموشی کی تاریکی میں پڑی ہوئی ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن سے بظاہر یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ واقعی مذاق کا کوئی اصل معیار نہیں۔ ہر شخص کا ذاتی مذاق ہی اُس کے لئے معیار کا کام دیتا ہے اور یہ کہ ہم کوئی ایسا مشترک معیار قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جس کے فیصلے کے سامنے سب کو بلا چون وچرا تسلیم کی گردن خم کر دینا پڑے۔

اگر ہم ذرا سا بھی غور وفکر سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ایسا سمجھنا محض ایک مغالطہ ہے۔ اگر بالفرض ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیں کہ اعلیٰ درجہ کے ذوق اور ادنیٰ ذوق میں امتیاز کرنے کے لئے کوئی ایسا معیار مشترک نہیں ہے جس سے مرافعہ کیا جائے تو لامحالہ ہمیں یہ ماننے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے کہ ہر قسم کا ذوق خواہ وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ اپنی اپنی جگہ پر اچھا ہے۔ اہلِ نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ یہ دعویٰ کس قدر مہمل اور بے معنی ہے۔ ممکن ہے کہ کلام کی سطحی خوبیوں کے معاملے میں یہ دعویٰ زیادہ ناقص اور بے معنی نہ نظر آئے لیکن جہاں شاعری کے اعلیٰ درجے کے نمونوں کی بحث آپڑتی ہے وہاں یہ دعویٰ محض غلط ہی نہیں بلکہ صد درجہ احمقانہ ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ ہمارے پیشِ نظر ایک ایسا گروہ ہے جس میں مذاق کے لحاظ سے ہر درجے کے لوگ شامل ہیں۔ اگر اس گروہ کا ہر شخص فرداً فرداً غالب کی شاعری کو پسند کرتا ہے تو اس سے ہم اس نتیجہ پر ہرگز نہیں پہنچ سکتے کہ اس جماعت کے تمام افراد کا ذوق یکساں طور پر اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اگر انہیں لوگوں سے

علیحدہ علیحدہ غالب کے بہترین شاہکاروں پر تنقیدی نقطۂ نظر سے تفصیلی رائے پوچھی جائے تو فوراً پتہ چل جائے گا کہ ذوق کے لحاظ سے اس جماعت کے سارے افراد یکساں نہیں ہیں بلکہ کسی کا مذاق بلند ہے کسی کا پست۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں یہ تسلیم کر لینا کہ اعلیٰ اور ادنیٰ ذوق میں سرے سے کوئی فرق نہیں کتنی بڑی ناانصافی ہے۔ جب ہمارے پاس اس بات کے کافی دلائل موجود ہیں کہ ہم بجا طور پر ایک شخص کے مذاق کو دوسرے شخص کے مذاق پر ترجیح دے سکتے ہیں یا ایک شخص کے ذوق کو اچھا اور دوسرے کے ذوق کو بُرا قرار دے سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ مذاق میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق قائم کر سکتے ہیں تو یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ ذوق کی اچھائی اور برائی پرکھنے کے لئے کوئی مشترک معیار ضرور ہونا چاہئے۔

اب یہاں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ معیار کی ضرورت عموماً کن صورتوں میں لاحق ہوتی ہے؟ ہمیں کب اس کی حاجت پیش آتی ہے کہ ہم کسی معیار سے فیصلے کے لئے اپیل کریں۔

اگر مختلف چیزوں کے متعلق متضاد آرا کا اظہار کیا جائے تو اس وقت معیار کا سوال زیادہ اہم نہیں ہوتا۔ مثلاً فرض کیجئے آپ کا کوئی دوست غالبؔ کا پرستار ہے۔ وہ کسی دوسرے شاعر کو غالبؔ کا مدِ مقابل نہیں سمجھتا۔ اس کا خیال ہے کہ غالبؔ کا کلام میرؔ سے بہتر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آپ میرؔ کی شاعری کو غالب کی شاعری پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ چونکہ آپ کی رائے آپ کے دوست کی رائے کے بالکل متضاد ہے۔ اس لئے یا تو آپ کا مذاق صحیح ہوگا یا آپ کے دوست کا۔ زیادہ سے زیادہ اپنے دعووں کی حمایت میں آپ یہ کہہ کر اُسے قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ میرؔ کا سا سوز و گداز، اس کی سی زبان کی حلاوت اور نرمی، اس کا سا خلوص اور درد غالبؔ کے کلام میں موجود نہیں لہذا میرؔ لازمی طور پر غالبؔ سے بہتر شاعر ہے۔ بالکل اسی طرح آپ کا دوست غالب کی فوقیت میں یہ دلائل پیش کر سکتا ہے کہ خیالات کی ندرت، مضامین کے تنوع، تخیل کی بلند پروازی، اندازِ بیان کی جدت، اور الفاظ کے شکوہ کے اعتبار سے اردو کا کوئی شاعر غالب کی ہمسری نہیں کر سکتا لیکن اس تمام بحث کے باوجود یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کا ذوق جو میر کو غالب پر فوقیت دیتا ہے بہتر ہے یا آپ کے دوست کا جو غالب کو میر کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ٹھہراتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تضاد کے باوجود دونوں کا مذاق اپنی اپنی جگہ پر اعلیٰ درجہ کا ہو۔

لہذا معلوم ہوا کہ دراصل معیار کے سوال کی اہمیت اُس وقت بڑھ جاتی ہے جب ایک ہی شے کے متعلق لوگوں میں اختلاف رائے ہو۔ یعنی جب اسی چیز کو ایک شخص خوبصورت اور دوسرا بدصورت قرار دے۔ مثلاً اگر

کوئی شخص یہ کہے کہ میر کے کلام میں کوئی خوبی نہیں۔ اس کی شاعری بے جان اور مردہ ہے اس کے کلام میں نہ کوئی گداز ہے نہ سوز و ساز نہ تاثیر۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اُسے اردو شعرا کی صف میں کوئی مرتبہ دیا جائے، تو ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ یا تو یہ شخص شاعری کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور یا اس کا مذاق حد درجہ ناقص اور بگڑا ہوا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم اس پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس کا مذاق غلط ہے شاعری کے کسی مشترک معیار سے اپیل کریں اور اس معیار کے ذریعہ اُس شخص کی بے راہ روی اسے سمجھاویں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ذوق کی اصلی بنیادیں تو اس اندرونی حاسہ پر ہوتی ہیں جس کا تعلق وجدانِ قلب سے ہے لیکن خارجی طور پر بھی ذوق کو عقلِ سلیم اور قوتِ امتیاز کے ذریعہ ترقی بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔

اب اگر دنیا میں کوئی ایک شخص ایسا موجود ہوتا جس میں تمام انسانی قوتیں مکمل ہوتیں۔ جس کے ذہنی اور دماغی قویٰ ہر حالت میں بہترین اور صحیح ترین کام انجام دیتے۔ جس کی عقل کبھی خطا نہ کرتی اور جس سے فیصلے کے وقت ذرہ برابر غلطی کا احتمال نہ ہوتا تو ہم بلا خوف و اندیشہ تمام مخلوق کے مذاق کے لئے ایسے شخص کی صائب رائے کو معیار قرار دے سکتے تھے۔ لیکن چونکہ خدا کی اس وسیع کائنات میں ایک شخص بھی اپنے اندر یہ تمام خصوصیتیں اکٹھی نہیں رکھتا اس لئے لازمی طور پر ہمیں اُس اکثریت کے فیصلے کو تسلیم کرنا پڑے گا جس کے افراد میں مندرجہ بالا خصوصیتیں بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ یعنی ہم بآسانی اُس اکثریت کے مذاق کو معیار قرار دے سکتے ہیں جس کا ہر فرد اپنی اپنی جگہ پر وہبی اور اکتسابی دونوں حیثیتوں سے اپنے اندر وہ تمام خوبیاں رکھتا ہو جو مذاق کی صحت اور لطافت کے لئے ضروری ہیں۔

میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ اختلاف رائے کے ہر موقع پر ہم اس معیار سے کسی صحیح اور فوری فیصلے کے طالب ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ شعر و سخن کے معاملات میں عام طور پر جو موٹے موٹے اختلاف پیدا ہوتے رہتے ہیں ان کے طے کرنے کے لئے اکثریت ہی کے مذاق کو معیار کے طور پر پیشِ نظر رکھا جا سکتا ہے۔

ذوقی

حیدرآباد دکن

غزل

پرستش کے قابل ہو تحقیق ہی
تصوّر کے ہمراہ تصدیق ہے

ہمیں علم ہے اور یہ تحقیق ہے
فقط دردِ دل وجہِ تخلیق ہے

بجا ہے، مرا نازِ قسمت بجا
کہ تیری تمنّا کی توفیق ہے

وہ مجھ سے قریب اور میں اُس سے دُور
مری جمع بھی رشکِ تفریق ہے

محبت کے اثنا میں ہر جورِ دوست
محبّت کے وعدے کی توثیق ہے

تعجب ہے اُس کا کرم اور یہ دیر
خدا جانے کیا وجہِ تعویق ہے

عطائے دو عالم تو برحق مگر
کچھ اس کے علاوہ بھی توفیق ہے

جو تُو کافرِ عشقِ جاناں نہیں
بالاجماع کافر ہے، زندیق ہے

مرے کفر کو کفر کہنا غلط
مرا کفر ایماں کی تصدیق ہے

اُسے خبطِ عقبیٰ سے کیا واسطا
جسے عیشِ دنیا کی توفیق ہے

مرا ایک دم اور دو عالم کے غم
عجب کشمکش ہی، عجب ضیق ہے

حقیقت میں آزاد! اُس کی جفا
ہماری وفا کی اتالیق ہے

حکیم آزاد انصاری

بلنسیہ

بلنسیہ جسے آج کل آپ نقشۂ یورپ پر ویلنشیا کے نام سے مرقوم دیکھیں گے سپین کا مشہور شہر ہے اور اُس کے دار الحکومت میڈرڈ سے جسے مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں مجریط کہتے تھے ۱۹۰ میل پر جنوب مشرق میں آباد ہے۔ وادی الکبیر کہ سپین کا مشہور دریا ہے اس کے شمال میں موجیں مارتا ہوا سمندر سے جا ملتا ہے۔ دریا کا منظر نہایت سہاونا ہے۔ اس کے دونوں کناروں پر سایہ دار درخت جھوم رہے ہیں، اور دریا کا نیلگوں پانی اُن کے درمیان سے گزرتا ہے جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا قدرت نے اپنی فیاضی کا ثبوت پیش کرنے کے لئے اپنے حسین و لطیف مناظر اسی جگہ کے لئے خاص کر دیئے ہیں۔ شہر کے باہر کی عمارتیں خوشنما اور منظر دلکشا ہے، مگر اندر کے مکانات بہت بلند واقع ہونے کے سبب آنکھوں کو کچھ اتنے بھلے معلوم نہیں ہوتے جب ان کا سایہ بازاروں پر پڑتا ہے تو طبیعت میں خنکی اور افسردگی کا احساس ہوتا ہے۔ بازار کچھ اتنے فراخ نہیں ہیں اور سڑکیں تو دور دور تک پیچ و خم کھاتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ صنعت لوہے شیشے اور ریشم سے ہمکنار ہے اور تجارت ریشم شراب انگور اور زعفران سے لطف اندوز۔ اک زمانہ تھا کہ بلنسیہ ریشم کے کیڑوں کی پرورش گاہ تھا، سوداگر کیڑوں کو دور دراز ممالک میں لے جاتے تھے، یہاں ایک خاص قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا جو نسیج بلنسی کے نام سے مشہور تھا، شمالی افریقیہ میں اس کی بہت مانگ تھی۔ نارنگیاں یہاں اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ اگر اس کو نارنگیوں کا شہر کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ بلنسیہ کو اپنی قدامت پر ناز ہے، ایک زمانہ میں پومپی نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی مگر کچھ عرصہ کے بعد از سرِ نو تعمیر ہو کر آباد ہوا۔ جب مسلمانوں نے ۷۱۳ء میں اس کو فتح کیا تو اُس وقت گاتھ قوم برسرِ حکومت تھی، ۱۰۹۴ء میں عیسائیوں نے اس پر حملہ کیا اور یہ مسلمانوں کے مستحکم ہاتھوں سے نکل گیا، ملثمین کی فوج نے دوبارہ اس کو پامال کیا مگر ۱۲۳۸ء میں کارپردازانِ قضا و قدر نے ہمیشہ کے لئے اس شہر کی حکمرانی سپینی عیسائیوں کی قسمتِ زریں میں لکھ دی۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بلنسیہ ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کا دار الحکومت شہرِ بلنسیہ نہایت آباد پُر رونق اور فضل و کمال کا مرکز تھا تاریخ جغرافیہ اور ادب کی کتابوں کے ہزاروں صفحے بلنسیہ کے باغات اور عمارات، یہاں کے علماء فضلا اور شعرا کے تذکروں سے معمور ہیں۔ اُس زمانہ میں بھی شہر کا بیرونی حصہ نہایت پُر فضا اور آباد تھا، سطحِ سمندر سے آفتاب

کی شعاعیں منعکس ہو کر اس حصے کو روشن رکھتی تھیں مگر اندرونی حصہ صفائی کے نہ ہونے سے متعفن اور تنگ و تاریک تھا۔ پسّوؤں اور مچھروں کے لشکر موجود رہتے تھے، چنانچہ غرناطہ کا ایک مشہور شاعر ابو جعفر بن سعدہ کہتا ہے۔

ھی الفردوس فی الدنیا جمالاً ۔۔۔ لساکنہا مکانہا البعوض

یعنی جمال و لطافت کے لحاظ سے تو بلنسیہ اپنے ساکنوں کے لئے بہشت ہے مگر اس میں مچھروں کی مصیبت ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے۔ کہ

رقص البراغیث فیہا ۔۔۔ علی غناء البعوض

یعنی مچھّر تو اس میں گیت گاتے ہیں اور پسّو رقص کرتے ہیں۔

اس زمانہ میں بلنسیہ کے باغات کی یہ کثرت تھی کہ ہر طرف سبزہ زار لہلہاتے اور چشمے رقصاں نظر آتے تھے رصافہ اور مدینۃ المنصور دو مشہور رہے تھے، ان میں نہریں بہتی تھیں اور نہریں پل بستہ تھیں۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی یا تو زعفران کے زریں کھیت دعوتِ نظارہ دیتے تھے یا نارنگیوں کے ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ ایک مورخ لکھتا ہے: بلنسیہ رصافہ اور پل کے اعتبار سے رونق اور لطافت میں بغداد کے ساتھ ہمسری کرتا ہے۔ سبزہ زاروں اور باغوں چشموں کی کثرت کے باعث بلنسیہ کو مطیب الاندلس یعنی سیرگاہِ سپین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بلنسیہ کے دلربا مناظر کی تصویر اکثر شعرائے اندلس نے اپنے اشعار میں نہایت حسن و خوبی سے کھینچی ہے۔ مگر جو عربی زبان کے مذاق اور علم سے محروم ہیں لاریب کہ انہیں ان مدحیہ اشعار کی آب و تاب اور لطافت سے بھی محروم ہی رہنا پڑے گا، چنانچہ ان کے نفسِ مضمون ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے

ابن زقاق لکھتا ہے "انصاف کی پوچھو تو بلنسیہ اپنی خوبیوں کے لحاظ سے تمام شہروں سے گوئے سبقت لے گیا ہے، میرے اس دعوے کی دلیل خود بلنسیہ ہے جس کا جمال آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہے، خدائے حسن نے اُسے حسن کا خلعت بخشا ہے جو دریا اور سمندر کے نقش و نگار سے مزین ہے!" بلنسیہ کے تاجدار، مروان نے کہا ہے۔ "بلنسیہ وہ نوجوان معشوق ہے جو سندسِ سبز کا لباس زیبِ تن کئے ہوئے ہے، اگر تم اُس کے قریب جاؤ تو وہ اپنے آپ کو پھولوں اور شگوفوں میں چھپا لے گا۔"

بلنسیہ کو کبھی کبھی قحط سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا اور سروی عیسائی آئے دن اُس پر یورش کرتے تھے۔

ابوالحسن بن حریق اس بات کا اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: یہ بات مشرق و مغرب میں مسلّم ہے کہ بلنسیہ ہر قسم کے حسن کا مرکز ہے اگر کوئی کہے کہ اس میں قحط کی آفت برپا ہوتی ہے اور تلواروں اور نیزوں کا مینہ برستا ہے تو اُس کو کہہ دو کہ بلنسیہ ہے تو بہشت، مگر قحط اور جنگ کی دو مصیبتوں کی اوٹ میں!

علم و فضل کے اعتبار سے سرزمینِ بلنسیہ بہت بلند مرتبہ ہے، مادرِ گیتی نے اس مردم خیز خطے میں ایسے ایسے علما اور شعرا کو جنم دیا کہ جن کے نام آسمانِ ادب و شہرت پر رہتی دنیا تک چاند سورج بن کر چمکتے رہیں گے اگر شاعروں کی فہرست تیار کی جائے تو یہاں کے مندرجہ ذیل شعرا نمایاں طور پر داد کے مستحق ٹھیریں گے:-

ابوالعباس بن امیہ، ابنِ محذر، ابنِ حجاف، ابوجعفر بن عبدالولی، ابوالحکم ابنِ غماز، ابنِ جبیر، ابنِ عبدون، علی بن احمدؒ، ابنِ سعد الخیر، رصافی وغیرہم۔

محدثین کے اسمائے گرامی بلنسیہ کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں:- ابوالمطرف بن عمیرہ، ابواحمد جعفر الخزراعی، ابوعبداللہ بن یعیش، ابنِ ماجراور ابنِ ہذیل وغیرہم

بلنسیہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ایک صوبے کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس میں بہت سے قصبے اور قریے آباد تھے، جن میں سے مشہور قصبہ شاطبہ ہے جو خصوصیت کے ساتھ قرات اور حدیث کی درس گاہ تھا، اور منظر کی لطافت و خوبی کے لحاظ سے بھی بے نظیر تھا، یہاں کا کاغذ تمام اندلس میں مشہور تھا اور دور دور تک جاتا تھا، ۶۴۵ میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے صوبوں کی فہرست میں اُس کے نام کا بھی اندراج ہو گیا! اندہ جس کے پہاڑوں میں لوہے کی کانیں ہیں بلنسیہ کے مضافات میں شامل تھا، یہی وہ سرزمین پاک ہے جس کو ابوجعفر احمد بن حسن القضاعی جیسے بلند پایہ محدث کی زادبوم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ابوجعفر کو حدیث کے علاوہ ادب اور فنِ طب میں بھی کمال حاصل تھا اور وہ ایک عرصہ تک غرناطہ کے گورنر عثمان بن عبدالمومن کے سکرٹری بھی رہے تھے۔

یہ ہے بھولے بسرے بلنسیہ کی مجمل سی تاریخ اور مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کی داستان کا ایک پارینہ اور پُر درد ورق!

امین

برسات

کل تک بیساکھ کی گرمی تھی آج آئی ہوا برکھارُت کی
کیا کیا نہ دعائیں کرتی تھی مخلوقِ خدا برکھارُت کی

اللہ یکایک یہ بادل گھر گھر کے کدھر سے آئے ہیں
اللہ کہاں سے آنکلی یہ سرد ہوا برکھارُت کی

بجلی کی کڑک بادل کی گرج، زوروں کی جھڑی اور طغیانی
دکھلا گئی کیا کیا دم بھر میں گھنگھور گھٹا برکھارُت کی

لو بھر گئے پل میں سب جل تھل، لو ندی نالے چلنے لگے
چشمے ہر سمت ابلنے لگے جن سے ہی فضا برکھارُت کی

کیسی ہے زمیں پر ہریاول، ہیں چرخ پہ کیا پیارے بادل
ہے ارض و سما پر کیفیت، کیا جلوہ نما برکھارُت کی

کیا وادی کیا صحرا کیا بن، کیا کوہ کا دامن کیا گلشن
ہر چیز بنی فردوسِ نظر، برسی جو گھٹا برکھارُت کی

دھرتی کو ملا ہے لباس نیا، آتا ہے نظر آکاس نیا
ہے رُوپ انوپ جدھر دیکھو تاثیر ہی کیا برکھارُت کی

کیا پیڑ ہیں، کیسی بیلیں ہیں، کیا پھول ہیں کیسا سبزہ ہے
گھر سے تو نکل جنگل کو تو چل، لذت تو اٹھا برکھارُت کی

اشجار میں کیا جھولے ہیں پڑے کس لطف میں ہیں سب چھوٹے بڑے
کیا جھولتے ہیں کیا گاتے ہیں، کر کر کے ثنا برکھارُت کی

کیا پیاری کوک ہے کوئل کی، کیا راگ چھڑا ہے بھونرے کا
کیا کیف فزا و ہوش ربا، ہے موج ہوا برکھارُت کی

بھنگراج کہیں، دراج کہیں، چنڈول کہیں، طاؤس کہیں
ہر پنچھی راگنی گاتا ہے ہر صبح و مسا برکھارُت کی

کیا ناچ رہی ہے ہر تتلی، کیا جھوم رہی ہے ہر ڈالی
اللہ یہ کیفیت کتنی، ہے ہوش ربا برکھارُت کی

چشموں کی صدا اللہ اللہ، جھرنوں کی نوا اللہ اللہ
کیا میٹھے سُروں میں رہ رہ کر گاتی ہی ہوا برکھارُت کی

مصروفِ تبسم ہیں کلیاں، مشغولِ ترنم ہیں چڑیاں
کس کس کو نہ جوش میں لائے گی مستانہ ادا برکھارُت کی

نسرین سمن جوہی چمپا، بیلا کیوڑا ہر سو ہے کھلا
کس درجہ معطر رہتی ہے ہر وقت ہوا برکھارُت کی

دیکھو تو ذرا اے اہلِ نظر کیسا ہی سماں یہ گردوں پر
بگلوں کی قطار ایسی اُجلی، کالی یہ گھٹا برکھارُت کی

رنگین گھٹا کی چادر پر کیسے ہیں شفق کے گل بوٹے
خورشید نے کیسی اوڑھی ہے خوش رنگ ردا برکھارُت کی

پھر جھوم کے بادل آئے ہیں، پھر دھار لگی ہی مینہ کی نجیب
ہاں بہرِ خدا پھر نظم ذرا تو اپنی سنا برکھارُت کی

میر سعادت حسین
نجیب

ساڑھی اور سُوٹ

کچھ عرصہ ہوا کہ شملہ کی کسی سڑک پر ایک خالی ساڑھی خراماں تھی یعنی ساڑھی تھی پر ساڑھی کے اندر کچھ نہ تھا یا کم از کم معلوم یہ ہوتا تھا کہ گھر والی گھر میں ہے اور ساڑھی ہوا خوری کے لئے تن تنہا خود ہی نکل پڑی ہے۔ خدا جانے ساڑھی اور ساڑھی پوش میں تُو تُو میں میں تک نوبت پہنچی تھی اور ساڑھی تنگ آکر نکل پڑی تھی یا بچاری پہننے والی کو گھر کے کام کاج سے فرصت نہ تھی اور اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ میں تو مرتی ہی ہوں یہ بچاری کیوں یونہی سڑے بسے، بہرحال کچھ بھی وجہ ہو چند آنکھوں والوں نے دیکھا کہ ساڑھی موجود ہے اور ساڑھی پوش غائب۔ ان میں سے ایک حضرت نے جرات کر کے قدم بڑھایا۔ اور ادھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی تاک میں تو نہیں یہ صاحب ساڑھی کے پاس جا نکلے اور ٹوپی اٹھا کر قدم ساتھ ملانے کو تھے کہ کسی غیبی طاقت نے ان حضرت کو سوٹ سے غائب کر دیا اور ان کا خالی سوٹ اس ساڑھی کے ساتھ سرگشت کرنے لگا۔ اسی غیبی طاقت نے صاحب موصوف کو سوٹ اور ساڑھی کی گفتگو سمجھنے کی لیاقت تو دے دی اور یہ بھی مجبور کیا کہ یہ ساڑھی اور سوٹ کے عقب میں چلتے رہیں مگر اور ہر قسم کی طاقت اُن سے لے لی۔ جو مکالمہ ان حضرت نے ساڑھی اور سوٹ کا سنا اُسے آپ یوں بیان کرتے ہیں۔

سوٹ۔ معاف کیجئے، مگر جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ سیر کا لطف اٹھاؤں انکار نہ کیجئے!

ساڑھی۔ آپ ساتھ ساتھ تو چل ہی پڑے مگر میں سوچتی ہوں کہ میرا آپ کا کیا ساتھ؟

سوٹ۔ کیوں؟

ساڑھی۔ جناب یہ بندی کسی غریب ہندوستانی جلاہے کی دستکاری کا سیدھا سادھا نمونہ اور وہ بھی ایسا جیسے جلیبی کہ وہ ہی بھولے پن سے لپٹ جانے کی عادت، اور آپ ماشااللہ مغربی چستی و چالاکی کا بہترین اشتہار۔ چلیں تو اکڑ کر اور رہتے ہوں تو وہ بھی شکنجے میں۔

سوٹ۔ بنانے میں تو آپ مشاق معلوم ہوتی ہیں۔

ساڑھی۔ واللہ بنا نہ رہی تھی۔ کیا جو کہتی ہوں وہ غلط ہے؟ مجھ غریب کا تو دامن آج تک جیب سے

آلودہ نہیں ہُوا اور آپ ہیں کہ اوپر جیب، نیچے جیب، اندر جیب، باہر جیب۔

سوٹ (ہنسکر) خالی جیب سے جیب نہ ہونا اچھا ہے۔

ساڑھی (اندازِ دلربائی سے) جی ہاں، جیب خالی اور اس پر اکڑ بازی۔

سوٹ۔ جناب یہ آپ کے آنچل کا ذرا سا کھسکنا سب کس بل نکال دیتا ہے۔

ساڑھی۔ اوہو، آپ تو شاعر مزاج معلوم ہوتے ہیں۔

سوٹ۔ ہوں تو نہیں مگر بننا پڑتا ہے۔

ساڑھی۔ اچھا آپ زبردستی شاعر نہ بنیئے اور کچھ آپ بیتی کہئے۔ جھوٹ چاہے کتنا دلفریب ہو سچ کے سامنے ہیچ ہے۔

سوٹ۔ تعمیلِ ارشاد میں عذر نہیں مگر بہتر تو یہی ہے کہ آپ بیتی نہ کہوں۔

ساڑھی۔ جی نہیں، ہم تو ضرور سنیں گے۔

سوٹ۔ اچھا تو سنئے۔ میں جب سے اس ملک میں آیا ہوں دراصل جلا بھنا رہتا ہوں۔ میرے وطن میں بہت ہی میری ذلت ہوتی تو بھی یہ خوشی ضرور ہوتی رہتی کہ کبھی کبھار کوئی اچھا سا فراک میری گود میں بیٹھتا گاہے ماہے قہقہوں کی لہر مجھ سے فراک تک اور فراک سے مجھ تک رواں ہوتی۔ چہل پہل میں وقت گذرتا مگر جس دن سے یہاں آیا ہوں میری تو مٹی خوار ہے۔ یہ سنتے سنتے کہ حد سے تجاوز نہ کرو، اعتدال سے کام لو، چلو تو سنبھل کر، بیٹھو تو سمٹ کر، دیکھو تو جھک کر، پاس رہو مگر دور دور رہیں تو جان بلب ہوں۔ اچھا ہو جو کسی دن پھٹ پھٹا کر اس دنیا سے چل دوں۔

ساڑھی۔ کیوں؟ میں نہ کہتی تھی کہ میرا آپ کا ساتھ نہیں۔ آپ کون ہیں یہاں کی تہذیب پر نکتہ چینی کرنے والے؟ کیا اتنا بھی پتہ نہیں کہ غیر کا کیا مذکور بھائی بہن کو نہیں کہہ سکتا کہ "بہن تم حسین ہو"۔ جب زمانہ بدلے گا تو بدلے گا فی الحال تو پرانی تہذیب رائج ہے اور اُس کے مطابق خوبرو کو حسین کہنا گناہ ہے اور اپنے آپ کو برا ثابت کرنا ہے۔

سوٹ۔ یہی تو رونا ہے کہ دیکھیں تو بُرے، کہیں تو بُرے اور جو قدرے قلیل آزادی چاہیں تو بُرے۔ آپ نے مجھ سے میرا حال پُوچھا کیوں تھا؟

ساڑھی۔ خدا جانے کیوں مگر مجھے تو کچھ ہمدردی پیدا نہیں ہوئی۔ ہمارا پُرانا فلسفہ تو یہ کہتا ہے کہ رنج میں

بھی راحت ہے اگر انسان کا ایمان ٹھیک ہو۔

سوٹ - یہ بات مطلقاً سمجھ میں نہیں آئی - رنج میں کس طرح راحت ہوسکتی ہے ؟

ساڑھی - آپ روحانیت سے بالکل عاری معلوم ہوتے ہیں - رنج خدا کی طرف سے ہے اور جب اُس کی مرضی سے ہے تو اُسے بخوشی قبول کرنا چاہئے - آپ کی خواہشات کے مطابق دنیا کا نظام جب نہیں ہے تو بہتر ہے کہ آپ وہ خواہشات ترک کردیں - یہاں اگر فراک اور ساڑھیاں آپ سے ملنے سے کتراتی ہیں تو آپ اُن سے ملنے کی خواہش ہی دل سے نکال دیں - قسمت کے آگے سرِ تسلیم خم کریں -

سوٹ - یہ ہو چکا - اگر روحانیت یہی ہے کہ کوشش نہ کی جائے تو اپن جانب کا روحانیت کو دور ہی سے سلام ہے - کوشش کرکے آپ سے نہ ملتا تو یہ چند لطف کی باتیں کیسے سنتا ؟

(۲)

صاحب سوٹ بیان کرتے تھے کہ کسی نکڑ پر یک لخت ساڑھی غائب ہوگئی اور اُن کا سوٹ پھر ان کے گلے کا ہار ہوگیا اور یہ بھی کہتے تھے کہ اُس دن سے وہ اپنے سوٹ کے سامنے سخت خجل رہتے ہیں کہ اس پردیسی کی زندگی عبث حرام کی - جب ان کی طبیعت ذرا زیادہ گداز ہوا کرتی ہے تو فرمایا کرتے ہیں کہ اس ملک میں انسان تو کیا اچھا کپڑا بھی اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے -

اس امر کی بہت کوشش کی گئی کہ پتہ چلایا جائے کہ کیا ساڑھی پوش سے اس ملاقات کا ذکر کیا یا اس تمام واقعے کو کھا گئی مگر اڑنی اڑانی بھی کوئی خبر نہ سنی - البتہ اس واقعہ سے ایک دو مہینے بعد کسی خاتون کی تحریر ایک رسالے میں شائع ہوئی اور اس تحریر سے شاید عقدہ کشائی ہو سکے - وہ تحریر حسب ذیل ہے

ساڑھی سے گفتگو

"چڑیل یہ تیرا اچھڑکنا مجھے کہیں کا نہ رکھے گا! کیا کہا کہ بیوی! یونہی خفا ہوتی ہو! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے بھلا جو میں یونہی خفا ہوتی ہوں تو یہ بتا کہ کل جو میں جوہری کی دوکان پر کھڑی تھی تو تو کیوں اس جنٹلمین کے سوٹ کو چھو رہی تھی ؟ ہوا کی اٹکھیلیاں ؛ اُف ری لپاٹن ! ہوا کا تو وہاں نام ونشان نہ تھا - اچھا ہاں سچ بتاؤ - کیا کہا کہ ایک دفعہ یونہی ملاقات ہوگئی تھی - سوٹ کا مجھ سے اور میرا سوٹ سے رنگ کھلتا تھا - اچھا کہاں ملاقات ہوئی تھی ؟ بیوی وہ نہ ہونے کے لئے گیا تھا اور مجھے آپ نے رنگنے کے لئے دیا تھا - وہ ایک بھلے سے آدمی کی دکان ہے ماٹھنڈی

سڑک پر۔ بس وہیں۔ ہم دونوں تیار تھے لیکن لینے کوئی نہ آیا تو ہم یونہی چہل قدمی کے لئے ذرا نکل پڑے تھے۔ اللہ قسم ایسے مزے کی باتیں کرتا ہے کہ کیا کہئے مگر میں نے اُسے خوب بنایا۔ اب آیا میری سمجھ میں یہ تیرا اپنا ٹھنا رہنا۔ شرم حیا گھول کر پی گئی ہو۔ کیا کہا؟ کیا کروں کہ رنگ ہی شوخ ہے' تیرا تو دماغ چل گیا ہے مگر بندی اس آزادی کی حامی نہیں۔ کیا کہا کہ تم نے اسے بہت سمجھایا؟ بچارا رو دیا تو رحم آیا؛ جی نہیں ایسے رحم کو تم رہنے دو۔ لوگ کچھ کا کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ اب تمہاری زبان بند بھی ہوگی یا یونہی قینچی کی طرح چلتی جائے گی؟ کیا کہا کہ ہنسنا بولنا کیسے بند ہو؟ ہے نا تو آفت! اب جو کچھ کہوں گی تو رو دوگی۔ کیا کہا کہ "برا ماننے کی بات نہیں مگر امر واقع یہ ہے کہ انسان کپڑے سے ہی بنتا ہے" جی ہاں۔ گویا وہ مہاتما لوگ جو کپڑا انہیں پہنتے انسان ہی نہیں۔ اری ہے تو تو دیسی مگر باتیں تیری سب فرنگنوں کی سی ہیں۔ کیا کہا کہ میری بلا فرنگن ہو۔ بات یہ ہے کہ سب ساڑھیوں نے حلف اُٹھایا ہے کہ ہندوستان کی خاتونوں کو آزاد کر کے چھوڑیں گی' اُف ری تیرے دعوے! گویا یہ جو ہندوستان میں ترقی کی رو ہے اُس کے محرک سوت، کپاس اور ریشم ہیں۔ کیا کہا کہ ہاں بیوی سچ تو ہے۔ مرد کمبخت ولایت گئے تو وہاں سے ٹوپی اٹھا لائے مگر ایک صدی سے ہندوستان کی روئی سفر کر کے ململ بن کر آ رہی ہے آخر کچھ تو اس سفر کا اثر ہونا تھا مجھ میں بھی ولایتی تاگا ہے مگر اس کی بدولت نہیں بلکہ نشو و نما کا تقاضا ہے کہ ہم آزادی چاہیں۔ دیسی کھیتوں میں امریکن کپاس کا بیج، انگریزی نہروں کا پانی، جاپانی کارخانوں کی مانگ۔ چھوڑیئے وہ اب اپنی پرانی ترنگ تو تو بڑی عالم فاضل نکلی۔ کیا کہا کہ اب مسکرا دوں۔ کیوں؟ کیا تجھے میرا مسکرانا بھاتا ہے؟ اری کیوں لپٹی جا رہی ہے۔ چلوں؟ کہاں؟ باہر۔ دیوانی ہو خواہ مخواہ چل نکلوں' کیا کہا کہ اور کئی ساڑھیاں مل جائیں گی' اور جوان کے ساتھ مرد ہوئے؟ کیا کہا کہ اگر ہوئے تو کوئی اچھی سی بات ہی کہیں گے کچھ کھا نہ جائیں گے' نہ بابا تو تو بڑی دلیر ہے"۔

فلک پیما

محبت ایک آتش ہے سردی سے معمور، ایک شیرینی ہے کڑواہٹ سے بھرپور، اور ایک درد ہے مسرت کا سرمایہ دار؛ یہی وہ جذبہ ہے جو خیالات و احساسات کو دل آنکھیں اور کان تفویض کرتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے خواہش جس کی خوراک ہے، مسرت جس کی تربیت ہے، حسد جس کا امتناع ہے، مکر و فریب کی چالیں جس کی موت ہیں اور بے توجہی جس کا کفن ہے ——— للی

امین

تاثرات

دے کر تسلیاں دلِ حسرت نشاں کو میں
پھر ڈھونڈنے چلا ہوں ترے آستاں کو میں

مسرور ہوں مٹا کے دلِ سخت جاں کو میں
فانی سمجھ رہا ہوں نشاطِ جہاں کو میں

دے کر فریب تیری نوازش کا رات دن
تسکین دے رہا ہوں دلِ نیم جاں کو میں

گردش نے جس کی خونِ تمنّا بہا دیا
ہمدرد جانتا تھا اسی آسماں کو میں

شکوہ ترے ستم کا نہ ہوگا بیاں کبھی
روکے رہوں گا حشر میں اپنی زباں کو میں

بجلی کو ضد ہوئی ہے کہ گلشن کو پھونک دے
لے جاؤں یا الٰہی کہاں آشیاں کو میں

تم چھپ گئے ہو دے کے مجھے دعوتِ تلاش
اب ڈھونڈتا پھروں گا تمہارے نشاں کو میں

کب تک سناؤں آپ کو رودادِ بے کسی
سو بار کہہ چکا ہوں اسی داستاں کو میں

سا رفعت پسندیاں ہیں یہ میری نگاہ کی
کعبہ سمجھ رہا ہوں ترے آستاں کو میں

جلوہ ہے ہر کلی میں کسی کے جمال کا
جنّت سمجھ رہا ہوں ظفر گلستاں کو میں

نذیر احمد ظفر

تاریخی جامعات

علمی مدارس کا رواج حقیقت میں زمانۂ قدیم سے جاری ہے۔ مغربی عمران کے ظہور سے بہت پہلے کلدانیوں اور مصریوں نے مدارسِ علمیہ کی تشئید کی تھی۔ ان کے مدرسوں میں طب و حکمت، اور فلکیات کی بہترین تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر سب سے پہلے یونانیوں نے اُن کے نقشِ قدم کی پیروی کی۔ اور یونان کی تبعیت میں رومن قوم نے بھی مدارس کا افتتاح کیا لیکن رومن قوم کی اس ترقی او ساٹھان سے پہلے بطالسہ نے (اسکندر مقدونی کی اجازت پر) اسکندریہ میں ایک مدرسے اور کتب خانے کی بنا ڈالی تھی۔ جو تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کے تمام مدارس و مکاتب پر فوقیت لے گیا۔ اسکندریہ کا یہ مدرسہ تقریباً سات صدیوں تک اعلیٰ پیمانے پر چلتا رہا۔

ابتدا میں پیروانِ مسیح نے زمانی علوم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اس زمانے میں اُن کی تمام تر ہمت و توجہ کا اصلی مرکز دینی علوم تھے۔ اس میدان میں فارس اور عرب مسیحیوں سے بہت آگے ہیں، نوشیروان عادل نے ۵۲۰ء میں جندیسا پور میں طب و حکمت کا اعلیٰ پیمانے پر ایک مدرسہ کھولا تھا جو عباسیوں کے زمانۂ حکومت تک قائم رہا۔ چنانچہ خلیفہ منصور عباسی نے اُسی نقش پر بغداد میں ایک نئے دار العلوم کا افتتاح کیا۔ لیکن ہارون رشید جب سریر آرائے خلافت ہوا تو علوم و فنون کی گرم بازاری بہت بڑھ گئی، حتیٰ کہ ہر جامع مسجد کے پہلو میں ایک پرائمری اسکول قائم تھا۔ مامون کے زمانہ میں باپ کی علمی یادگاریں اور زیادہ آب و تاب کے ساتھ چمکیں۔ دمشق و بغداد، بصرہ و بخارا، اسکندریہ و قاہرہ، مراکش و فارس اور اندلس وغیرہ میں مدارس علمیہ کا رواج بڑی دھوم سے پھیلا۔ ۱۲۰۰ میلاد میں صرف قاہرہ کے اندر ۲۰ بڑے بڑے مدارس تھے۔ قرطبہ میں ۷ عظیم الشان کتب خانے بہترین اور لاجواب کتابوں سے مملو موجود تھے۔ اندلس کے ہر پرگنے میں چھوٹے چھوٹے مدارس کے علاوہ ایک بڑا مدرسہ بھی تھا۔ ۱۱۲۶ میلاد میں خود قرطبہ کے اندر ۱۵۰ مدرسے میں ۵۲، پرتگال میں ۲۵، مرسیہ میں ۱۷ علمی انجمنیں تھیں، اشبیلیہ، غرناطہ اور بلنسیہ کی علمی انجمنوں کی تعداد مزید برآں تھی۔ علامہ مقری کا بیان ہے کہ "اہلِ اندلس علم کے بڑے حریص تھے"۔

خود علم اور علمی کتابوں کے ساتھ خلیفہ المستنصر کی عنایتوں کا یہ حال تھا کہ اُس نے اپنی طرف سے علمی

کتابوں کی خریداری کے لئے مصر و افریقہ فارس و عرب کی طرف مختلف وفود بھیجے، جو ہر قسم کی علمی کتابوں کو خریدتے اور نقل کرتے۔ خلیفہ نے مصنفینِ زمانہ سے اُن کی تمام تصنیفات طلب کیں، اور معاوضے میں زر و جواہر سے اُن کے دامن کو مالا مال کیا۔ یہاں تک کہ علمی جواہر ریزوں کا چار کروڑ یا چھ کروڑ کتابوں کی صورت میں ایک انبار لگ گیا۔

ابو الفرج المطلی کی روایت ہے کہ قاضی صاعد بن احمد اندلسی قاضی طلیطلہ المتوفی ۴۶۲ھ نے لکھا ہے کہ:۔ عرب نے صدرِ اسلام میں زبان اور احکامِ شریعت کی معرفت کے علاوہ کسی دوسرے علم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ کہیں کہیں بعض افراد ضرورت کی مجبوریوں سے صرف طبی مشغلہ رکھتے تھے۔ عربوں کی یہ رفتار دولتِ امویہ کے خاتمہ تک قائم رہی لیکن جب ہاشمیہ کا دور آیا اور یہ لوگ ملک کے بادشاہ ہوئے تو سب سے پہلے جس نے علوم کی طرف توجہ کی وہ خلیفہ ثانی ابو جعفر المنصور کی ذاتِ گرامی تھی۔ موصوف کو تبحرِ فقہ کے علاوہ فلسفہ و نجوم کے مسائلِ دقیقہ میں بھی مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ اسی سلسلہ کا ساتواں فرمانروا مامون بن ہارون رشید جب سریر آرائے خلافت ہوا تو اُس نے اپنے دادا المنصور کے ناتمام عزائم کو بڑی خوبی سے پورا کیا۔ مامون نے علوم و فنون کی جو گرانقدر خدمات انجام دیں، وہ تاریخ کے اوراق میں زندۂ جاوید رہیں گی۔ مامون نے ملوکِ روم کے پاس بہت سے وفود بھیجے۔ اور اُن کے کتب خانوں کی نادر اور جید فلسفیانہ کتابیں منگوا کر ماہرینِ فن سے اُن کے ترجمے کرائے اور لوگوں کو فلسفہ پڑھنے کی ترغیب دی۔ مامون کو حکما سے بہت زیادہ انس تھا۔ وہ ان کے مذاکرات اور مناظروں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا کرتا تھا۔

بغداد میں عباسیوں نے، مصر میں فاطمیوں نے، اندلس میں امویوں نے مامون کے اس مبارک طرز کی عرصہ دراز تک تقلید کی۔ جس کی بدولت مدارسِ عربیہ کے انتشار کا دائرہ سمرقند و بخارا سے لے کر فارس و قرطبہ تک پھیل گیا۔ امرا و ملوک ان مدارس پر بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے تھے۔ مشہور مورخ گبن نے نقل کیا ہے کہ: کسی وزیر نے بغداد میں صرف ایک مدرسہ جامعہ کے انشا پر ۲۰۰ ہزار گنی خرچ کی تھی اور ۹ ہزار گنی سالانہ کی آمدنی کی جائیداد اُس پر وقف کی تھی۔ (یہ فیاض ذات نظام الملک طوسی کی ذات تھی اور وہ مدرسہ بغداد کا مشہور مدرسہ نظامیہ تھا)

قاہرہ کے صرف ایک کتب خانے میں مختلف علوم و فنون کی ایک لاکھ سے زیادہ نادرِ روزگار کتابیں موجود تھیں اور اُن کے مطالعہ کی ہر شخص کو عام اجازت تھی۔ اس مکتبہ کی صرف فلکی اور طبی کتابوں کا شمار ۶۵۰۰ مجلدات

سے زیادہ تھا۔

مدارسِ عربیہ اور اُن کی علمی خدمات کے حیرت انگیز کارناموں کی یہ ایک معمولی توصیف ہے۔ (اگر موقعہ ملا تو کسی اگلی صحبت میں انشا اللہ بسط کے ساتھ ہم پھر عرض کریں گے) لیکن بااین ہمہ تاریخ کی یہ ایک ناقابلِ برداشت حقیقت ہے کہ گیارھویں اور بارھویں صدی سے پہلے حقائق و معارف اور علوم و فنون کا آفتاب عالمتاب مشرق سے مغرب کی طرف مائل ہوگیا۔ اور ایشیا و افریقہ سے ہٹ کر اس کی نورانی شعاعیں سرزمینِ یورپ پر پڑنے لگیں۔ یورپ میں سب سے پہلے علوم و فنون کے مدارس کا رواج اٹلی میں شروع ہوا۔ نویں صدی میں مدرسہ "سالرنو" کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور گیارھویں صدی میں یہ مدرسہ طب میں اتنا مشہور ہوا کہ اقطارِ یورپ سے جوق درجوق طلبا آنے لگے۔ دسویں صدی کے اواخر میں مدرسہ "پولونا" کا افتتاح ہوا اور گیارھویں صدی میں اس مدرسے نے قانون میں عام شہرت حاصل کی۔ اور ۱۱۶۰ء میں طب و قانون اور الٰہیات کی اعلیٰ ڈگری دینے لگا۔

پیرس کا مدرسہ ایک زمانے سے قائم ہے لیکن تیرھویں صدی کے اوائل میں جاکر قانون اور طب، فنون اور الٰہیات وغیرہ کا اس میں باقاعدہ انتظام ہوا۔ ۱۲۵۳ء میں پیرس کے اندر ایک جدید مدرسہ "سارین" کی تعمیر شروع ہوئی۔ اور ابھی چودھویں صدی عیسوی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فرانس میں ۱۴ یونیورسٹیاں تیار ہوگئیں۔ "سلامنکا" کا مشہور مدرسہ ۱۲۴۳ء میں قائم ہوا۔ اور مسلسل ۵۰۰ برس تک اسپین والوں کے لئے باعثِ فخر رہا۔ آکسفورڈ کے متعلق صحیح طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب قائم ہوا لیکن غالب گمان یہ ہے کہ بارھویں صدی کے شروع میں اس کا مکمل افتتاح ہوچکا تھا۔ ۱۲۳۳ء میں "کیمبرج" کا مدرسہ، جامعہ کی حیثیت میں منتقل ہوا۔ ۱۳۴۷ء میں مدرسہ "براگ" اور ۱۳۶۵ء میں مدرسہ "وائنا" کو یونیورسٹی بنایا گیا پھر مدارسِ جامعہ کی تاسیس اور تشئید اس کثرت سے پھیلی کہ سارے یورپ میں عام ہوگئی۔ امریکہ والوں نے بھی اپنے یورپین اسلاف کی پیروی میں بے نظیر ہمت اور انفاق کے ساتھ یونیورسٹیوں کا افتتاح کیا۔ امریکہ میں کتنے ہیں جنہوں نے بیسیوں لاکھ گنی یا اس سے بھی زیادہ کی رقمیں مدارس پر وقف کی ہیں۔ امریکہ والوں کی یہ عدیم النظیر قربانی اور ایثار حقیقت میں ساری دنیا کے لئے ایک پیغامِ درس و عمل ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار لعلکم تفلحون

بدر اصلاحی

خدا حافظ

اے گلِ گلستانِ رعنائی ۔۔۔ جانِ محبوبی و دلآرائی

میرے دم سے ہے سوزِ پروانہ ۔۔۔ تجھ سے روشن ہے شمعِ زیبائی

میرا جینا بھی کوئی جینا ہے ۔۔۔ تجھ بن اے نورِ چشمِ بینائی

تجھ بن آرام زندگی معلوم ۔۔۔ اے سرورِ دلِ تمنّائی

کیسے گزرے گی رات فرقت کی ۔۔۔ کیسے کاٹوں گا روزِ تنہائی

جاں ہی لے کر رہے گی آخرِ کار ۔۔۔ دردِ فرقت کی کارفرمائی

مر رہا ہوں میں اس تصوّر سے ۔۔۔ ہے مرے دل پہ غم کی یغمائی

از جگر دود میرود بسرم

شعلہ ام خشک مغز و سودائی (نظیری)

تجھ کو جانے نہ دوں کہیں ہرگز ۔۔۔ چاہتا ہے یہ شوقِ سودائی

لیکن اس وقت کی عنان گیری ۔۔۔ ہے سراسر خلافِ دانائی

کہہ رہا ہوں تجھے خدا حافظ ۔۔۔ گو نہیں طاقتِ شکیبائی

بسفر رفتنت مبارک باد

بسلامت روی و باز آئی (سعدی)

شادی کیونکر ہو

سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ مردانی بیٹھک میں ایک چھوٹی کوٹھڑی اور دو خاصہ کمرہ ہیں زنانے میں ایک چھوٹا سا صحن ہے دو جانب دالان اور اندر کے رخ تین چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ بیچ میں ایک شاہ نشین سی بنی ہے۔ اوپر ایک چبوترہ اور اس کے بعد تین در کا دالان۔ دالان کے بعد ایک سہ درہ کمرہ اور بازوؤں میں دو چھوٹے کمرے ہیں۔ دالان میں دری کا فرش ہے وسط میں گاؤ تکیہ اور سوزنی بچھی ہے۔ اس چھوٹے سے صاف ستھرے گھر کی مکین دو بہنیں ہیں۔ بڑی بہن عصمت لاولد ہیں۔ بیوہ ہو چکی ہیں اپنی چھوٹی بہن رفعت کے پاس رہتی ہیں۔ رفعت کے دو بچے ہیں لڑکی پندرہ سال کی اور لڑکا دس سال کا ہے۔ رفعت کا میاں وکیل ہے کافی آمدنی ہے گھر کا خرچ اجلا ہے۔ شریفانہ زندگی بسر ہوتی ہے۔ موقع موقع سے کچھ پس انداز بھی ہو رہتا ہے۔

رفعت دالان میں بیٹھی کچھ سی رہی ہیں۔ عصمت کسی اور کام میں مشغول ہیں

رفعت۔ اے باجی ذرا ورے آنا۔

عصمت۔ بوا کیا ہے۔ آج فرصت تھی میں نے کہا لاؤ خمیری سمبوسہ ہی تل لوں تمہارے میاں کو پسند ہیں چار اور رہ گئے ہیں، ذری ٹھہر جاؤ یہ نکال لوں۔ نہیں تو کڑاہی جلے گی۔

رفعت۔ اے ہے آپا آپ کو تو جب دیکھو جب بھی تلتا پکاتا۔ وہی مثل ہے اُٹھ ساسو پیٹ کا دکھ۔ وہ رحمت بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ اسے دیجے نا۔

عصمت۔ اے رحمت تو آ بیٹھ تیری بیوی کوئی کام بھی قرار سے کرنے دیتی ہیں؟ دیکھیو ذرا سنہری نکالیو جلا نہ دیجو۔

عصمت کفگیر چھوڑ بہن کے پاس آ بیٹھیں۔ پٹاری گھسیٹ کے پان بنایا۔

رفعت۔ آپا کل مہرالنسا پھر آئیں گی میں کیا جواب دوں گی۔

عصمت۔ جواب کیا "ہاں" اس کے لئے بھی کسی تام جھام کی ضرورت ہے،

رفعت ۔ اوئی لو اور سنو ۔ آپ نے تو کیسی آسان "ہاں" کہہ دی ۔
عصمت ۔ تو بوا اور کیا کہوں ۔ بیٹی کا معاملہ ٹھہرا آخر لڑکے میں کیا نی ہے ۔ ٹک ٹک سے ٹھیک ۔ ننھال ددھیال صاف ۔ پڑھا لکھا وہ مو ابی اے ٹی اے کیا ہوتا ہے اس میں پڑھتا ہے سو پچاس کا نوکر بھی ہو جائے گا اور تمہیں کیا چاہئے ۔ یہی چودھویں پندرھویں برس شادی کا وقت ہوتا ہے ۔
رفعت ۔ آپا ابھی تو شوکت کی پڑھائی بھی ختم نہیں ہوئی ہے ۔ اور پھر جب تک لڑکا کھاتا کماتا نہ ہو کس امید پہ لڑکی دے دوں ۔ میں تو بیس سے پہلے کبھی بھی میری شوکت کو نہ بیاہوں اور وہ بھی جب تک شوکت کی رائے نہ ہو "ہاں" کیسے کہہ دوں ۔
عصمت ۔ تو بوا پھر پوچھتی کیوں ہو جو دل میں آئے سو کرو ۔ نا بوا ہمارے زمانے میں اماں باوا نے جس کے چاہا حوالے کر دیا ۔ جیسا ملا اُسے بھر ابھگتا ۔ جب آئی گور میں جا سوئے کسی نے ہوں سنی نہ ہاں ۔ یہ موئے فرنگیوں کے طور طریق انہیں کو مبارک رہیں ۔ بھلا غضب تو دیکھو شوکت سولہویں برس میں موئے لونڈوں کی طرح مدرسوں میں پڑھنے جائے نہ ڈولی نہ گاڑی ۔ اچھی بُری نظریں پڑیں ۔ بیٹی ذات ٹھہری ۔ اللہ اماں باوا کی عزت رکھے ۔ نا بوا مجھے تو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی ۔
رفعت ۔ آپا بے شک والدین اولاد کے لئے اچھا ہی کرتے ہیں لیکن انہیں اولاد کے خیالات کا احساس کیسے ہو ۔ اب آپ ہی بتائیے میرے دل میں اس وقت کیا ہے ۔ آپ اپنی ہی کہئے آگا دولہا سے آپ خوش تھیں ۔ ایک نہیں دو دو سوکنوں کا جلاپا رات دن کی دانتا کِل کِل آپ دن کٹتیں تو وہ رات ۔ آپ نے اپنے کو تمام کر لیا ۔ مگر انہیں کبھی پروا بھی نہ ہوئی ۔ کیوں کیا ابا جان کو اُن کے اطوار معلوم نہ تھے بچپن سے دیکھا تھا ۔ مگر وہی کوتاہ نظری ۔ خاندان سے باہر نگاہ ہی نہ کی ۔ بیسیوں پیام آئے مگر خدا بخشے اماں جان نے کسی کو کشمیر کا جلاہا ٹھہرایا کسی کو نو دولتا کہا کسی کی ددھیال میں فی نکالی ۔ کسی کی ننھیال میں کیڑے ڈالے ایک نہ پسند آیا ۔
عصمت ۔ نا بوا ۔ میرے موئے اماں باوا کو کیوں پیٹتی ہو قسمت میں جیسا لکھا تھا مل گیا ۔ تم ہی کہو شمّوں کے لئے آخر تمہیں بھی تو مانگا تھا ۔ وہ بھی تو اُن کا بھانجا ہی تھا ۔ پھر تمہیں کیوں نہ دے دیا ۔
رفعت ۔ تو مجھے جھونکنے میں کسر ہی کیا تھی ۔ اللہ بخشے نانا جان نہ اڑتے نہ ان سے میری شادی ہوتی ایک نوسی کا حشر تو دیکھ چکے تھے دوسری کی چھاتی پر کیوں مونگ دلواتے ۔ دیکھ لو شموں کیا کر رہا ہے ایک پہ ایک سوکن لا رہا ہے باپ کی اس گاڑھے پسینے کی کمائی یوں خاک میں ملا رہا ہے ۔ باجی یہ سب جہالت کی باتیں ہیں ۔ قسمت کے

لکھے کو تو کون میٹ سکتا ہے۔ مگر اللہ نے جب آنکھیں دی ہیں تو اندھے کیوں ہو جائیں

عصمت ۔ ہاں بوا سچ ہے۔ چودھویں صدی ہے ۔لڑکی کو تو لیے سے لگائے بیٹھی رہو ۔ تم ہی نے تو اس لڑکی کو غارت کیا ہے ۔موئی پھلپھل پائیاں میموں جیسا لہنگا پھڑکاتی پھرے ۔ بوا چاہے برا مانو یا بھلا میں تو خدا لگتی کہوں گی ۔ نوج کنبہ کی لڑکیاں ایسی ہوائی دیدہ ہوں ۔ نہ سینا نہ پرونا نہ پکانا نہ ریندھنا ۔ جب دیکھو جب نگوڑی پرچیاں ۔ یہ فلانی مس کی ہے یہ ڈھمکی میم کی ہے ۔ بس یہی کسر رہ گئی بیٹی سے میاں بھی پسند کرا لو ۔ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر ۔ نابوا ۔ اللہ بچائے برا زمانہ ہے ۔

رفعت ۔ آپا آپ سچ کہتی ہیں ۔ اگلے زمانے میں اور اب میں بہت فرق ہے ۔ اس زمانے میں نہ کوئی شرم کو پوچھتا ہے نہ گھرداری کو ۔ جہاں دیکھو تعلیم پوچھی جاتی ہے ۔ جس لڑکے کو دیکھئے انگریزی تہذیب کا دلدادہ ، انگریزی رہائش کا شیدا ۔ اگر لڑکی اس جیسی نہ ہوئی تو دونوں کی جان ضیق میں اور اماں باوا کے گلے میں جیتا ہار ۔ تو باجی اپنے کو جنجال میں کون ڈالے ۔ اولاد جانے اور اُس کا کام ۔ ہاں اچھا برا ہم بھی بتا دیں گے ۔

عصمت ۔ بس بوا تو پھر تم پہ کاہے کا بوجھ ہے ۔ لڑکی خود جواب دے گی ۔

رفعت ۔ توبہ آپا آپ تو ناراض ہوتی ہیں ۔

عصمت ۔ ناراض نہ ہوں تو کیا کروں ۔ لڑکی کو تم نے ہوّا بنا دیا ۔ بوا بیٹی نہ ہوئی اتالیق ہوئی ۔

رفعت ۔ آپا اتالیق کی کیا بات ہے ۔ لڑکی سے پوچھنے میں ہرج ہی کیا ہے ۔ میں تو کل مہرالنسا سے کہہ دوں گی لڑکا پڑھ لکھ لے کام سے لگ لے پھر دیکھا جائے گا ۔ ایسی جلدی ہی کیا ہے ۔

سردار محمد معظم خاں

بھابی کے نام خط

اے بی بھابی سلام

کہوگی تو سہی کہ ایدری سعیدہ کتنی جھوٹی ہے۔ مگر بھئی بھابی دیدوں گھٹنوں کی قسم جو مجھ نگوڑی کو دم لینے کی بھی مہلت ملی ہو۔ یوں تو مجھے گھر پہنچے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہو گئے مگر ادھر تو نگوڑے گھر کے دھندے اور اُدھر ماما ایسی کم بخت ہے کہ بس اگر خبر نہ رکھوں تو کھانا دیکھتے ہی بجائے بھوک لگنے کے بھاگ جائے۔ مصالحہ کی ہراند گوشت کی بساند کے مارے متلی ہونے لگتی ہے۔ یہ نگوڑی دیہات کی عورتیں ہماری دہلی کے کھانے کیا جانیں۔ یہ تو خیر بیچاری غریب عورت ہے جو سونے سے پیلی ہوئی پڑی ہیں اُن کو بھی دیکھو تو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ روپیہ ہو جانے دو موا گنوارپن کہاں جائیگا کل یہاں کے تحصیلدار کی بیوی ملنے آئی تھیں، کوئی پچاس برس کی عورت، سر میں کڑبڑے بال، سانولا رنگ، موٹا نقشہ، تلوں سے سارے منہ پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سبز مخمل کا سرپیب پاجامہ جس کی مہریوں پر لچکا ٹنکا، اودا مخمل کا کرتا تھی جان توئی لچکا لگا، سبز چمپا نے رنگ کا بنارسی دوپٹہ، زیور میں گوندنی کی طرح لدی، پاؤں میں پازیب رم جھول چوراہی بل بچھے الم غلم پھنسے، ہاتھ میں آرسی جس میں بار بار اپنا منہ دیکھتی تھیں۔ غرض کہ عورت کیا تھی خاصا ہولی کا سوانگ تھی۔ بے خبر بے اطلاع آ دھمکیں۔ میں غسل کر رہی تھی بسنتی نے جا کر کہا، جلدی جلدی تین لوٹے ڈال باہر نکلی۔ یہ ہیئت کذائی دیکھ کر ہنسی بہت آئی مگر ضبط کیا۔ افروز جہاں جیسی شریر ہے تم کو معلوم ہے۔ وہ باتیں کر رہی تھیں یہ پیچھے کھڑی نقلیں اتار رہی تھی میری مارے ہنسی کے بُری حالت تھی۔ اے ہے بھابی ان دیہات والیوں کی شکل پر پھوہڑاپن کیسا برستا ہے۔ خدا کسی دلی والے کو تو دیہات میں لائے نہیں۔ بات کرو تو مزا نہیں، نگوڑی سخت زبان، میرا تو دم الٹتا ہے، آٹھ دن میں دل گھبرا گیا۔ سچ کہوں تمہارے نندوئی کی تکلیف کا خیال نہ ہو تو ایک دن بھی نہ ٹھہروں۔ سونے میں لدی پڑی ہیں مگر قرینہ نہیں۔ ایلو میں تم کو ایک دعوت کا حال

معلوم ہوا یہ سردار صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ میں یہ تماشا دیکھتی چلی جارہی تھی کہ دو تین لونڈیاں دھڑ دھڑ بھاگتی
ہوئی اور یہ کہتی ہوئی آئیں کہ بی بی جی بی بی آتی ہیں۔ بوا میں ان کی شکل حیران ہوکر دیکھنے لگی بے خیالی میں منہ اوپر
اٹھائے جارہی تھی نگوڑے کیلے کے چھلکے پر پاؤں پھسلا، اوندھے منہ گرنے سے بچی، ابھی پوری طرح سنبھلنے
بھی نہ پائی تھی کہ ایک بیوی سیاہ فام، بھدی سی آکر نہ سلام نہ دعا گلے سے لپٹ گئیں۔ میں ہکا بکا کہ یہ تماشا
کیا ہے۔ خیر جب وہ الگ ہوئیں تو معلوم ہوا سردار صاحب کی بیوی یہی ہیں۔ کہنے لگیں بویو اندر چلو۔ اُن کے
اس فقرے پر ایسی ہنسی آئی کہ بے اختیار ہنس پڑی۔ ہنستے ہوئے دوپٹے پر جو نظر پڑی تو نگوڑا ابر لیٹ کا
دوپٹہ جس پر اللہ بخشے دوا خوش قدم کے ہاتھ کی کیکری اور کٹاؤ بنا ہوا تھا غارت ہوکر رہ گیا۔ چکنے ہاتھ کا پورا
پنجے کا نشان دوپٹے پر ہوگیا۔ صدر دالان میں پہنچی۔ چوکوں پر قیمتی دالان کا فرش مگر منوں گرد۔ قیمتی اشیاء جو
طاقچوں میں سجی تھیں وہ بھی خاک آلود۔ اب کھانے کا حال بھی سنو۔ سینی نہ سینی خوان پوش، دو لونڈیاں طشتریوں
میں کھانا لے کر آئیں۔ پیچھے سے ایک روٹیوں کی نھئی لے کر آئی۔ کھانے تو بہت تھے مگر نگوڑے سراندے
بساندے، گوشت کچر کچر کرتا۔ بمشکل تھوڑا بہت کھایا۔ اور تو خیر سب کچھ تھا مگر شامی کبابوں پر ورق دیکھ کر ہنسی
ضبط نہ ہوسکی۔ کھانا شروع کرنے سے ذری دیر پہلے ایک بیوی نے آکر پاؤں پکڑ لئے۔ میں نے سردار صاحب
کی بیوی کی طرف حیرت سے دیکھا، کہنے لگیں یہ بہو ہیں، ہمارے ہاں بہوئیں پاؤں چھوتی ہیں۔ ان کا بھی حلیہ
سنو۔ شکل تو خیر خاصی تھی مگر دیہات کا روڑھا پن کہاں جائے۔ بچہ کوئی چار برس کا گود میں، ٹانگوں سے ننگا
سر پر گوٹے کی ٹوپی، ہاتھ میں گاجر کا ٹکڑا۔ کھانا شروع ہوا لڑکا بہت بے باکی سے سب چیزیں بہت بہت سے
کر کھا رہا تھا، شب دیگ کا پیالہ اٹھانے کے لئے جو ہاتھ بڑھایا تو پانی کا گلاس جو بھرا رکھا تھا وہ اس سے
ٹکرا کر گرا۔ شامتِ اعمال سے وہ مجھ نگوڑی کے قریب تھا۔ پانی بہ کر آیا اور جب تک میں اٹھوں اٹھوں
غرارے کے پائنچے سب گیلے ہوگئے۔ اس قدر غصہ آیا کہ بس کیا کہوں مگر دادی نے مسکرا کر کہا۔ ننھے نچلے بیٹھو،
دیکھو پانی گر گیا۔ لڑکا اس کہنے پر بگڑ گیا اور منہ اوندھا کر جو لات ماری تو تلاجی کا پیالہ جو پاس رکھا تھا اوندھ گیا۔ بمشکل
ماں نے خوشامد منت سماجت سے اٹھایا۔ میں تو ایسی گھبرائی کہ کھانا ختم کرتے ہی اجازت مانگی۔ لے ہے بھابی کبھی
اماں جان یہاں ہوں اور تم ہو تو تماشا دیکھو۔ لے بھابی افروز کہتی تھی کہ جننے کا خیر سے پیر بھاری ہے اس چھوٹی
پلپاٹن کا تو مجھے یقین نہیں تم لکھو تو یقین آئے۔ ہم تو اس دن کی آس منا رہے ہیں۔ ماموں ابا تو بہت خوش
ہوں گے! افروز تم کو سلام کہتی ہے۔ یہ خط ذری حمیدہ کو دکھا دینا۔ ذرا مہلت ہو تو اُن کو بھی خط لکھوں۔ اماں جان کی
خیریت لکھنا۔ لو خدا حافظ۔ اب غسل کرنے جاتی ہوں، مارے گرمی کے دم بولا رہا ہے۔ فقط تمہاری سعیدہ

ماہ رخ

لمعات

حیات و ذوقِ طرب، اے رہینِ بیخبری
گئی نہ ظلمتِ شب تا ستارۂ سحری

غمِ زمانہ صبر آزما مبارک باد
کہ رازِ ہمتِ پرواز ہے شکستہ پری

ہر ایک ذرّۂ تاریک ہے حریمِ جمال
حجابِ دید اگر ہو نہ تیری کم نظری

مگر بطرزِ جنوں چاکِ پیرہن کر لے!!
جنوں اگرچہ نہ دیتا ہو درسِ جامہ دری

نثار لاکھ نشاطِ ارم، جو ممکن ہو
شرابِ ناب و لبِ جوئبار و رقصِ پری

مقامِ شکر ہے اے شکوہ سنجِ ناپرسی
کہ ننگِ زخمِ جگر تھا خیالِ بخیہ گری

حدودِ میکدہ ہیں، کائناتِ لامحدود
جہانِ بیخودی و صد جہانِ بےخبری

ذلیل کیوں نہ متاعِ کمال ہو اختر
ہوئی ہے زینتِ بازارِ جنسِ بے ہنری

سید علی اختر

خالد اور حمیدہ

(عرب کے مشہور شاعر اصمعی کا ایک افسانہ)

محارب اور ظہیر ایک ہی ماں باپ سے دو بھائی تھے، دونوں اپنی جرات اور شجاعت کی وجہ سے ملک بھر میں مشہور تھے۔ لیکن محارب قبیلے کا سردار تھا اور ظہیر اُس کا وزیر تھا۔ محارب اُس کے مشورے پر چلتا تھا مگر ظہیر پھر بھی اُس کا تابعِ فرمان تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اُن کے درمیان کسی معاملہ پر سخت تکرار ہوئی اور بڑا بگاڑ پیدا ہو گیا۔ ظہیر اُٹھ کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔ وہ نہایت مغموم تھا اور نہ جانتا تھا کہ اب کیا کرے۔ اُس کی بیوی نے اُس سے پوچھا "اے عربی سرداروں کے سردار! تم اس قدر آزردہ خاطر کیوں ہو؟ کیا تمہیں کسی نے ناراض کیا ہے یا کسی نے تمہاری توہین کی ہے؟" ظہیر نے کہا "میں کیا کروں وہ جس نے میرے دل کو زخمی کیا ہے وہ ہے جس پر میں اپنا ہاتھ نہیں ڈال سکتا، جسے میں کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتا وہ دنیا میں میرا ایک ہی رفیق، میرا بھائی ہے۔ آہ، اگر وہ کوئی اور ہوتا تو میں اسے بتا دیتا کہ وہ کیسے شخص کا مدمقابل ہوا ہے اور اپنی قوم کے رؤسا کے سامنے اس کی مثال کو ایک عبرت بنا کر پیش کرتا۔" اُس کی بیوی نے کہا "اُسے اپنے مال و منال سے لطف اٹھانے دو اور تم یہاں سے چلو۔" اور ظہیر کو آمادہ کرنے کے لئے اُس نے بڑے بڑے شعرا کے شعر پڑھے، جن میں مذکور تھا کہ توہین انسان کو اپنے ماں باپ کی جانب سے بھی قبول نہیں کرنی چاہئے۔

ظہیر نے اپنی بیوی کے مشورہ کو مان لیا۔ اُس نے رخصت کی تیاری کر لی۔ اپنے خیمے لپیٹ لئے اونٹوں پر اسباب لادا، اور قبیلہ سعد کی قیام گاہ کی طرف چل دیا جو اُس کے حلیف تھے۔ مگر اُس کے دل میں اپنے بھائی سے جدا ہونے پر رہ رہ کر ایک درد اُٹھتا تھا ——— اور اُس نے کہا "اس سفر میں جو مجھے تجھ سے دُور لے جا رہا ہے مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ہزار سال چلتا رہوں گا اور ہر سال مجھے تجھ سے ہزار میل دُور لے جائے گا۔ . . . . اگر اب تو مجھ پر ہزار مصر کے برابر بھی احسان کرے اور ہر مصر میں ایک ہزار نیل ہوں تو میں انہیں حقارت کے ساتھ ٹھکرا دوں گا جب تک میں تجھ سے دور رہوں گا اپنی کم مائگی پر قناعت کروں گا اور جدائی کے دنوں میں اس شعر کو پڑھوں گا جو تابناک موتیوں کی لڑی سے بھی زیادہ قیمتی ہے: "جب کسی شخص کی اپنی ہی قوم اور اپنے ہی وطن میں تحقیر کی جائے تو

اُس کے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ تو جس نے میرے دل کو یوں زخمی کیا ہے بہت جلد رحمٰن و رحیم خدا کی قوت کو محسوس کرے گا کیونکہ وہی میرے اور تیرے درمیان فیصلہ کرنے والا اور قائم و دائم ہے"۔

آخر ظہیر قبیلۂ سعد میں پہنچ گیا اور گھوڑے پر سے نیچے اُتر آیا۔ بنو سعد نے اس کا نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا اور اسے اپنے پاس رہنے پر مجبور کیا۔ اُس کی بیوی جلد ہی ایک بچے کی ماں بننے والی تھی، اور ظہیر نے اُس سے کہا "اگر خدا نے ہمیں لڑکا دیا تو یہ اُس کی عین عنایت ہے لیکن اگر لڑکی پیدا ہوئی تو اس کا چرچا نہ کرنا اور لوگوں کو اس مغالطے میں رہنے دینا کہ ہمارے ہاں لڑکا ہوا ہے تاکہ میرے بھائی کے لئے وجہ شماتت پیدا نہ ہو"۔ آخر وہ وقت بھی آن پہنچا اور ظہیر کی بیوی کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی انہوں نے اس کا نام جیّدہ رکھا لیکن ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ باہر لوگوں میں اُسے جُندر کہہ کر پکارا جائے تاکہ وہ اسے لڑکا سمجھیں۔ اور لوگوں کو اس کا مزید یقین دلانے کے لئے ان کے ہاں کئی دن تک صبح و شام دعوتیں اور جلسے ہوتے رہے۔

قریب قریب اسی زمانے میں دوسرے بھائی محارب کے گھر بھی لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اُس نے خالد رکھا۔ اُس نے یہ نام خدا کی بارگاہ میں شکرانہ کے طور پر منتخب کیا، کیونکہ جب سے اُس کا بھائی اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اُس کے معاملات سلجھ رہے تھے۔

دونوں بچے جوان ہو گئے اور اُن کی شہرت عرب کے طول و عرض میں پہنچ گئی۔ ظہیر نے بیٹی کو گھوڑے کی سواری اور تمام وہ فنونِ جنگ سکھا دیئے تھے جو ایک جری اور بہادر سپاہی کے لئے سیکھنے لازمی ہیں۔ اُس نے اُسے سخت سے سخت محنت اور خطرناک سے خطرناک مہم میں کود پڑنے کا عادی بنا دیا تھا۔ جب کبھی وہ کسی جنگ پر جاتا قبیلہ کے اور عربوں کے ساتھ وہ اُسے بھی ہمراہ لے لیتا۔ اور ان جنگی سواروں میں جیدہ نے اپنی شجاعت کے طفیل جلد ہی ایک امتیازی درجہ حاصل کر لیا۔ اور ایسا ہوا کہ وہ بہادری میں اپنے رفقا سے سبقت لے گئی، یہاں تک کہ وہ تنِ تنہا شیروں پر اُن کے غاروں میں جا کر حملہ کر دیا کرتی تھی۔ اُس کا نام سن کر لوگ کانپ جایا کرتے تھے۔ جب وہ کسی بہادر کو مغلوب کرتی تھی تو وہ ضرور کہا کرتی تھی: "مَیں جندر، ابنِ ظہیر ہوں جو قبیلوں کا شہسوار ہے"۔

اُدھر اُس کے عم زاد بھائی خالد نے بھی اپنے دلیرانہ کارناموں کے باعث بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اُس کے باپ محارب نے جو ایک نہایت عقلمند اور دانا سردار تھا اجنبیوں کی تواضع کے لئے محلات تعمیر کرا رکھے تھے جہاں بہادرانِ ملک کی خصوصاً بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ خالد بڑے بڑے جنگجوؤں کی صحبت میں پلا اور بڑھا تھا۔ یہی وہ مکتب تھا جس میں اُس کے ذوق کی تربیت ہوئی تھی۔ یہیں اُس نے شہسواری کا فن سیکھا تھا،

اور اب ایک بے باک سپاہی اور ایک خوف انگیز مبارز بن گیا تھا۔ اُس کے سپاہیوں کو اب علم ہو چکا تھا کہ اُس کے جوش اور اُس کی قوت پر کوئی غلبہ نہیں پا سکتا۔

آخر اُس نے اپنے بھائی جندر کے متعلق سنا اور اُس کے دل میں اُس سے ملنے، اُس کے حالات معلوم کرنے اور اُس کے کرتب دیکھنے کا بے انتہا شوق پیدا ہوا لیکن وہ اپنے اس شوق کو پورا نہ کر سکتا تھا کیونکہ اُس کا باپ اپنے بھائی کے اس بیٹے کے متعلق اکثر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ خالد کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اُس کے باپ محارب کا انتقال ہو گیا۔ جس سے اعزاز دولت اور حکومت اُس کے اپنے قبضے میں آ گئی۔ اجنبیوں کی تواضع، غربا اور مساکین کی دستگیری اور بھوکے ننگوں کو کھانا کپڑا دینے میں وہ اپنے باپ کا پیرو تھا اُس نے اپنے بہادر سپاہیوں کی معیت میں بادیہ پیمائی کا سلسلہ بھی جاری رکھا جس نے اُس کی جسمانی قوت اور جرأت کو اور بڑھا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس نے بہت سے قیمتی تحائف جمع کئے اور اپنی ماں کو ساتھ لے کر اپنے چچا سے ملنے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ اُس نے اُس وقت تک اپنے گھوڑے کی لگام نہ کھینچی جب تک وہ ظہیر کے خیمے کے پاس نہ پہنچ گیا۔ ظہیر اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اُس نے اس کی خاطر تواضع کا بڑا اہتمام کیا۔ کیونکہ اُس نے اپنے بھتیجے کی قابلیت اور شجاعت کی باتیں کئی موقعوں پر سنی تھیں۔ خالد جیدہ سے بھی ملا۔ اُس نے اُسے سلام کیا اور پھر گلے سے لگا کر اُس کی پیشانی کو چوما یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ بھی اسی کی طرح مرد ہے۔ جیدہ کی رفاقت میں اُسے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی اور وہ دس دن تک اپنے چچا کے ہاں مقیم رہا۔ اس اثنا میں اُس نے شہسواری اور سپہگری کے کتنے ہی مقابلوں میں حصہ لیا۔ اُدھر جیدہ کا یہ حال تھا کہ جب سے اُس کی نظر خالد کی شجاعت اور حسن پر پڑی تھی وہ سو جان سے اُس پر نثار ہو چکی تھی۔ اُسے نیند نہ آتی تھی، اُسے کھانا پینا بھول گیا تھا اور اُس کی محبت اس درجہ بڑھ گئی تھی اور اُسے اپنا دل یہاں تک خالد کے قبضے میں نظر آتا تھا کہ اُس نے اپنی ماں سے کہا "اے میری ماں، اگر خالد مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میں اُس کی جدائی میں مر جاؤں گی"۔ اُس کی ماں نے جب یہ سنا تو اپنی بیٹی پر اُسے بڑا رحم آیا۔ اُس نے اُسے کچھ نہ کہا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ناراض ہونا بے کار ہے۔ اُس نے کہا "جیدہ، اپنے جذبات کو چھپاؤ اور غم سے اپنے آپ کو نجات دو۔ تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، کیونکہ خالد تمہاری پسند کا لڑکا ہے اور اُس کی رگوں میں تمہاری قوم کا خون دوڑ رہا ہے۔ اُسی کی طرح تم خوبصورت اور دلربا ہو اور اسی کی طرح تم بہادر اور شہسواری میں فرد ہو۔ کل صبح جب اُس کی ماں ہمارے ہاں آئے گی تو میں سب معاملہ اُس کے سامنے پیش کر دوں گی، پھر ہم جلد ہی تمہاری شادی خالد سے کر دیں گے اور آخر کار ہم سب اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔

ظہیر کی بیوی آنے والی صبح کا انتظار کرتی رہی۔ جب خالد کی ماں اُن کے ہاں آئی تو وہ اپنی بیٹی کو اُس کے پاس لے آئی۔ جیدہ کے لمبے لمبے بال کندھوں پر پڑے ہوئے تھے۔ حسن کی اس تصویر کو دیکھ کر خالد کی ماں ششدر رہ گئی، اور کہنے لگی: "کیا! یہ تمہارا بیٹا جندر نہیں ہے؟" جیدہ کی ماں نے کہا "نہیں! یہ جیدہ ہے ـــ ماہِ حسن کو دیکھو وہ طلوع ہو چکا ہے۔" پھر اُس نے وہ تمام باتیں سنائیں جو اُس کے اور اُس کے شوہر کے درمیان بچے کی تذکیر و تانیث کو چھپانے کے متعلق قرار پائی تھیں۔ خالد کی ماں نے جس کی حیرت ابھی کم نہ ہوئی تھی جواب دیا: "میری پیاری بہن ملکِ عرب کی تمام بیٹیوں میں جو اپنے حسن کے لئے مشہور ہیں میں نے کبھی اس سے زیادہ پیارا چہرہ نہیں دیکھا۔ اس کا نام کیا ہے؟" جیدہ کی ماں نے کہا "میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس کا نام جیدہ ہے اور اس راز سے تمہیں آگاہ کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں یہ حسن وجمال کا تحفہ تمہیں پیش کروں۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنی بیٹی کو تمہارے بیٹے سے بیاہ دوں اور اس طرح پھر ہم اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔" خالد کی ماں نے فوراً اس تجویز کو مان لیا۔ اور کہنے لگی "جیدہ کی رفاقت یقیناً میرے بیٹے کو بہت مسرور کرے گی۔" وہ فوراً اٹھی اور خالد کو تلاش کر کے اُس نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اسے بتا دیا اور جیدہ کے حسن وجمال کا خاص طور پر ذکر کرتی رہی اُس نے کہا "مجھے اپنے ایمان کی قسم، اے بیٹے، میں نے جیدہ سے زیادہ خوبصورت لڑکی نہ کبھی صحرا میں دیکھی ہے اور نہ کبھی شہر میں۔ کوئی چیز اپنے حسن میں اس سے زیادہ کامل نہیں ہے اور کوئی چیز اس سے زیادہ دلآویز اور اس سے زیادہ دلکش نہیں ہے۔ جلدی کرو میرے بیٹے اور اپنے چچا سے مل کر اُس کی لڑکی کو اپنے لئے مانگ لو۔ اگر وہ تمہاری استدعا کو قبول کر لے تو یقیناً تم خوش قسمت ہو گے۔ جاؤ اور جلد سے جلد اُسے حاصل کر لو۔"

یہ الفاظ سن کر خالد کی آنکھیں جھک گئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ کچھ متفکر سا ہو گیا، پھر اُس نے کہا "اماں، میں یہاں اب اور نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے اب اپنے سواروں اور فوجیوں سمیت یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیئے مجھے اب جیدہ سے کچھ نہیں کہنا، مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایک لڑکی ہے جس کا مزاج اور جس کا فلسفہ غیر معین ہے، اُس کی سیرت اور اس کا طرزِ کلام استحکام اور استقلال سے عاری ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی زندگی سپاہیوں کے درمیان گزاری ہے جن پر میں اپنا روپیہ صرف کرتا ہوں اور جن کے ساتھ مل کر میں نے اپنی سپاہیانہ شہرت حاصل کی ہے۔ اب رہی جیدہ کی میرے لئے محبت، سو یہ ایک عورت کی کمزوری ہے، ایک نوجوان لڑکی کی۔" پھر اُس نے اپنا زرہ بکتر پہن لیا، اپنے گھوڑے پر سوار ہوا، چچا کو خدا حافظ کہا اور اسی وقت اپنی روانگی کا اعلان کر دیا۔ ظہیر نے پوچھا "آخر اس جلدی کے کیا معنی ہیں؟" خالد نے کہا "میں اب یہاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔" او

گھوڑے کو ایڑ لگا کر یکایک صحرا کی وسعت میں کود پڑا۔ خالد کی ماں بھی وہ تمام گفتگو جو اُس کے اور خالد کے درمیان ہوئی تھی جیدہ کو بتانے کے بعد ایک اونٹ پر سوار ہوئی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

جیدہ کی حساس روح نے اس تحقیر کو بڑا محسوس کیا۔ وہ اسی سوچ میں ڈوب گئی — اُس کی نیند اڑ گئی اور اُس کی بھوک زائل ہوگئی کچھ دن کے بعد جب اُس کا باپ اپنے سواروں کے ساتھ دشمنوں پر ایک حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا تو اُس کی نگاہ جیدہ پر پڑی۔ اُسے یوں افسردہ اور پژمردہ دیکھ کر اُس نے کچھ نہ کہا۔ اُس نے سوچا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ یقیناً پھر اپنے آپ میں آجائے گی۔

ابھی ظہیر نظروں سے اوجھل ہوا ہی تھا کہ جیدہ نے جو اپنے آپ کو موت کے بالکل قریب سمجھ رہی تھی اور جس کی اداسی اب ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی اپنی ماں سے کہا "اماں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں مر رہی ہوں، درآنحالیکہ یہ کم بخت خالد اپنی زندگی کی قوتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اگر خدا مجھے قوت دے تو میں چاہتی ہوں کہ اسے موت کے قہر و غضب کا تجربہ کراؤں اور اُس کے درد و کرب کا مزہ چکھاؤں" یہ کہہ کر وہ ایک شیرنی کی طرح اُٹھی، اُس نے زرہ پہنی اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ماں سے کہنے لگی کہ میں شکار کے لئے جارہی ہوں۔ تیزی سے اور بغیر کہیں ٹھہرے وہ چٹانوں اور پہاڑیوں کو طے کرتی ہوئی اور اپنے بڑھتے ہوئے جوش کو بڑھاتی ہوئی خالد کی قیام گاہ میں پہنچ گئی۔ چونکہ اُس نے بھیس بدل رکھا تھا اس لئے کسی نے اُس کو نہ پہچانا اور وہ اُس خیمے میں داخل ہوگئی جو اجنبیوں کے قیام کے لئے مخصوص تھا۔ اُس کے خود کی آنکھیں حجازی سواروں کی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ غلاموں اور خادموں نے اس کا استقبال کیا اور اس طرح اُس کی خاطر و مدارات کی جیسے وہ ملک کی کوئی بہت عالی رتبہ شخصیت تھی۔ اُس رات جیدہ نے آرام کیا، لیکن دوسرے دن فوجی ورزشوں میں اُس نے حصہ لینا شروع کردیا، بہت سے بہادروں کو دعوتِ مقابلہ دی اور اپنی کاروانی اور بہادری کی ایسی نمائش کی کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ دوپہر سے بہت پہلے اُس نے خالد کے سب بہادروں سے اپنی فوقیت تسلیم کرالی۔ خالد خود اُس کی شجاعت کا نظارہ کرنے آیا، اور جب اُس نے اُس کا کمالِ فن ملاحظہ کیا تو وہ حیران رہ گیا، اور اپنے آپ کو اُس کے مقابلہ کے لئے پیش کیا۔ جیدہ فوراً مقابلے کے میدان میں آگئی اور پھر دونوں لڑائی میں گتھ گئے۔ ایک ایک کر کے انہوں نے حملے اور مدافعت کے تمام داؤں آزما ڈالے یہاں تک کہ رات کے سائے اُن پر چھانے لگے۔ جب وہ جدا ہوئے تو کسی کو کوئی مضرت نہ پہنچی تھی اور دونوں میں سے کوئی بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ فریقِ غالب کون ہے۔ یوں جب جیدہ تماشائیوں پر اپنی بہادری کا سکہ بٹھا رہی تھی تو اُس نے دیکھا کہ لوگ

اپنے سردار کو ایک اجنبی کے ہاتھوں مجبور دیکھ کر کچھ جز بز سے ہو رہے ہیں۔ خالد اپنے حریف کے لئے ہر ممکن خاطر و مدارات کے احکام دے کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔ اُس کا دل آج کے معرکے کے خیالات سے بھرا ہوا تھا۔ جیدہ تین دن تک خالد کے ہاں مقیم رہی۔ ہر صبح وہ مقابلے کے میدان میں آدھمکتی اور جب تک رات نہ ہو جاتی وہ اپنے ہتھیار ہاتھ سے نہ رکھتی۔ اُس نے ان مقابلوں سے خوب لطف اٹھایا مگر اپنے آپ کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ اُدھر خالد نے بھی اُس سے کچھ نہ پوچھا، کوئی سوال نہ کیا کہ وہ کون ہے اور کس قبیلے سے ہے۔

چوتھے دن صبح کے وقت جب خالد حسبِ معمول اپنے گھوڑے پر چڑھ کر باہر نکلا اور مہمانوں کے خیموں کے پاس پہنچا تو اُس نے جیدہ کو بھی ایک گھوڑے پر سوار دیکھا۔ اُس نے اسے سلام کیا اور اُس نے سلام کا جواب دیا۔ خالد نے کہا "اے شریف عرب، میں تجھ سے ایک سوال کرتا ہوں گو میں اب تک اظہارِ نیازمندی سے قاصر رہا ہوں لیکن اب میں اُس خدا کے نام پر تجھ سے التجا کرتا ہوں جس نے تجھے یہ قوت اور چستی عطا کی ہے مجھے بتا کہ تو کون ہے، اور تیرا تعلق کس بادشاہ سے ہے؟ کیونکہ میں نے تیرے جیسا بہادر جنگجو آج تک نہیں دیکھا۔ مجھے بتا میں تجھ سے عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کیونکہ میں یہ معلوم کرنے کے لئے سخت بیتاب ہوں"۔

جیدہ مسکرائی، اور خود کو اوپر اٹھاتے ہوئے اُس نے جواب دیا "خالد میں ایک عورت ہوں جنگجو نہیں ہوں میں تیرے چچا کی بیٹی جیدہ ہوں جس نے اپنے آپ کو تیرے سامنے پیش کیا تھا اور اپنا آپ تجھے دے ڈالنے کی خواہش کی تھی مگر تو نے انکار کر دیا ——— اپنے اُس غرور میں جو تجھے اپنی تلوار کے باعث ہے"! یہ کہہ کر اُس نے اپنے گھوڑے کا منہ موڑا۔ ایڑ لگائی اور ہوا کی رفتار سے اُسے اڑاتی ہوئی اپنے گھر کی سمت روانہ ہو گئی۔

خالد حیران پریشان اپنے خیمے میں واپس آگیا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ کیا کرے اور نہ جانتا تھا کہ اُس بیتاب محبت کا جو یکایک اُس کے سینے میں لہریں لینے لگی ہے کیا انجام ہو گا۔ وہ اپنے اُس جنگجویانہ ذوق اور اپنی اُن سپاہیانہ عادات سے سخت بیزار ہو گیا جنہوں نے اُسے اس رنج و اندوہ کے کرب و اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ عورتوں سے اُس کی نفرت یکایک محبت سے بدل گئی۔ اُس نے اپنی ماں کو بلا کر سب ماجرا کہہ سنایا۔ ماں نے کہا "میرے بیٹے یہ تمام حالات ایسے ہیں کہ جیدہ تمہیں اس سے بھی زیادہ عزیز ہونی چاہئے، مگر تھوڑی دیر صبر سے انتظار کرو، تاکہ میں جا کر اُس کی ماں سے اُس کا رشتہ تمہارے لئے مانگوں"۔ یہ کہہ کر وہ ایک اونٹ پر سوار ہو گئی اور صحرا میں اُن نقوشِ قدم پر پڑ لی جو جیدہ کے گھوڑے کے سموں سے ریت پر بن گئے تھے۔ جیدہ نے گھر پہنچ کر تمام واقعہ من و عن اپنی ماں کو سنا دیا تھا۔ خالد کی ماں نے آتے ہی اپنے آپ کو ظہیر کی بیوی کی جھولی

میں ڈال دیا اور اپنے بیٹے کے لئے جیدہ کا رشتہ مانگا کیونکہ ظہیر ابھی اپنی مہم سے واپس نہ لوٹا تھا جب جیدہ نے اپنی ماں سے خالد کی درخواست کو سنا تو اُس نے کہا "یہ کبھی نہ ہوگا خواہ مجھے اس کے لئے موت کا جام ہی کیوں نہ پینا پڑے۔ جو کچھ اُس کے خیموں کے پاس واقع ہؤا اُس کا مقصد محض غم و اندوہ کی اُس آگ کی پیاس کو بجھانا تھا جو میرے سینے میں شعلہ زن تھی اور میری روح کو جھلسے ڈالتی تھی"۔

یہ الفاظ سن کر خالد کی ماں مایوس واپس اپنے بیٹے کے پاس چلی گئی جسے جیدہ کی جدائی میں کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ ماں کو دیکھ کر وہ دفعتہً اُٹھ کھڑا ہؤا اور مضطربانہ اپنی نسبت جیدہ کے خیالات دریافت کرنے لگا۔ جب اُس نے جیدہ کا جواب سنا تو اُس کا اضطراب حد سے گزر گیا۔ اور جیدہ کا انکار اُس کے سمندِ شوق پر ایک اور تازیانہ ہوگیا۔ اُس نے کہا "اے میری ماں، میں کیا کروں مجھے اس دام سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا"۔ اُس نے جواب دیا "مگر یہ کہ تم اپنے تمام شہسواروں کو اکٹھا کرو اور اُن دوسرے قبائل کے بہادروں کو بھی جو تمہارے حلیف ہیں اور اُس وقت تک انتظار کرو جب تمہارا چچا اپنی مہم سے واپس آجائے، اور پھر اپنے آدمیوں کو لے کر اُس کے پاس جاؤ اور ان سپاہیوں کے درمیان کھڑے ہو کر اُس سے اس کی بیٹی کا رشتہ طلب کرو۔ اگر وہ کہے کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے تو اُسے تمام قصہ سنا دو اور اپنا دامن پھیلائے رکھو یہاں تک کہ وہ تمہارے مطالبے کو قبول کرلے"۔ اس تجویز نے خالد کے غم کو کسی قدر کم کر دیا۔ جونہی اُسے معلوم ہؤا کہ اُس کا چچا گھر واپس آگیا ہے اُس نے اپنے رؤساءِ خاندان کو اکٹھا کیا اور اپنی کہانی انہیں کہہ سنائی۔ وہ سخت حیران ہوئے اور معدی کرب جو خالد کا بہادر ترین رفیق تھا یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ "یہ عجیب بات ہے کیونکہ ہم تو ہمیشہ سے یہی سنتے آئے تھے کہ تمہارے چچا کے ہاں ایک بیٹا ہے جس کا نام جندر ہے مگر حقیقت آج کھلی۔ اور یقیناً تم ہی ایک شخص ہو جو اپنے چچا کی لڑکی پر سب سے بڑھ کر حق رکھتے ہو۔ اس لئے ہمارے لئے بہترین طریقِ عمل یہ ہے کہ ہم سب اُس کے سامنے جا کر اپنے سر جھکا دیں اور اُس سے اپنے خاندان میں واپس آنے کی التجا کریں اور کہیں کہ وہ اپنی بیٹی کسی اجنبی کو نہ دے"۔ خالد کچھ اور سنے بغیر اُٹھ کھڑا ہؤا، اور اپنے ساتھ اُن ایک سو بہادر سواروں کو جو بچپن سے محارب اور ظہیر کے ساتھ پلے اور بڑھے تھے اور پہلے سے زیادہ قیمتی تحائف لے کر روانہ ہؤا اور اُس وقت تک دم نہ لیا جب تک وہ قبیلۂ سعد میں پہنچ نہ گیا۔ سب سے پہلے خالد نے اپنے چچا کو جنگ سے اُس کی کامیاب واپسی پر مبارکباد پیش کی۔ خالد کی اس دوبارہ آمد پر سب سے زیادہ حیرت ظہیر کو تھی، خصوصاً جب اُس نے اپنے بھتیجے کو تمام امرا و اعیان کے ساتھ دیکھا۔ اُسے سان گمان بھی نہ تھا کہ خالد کے دوبارہ آنے میں اُس کی بیٹی جیدہ کا بھی کچھ تعلق ہے۔ اُس نے خیال کیا کہ

اُسے صرف وطن واپس چلنے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ ظہیر نے ان کی بڑی عزت و توقیر کی اُن کے لئے خیمے مہیا کئے اور نہایت تواضع سے پیش آیا۔ اُس نے اونٹ اور بھیڑیں ذبح کرنے کا حکم دیا اور اُن کی ایک عظیم الشان دعوت کی اور تین دن کے لئے ہر قسم کی ضروریات کا انتظام اُن کے لئے کر دیا۔ چوتھے دن خالد نے کھڑے ہو کر اپنے چچا کا شکریہ ادا کیا اور اُس کے بعد جیدہ کے رشتے کے لئے درخواست کی اور اپنے ملک کو واپس چلنے کی التجا کی۔ ظہیر نے کہا کہ جندر کے علاوہ میری کوئی اولاد نہیں لیکن خالد نے جو کچھ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہہ دیا اور جو کچھ اُس کے ساتھ گزر چکا تھا بتا دیا۔ یہ باتیں سن کر ظہیر شرمندہ ہو گیا اور اُس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ کچھ دیر وہ خیالات میں غرق رہا اور یہ سوچ کر کہ کہیں حالات بد سے بدتر نہ ہو جائیں اُس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا "میرے بھائیو میں اس راز کو زیادہ چھپانا نہیں چاہتا۔ اس لئے میری بیٹی کی شادی اب خالد ہی سے ہو گی کیونکہ ہر اُس شخص سے جسے میں جانتا ہوں میں خالد ہی کو اُس کے لائق پاتا ہوں۔" اُس نے اپنا ہاتھ خالد کو پیش کیا جس نے فوراً اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خالد کے اکابر و اعیان اس معاہدے کے گواہ تھے۔ پانچ سو خوبصورت سیاہ چشم اونٹ اور یمن کی منتخب ترین پیداوار سے لدے ہوئے ایک ہزار اونٹ جہیز قرار پاتے۔ لیکن قبیلہ سعد پر جن کے پاس ظہیر کا قیام تھا اس معاملہ کا کوئی بار نہ تھا۔

جب اس بات کے متعلق ظہیر نے اپنی بیٹی کی منظوری کے لئے سوال کیا تو جیدہ کی طبیعت اپنے باپ کے اس طریق عمل پر درہم برہم ہو گئی۔ مگر جب اُس نے لڑکی کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ اب اُسے بن بیاہا نہیں رکھنا چاہتا تو اُس نے کہا "ابا! اگر خالد مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میں اُس وقت تک اس کے خیمے میں داخل نہ ہوں گی جب تک وہ میرے بیاہ پر اُن اونٹوں میں سے ایک ہزار اونٹ حلال نہ کرے جو اس وقت "تلوار کے دھنی" قاسم بن مالک کی ملکیت میں ہیں۔" خالد نے اِس شرط کو منظور کر لیا، لیکن اُس کے افسروں اور سپاہیوں نے اُس وقت تک ظہیر کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک اُس نے تمام مال و اسباب اپنے وطن کو منتقل ہونے کی خاطر جمع نہ کر لیا۔ جیسے ہی یہ تیاریاں ختم ہوئیں خالد ایک ہزار سواروں کو ہمراہ لے کر مہم پر روانہ ہو گیا اور اُن کی مدد سے اُس نے قبیلۂ عامر کو مغلوب کر لیا۔ "تلوار کے دھنی" کو اُس نے تین دفعہ زخمی کیا، بہت سے بہادروں کو موت کے گھاٹ اتارا، اُن کو لوٹا اور اُس سے بہت زیادہ مالِ غنیمت اُن کے ملک سے لے گیا جتنا جیدہ نے طلب کیا تھا۔ مال و دولت سے لدا ہوا اور فتح کے نشہ سے سرشار وہ واپس آیا۔ مگر جب اُس نے شادی کا دن مقرر کرنے کو کہا تو جیدہ نے اسے اپنے پاس بلا کر یہ الفاظ کہے، "اگر تم مجھے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو تو سب سے پہلے میری فرمائشوں کو پورا کرو اور جو عہد میں تم سے کرتی ہوں

اُس پر قائم رہو۔ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی کے دن کسی ذی رتبہ آدمی کی بیٹی، جو اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئی ہو میرے اونٹ کی مہار تھامے۔ وہ ملک کے کسی معززترین رئیس کی بیٹی ہو تاکہ اُس دن میں عرب کی معززترین بیٹی سمجھی جاؤں۔" خالد نے مان لیا اور اُس کی خواہشات کے حصول کے لئے تیار ہو گیا۔ اُسی روز وہ اپنے سواروں کو لے کر چل کھڑا ہوا اور سرزمین یمر کو تلاش کرتا ہوا بہت سے میدانوں اور وادیوں کو طے کر گیا یہاں تک کہ وہ ملکِ حجاز میں پہنچا۔ اس جگہ اُس نے معاویہ بن مصقل کے قبیلہ پر حملہ کیا۔ وہ طوفان کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑا، اور مدافعین کی صفوں کو چیرتے ہوئے عین اُس وقت اُس نے عمیمہ بنتِ معاویہ کو گرفتار کیا جب وہ راہِ فرار اختیار کرنے کو تیار تھی۔

اُس نے اپنی تیغ کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کے بہادر سپاہیوں کی سب مدافعت بے کار ہو گئی، اور وہ بھاگ کر منتشر ہو گئے۔ اس علاقے کے عربوں کی تمام دولت اُس نے چھین لی اور پھر گھر کی طرف رخ کیا۔ مگر وہ اُس وقت تک اپنے خیموں میں داخل نہ ہوا جب تک اُس نے وہ سارا مال و دولت اکٹھا نہ کر لیا جسے وہ صحرا کے مختلف مقامات پر چھوڑ آیا تھا۔

جوان لڑکیاں جھانجھیں اور کئی قسم کے دوسرے ساز بجاتی ہوئی اُس کے آگے آگے چلتی تھیں۔ سارا قبیلہ خوشیاں منا رہا تھا اور جب خالد ظاہر ہوا تو اُس نے بیواؤں اور یتیموں کو کپڑے تقسیم کئے اور رفیقوں اور دوستوں کو اُس دعوت پر مدعو کیا جسے وہ اپنی شادی کی تقریب میں تیار کر رہا تھا۔ شادی پر اس علاقے کے تمام عرب بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئے۔ شراب و کباب کی فراوانی سے اُس نے انہیں سرمست کر دیا لیکن جس وقت سب مہمان کھانے پینے میں مصروف تھے خالد اپنے ساتھ دس غلاموں کو لے کر شیروں شیرنیوں اور اُن کے بچوں کے شکار کے لئے جنگل کی طرف جانے کی تیاری کر رہا تھا تاکہ اس تقریب کے مہمانوں کے لئے ایک انوکھی ضیافت کا سامان مہیا کرے۔

لیکن جیدہ کو کسی طرح پہلے ہی سے اُس کے ارادہ کا علم ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو زرہ بکتر میں چھپا لیا اور گھوڑے پر چڑھ کر نیزہ خالد کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ ابھی جشن کے تین دن باقی تھے کہ ایک غار میں اُن دونوں کا سامنا ہوا۔ وہ ایک وحشی درندے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی اور ایک شدید حملے کے ساتھ چلا کر بولی "اے عرب! اپنے گھوڑے سے اُتر جا اور اپنی زرہ بکتر اتار ڈال اگر تو نے ذرا بھی لیت و لعل کی تو میرا یہ نیزہ ابھی تیرے سینے سے پار ہو گا" خالد نے اُس کے مطالبے کے جواب میں فوراً مدافعت کا ارادہ کر لیا۔ ذرا سی دیر میں ایک شدید جنگ کی صورت پیدا ہو گئی۔ یہ کشمکش ایک گھنٹے سے زیادہ تک جاری رہی۔ پھر خالد کو اپنے حریف

کی آنکھوں میں ایک ایسی بات نظر آئی کہ وہ ڈر گیا۔ وہ پھر اپنے گھوڑے پر چڑھ گیا اور لڑائی کی جگہ سے ہٹ کر اُس نے کہا "میں تجھ سے دینِ عرب کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، مجھے بتا کہ تو اس صحرا کا کون سا بطلِ جلیل ہے، کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ تیرا حملہ اور تیرے وار مجھ سے روکے نہیں جاتے۔ تو نے میرے ارادوں کو اور میری دلی خواہشوں کو خاک میں ملا دیا ہے"۔ یہ الفاظ سن کر جبیدہ نے اپنا خود اوپر اُٹھایا تاکہ وہ اس کا چہرہ دیکھ لے۔ اُس نے کہا "خالد کیا اُس لڑکی کے لئے جس سے تجھے محبت ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ وحشی درندوں کا شکار کرے تاکہ عرب کی بیٹیاں سیکھیں کہ اس کے واحد اجارہ دار جنگوں میں لڑنے والے مرد ہی نہیں ہیں؟" اِس چبھتی ہوئی ملامت پر خالد شرم میں غرق ہو گیا۔ اُس نے جواب دیا "خدا کی قسم، جبیدہ تیرے سوا اور کوئی مجھے مغلوب نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا اس ملک میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے تجھے دعوتِ مقابلہ دی ہو یا بس مجھ ہی پر تجھے اپنے زور وقوت کو ثابت کرنا تھا؟" جبیدہ نے کہا "خدا کی قسم، میں اس صحرا میں اس لئے آئی ہوں کہ وحشی درندوں کے شکار میں تیری مدد کروں، تاکہ تیرے سپاہی تجھے بیوی کے انتخاب پر طعنہ زنی نہ کر سکیں۔ یہ الفاظ سن کر خالد جبیدہ کی جرات اور عزم پر حیرت اور تعجب سے مبہوت رہ گیا۔

پھر دونوں اپنے گھوڑوں پر سے اتر پڑے اور ایک غار میں داخل ہو گئے۔ خالد نے دو خونخوار جانوروں کو اسیر کیا اور جبیدہ نے ایک شیر اور دو شیرنیوں کو مارا۔ یہ مہم انجام دے کر انہوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی، اور جبیدہ خالد کی ہمراہی پر خوش تھی۔ اُس نے کہا "اور میں تمہیں اُس وقت تک اپنے خیموں سے جانے کی اجازت نہیں دوں گی جب تک کہ ہماری شادی نہ ہو جائے"۔ پھر یکایک وہ اسے چھوڑ کر تیزی سے اپنی جائے سکونت کی طرف چل دی۔

خالد اپنے غلاموں کی طرف بڑھا جنہیں وہ کچھ فاصلے پر چھوڑ آیا تھا، اور اُس نے انہیں درندوں کو اٹھا کر خیموں کی طرف لے جانے کا حکم دیا۔ خوف سے کانپتے ہوئے کہ خالد نے کیا کیا ہے انہوں نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ خالد تمام بہادروں سے بڑا بہادر ہے۔

دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا اور جو لوگ آتے تھے اُن کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ دوشیزہ کنیزیں جھانجھیں بجاتی تھیں، غلام اپنی تلواریں ہوا میں ہلاتے تھے اور نوجوان لڑکیاں صبح سے شام تک گاتی رہتی تھیں۔ اس نشاط و سرود کے درمیان خالد اور جبیدہ کی شادی ہوئی۔ عمیمہ بنتِ معاویہ دلہن کے اونٹ کی مہار تھامے ہوئے تھی اور عورتیں اور مرد جبیدہ کے نام کو بلند کر رہے تھے۔

منصور احمد

جستجوئے حق

جنہیں علمِ حقیقت ہے عمل سے ہے مُدعا اُن کا
جو دل رکھتے ہیں سینے میں خدا ہے منتہا اُن کا

ضمیر ایمان سے ہے جن کا جنہیں حاصل ہی یکسوئی
اُنہیں کعبے سے کیا؟ دل اُن کا ہے قبلہ نما اُن کا

کسی کو کیا ضرورت ہے کسی کی رہنمائی کی؛
خود اپنے رہنما ہیں جو خُدا ہے رہنما اُن کا

جنہیں دشت جہاں میں زندگی راہِ ترقی ہے
اُنہیں منزل سے کیا مطلب؛ سفر ہے مُدعا اُن کا

خوشی ہو غم ہو کچھ ہو زندگی یہ ہے کہ خوش رہئے
جو خوش رہتے ہیں خوش اُن سے ہمیشہ ہی خدا اُن کا

جنہیں ہے آرزو حق کی جنہیں ہے جستجو حق کی
خدا ہے مبتدا اُن کا خدا ہے منتہا اُن کا

یہی رازِ حقیقت ہے خودی بھی بے خودی بھی ہو
جو بیخود ہیں خودی میں وہ خدا کے ہیں خدا اُن کا

ل۔ب

رات کی خاموشی میں

رات کی خاموشی میں تنگ وتاریک جھونپڑی کی گلا گھونٹنے والی ہوا کے اندر فرش خاکی پر لیٹے ہوئے کئی مرتبہ میں نے چاہا کہ اب ایسی نیند سو جاؤں کہ پھر نہ اٹھوں۔ گناہ کا بار سینے پر لئے ہوئے اس طرح غائب ہو جاؤں کہ دنیا اور دنیا والوں کے لئے کوئی نشانِ عبرت بھی باقی نہ رہے۔ مگر ہر صبح جب صبح قیامت کے استقبال کو اٹھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی روزمرہ کا سورج اپنی آتشیں شعاعوں کے ساتھ پھر ایک مرتبہ مجھے دنیا کی راز جُو نگاہوں کے سامنے عریاں ہدفِ استہزا بنانے کے لئے چمک رہا ہے اندھیری راتوں کو جب جھکڑوں کی خوفناک تندی اور آندھی کا زور بدن میں سنسناہٹ پیدا کر دیتا ہے، بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ جب بارش اور اولوں کے طوفانی شور میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خبیث روحیں تحت الثریٰ سے نکل کر کائنات کو اپنی لرزہ انگیز چیخوں سے تہ و بالا کر ڈالیں گی میں اپنے پر نگاہ ڈالتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ انسان کا دل ان طوفان زدہ عناصر سے کس قدر مشابہت رکھتا ہے۔ "انسان کا دل" میں نے غلط استعمال کیا۔

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا

وہ جنہیں زندگی کی تلخ کامیوں سے واسطہ ہی نہیں پڑا جنہوں نے آنکھ کھولتے ہی گلشنِ حیات میں شگوفے نکلتے، کلیاں چٹکتی اور نوا سنجانِ چمن کو نغمہ پیرائی میں مصروف دیکھا۔ جن کے کان سازِ زندگی سے صرف نغمہ ہائے عشرت ہی سننے کے عادی رہے۔ جن کی سماعت نوحۂ غم کی دلدوز صداؤں سے ہمیشہ محفوظ رہی آہ وہ بھی انسان ہیں۔ اگر یہی "انسان" ہیں تو کیا اس لفظ کا اطلاق اُن سوختہ سامانوں پر بھی ہو سکے گا جن پر آسمان کے ترکش کا آخری تیر ختم ہو چکا ہے۔ جنہوں نے آنکھ کھولی تو زندگی کے باغ میں پت جھڑ شروع ہو چکی تھی اور جوں جوں دن گزرتے گئے بادِ خزاں کے تند جھونکوں سے پتے گرتے اور پھول مرجھاتے چلے گئے جن کی امید کی کلی کھلنے سے پیشتر ہی مصائب کی گرم لو نے جلا کر خاک کر دی۔ جن کی کشتئ حیات سفر کی شروع منزل میں حوادث کی سخت چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ وہ خوش نصیب جن کی آنکھیں اشکِ خوناب اور دل بارِ الم سے آزاد ہیں کیونکر سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کا دل بھی ان طوفان زدہ عناصر کی طرح بجائے خود ایک پُر خروش طوفان ہے

وہ بیدار بخت ہستیاں جن کے لئے "ہزار بستر خار بستر" اور "سر رنجِ بالیں" نہیں ثابت ہوتا کیا جانیں کہ ایک طوفان زدہ دل کو پہلو میں لے کر سونا گویا کانٹوں پہ لیٹنا اور دہکتے کوئلوں پہ جلنا ہے۔

اکثر راتیں اسی طرح آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں۔ صبح کے انتظار میں نہیں کیونکہ فکرِ فردا اور غمِ ماضی تو میری جان کے قاتل ہیں۔ آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں اور اندر ہی اندر مرجاتی ہیں خیالات آتے ہیں اور کسی کے کان یا زبانِ قلم تک پہنچنے سے قبل ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ رات کے اختتام پر سپیدۂ سحر نمودار ہو کر حیاتِ تازہ کا پیغام دیتا ہے۔ ہر شب آسمان پر تیرہ و تار بادل چھائے رہتے ہیں اور کائنات ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ملفوف رہتی ہے لیکن اس وقت بھی گاہے گاہے بجلی چمک کر زمان و مکان کو، ایک لمحہ کے لئے ہی سہی، پُر نور کر جاتی ہے۔ مگر آہ میرا مطلعِ حیات!!!!!!! سالہا سال گزر جانے پر ایک امیدِ گریزاں، ایک فریبِ نفس میں مبتلا ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہوں کہ شاید اس کے افقِ تاریک پر بھی کوئی روشنی جلوہ گر ہو۔ مگر جہاں میری اور تمنائیں لاحاصل ثابت ہوئیں یہ آرزو بھی گھٹتی نظر آرہی ہے۔

میرے آقا عین اُس وقت جب میں صبحِ مسرت کی شادکامیوں سے ہمکنار ہونے والا تھا تو نے مجھے شامِ غم کی حسرتوں سے دوچار کر دیا۔ جامِ عشرت میرے لبوں تک پہنچتے پہنچتے تلخابۂ حیات میں متبدل ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں ہر شخص کو آگ اور پانی کے طوفان میں سے گزرنا پڑتا ہے اور پھر زندگی کی تکمیل ہوتی ہے سب صحیح۔ لیکن ایسے تہی دستانِ قسمت بھی تو ہیں جو تکمیلِ حیات کے اس مرحلہ سے گزرتے ہوئے شعلوں کی نذر ہو گئے یا موجوں کا لقمہ بن گئے۔ جاڑا، گرمی، برسات، بہار، خزاں رنگ رلیاں منانے والوں کے لئے قدرت کے مختلف اللون مظاہر ہیں جن سے بہ لحاظِ موسم دلبستگی کے لوازمات بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ مگر غم کا ایک ہی موسم ہے غمگین دلوں کے لئے وقت بدلتا نہیں گردش کرتا ہے۔ کتنی برساتیں آئیں اور گزر گئیں مگر [illegible] نہ چھینٹیں۔ گرمی

جہاں روزِ محشر سے قبل ہی نفسا نفسی کا عالم طاری ہے ۔ اطمینان کا ایک سانس چاہتا ہوں ۔ قلب کو وہ کیفِ سرمدی عطا کر جو رنج و راحت، دکھ اور سکھ کو یکساں برداشت کرلے اور شکوہ زبان پر نہ آئے ۔ تیری رضا سے اپنی رضا وابستہ کرلوں ۔

مجھے دوست دشمن، کسی سے گلہ نہیں ۔ ہر چند کہ اپنوں کی بیگانگی اور دوستوں کی بے مروتی نے کئی مرتبہ خون کے آنسو رلائے ۔ تُو جو لطف و احسان کا سرچشمہ اور انوار و تجلیات کا منبع ہے مجھ سیہ کار کے قلبِ حزیں کو، جو کثرتِ عصیاں سے اپنی درخشانی کھو چکا ہے، لمعاتِ قدسی کے ایک پرتو سے منور کردے ۔ تیری ذات میری حدِ نگاہ سے بھی بلند اور اتنی پاکیزہ ہے کہ یہ گنہگار اس کا تصوّر بھی کرنے کا اہل نہیں ۔ مگر اے نحن اقرب کہہ کر کشتِ امید کو سرسبز کرنے اور مایوس دلوں کو ڈھارس دینے والے، مَیں دیوانہ وار تیری طرف دوڑتا ہوں ۔ ناچیز کو دامنِ شفقت میں چھپالے ۔ پانی کا بے مقدار قطرہ سمندر میں مل کر بحرِ بے پایاں کا لقب اختیار کرلیتا ہے ۔ ریت کا حقیر ذرہ ریگ زار میں سماتا ہے تو صحرا بن جاتا ہے ۔ میں بھی ہر چند کہ کون و مکان کی بے پناہ پہنائیوں اور عالمگیر وسعتوں میں گم کردہ راہ مسافر کی طرح بھٹک رہا ہوں، تیری جانب دوڑوں گا ۔ اگر سمندر کی لہریں چاند تک پہنچ سکیں گی اگر دیدۂ نرگس کی بے نوری دیدارِ حبیب سے روشن ہو سکے گی اور اگر بلبلِ سینہ چاک کو بہارِ جاوداں کی دائمی مواصلت کبھی نصیب ہو سکے گی تو شاید میں بھی، آہ میں بھی ایک دن اپنی ذات کو جو میری روح کے لئے بوجھل اور روح کو جو میری ذات کے لئے بارِ گراں ہے تجھ میں فنا کر کے مقصدِ حیات پاسکوں ۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

عاشق بٹالوی

ضبطِ نفس

اکثر لوگ "ضبطِ نفس"، "شکستِ آرزو" اور "فنائے خودی" کی مصطلحات کے متعلق نہایت مبہم اور غلط خیالات رکھتے ہیں بعض لوگ اور بالخصوص ایسے لوگ جن کی طبائع کا میلان قیاسیات کی طرف ہوتا ہے ضبطِ نفس کے مسئلہ کو کوئی مسئلہ مابعد الطبیعیات سمجھتے ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو زندگی اور اُس کی تمام قوتوں کو معدوم کر کے جمود پیدا کر دینے کی سعی کو ضبطِ نفس کا مرادف سمجھتے ہیں۔ یہ غلط اور پریشان خیالات جو اکثر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں انہی کی ذاتی کوششوں سے دور ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی کو سچائی کی تلاش ہو تو اُس کی تمام لاطائل قیاس آرائیاں اس مسئلہ کو اپنی حقیقی شکل و صورت میں پیش کر کے نہایت آسانی سے رفع کی جا سکتی ہیں۔

اپنے نفس پر قابو پانے اور اسے مغلوب کر لینے کا مسئلہ نہایت سادہ ہے۔ اس قدر سادہ اور قابلِ عمل کہ ایک پنج سالہ بچہ جس کے دماغ پر قیاسیات مذہبیات اور فلسفیانہ خیال آرائیوں کے گرد و غبار کا پردہ ابھی نہیں پڑا اُن سن رسیدہ لوگوں سے جن کی لوحِ دل سے پیچیدہ مسائل کے غبار نے تمام سادہ اور خوبصورت سچائیوں کو محو کر دیا ہے زیادہ آسانی سے اس کی کنہ کو پہنچ جاتا ہے۔

خودی کو فنا کر دینے کے یہ معنی ہیں کہ روح سے اُن تمام عناصر کو خارج کر دیا جائے جو تشتت، جنگ، مصائب، امراض اور آلام کے پیش خیمہ ہیں۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ کسی امن پرور صفتِ حمیدہ کو تباہ کیا جائے، مثلاً جب ایک آدمی کو غیظ و غضب یا غصہ آنے لگے اور وہ کوشش خاص سے اس کو ضبط کرے اور صبر و محبت سے کام لے تو اُس کے اِس عمل کو ضبطِ نفس یا شکستِ خودی سے تعبیر کریں گے۔ ہر شریف آدمی خواہ وہ اس حقیقت سے انکار ہی کیوں نہ کرے اس پر جزواً عمل کرتا ہے۔ اور جو شخص اس عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے اور ہر ایک خود غرضانہ خیال کو مٹا دیتا ہے حتیٰ کہ اس میں صرف الٰہیانہ صفات باقی رہ جاتی ہیں وہ اپنی خودی کو مٹا دیتا ہے اور صداقت کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔

خودی جو مٹا دینے کے قابل ہے اِن دس بے قیمت اور رنج زا عناصر سے مرکب ہے، شہوت، نفرت، لالچ، حظِ نفس، خود غرضی، تکبر، غرور، شک، بداعتقادی اور فریب۔ ضبطِ نفس سے مراد یہ ہے کہ ان دس ذلیل عناصر کو بالکل معدوم کر دیا جائے۔ اس سے انسان میں تربیتِ ذات، عمل اور پاکیزگی، صبر و تحمل، تواضع، ایثار،

خود اعتمادی، بے خوفی، علم عقل، حلم اور محبت جیسی صفات حمیدہ کے تحفظ کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ صداقت الٰہی دس صفات سے مرکب ہے۔ اور جو شخص ان صفات کے دائرہ میں زندگی بسر کرتا ہے وہ صداقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہ خود صداقت کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ اول الذکر دس عناصر کے اجتماع کا نام خودی یا نفس ہے، اس کے برعکس آخر الذکر دس صفات کے مجموعہ کو صداقت کہتے ہیں جو انسان کو بے نفس، دائمی حقیقی اور زندۂ جاوید بنا دیتی ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ ضبط نفس کا یہ مفہوم نہیں کہ کسی شریفانہ سچی اور متحملانہ صفت کو تباہ کیا جائے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ غیر شریفانہ جھوٹی اور رذیل خصلت کو معدوم کر دیا جائے۔ یہ بھی غلط ہے کہ انسان ضبط نفس سے مسرت، بہجت اور خوشی کھو بیٹھتا ہے، نہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ صفات حمیدہ کے دائرہ میں رہ کر ان چیزوں کو ہمیشہ کے لئے پا لیتا ہے۔ ضبط نفس خوشی کی حرص کو ترک کرنے کا نام ہے نہ کہ خوشی ہی کو۔ یہ مسرت کی ہوس کو تباہ کرتا ہے نہ کہ مسرت کے وجود کو۔ یہ محبت طاقت اور اقتدار کی خود غرضانہ تمناؤں کا خاتمہ کرتا ہے نہ کہ محبت طاقت اور اقتدار ہی کا۔ ضبط نفس اُن تمام چیزوں کو قائم رکھتا ہے جو بنی آدم کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہیں اور انہیں رشتۂ اتحاد و مودت میں منسلک کر دیتی ہیں۔ ضبط نفس جمود و موت کی پرستش سے ہٹا کر بلند ترین، شریف ترین، موثر ترین اور پائدار عمل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ شخص جس کے افعال مذکورہ دس رذائل پر مبنی ہوں اپنی قوتوں کو اپنی تخریب پر ضائع کرتا ہے اور اپنی روح کو محفوظ نہیں رکھتا، لیکن وہ شخص جس کے افعال کی محرک ثانی الذکر دس صفات ہوں نہایت دانائی سے صحیح راستہ پر گامزن ہے اور اپنی روح کو برقرار رکھتا ہے۔

ایسا شخص جو مذکورہ بالا دس رذائل کی تنگ دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے تسلیم و رضا کے اصول میں کوئی کشش نہیں پاتا اور تمام روحانی حقائق کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہے اور حق کی آوازوں پر پنبہ بگوش ہے کیونکہ اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تسلیم و رضا کے معنی یہ ہیں کہ ذات کو بالکل مٹا دیا جائے۔ اس کے برعکس وہ شخص جو ان دس آسمانی صفات کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنا لیتا ہے اس اصول کے حسن و شوکت کو بخوبی دیکھ سکے گا، اور اسے حیات جاوداں کا سرچشمہ قرار دے گا۔ وہ یہ بھی دیکھے گا کہ جب بنی نوع انسان نے اس اصول کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا تو صنعت و حرفت، تجارت و حکومت غرضکہ زندگی کا ہر شعبہ برائیوں سے پاک و صاف ہو جائے گا اور عمل، مقصد اور ادراک تباہ ہونے کی بجائے خوب بڑھیں پھولیں گے اور زندگی کی کلفت انگیز کشاکش دور ہو جائے گی۔

شفیع واکبر

معارفِ محبّت

کھو گیا ہوں یہ اِن نظاروں میں ڈھونڈتا ہوں تجھے بہاروں میں

کچھ نہ سمجھا کہ صبح کو غنچے ہنس کے کیا کہہ گئے اشاروں میں

دیکھنا ہے کہ فرش کیوں ہیں گل چھپ کے بیٹھوں کا لالہ زاروں میں

اوس برسا رہی ہے کیوں موتی کون پھرتا ہے سبزہ زاروں میں

بزم کی بزم بے قرار ہے کیوں کون بیٹھا ہے بے قراروں میں

کھینچے لیتا ہے دل کو اور کوئی یا کشش خود ہے اِن ستاروں میں

تیرا ہی گیت گاتی ہے ہر شے کیا ترنّم ہے آبشاروں میں

جب نظر اور اُوپر اُٹھتی ہے دل نہیں لگتا چاند تاروں میں

آنسوؤں میں سفینۂ دل ہے بہا جاتا ہوں جوئباروں میں

تیری ممنون ہر خلش دل کی لطف گلزار کا ہے خاروں میں

تھے اکیلے نہ صبح کے تارے تُو بھی تھا صبح کے ستاروں میں

صُبح ہوتے ہی کلیاں کھلنے لگیں نہ رہا راز، راز داروں میں

پایا ہر بزم میں تجھے یکتا تُو مگر ایک ہے ہزاروں میں

بندۂ غیر تو نہیں گویاؔ!
ہوں اگرچہ گنہگاروں میں

گویا جہان آبادی

ایک بالا ترہستی کے مصائبِ زندگی

یا

سنجیدہ خانم کا روزنامچہ

اے دوست! کیا تو کبھی آئینے میں اپنا منہ دیکھتا ہے؟ میں تو دیکھتی ہوں! اکثر میں گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی رہتی ہوں اور غور سے اپنے چہرے کو اس میں دیکھتی ہوں۔ اور حیرت کرتی ہوں! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں اُس کو الٹ دیتی ہوں اور غور سے اس کی پشت کو دیکھنے لگتی ہوں! میں وہ راز معلوم کرنا چاہتی ہوں جس پر بدنصیب آئینے کے وجود کا انحصار ہے! مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی سرخ سیندوری آنکھ سے میری طرف دیکھتا ہے۔ گویا وہ مجھ سے واقف ہے اور ہم کلام ہونا چاہتا ہے!

صبح سے شام تک میں ہزاروں سوال آئینہ سے کر لیتی ہوں۔ آہ! مگر کوئی جواب نہیں ملتا! ایک دھواں سا دل میں اٹھتا ہے اور وہیں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ میں کیوں پیدا ہوئی تھی؟ مجھ کو یہ بھی معلوم نہیں! ایسا اوقات جب لوگ میرے کمرے کے پاس سے گذرتے ہیں ـــــ میری نوکرانی نصیرن اور ملازم رحیم ـــــ اور مجھ کو آئینہ سے بات کرتا دیکھتے ہیں تو مجھ کو دیوانہ سمجھنے لگتے ہیں! کیا اس میں کوئی حقیقت ہے؟ ہرگز نہیں!

کبھی میں اپنے آپ کو کسی صوفے پر پھینک دیتی ہوں اور اپنے سر کو نرم تکیوں میں ڈال دیتی ہوں! باوجود اتنی کوشش کے مجھ کو اپنی ہستی کا راز معلوم کرنے میں ناکامی ہوتی ہے! میری عمر اس وقت اٹھارہ برس کی ہے لیکن کیا میں اٹھاسی کی بھی ہو جاؤں گی؟ آہ جس وقت یہ خیال آتا ہے میرے دل میں ایک الجھن اور بے چینی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ قدرت کے سربستہ بھیدوں کو معلوم کرنے کے لئے دل کی آنکھ زیادہ متجسس ہو جاتی ہے! آہ کیا میں چھیاسٹھ برس کی بھی ہو سکوں گی.....؟ اکثر میں نے آئینہ سے پوچھا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ کبھی میں سوتے سوتے چونک پڑتی ہوں اور بے اختیار پوچھنے لگتی ہوں کہ میں ننانوے برس کی کب ہونگی؟ معبود جانے.....!

+ + + + + + + دوسرا دن

آج میں ایک خوشنما پھول کے پاس سے گزری تھی۔ وہ ساحلِ دریا پر ایک لہراتے ہوئے شاداب

کھیت کے خاموش کنارے پر رقص کر رہا تھا۔ شاید تھک کر اپنی نازک شاخ پر سو گیا تھا۔ کیا میں اس کا نام نہیں جانتی؟ کیا میں گوبھی کے پھول کو کبھی بھول سکتی ہوں؟ نہیں یہ پیارا نام میرے دل میں نقش فی الحجر کی طرح محفوظ ہو گیا ہے۔ میں اس کے اوپر جھکی اور پوچھا "ننھے خوبصورت پھول کیا میرا دل کبھی محبت کے جذبہ کا باربردار ہوگا؟" وہ میرا پُرحسرت استفسار سن کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس لئے ساکت رہا!

واپسی پر مجھے ایک پیاز ملی۔ وہ شاہراہ کے کنارے کس مپرسی کے عالم میں پڑی تھی کسی بے درد نے اُس کی نازک پتیوں کو کچل ڈالا تھا! آہ، پیاز کو کیسا صدمہ پہنچا ہوگا! میں نے اُس سے کہا بدقسمت پیاز! تیرے حسرتناک انجام اور میری پُرالم زندگی کے مصائب میں کچھ مطابقت سی معلوم ہوتی ہے! میری تمام ہمدردی تیرے ساتھ ہے!" میری آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری تھے اور آہستہ سے اٹھا کر میں نے مرحوم پیاز کو اپنے رومال میں لپیٹ لیا۔ اور سوتے وقت اپنے سرہانے رکھ لیا!

پرسوں + + + + + + +

میں محبت کرنا چاہتی ہوں مگر کسی سے محبت نہیں کر سکتی۔ میں نے کئی بار کوشش کی! مگر میں اپنے ماں باپ۔ بھائی بہن کسی سے محبت نہ کر سکی۔ میرے ابا جان نے میری منگنی معموم نواز خاں سے کر دی تھی۔ جو فوج میں رسالدار میجر ہے، مگر میں اس سے محبت نہ کر سکی نہ کر سکتی ہوں۔ آہ! مجھے ان لوگوں نے کیسا مجبور کر دیا ہے! کتنا ستا رکھا ہے! مجھے سانس لینے کی اجازت نہیں ہے اور میں لے بھی نہیں سکتی! بارہا میں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر ان لوگوں نے میری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ گزشتہ شب میں نے پھر کوشش کی میں نے اپنے پلنگ کے بالکل قریب میز پر "سہ آتشہ مار اللحم" کی ایک بھری ہوئی بوتل رکھ لی۔ مگر وہ کمبخت بھی میرا کام تمام نہ کر سکی! صبح کو جب میں اٹھی تو وہ اسی طرح پڑی تھی اور میں زندہ سلامت موجود تھی!

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

گذشتہ پرسوں! + + + + + + +

مجھ کو ڈوبنے کی اجازت بھی تو نہیں! کیوں؟ یہ میں نہیں کہہ سکتی! بے سود میں صبا سے پوچھتی ہوں اور درختوں سے کہ کیا مجھ کو غرقاب ہو جانے کی اجازت ہے؟ آہ! وہ ظالم بھی خاموش رہتے ہیں!

تاہم میری انتہائی آرزو آزاد رہنے کی ہے۔ ننھی چڑیوں کی طرح آزاد! ان میں سے سب سے ننھی

کے برابر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔! میں خزاں کی پتیوں کو بادِ پریشاں کے جھونکوں پر دیوانہ وار ناچتا دیکھتی ہوں! کاش میں ایک پتّا ہی ہوتی!

یہی نہیں۔ میری خوشیوں کو پامال کرنے کے اور بہت طریقے اُن کو آتے ہیں!

آہ! مجھ کو مجبور کرتے ہیں کہ کھاؤ! چنانچہ کل انہوں نے مجھ کو ایک اناس کھلا دیا جس نے میری تمام آرزوؤں کا ناس کردیا!! میں اس کا مزہ اور خوشبو تمام عمر نہیں بھول سکتی!

\+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ نیا دن!

میرا دل دھڑکتا ہے! آج ایک آدمی میرے پاس سے گزرا! وہ سچ مچ پاس سے گزر گیا!

میں نے اپنی کھڑکی سے اُس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ کھیت کے کنارے کنارے جا رہا تھا جہاں میرے خوبصورت گوبھی کے پھول کے پودے لگے ہیں! چلتا ہوا وہ کیسا اچھا معلوم ہوتا تھا! پست قد اور فربہ جسم ہونے کے باعث اس میں میرے پھول کی بہت مشابہت نظر آتی تھی! خوبصورتی میں وہ خوشنما گوبھی کا عکس معلوم ہوتا تھا! اُس کے ہاتھ میں ایک اسٹول تھا اور اُس کی کمر پر ایک میز لٹکی تھی۔ وہ سگار کا دھواں اڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ جیسے ایک دخانی انجن سے دھواں اٹھتا ہو! اُس کے اندازِ رفتار میں کیسی دلکشی تھی! کیا میں اس سے محبت کرتی ہوں؟ نہیں کہہ سکتی! ابھی نہیں! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! محبت ایک نازک پودے کی مانند ہوتی ہے! کوئی اس کو بڑھا نہیں سکتا! آہ اُس کے گندمی رنگ کے چہرہ پر دوڑتی ہوئی مسکراہٹ ایسی ہی بھلی معلوم ہوتی تھی جیسے دھان کے کھیت پر بھاگتی ہوئی شہاب ثاقب کی روشنی! میں نے گلدان سے نکال کر ایک گوبھی کا پھول اُس پر پھینکا۔ آہ مگر وہ اس پر نہ گرا! تب میں نے پیاز کی پتیاں (جن میں مرجھانے کے بعد بھی خوشبو باقی تھی) اُس پر پھینکیں۔ مگر اُن کو ہوا کے ظالم جھونکے اڑا کر لے گئے!

\+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ نئی کل!

میری زندگی کے خشک باغ میں آخر بہار آئی! اُجڑے چمن کو محبت کی شگفتگی نے شاد و آباد کردیا! آج میں نے اُس کو پھر دیکھا! ۔ ۔ ۔ ۔ ! اس سے بات کی ۔ ۔ ۔ ! وہ لہریں مارتے ہوئے دریا کے کنارے اپنے اسٹول پر عالمِ محویت میں بیٹھا تھا۔ اسٹول پر بیٹھا وہ اتنا ہی اچھا معلوم ہو رہا تھا جتنا اپنی نازک شاخ پر سوتا ہوا میرا پسندیدہ پھول اس کے سامنے میز پر تصویر بنانے کا فریم تھا۔ جس میں وہ پہاڑ کے قدموں پر پڑے ہوئے شاہ بلوط کے خشک سایہ دار درختوں کے نیچے چرتے ہوئے بار برداری کے ایک ایسے کوہستانی چرندے

کی تصویر بنا رہا تھا جس کے سر سے بے ثباتیٔ دنیا اور گردشِ افلاک کے باعث سینگ اُڑ گئے ہوں۔ اُس کے ایک ہاتھ میں مصوّری کا پاپوش برش تھا۔ سامنے کئی قسم کے رنگوں کی کوبرا پالش کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ڈبیاں رکھی تھیں! میں نے اُس سے بات کی! اب تو مجھ کو اُس کا نام بھی معلوم ہوگیا تھا! اُس کا نام...... ! میرا دل دھڑکتا ہے...... ! میں لکھنا چاہتی ہوں مگر نہیں لکھ سکتی...... ! پھر کسی وقت...... !

اُس کا نام مرزا گاؤزبان بیگ تیموری لنگوی ہے...... ! وہ کالے اور بادامی رنگوں سے کیسی اچھی تصویر بنا رہا تھا...... ! میں دیر تک کھڑی دیکھتی رہی! اپنے تئیں سنبھالتے ہوئے میں نے اپنے دل میں اس سے یوں کہا "اس تصویر کے بنانے کا کیا راز ہے؟ کیا یہ کشمکشِ وجود کی تصویر ہے جس کو مرقعِ قدرت کی زیبائش کے لئے تصور کی مدد سے بنا رہے ہو؟ موجوداتِ عالم کے رازوں کو جاننے والے مصور! مصورانِ فطرت وغم کے قابل استاد کیا یہ تصویر بہشتِ بریں کے کسی نادر و نفیس جانور کی ہے؟" اُس نے پُرمعنی طور پر جواب دیا "نہیں!" میں نے غور سے دیکھا واقعی اُس کا کہنا سچ تھا! میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف پُراسرار نظر سے دیکھتے ہوئے کہا "یہ ہمارا راز رہے گا!"

پرانی کل + + + + + + +

ہر صبح میں دریا کے کنارے مرزا گاؤزبان بیگ تیموری لنگوی (کیسا پیارا نام ہے) کے پاس جاتی ہوں! وہ خاموش تصویر بناتا رہتا ہے۔ میں پاس بیٹھی رہتی ہوں اور اس طرح ہم دونوں باتیں کرتے ہیں! میں جو کچھ سوچتی ہوں۔ جو کچھ پڑھتی ہوں۔ جو کچھ جانتی ہوں! جو کچھ محسوس کرتی ہوں یا جو کچھ کھاتی ہوں یا جو کچھ پہنتی ہوں سب حال اُس کو سناتی ہوں۔ وہ بے پروائی کے ساتھ خاموش بیٹھا تصویر بناتا رہتا ہے گویا ہمہ تن گوش ہے اور میری باتیں سن کر کسی گہرے خیال میں مستغرق ہوگیا ہے!

بعض مرتبہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ میری کوئی بات سُن ہی نہیں رہا ہے...... ! ہم روز اسی طرح باتیں کرتے ہیں!

اس طرح تبادلۂ خیالات اور علمی مباحثوں سے مجھ کو اندازہ ہوا ہے کہ اُس کے سامنے میں ایک طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتی ہوں۔ کل میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ "مولانا رومؔ کی رباعیات میں کوئی خوبی ہے؟" اُس نے جواب دیا "نہیں"! علمی تحقیق، علمی گفتگو اور نئی معلومات سے بھی کیسا فائدہ ہوتا ہے!

دو دن پہلے! + + + + + + +

آج گاؤزبان نے مجھ سے نشانی مانگی تھی! میں نے اُس کو خوشی سے اپنے جوتے کا تسمہ نکال کر دے دیا!

تھا۔ مگر اُس نے کہا "نہیں!" اور صندوقچے میرا ہیروں کا بروچ لے گیا! میں اُس کے اس مصلحت آمیز برتاؤ کا پوشیدہ سبب سمجھ گئی۔ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ اُس کی نظروں میں میری اتنی ہی وقعت ہے جتنی ایک معمولی کم خیال ہستی کی نظروں میں ایک ہیرے کی ....!

+ + + + + + + اس سے دو دن پیشتر!

آج صبح اُس نے دوسری نشانی مانگی! میں نے اپنے صندوقچے سے ایک اشرفی لاکر اُس کو دے دی اور کہا کہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کردو تاکہ ہم دونوں کے پاس اُس کی یادگار رہ سکے! لیکن گاؤزبان نے کہا "نہیں!" میں اُس کے خیالات کا مفہوم سمجھ گئی۔ وہ اشرفی کو اس لئے نہ توڑنا چاہتا تھا کہ ہماری محبت ہمیشہ سالم رہے اور کبھی نہ ٹوٹے! وہ بہت دور اندیش ہے! اب وہ اشرفی کو ہم دونوں کے بدلے اپنے ہی پاس رہنے دے گا!

+ + + + + + + کل سے پہلے!
آج سے بعد

آج اُس نے پوچھا تھا کہ میرے پاس کوئی دوسری اشرفی بھی ہے؟ اُس کی سادہ باتیں مجھے بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں!

+ + + + + + + نہ آج نہ کل!

آج میں نے دوسری اشرفی لاکر اُس کو دے دی! اُس کی خواب آلود آنکھیں محبت کی خوشی سے چمک اُٹھیں! اس کے عوض اُس نے مجھ کو تانبے کا ایک منصوری سکہ دیا ہے۔ گویا ہماری محبت سونے کی طرح پاک ہے اور تانبے کی طرح مضبوط! میں اس کے اعلیٰ جذبات اور وسیع خیالات کی داد دیتی ہوں!

+ + + + + + + گزشتہ پرسوں کے دو دن بعد!

مجھ پر خوف طاری ہے کہ میری شادی کا دن قریب آگیا اور مغموم نواز خاں آتا ہوگا! مجھے زیادہ ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں گاؤزبان اس کو مار نہ ڈالے! وہ اس قدر خاموش رہتا ہے کہ میں ڈرتی ہوں وہ مغموم کا نہ معلوم کیا حشر کرے! میں کانپتی ہوں!

+ + + + + + + آنے والی کل سے ایک دن پہلے!

میں نے گاؤزبان سے مغموم کے متعلق کہہ دیا ہے اور یہ بتادیا ہے کہ وہ سرحدی فوج میں افسر ہے، اور یہ کہ اُس سے میری منگنی ہوچکی ہے۔ پہلے تو گاؤزبان کو اس کا سننا ہی گوارا نہ تھا! اُس کے چہرے کی گھبراہٹ سے ظاہر ہورہا تھا کہ اُس کو خوف ہے کہ کہیں اُس کو بہت زیادہ غصہ نہ آجائے! چنانچہ اُس نے اپنا سامان سنبھالنا

شروع کر دیا۔ تب میں نے اُس کو سمجھایا کہ مغموم کے آنے میں ابھی عرصہ ہے! اُس کے چہرے پر سکون کے آثار نمایاں ہونے لگے! اس خیال سے مجھ کو خوشی ہوئی کہ اُس کا غصہ فرو ہوا!

+ + + + + + + بالکل نیا دن!

آہ! مغموم کے آنے میں صرف پندرہ دن رہ گئے! اب زندگی عبث ہے! رات میں نے اپنا خاتمہ کرنے کی کوشش پھر کی تھی۔ اب مجھ کو جینے کی کیا ضرورت ہے جب کہ وہ نایاب شے، محبت، جس کی مجھ کو عرصے سے تلاش تھی مجھ کو مل گئی ہے! میں نے اپنے پلنگ کے پاس بھرے ہوئے کارتوسوں کا ایک ڈبہ رکھ لیا تھا! صبح کو اٹھی تو میں زندہ تھی! وہ بھی میرا کام تمام نہ کر سکے! میں جانتی ہوں اس کا کیا مطلب ہے! اس کے معنی ہیں کہ اب میرا اور گاؤزبان کا خاتمہ ایک ساتھ ہی ہوگا!

+ + + + + + + گذشتہ دن سے ایک دن بعد!

آج میں نے گاؤزبان سے کہا ہے ہم دونوں کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دیں۔ اُس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر اُس نے رائے دی کہ پہلے مجھ کو اپنی زندگی کا خاتمہ کر دینا چاہیئے بعدازاں وہ میری قبر کا جاروب کش بن کے "بھوک ہڑتال" سے اپنے آپ کو فنا کر دے گا!! مگر مجھ کو پسند نہیں کہ وہ اتنی بڑی قربانی کرے! میں نے اُس کو صلاح دی ہے کہ تم دریا کے کنارے اپنے گلے میں پھانسی ڈال لو۔ میں ہر طرح مدد کے لئے تیار ہوں! وہ اس پر غور کرے گا۔ اگر اُس نے پھانسی نہ ڈالی تو گولی ضرور مارے گا!

+ + + + + + + بعدازاں!

افسوس گاؤزبان ابھی زندہ ہے۔ وہ کہنے لگا کہ "میں رسی خریدنا بھول گیا"! بیچارے نے کئی بار اپنے دل میں گولی ماری۔ مگر ہر بار نشانہ خطا گیا اور گولی سر میں لگی! اور اس کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا!

+ + + + + + + قبل ازاں!

گاؤزبان اور میں ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لئے ہمیشہ زندہ رہیں گے! اس بارے میں ہماری تمام خودکشی کی کوششیں رائگاں گئیں اب ہم مغموم کے آنے سے ایک دن پہلے کہیں باہر چلے جائیں گے! جب وہ آئے گا تو ہم کو نہ پائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ! میں اپنے پیارے گوبھی کے پھولوں اور باغ کی چڑیوں درختوں، پتوں اور مکھیوں کو خدا حافظ کہہ دوں گی!

+ + + + + + + قیامت خیز شام!

کس دل سے میں ان واقعات کی تفصیل بیان کروں جن کو میں قلمبند کر رہی ہوں! آہ میرے قلم کی نب کانپتی

ہے! جس بات کا سخت خطرہ تھا آخر وہی ہوئی! اب میں زندہ رہ کر کیا کروں! آہ! پروردگار! کیسا خوفناک بیان ہے! میں اور گاؤزبان کھڑے تھے۔ میں اُس کو اپنے زیورات کا صندوقچہ دے رہی تھی۔ اور ساتھ ہی اپنی محبت اور زندگی بھی۔ سامنے میں مغموم کو آتے دیکھا! وہ اپنے فوجی لباس میں کیسا شاندار معلوم ہو رہا تھا! بجلی کی طرح یہ خیال میرے دل میں کوندگیا کہ دنیا کیسی بے ثبات ہے اور ناپائیدار! اگر گاؤزبان نے مغموم کو قتل کر دیا تو ابھی ذرا دیر میں اُس کا خون آلود جسم فرشِ خاک پر ایک بے جان چیز کی مانند خاموش اور بے حس و حرکت پڑا ہوگا! میں چلّائی "گاؤزبان بھاگو۔ اگر تم ذرا دیر اور ٹھہرے تو ضرور تم اُس کو قتل کر ڈالو گے!"

گاؤزبان نے مغموم کو آتا ہوا دیکھا۔ اُس کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا! میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے وہ بھاگا! جب وہ بھاگ رہا تھا تو کیسا شجیع اور رفیع الخیال معلوم ہو رہا تھا! صد آفرین ہے تجھ کو اے بہادر دل والے انسان! تو نے ایک ہم جنس کی زندگی کو بچانے کے لئے غصہ کی مطلق پرواز کی اور اس طرح اپنے جذبات کی بڑی قربانی کر دکھائی۔ ...... ! مگر مغموم نے دوڑ کر اُس کو پکڑ لیا! گاؤزبان بہادری کے ساتھ لڑنے لگا۔ آہ! جب دو مرد آپس میں لڑتے ہیں تو کیسا ہیبت ناک نظارہ ہوتا ہے! مغموم نے ذرا دیر میں گاؤزبان کو اوپر اٹھا لیا اور کوٹ سے پکڑ کر اپنے گرد کئی دفعہ گھمایا۔ یہاں تک کہ کوٹ پھٹ گیا اور گاؤزبان ایک دھماکے کے ساتھ گھاس میں جا گرا! اُس کے گرنے کی آواز میں وہی نغمہ تھا جو کسی آبشار کے پتھروں پر گرنے سے پیدا ہوتا ہے!

پھر مغموم نے اپنے فوجی بوٹ سے اُس کی کمر کو اس طرح چھوا جیسے کوئی شریر لڑکا مظلوم فٹ بال کو تنگ کرتا ہے! پھر اُس نے تصویر کے تختہ کو اٹھا کر اُس کے سر پر پٹکا! تختہ چٹخ جانے کے باعث اُس کے گلے میں ہار کی طرح آویزاں ہوگیا! آہ! اس وقت گاؤزبان کیسا بہادر معلوم ہو رہا تھا! اُس کے گلے میں تختہ لٹکا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بہادر راجپوت سورما کے گلے میں ڈھال! تب مغموم نے اُٹھا کر اُس کو دریا میں پھینک دیا! میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ کنول کے پھول کی طرح پانی پر تیرنے لگا! وہ نظارہ میں کبھی نہ بھولوں گی ....!

چھ مہینے بعد
+ + + + + + +

میری شادی مغموم سے ہوگئی ہے اور اُس نے دہلی میں میرے لئے ایک عالیشان کوٹھی خرید لی ہے!

اب وہ کمانڈر ان چیف کا ایڈیکانگ مقرر ہو گیا ہے۔ ہاں جس وقت گاؤزبان کنول کے پھول کی طرح

سطح آب پر تیر رہا تھا اُس وقت مغموم ہوٹل جا کر اُس کے کمرے سے میرا تمام وہ سامان واپس لے آیا تھا جو سفر کے خیال سے میں نے وہاں بھجوایا تھا۔ اب بھی میں سوچتی ہوں تو مجھ کو خیال آتا ہے کہ گاؤ زبان گومتی میں بہتا ہوا جمنا میں جا ملا ہوگا! اور جمنا سے نکل کر گنگا میں پہنچا ہوگا! آخر بہتا بہتا طویل سفر کے بعد خلیج بنگال میں جا ملا ہوگا!

"کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا"

پاس سے گذرنے والے جہازوں کے مسافر اگر غور سے دیکھتے ہونگے تو اس میں اب بھی گوبھی کے پھول کی خوبصورتی کا تمام عکس موجود پاتے ہونگے!!

شاہد حسین بی، اے

ایک کشمیری گیت

ہائے میرا محبوب میری شاخِ حیات میں محبت کی آگ لگا کر چپکے سے چلا گیا۔

میری قسمت کا ستارہ اس وقت بلند ہوگا جب میرا محبوب میرے صحن میں آجائے گا۔

میرا محبوب چلا گیا۔ میں اُسے کہاں تلاش کروں۔ اے سکھی اس کو مجھ پر ذرا بھی رحم نہ آیا۔ جب میرے باغِ جوانی میں بسنت کے دن آئیں گے تو اس کی بہار کون لوٹے گا؟

ہائے وہ جوانی پھر نہ آئے گی جو تیر کی طرح نکلی جا رہی ہے۔

اس کا جینا کس کام کا جس کے ساتھ اس کا محبوب نہ ہو۔ وہ ہاتھ مل کر پچھتائے گا کہ ہائے تیر کی طرح میرا جوبن نکل چلا۔

جو مر گئے وہ اس دنیا کی تمام مصیبتوں سے چھوٹ گئے مٹی کے ساتھ مٹی مل جائیگی۔ ہائے جوبن تیر کی طرح نکل گیا۔

اس جوانی پر غرور نہ کرو یہ زمانہ سوچنے کا ہے۔ یہاں سے جانا ہے یہ سوچ کر تیار رہو۔ جوبن تیر کی طرح نکل گیا۔

(مندرجہ بالا گیت جس کا میں نے ترجمہ کیا ہے کشمیر میں بہت مشہور ہے۔ کشتیوں پر ملاح، کھیتوں اور کھلیانوں میں کسان اور بوجھ ڈھونے والے مزدور اس گیت کو خوب جھوم جھوم کر گاتے ہیں۔)

اعظم کریوی

تجلّیات

قدر آموزِ وفا خونِ شہیداں ہوگا　　ہم نہ ہونگے نہ سہی تُو تو پشیماں ہوگا

ہر نظر پردہ برانداز ہے چھپنے والے　　تو کہاں جا کے نظر والوں سے پنہاں ہوگا

چارہ فرمائی عبث، فکرِ سکوں بے حاصل　　درد ہی بڑھ کے ہمارے لئے درماں ہوگا

موت آئی نہیں اور یاد تری بھول چلی　　کون اب حالِ دلِ زار کا پُرساں ہوگا

پھر بہار آئی کھلے پھول چلی بادِ مراد　　مژدہ پھر تا بہ جگر چاک گریباں ہوگا

اے جنوں ہوش سے آزاد کیا خوب کیا　　اب غمِ جیب نہ اندیشۂ داماں ہوگا

یوں ہوا اک قطرۂ خوں شورشِ محشر بہ کنار　　دل جسے کہتے ہیں وہ آپ کا ارماں ہوگا

یوں تو دنیا میں ہزاروں ترے دیوانے ہیں

کہیں مجھ سا بھی کوئی بے سروساماں ہوگا

نورجہاں بیگم نازؔ

بچّے اور بُوڑھے

ہر شب سونے سے پہلے بچے آپس میں باتیں کیا کرتے۔ وہ سب ایک کمرے میں ایک تخت پر بیٹھ جاتے اور جو کچھ اُن کے ننھے دماغوں میں آتا بکا کرتے۔ اور دھندلی کھڑکی میں شام کی نیرگی خواب آلود آنکھوں سے انہیں جھانکتی رہتی۔

ہر کونے سے خاموش سائے اپنے ساتھ عجیب و غریب حکایات اور کہانیاں لئے ہوئے اوپر کی طرف اُٹھتے ہوئے نظر آتے۔

اُن کے دماغ میں جو کچھ آتا کہہ ڈالتے، لیکن اُن کے دماغ میں صرف بہار اور روشنی کی محبت اور امید افزا داستانیں ہی آتی تھیں۔ سارا مستقبل اُن کے لئے ایک مسرت ناک تعطیل کا روشن دن ہوتا تھا۔ الفاظ زبان سے نکلتے تھے ـــــ نہایت آہستہ ـــــ سرگوشیوں کے لباس میں مستور، اور صرف نصف سمجھ میں آتے تھے اُن کے قصوں کی نہ ابتدا ہوتی تھی نہ انتہا، اور نہ اُن میں تسلسل ہوتا تھا۔ بعض اوقات چاروں بچے ایک ساتھ بول اُٹھتے، لیکن ایک کی وجہ سے دوسرا گھبراتا نہ تھا۔

بچے ایک دوسرے سے اس قدر مشابہت رکھتے تھے کہ دھندلی سی چاندنی میں، سب سے چھوٹے چار سالہ تان شیک اور سب سے بڑے دہ سالہ لوئی کا کی شکلوں میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔

اس شام کو ایک ایسی خبر جسے وہ نہ سمجھ سکتے تھے ایک ایسے مقام سے جسے وہ نہ جانتے تھے اس فردوسی فضا میں پہنچی اور اُس نے کہانیوں اور لطیفوں کا خاتمہ کر دیا۔ ڈاک سے انہیں یہ خبر ملی تھی کہ اُن کا باپ سرزمینِ اطالیہ میں چل بسا۔

"لیکن وہ کب واپس آئیں گے؟" تان شیک نے تعجب سے پوچھا۔

لوئی کا نے اُسے کہنی مارتے ہوئے مغموم لہجہ میں جواب دیا۔ "وہ کس طرح واپس آسکتے ہیں جب کہ وہ خدا کے ہاں چلے گئے!"

یہ سُن کر سب خاموش ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بڑی سیاہ دیوار کے سامنے کھڑے تھے

اور اُس کے آگے کچھ نہ دیکھ سکتے تھے۔

"میں بھی جنگ پر جا رہا ہوں" میٹی چی نے بلاغور و خوض زور سے چلا کر کہا۔

"تم ابھی بہت چھوٹے ہو" تان شیک نصیحتاً بولا۔

سب سے زیادہ لاغر، نازک اندام اور نحیف ملکا نے، جو اپنی ماں کے بڑے دوشالے میں لپٹی ہوئی تھی اور ایک مسافر کی گٹھری معلوم ہوتی تھی، اپنے نرم اور دھیمے لہجہ میں کسی پوشیدہ مقام سے پوچھا "جنگ کیسی ہوتی ہے، مجھے بھی بتاؤ میٹی چی"۔

میٹی چی نے مطلب یوں سمجھایا "سنو جنگ اس طرح کی ہوتی ہے کہ لوگ ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے پر چاقوؤں سے حملے کرتے ہیں، تلواروں سے قتل کرتے ہیں اور بندوقوں سے مارتے ہیں۔ جتنا زیادہ کوئی مارے اور قتل کرے اتنا ہی اچھا سمجھا جاتا ہے —— یہی جنگ ہے"

"لیکن وہ لوگ کیوں قتل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی جان لیتے ہیں؟" ملکا نے پوچھا۔

"شہنشاہ کے لئے" میٹی چی نے کہا۔ اور سب چپ ہو گئے۔

پھر فوراً ہی میٹی چی نے اپنے خیالات یکجا کئے۔ تاکہ اُس خاموشی کو دور کرے جو اس وقت ان پر بار گذر رہی تھی۔

"میں بھی دشمن کے خلاف لڑائی پر جا رہا ہوں"

"دشمن کیسا ہوتا ہے؟ کیا اُس کے سینگ ہوتے ہیں؟" ملکا کی کمزور آواز نے فوراً سوال کیا۔

"درحقیقت اُس کے سینگ ہوتے ہیں۔ ورنہ پھر وہ دشمن کیسے ہو سکتا؟" تان شیک نے متانت اور کسی قدر غصہ سے جواب دیا۔ اور اب خود میٹی چی بھی صحیح جواب نہ جانتا تھا۔

"میں نہیں سمجھتا —— کہ اس کے سینگ ہوتے ہیں۔!" اُس نے رکتے رکتے آہستہ سے کہا۔

"اُس کے سینگ کیسے ہو سکتے ہیں؟ وہ ہماری طرح ایک انسان ہے،" لوئی کا نے کہا۔

"مگر صرف یہ بات ہے کہ اس میں روح نہیں ہوتی"

چند لمحوں کے بعد تان شیک نے پوچھا "لیکن جنگ میں آدمی خدا کے ہاں کیسے چلا جاتا ہے؟"

"لوگ اُسے جان سے مار ڈالتے ہیں،" میٹی چی نے جواب دیا،

"ابا جان نے میرے لئے ایک بندوق لانے کا وعدہ کیا تھا" تان شیک غمگین لہجہ میں بولا۔

"وہ بندوق کیسے لا سکتے ہیں، جب کہ خدا کے ہاں چلے گئے" لوئی کا نے کسی قدر سختی سے پوچھا
"اور لوگوں نے انہیں جان سے مار ڈالا؟" تان شیک نے سوال کیا۔
"ہاں جان سے!" لوئی کا نے جواب دیا۔
معصومیت اور بچپن سے آلودہ اور حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں میں سے سکوت اور غم تاریکی میں گھورنے لگا ـــــ کسی نامعلوم فضا میں ـــــ دماغ اور دل میں محسوس نہ ہونے والی فضا میں۔
اس وقت جھونپڑے سے باہر، ایک بنچ پر اُن کی دادی اور دادا بیٹھے تھے۔ آفتاب کی آخری سرخ اور سنہری شعاعیں گھنے درختوں میں سے گذر کر باغ میں آرہی تھیں۔ شام نہایت پُرسکون تھی، مگر ایک مسلسل رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ غالباً یہ بچوں کی جوان ماں کے گریہ و بکا کی آواز تھی۔ دونوں بوڑھی جانیں کمر خمیدہ ایک دوسرے سے ملی بیٹھی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ اس طرح پکڑے ہوئے تھے جیسے عرصۂ دراز کے بعد یہ موقع ملا ہو۔ وہ دونوں آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے، اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے محروم تھیں اور وہ کچھ نہ بول سکتے تھے۔

محشر عابدی

غزلیات

۱

بہارِ گلشنِ ہستی کا اعتبار نہیں — خزاں نہیں ہے اگر آجکل بہار نہیں

ملے ہیں سب کی نشانی ہیں داغِ ناکامی — وہ کونسی ہے تمنا جو یادگار نہیں

بتا گئی نگہِ واپسیں ہیں رازِ فراق — وہ آنکھ ہائے جو اب محوِ انتظار نہیں

عدم سے واں مجھے لائی ہوائے آزادی — جہاں کہ اپنی طبیعت پہ اختیار نہیں

ہوا نے دوش پہ رکھی ہے خاکِ کشتۂ ناز — شہیدِ عشق کا لاشہ زمیں پہ بار نہیں

وفا کا عہد وہ کرتے ہیں مجھ سے میں چپ ہوں
نگاہِ یاس نہ کہہ دے کہ اعتبار نہیں

علی حسنین زیبا ردولوی

جی سے جانا ہی ہوش میں آنا — مجھ سے کہتی ہے بیخودی میری

غش بھی آتا نہیں خبر لینے — کتنی بے کس ہے بے کسی میری

قصۂ غم دراز ہے میرا — اور کوتاہ زندگی میری

بن گئے وہ عدو کی روحِ رواں — موت ہے اب تو زندگی میری

کون ان کو منا کے لے آئے — مجھ سے روٹھی ہے زندگی میری

بھول کر آگئے ہو تربت پر — دیکھتے جاؤ بے کسی میری

دن کو نالے ہیں رات کو آہیں — یوں ہی کٹتی ہے زندگی میری

خاک سمجھے گا مدعی شائق
اک معما ہے شاعری میری

سید محمد کاظم علی شائق

محفلِ ادب

ادیب آقا ہے یا غلام؟

جب یونانیوں کی آزادی چھن گئی اور رومی اُن پر حکمران ہو گئے تو ادب آقائی کے درجہ سے گر کر غلامی کے درجے پر آ گیا۔ یونانی ادبا فلسفہ کے مالک اور ڈرامے کے بانی ہونے کی وجہ سے اپنی قوم کو اس نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے بادشاہ اپنی رعایا کو دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ قوم کی اصلاح کے طریقے نکالنے، اس کی حکومتوں کو منظم کرنے، اس کے اخلاق کی سطح کو بلند کرنے اور اُسے ترقی کی طرف لے جانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ تم ارسطو یا افلاطون کا مطالعہ کرو تو ان میں سے ہر ایک کو ایک بادشاہ کی طرح اپنی رعیت کی دشواریوں کو دور کرنے کی فکر میں مبتلا پاؤ گے جو دل سے چاہتا ہے کہ اُن کے اخلاق وسیع اور ان کی حکومتیں با نظم ہو جائیں۔ تم ان میں سے کسی کو بھی ایک غلام کی طرح نہیں پاؤ گے جو عوام سے چاپلوسی کرے۔ قوم کو دھوکے میں رکھے اور اُن کی برائیوں کو بھی اچھا بتائے۔

بہرحال جب رومی یونانیوں پر غالب آ گئے اور انہیں یونانی زبان سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور بچوں کو اس کی تعلیم دینے کی خواہشات بڑھنے لگیں تو رومی اس مقصد کے لئے کثرت سے یونانی غلام خریدنے اور اپنی اولاد کو اُن کے سپرد کرنے لگے۔ اور اس طرح یونانی اہلِ ادب غلام ہو کر رومی بچوں کے استاد بن گئے۔ یہ شاگرد اپنے معلم کی باتیں ضرور مانتے اور اس کی نصیحتیں بھی قبول کرتے۔ لیکن اسی طرح جیسے ہم اپنے ڈرائیور کی بات مان لیتے ہیں جب وہ ہم کو قریب ترین راستہ بتاتا ہے یا جس طرح ہم اُس قلی کی رائے پر چلتے ہیں جو ہمارا اسباب اٹھائے ہم کو ریل پر سوار کرانے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں کی وقتی اطاعت اور ایک قسم کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا ضمیر کہتا رہتا ہے کہ ہم ان دونوں سے بالا و برتر ہیں۔ اس حالت کا اثر لازمی طور پر معلم پر بھی ہوا اور اُس نے محسوس کیا کہ اپنے آقاؤں کے مقابلہ میں تعلیم دینے اور بات بات پر ٹوکنے والا استاد ہونے کے بجائے ایک خوش باش مصاحب ہونا زیادہ ضروری ہے۔

پھر ازمنۂ وسطیٰ کا دور آیا جس میں عرب اور اہلِ فرنگ مذہبی پیشوا خلیفہ یا پوپ کے خود مختار نظامِ حکومت کے لحاظ سے اور ادب کی یک رنگی کے اعتبار سے تقریباً برابر ہو گئے اور دونوں کا ادب مذہبی اور دنیاوی آقاؤں

کی خوشامد میں آقائی رتبے سے گر کر غلامی کے درجے میں آگیا۔ علاوہ ازیں اس دور میں ادب اَور دو بڑی قسموں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک قسم دینی ضروریات کو پورا کرتی، دوسری ضروریاتِ زندگی کو۔

ادب کا جو حصہ ضروریاتِ زندگی کے لئے وقف تھا وہ آقائی کے اُس بلند مرتبہ تک نہیں پہنچ سکا جو قدیم یونانی اہلِ قلم کا مرکز تھا بلکہ غلامی کے اُس درجے میں اتر آیا جس میں یونانی ادیب غلام ہو کر اتر آتے تھے۔

بنی عباس کے زمانے میں جس طرح بغداد میں تم کو غلاموں کی ایک بڑی جماعت ملے گی جس نے ادب حاصل کر کے اپنی ساری عمر اپنے آقاؤں کی مدح گوئی میں صرف کردی اسی طرح انہیں ایام میں اٹلی میں بھی تم ہر امیر کے پاس ایک شاعر کو اُس کی مدح سرائی میں رطب اللساں پاؤ گے۔ غرض کہ ازمنۂ وسطیٰ میں مشرق اور مغرب کے تمام اہلِ ادب اسی رنگ پر جارہے تھے اور اس خیال نے اعتقاد کی جگہ لے لی تھی کہ اُن کی سب سے بڑی مہم اور اُن کا سب سے اہم فرض دولت مندوں اور آقاؤں کو خوش کرنے تک محدود ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ ادب امرا کے اثر سے ایک حد تک آزاد ہوگیا اور اہلِ ادب کو امرا کی مدح سرائی سے نجات ملی۔ لیکن اب انہوں نے اپنے ناظرین کو محظوظ اور مسرور کرنا اپنا فرض قرار دے لیا اور اس طرح حریری اور ہمدانی جیسے خوش گو یوں اور نقالوں کی خاصی تعداد پیدا ہوگئی جس نے الفاظ کے ذریعے سے وہی کر دکھایا جو مجلسوں میں لوگوں کا دل بہلانے اور ہنسانے کے لئے بھروپئے اور بھانڈ اپنے حرکات کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔

بعد ازاں یورپ کی بیداری اور ترقی کا دور آیا اور اُس نے قدیم ادب کے ناخداؤں کو زندہ کرنا اور دامانِ ادب کو غلامی کے گرد و غبار سے پاک کرنا شروع کیا۔ آخر میں یورپ کے جدید ادب میں آقائی کا رنگ جھلکنے لگا اس دور کا انشا پرداز تم کو ہنسانے کے لئے تمہارے سامنے نہ چوپائے کا روپ بھر کر آسکتا ہے اور نہ تم کو خوش کرنے کے واسطے بھانڈپن دکھا سکتا ہے بلکہ وہ تم کو اس حقیقی دنیا کے ایسے سبقوں سے آشنا کرتا ہے جن سے تم کو بسا اوقات دردمند بنا دیتا ہے اور تم اسی دردمندی میں لذت اور مزا محسوس کرتے ہو کیونکہ تم کو اس طرح دردمند بنانے سے انشا پرداز کا مقصد محض تمہیں صاحبِ بصیرت اور روشن ضمیر بنانا ہے جس سے تمہارے لئے اس دنیا میں احتیاط کے ساتھ ترقی کرنے کا دائرہ وسیع ہو جائے۔

مگر ہم میں اب تک اہلِ قلم کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بہ نسبت آقاؤں کے غلاموں کے مرکز سے زیادہ قریب ہے جس کی ساری ہمت شوخی نقالی اور گرانڈیل الفاظ تک محدود ہے۔ میں بعض خاص حالات میں لفظی آرائش اور مرعوب کر دینے والی صنعتِ ترصیع کے فائدوں سے انکار نہیں کرتا۔ اگرچہ میں خوب جانتا ہوں کہ سونے کا

کٹورا سادہ ہی بھلا معلوم ہوتا ہے ایک حسین وجمیل ہستی لباس سے عریاں اور برہنہ ہوکر ہی زیادہ جاذب نظر اور فتنہ انگیز دکھائی پڑتی ہے اور ریشمی کپڑا نقش ونگار کے بغیر ہی زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے، لیکن سونا اور ریشم ہر شخص کو دستیاب نہیں ہوسکتا اور سینکڑوں عورتوں میں شاید ہی ایک دو کے جسم کی بناوٹ ایسی ہو جو عریانی میں زیادہ حسین وجمیل معلوم ہوتی ہوں۔ چونکہ کوئی سادہ چیز اُس وقت تک بھلی نہیں معلوم ہوتی جب تک کہ وہ کسی مادہ سے اعلیٰ طرز کی نہ بنی ہو اور لغت ہماری ہر ضرورت کو سادہ اور حسین مادہ سے اعلیٰ طرز پر پورا نہیں کرسکتا اس لیئے ہم کو کبھی کبھی لفظی نقش ونگار اور اچھوتا اسلوب بیان اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میں اس کا بالکل مخالف ہوں کہ انشا پرداز کی ساری ہمت صرف الفاظ کی ندرت، عبارت کی شگفتگی اور طرز بیان کی شوخی پر صرف ہوجائے۔ اور وہ اپنے ناظرین کے سامنے ایک غلام کے رتبے میں رہ جائے جو صرف ان کو مسرور کرنے اور راضی رکھنے پر قناعت کرلے۔ میری تمنا ہے کہ ہر ادیب اپنے آپ کو آقائی کے درجہ میں رکھے اور اپنے ناظرین کا فائدہ اُن کی تعلیم اور اُن کی رہنمائی اس کو مدنظر رہے۔ مگر یہ رتبہ وہی ادیب حاصل کرسکتا ہے جو عالم موجودات میں اپنی بصیرت اور بصارت کو کافی وسعت دے۔ اور وسعتِ نظر اسی انشا پرداز کو نصیب ہوسکتی ہے جو انسان اور اس کی تاریخ، اس کی اصلیت، اس کے حاضر ومستقبل، اس کے رسم ورواج، اس کی جہالتوں، اس کے قصے کہانیوں، اس کے علوم وآداب اور اس کی تہذیب وتمدن کا مسلسل اور گہرا مطالعہ کرے۔

یہی چیزیں ایک ادیب کا موضوع ہیں اور ہر ادیب پر لازم ہے کہ خود ان کی تعلیم حاصل کرے اور اپنے ناظرین کے سامنے انہی کو پیش کرے تاکہ اُس کا ادب غلاموں کے ادب سے ممتاز ہوکر آقاؤں کا ادب ہوجائے۔

(سلامہ موسیٰ مصری) "ادبی دنیا"

کیفیات

کوئی نہیں پچھتانے والا	مرجائے مرجانے والا
محفل میں بیٹھے گا کیوں کر	خلوت میں شرمانے والا
میں روکوں لیکن کیا روکوں	جائے گا گھر جانے والا
صبر مرا بے کار نہ جائے	تڑپے وہ تڑپانے والا
اپنا دل بہلاؤں کس سے	ہے کون آنے جانے والا

وہ نہ ملیں مجھ کو مل جائے — کوئی جی بہلانے والا

ہم نہ کریں گے ترکِ محبت — سمجھا کیا سمجھانے والا

دل وہ شے ہے جس کا شاکی — کھونے والا پانے والا

سب سے مشکل بات یہی ہے — زندہ ہو مر جانے والا

کیا سمجھے اسرارِ محبت — دل دے کر پچتانے والا

جان مری ہے جانے والی — دل ہے اُن پر آنے والا

پھولوں کا مرجھانا، دیکھے — کلیوں پر اترانے والا

کب سنتا ہے میری آہیں — باتوں سے گھبرانے والا

یا میں ہوں یا میرا دل ہے — روز نیا غم پانے والا

نوح مرا کافی یہ پنہ ہے
وہ طوفان اٹھانے والا

"چمن"

گرمی

کالے کالے بھونرے پھر کنول کے پتوں کے نیچے سے جھانک جھانک کر دیکھنے لگے! اور سبز طوطوں کی سرخ چونچوں میں پکے پکے شہتوت نظر آرہے ہیں +

اونچے اونچے پہاڑوں پر اب وہ سبزی نظر نہیں آتی - بادامی رنگت کی گھاس اُگی ہوئی ہے -

جنگلوں کے رسیلے پھولوں پر شہد کی مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں - اور بکریاں پہاڑوں کے دامن میں سوکھی گھاس چباتی نظر آتی ہے +

گرمی کے دن آگئے! ——— وہ دن جو شاعر کے خواب کی طرح چمکیلے ہوتے ہیں اور مشک کی طرح گرم ہوتے ہیں +

او معبود! معلوم ہوتا ہے کہ یہ روشنیاں پیدا ہونے کے دن ہیں! کہ ہر طرف اک محبوب نور برس رہا ہے

جیسے درِ فردوس پر برس رہا ہو +

گہرے نیلے آسمانوں سے اک روشنی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے ۔ جو سمندر، پہاڑ اور پوری زمین کو چمکا رہی ہے +

گرمی کے دن آگئے!

پھر آفتاب بلند ہو ہو کے چمکے گا ۔ پھر جنگلوں میں خرگوش خوش ہو ہو کے ناچیں گے!

دوست! دیکھو ۔ گرمیوں کے شفاف آسمان پر ستارہ کیسا جگمگا رہا ہے جیسے کم سن ہرن کی آنکھ میں روشنی کانپ رہی ہو ۔

خوبصورت پرندوں کے پروں پر آفتاب کی تیز کرنیں کیسی پھسل رہی ہیں! جیسے ہلکی ہلکی برف پہاڑوں پر سے پھسل رہی ہو ۔

گرمی کے دن آگئے +

ہر طرف اک نور کا دریا لہریں مار رہا ہے +

"تہذیب نسواں"

سمندر کی آخری تان

شہرت و اقتدار اور محبت و آرام کی لذتوں سے میں ناآشنا ہوں وہ لوگ ایک ایک کر کے میری نظر کے سامنے ہیں جوان چیزوں میں بسے ہوئے ہیں ہنس بول کر جیتے اور زندگی کو سازِ عشرت سمجھتے ہیں لیکن کیا بتاؤں کہ مجھے قدرت نے زندگی کے اور ہی گھونٹ پلائے! اب یاس و حرماں، ہوا اور پانی کی طرح میرے لئے شیریں بن گئے ہیں ۔ ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح میں اس جنجال کی زندگی کو رو رو کر اپنے آنسوؤں سے بہا سکتا ہوں تا آنکہ موت دبے پاؤں نیند کی طرح مجھ پر چھا جائے، ہوا کی گرمی میں میرے گال ٹھنڈے پڑنے لگیں اور سمندر کی آخری تان میری مائل بہ پرواز روح پر ٹوٹ جائے" (شبلی)

"مجلّۂ عثمانیہ"

مطبوعاتِ جدیدہ

تاریخ اسلام۔ یہ کتاب عہدِ حاضر کے مشہور ادیب اور مورخ علامہ محی الدین خیاط مصری کی مستند اور جامع "تاریخ اسلام" کا اردو ترجمہ ہے جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں فلسفہ "تاریخ کی ماہیت"، تاریخ کے مآخذ اور رسولِ کریم صلعم کے سوانح درج ہیں۔ دوسرے حصے میں خلفائے راشدین کے حالات ہیں۔ تیسرا حصہ خلافت بنی امیہ کے حالات میں ہے، چوتھا حصہ خلافتِ بنی عباس اور پانچواں تاریخ اندلس پر مشتمل ہے۔ ترجمہ مولانا مولوی ابو المحمود محمد حامد خاں صاحب فاضلِ ادبیات نے کیا ہے۔ زبان ایسی سلیس اور عام فہم ہے، کہ عورتیں اور بچے بھی بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اصل کتاب قریب قریب تمام ممالکِ اسلامیہ میں بہ طورِ نصابِ تاریخ رائج ہے، اور یہ اُس کے مستند اور مفید ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ ہے۔ ہر حصہ میں ضروری نقشے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ قیمت مع محصول پانچ روپے مقرر ہے۔ مدارس اسلامیہ اگر بہ طورِ نصاب رائج کرنا چاہیں تو ان کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی ہے۔ ملنے کا پتہ مینجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ۔

اربابِ نثرِ اُردو، از مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نویسوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس موضوع پر پہلی کتاب ہے، قابل مولف نے اسے نہایت محنت اور جانفشانی سے ترتیب دیا ہے۔ سوا سو سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا کہ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ چند ادبا کو اکٹھا کر کے ان سے انگریز اہلکاروں کے لئے آسان زبان میں درسی کتابیں لکھوائی جائیں چنانچہ نثرِ اردو کے یہ ارباب ملک کے مختلف حصوں سے یہاں جمع ہوئے اور انہوں نے قصص، تاریخ، قواعدِ زبان، اخلاق اور مذہب پر ایسی ایسی کتابیں لکھیں کہ اردو نثر کی بنیاد قائم ہو گئی۔ اس تذکرہ میں تقریباً بیس ایسے اربابِ نثر کے حالات اور اُن کے کارناموں کی تنقید درج ہے اور ہمارے خیال میں تاریخ ادبیات اردو کا یہ ایک اہم باب ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے بھی کتاب بہت اچھی ہے۔ حجم ۳۰۰ صفحات مجلد کی قیمت دو روپے۔ مکتبۂ ابراہیمیہ امدادِ باہمی، اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے طلب فرمایئے۔

چمنستان۔ اس نام کا ایک نیا مصور ادبی رسالہ ماہِ اگست سے مولوی محمد افضل خاں صاحب اور سید ظفر ہاشمی صاحب کے زیرِ ادارت شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ دوسرا نمبر ہمارے سامنے ہے جس میں نظم و نثر کے نہایت شستہ نمونے جمع کئے گئے ہیں۔ ایک سہ رنگی اور ایک یک رنگ تصویر بھی رسالہ کی زینت ہے۔ حجم ۴۲ صفحات اور سالانہ چندہ دو روپے۔ بینجر "چمنستان" امرت سر سے منگائیے۔

فہرستِ مضامین

جلد ۱۶ — نمبر ۵

بابت ماہ نومبر ۱۹۲۹ء

تصویر:- داستان گو

رباعیات

(۱)

ہم وہ ہیں کہ فاتحیٔ سخن ہے ہم سے
خلوت ہی ہماری انجمن ہے ہم سے
دنیا سے الگ ہے اپنی دنیائے خیال
ویرانہ ہی [illegible] وطن ہے ہم سے

(۲)

ہر [illegible] دشت ہے کوئی نہ کوئی آبادی
ہر بند ہے کوئی نہ کوئی آزادی
ہستی سے واقف ہے جس کی فریاد
[illegible] میں ہے کوئی نہ کوئی بربادی

(۳)

جو کچھ بھی یہاں ہے جز تشکیل و ترتیب نمود
جو کچھ بھی کہیں ہے آج و ابد میں موجود
انسان کی روح میں ہے ایک ایک کا علم
کیا کچھ نہیں سب کچھ ہے اسی میں موجود

(۴)

گردش میں ہیں سب ہے جو وہ سیارہ بن
اپنی ہی فلک سے ٹوٹ اور تارہ بن
یہ راہ وہ ہے جس راہ میں کچھ آرام نہیں
منزل پہ پہنچا ہے تو آوارہ بن

ب ل

جہاں نما

شتاقوا

امریکا کے تعلیمی طریقوں میں ہمیشہ یہ مقصد ملحوظ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کو تقویت پہنچائیں اور سب لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ ایشیا اور یورپ کے بالمقابل امریکا کو جمہوریت کی نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ یہاں ہندوستان میں ہم جمہوریت کے اُس عظیم الشان کارخانے کا تصور بھی اپنے دماغوں میں نہیں لا سکتے جس کے ماتحت مدرسوں کے استاد اور ریاست کے عہدہ دار بھی عوام کی رائے سے منتخب ہوتے ہیں۔ مگر امریکا میں عام انتخاب کا دستور جاری ہونے سے پہلے ہی تعلیم عام ہو چکی تھی۔ حکومتِ ہند ملک کی تعلیم پر کل ۸۰ لاکھ روپیہ خرچ کرتی ہے لیکن امریکا میں صرف ایک یونیورسٹی پر ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے۔

بہت دیر تک امریکا کے تعلیمی طریقے بھی انگریزی امارت کی روایات سے متاثر رہے لیکن امریکا نئے آئین وضوابط کی سرزمین ہے اور وہاں کی جدید جامعات نئی ذہنیت کی پیداوار اور ملک کے جمہوری آئین، روایات اور عادات کا نتیجہ ہیں۔

امریکا میں صرف مدرسے اور کالج ہی ایسے ادارات نہیں ہیں جو لوگوں کی تہذیب و تربیت کا کام کر رہے ہیں، بلکہ بیسیوں اور ایسے طریقے ہیں جن سے امریکا عام تعلیم اور مدنی علم کو اپنے کروڑوں فرزندوں کے لئے پھیلا رہا ہے۔ ان تمام طریقوں میں شتاقوا غالباً سب سے حیرت انگیز ہے۔

آج سے نصف صدی پہلے شتاقوا محض نیویارک کی ایک جھیل کا نام تھا۔ لیکن آج یہ لفظ اُس زبردست ترین مدنی طاقت کی نمائندگی کرتا ہے جس کے ذریعہ سے دیہاتی اور قصباتی آبادی کو دنیا کی موجودہ عظیم الشان دماغی ترقیات سے روشناس کرایا جاتا ہے۔

نصف صدی گزر چکی ہے کہ امریکہ کے بعض بڑے بڑے معلموں اور شہریوں نے جھیل شتاقوا کے پُرفضا کناروں پر گرمیاں گزارنے کے لئے اپنے خیمے گاڑے۔ تقریروں، نصابوں اور مختلف قسم کی دلچسپیوں کا انتظام کیا گیا، اور بڑی عمر کے آدمی اور کاروباری لوگ جو اوائلِ عمر میں کالج کی تعلیم سے محروم رہ گئے تھے یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آنے لگے۔ تقریریں ہر مضمون کے متعلق ہوتی تھیں اور طالبِ علم کو علم کے جس کسی شعبہ سے دلچسپی

ہوتی وہ اس کا مطالعہ کرسکتا تھا۔ معلمین کا طرزِ بیان نہایت آسان ہوتا تھا اور کتابیں ان تقریروں کا نہایت موزوں و مناسب ضمیمہ ہوتی تھیں۔ رات کو ناچ راگ اور دوسرے کھیل تماشے ہوتے تھے اور ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق ان میں حصہ لے سکتا تھا۔ بعد میں اسی جھیل کا نام جس کے بلوریں پانیوں کے کنارے یہ لوگ آ جمع ہوئے تھے اس نئی عضویت کو دے دیا گیا۔

امریکن، ہندوستانیوں کے برعکس نئے خیالات کو قبول کرنے میں ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ہر نئی بات انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے چنانچہ شتاقوا کا طریقۂ تعلیم تمام جمہوریہ میں نہایت سرعت سے پھیلا۔ آج جس قصبے اور جس گاؤں میں جاؤ شتاقوا کی روشنی ہزاروں گھروں کو منور کرتی نظر آتی ہے۔

موجودہ شتاقوا ایک مختلف چیز ہے۔ اس نے اب کتابی اور انفرادی تعلیم کی منزل سے گزر کر ایک سالانہ قومی میلے کے خطبات، راگ اور ناٹک کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ڈاکٹر سدھندر ابوس اس کے موجودہ مقاصد کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

"شتاقوا کا ایک باقاعدہ لائحہ عمل تیار کرنا بڑی مشکل بات ہے۔ اس کا مقصد قلب کو وسیع کرنا ہے اور اس لئے اس میں اسفار، ادبیات اور سائنس پر خطبات پڑھے جاتے ہیں۔ پھر زندگی کے لطیف رخ کو بھی اس وقت تک نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جب تک دنیا میں موسیقی، شاعری اور آرٹ کا وجود ہے۔ ہر شخص کے لئے یہاں کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ مذہب، تعلیم، تفریح ان تینوں کا نام شتاقوا ہے۔ لوگ روزانہ زندگی کے بار اور فرائض یک قلم اتار کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور شتاقوا میں آ شامل ہوتے ہیں ——— تفکر و تدبر کے لئے، سیر اور نظارے کے لئے، تفریح و تبسم کے لئے اور اس طرح وہ اپنے قلب اور جسم کو سکون دینے اور تازہ دم ہونے کے لئے ایک ہفتے کی مہلت دیتے ہیں"

جدید شتاقوا کے جلسے مسلسل دس روز تک جاری رہتے ہیں صبح سیاسی، مذہبی اور ادبی موضوعات کی تقاریر کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ بچے کھیلتے ہیں۔ تیسرے پہر موسیقی شروع ہوتی ہے اور تمدنی اور بین الاقوامی مسائل پر تقریریں کی جاتی ہیں۔ شیکسپیر کے کھیل، رقص اور دوسری تفریحات رات کے پروگرام میں شامل ہوتی ہیں۔

لیکن امریکہ کے رہبرانِ تعلیم نے محسوس کیا ہے کہ صرف ایک یا دو بڑے بڑے مقامات پر ایسی [illegible] اور نمائشیں کافی نہیں ہیں کیونکہ اس طرح جمہور کا ایک نہایت قلیل تناسب ان میں حصہ لے سکتا ہے۔

سوا انہوں نے شتاقوا کو ایک قومی تہوار بنا لیا ہے اور شتاقوا کے ہفتے کے دوران میں اتنے ہی جلسے منعقد ہوتے ہیں جتنے جمہوریہ کے قصبے اور شہر ہیں۔

اس ہفتے سے چند دن پہلے تمام قوم کے سینے جوش و خروش سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ لوگ نفیس نفیس لباس پہنتے ہیں۔ مکان، دوکانیں اور سرکاری عمارات قومی جھنڈوں سے مزین کی جاتی ہیں۔ جا بجا بڑے بڑے اور چھوٹے اشتہارات لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ شتاقوا کے خاص رنگ بٹن اور ٹوپیاں پہنتے ہیں نوجوان موٹروں میں بیٹھ کر ملک کے طول و عرض میں نعرے لگاتے پھرتے ہیں "ہماری شتاقوا!" ہر شہر اور ہر قصبے کے باہر بڑے بڑے خیمے نصب کئے جاتے ہیں۔ شتاقوا کے منتظم اور رہنما آتے ہیں۔ میئر بلدیہ آتا ہے اور ایک برجستہ تقریر میں انہیں شہر کی آزادی کا پیغام دیتا ہے۔ یک بیک بہنسی مذاق، اور تہذیب و تعلیم کے ہفتے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ دوکانیں، بنک، ڈاک خانے سب بند ہو جاتے ہیں۔ شہر سنسان ہو جاتا ہے اور سب شتاقوا کے خیموں کی طرف چل دیتے ہیں۔

شتاقوا کے میلوں کو انفرادی شرکتیں منعقد کرتی ہیں۔ درحقیقت یہ ایک عظیم الشان تجارت بن گئی ہے اور خیموں میں داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ شرکتیں بڑا روپیہ کماتی ہیں لیکن ایک اچھی شتاقوا منعقد کرنے کے لئے بھی بڑے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔

شتاقوا کا سب سے نمایاں پہلو وہاں کی تقاریر ہیں۔ ماہر حکما اور سیاس اور بڑے بڑے خطیب اور پروفیسر شتاقوا کے منبر پر آ کر بولتے ہیں۔ چھوٹی قابلیت کو وہاں کوئی جگہ نہیں ملتی۔

شتاقوا کی تحریک لیاقت اور قابلیت کا ایک باب مفتوح ہے۔ اول اول مقرروں کو ان کی محنت کا نہایت قلیل معاوضہ ملتا تھا لیکن اب اس کی مقدار بہت بڑھ گئی ہے۔ مسٹر ولیم جننگ برائن نے صرف ایک تقریر کا معاوضہ ۷۵۰ روپے وصول کئے اور اندازہ کیا گیا ہے اُن کی تقریروں کی سالانہ آمدنی چار لاکھ روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی۔

غرض کہ شتاقوا ساری قوم کے لئے ایک دماغی کارنیوال ہے۔ امریکی جمہوریت کی کامیابی زیادہ تر انہیں تعلیمی تحریکوں کی مرہونِ منت ہے

یورپی زاہد

ٹائمز آف انڈیا کا ایک نامہ نگار کہتا ہے کہ شہر پونا میں یورپ کے مسیحی زاہدوں کا ایک گروہ ہے جنہوں نے یہ قسم کھا رکھی

ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی طرح زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں گے، چنانچہ ہر بات میں اُن کے پیش نظر حضرت مسیح کا نمونہ ہوتا ہے ان کی کوئی جائداد نہیں ہے اور وہ اپنی خدمات کی کوئی تنخواہ نہیں لیتے۔ ان کے اخراجات مشترک ہیں اور وہ معاشرہ کے غریب ترین افراد کے پہلو بہ پہلو رہتے ہیں، اپنے گھروں کا کام خود کرتے ہیں، جھاڑو دیتے ہیں اور کھانا چن لیتے ہیں۔

اس سلسلہ کا نام کرسٹا سیوا سنگ ہے اور اس کے افراد بالکل رومن کیتھلک پادریوں کا سا لباس پہنتے ہیں جو ایک نہایت معمولی کپڑے کا سفید چغہ ہوتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ وہ ننگے پاؤں چلتے ہیں۔ اس برادری نے جس میں ہندوستانی بھی شامل ہیں اور یہ سب اکٹھے ایک آشرم میں رہتے ہیں ہندوستان میں جنم لیا ہے اور یہی اس کا گھر ہے۔ ان میں کچھ شادی شدہ گھرانے بھی ہیں۔ یہ اُن کے مقاصد کے حامی اور اُن کے کام میں مددگار ہیں لیکن انہوں نے ابھی آخری قسم نہیں اٹھائی۔ ہندوستانی اور یورپی ایک ہی جگہ رہتے سہتے اور اکٹھے عبادت اور خدمت کرتے ہیں۔ سب سے بڑا بنیادی اعزاز جو اس برادری کے بڑے بڑے ارکان کو ملتا ہے، اور یہ ارکان غیر شادی شدہ ہوتے ہیں، یہ ہے کہ وہ زعفرانی رنگ کا چغہ پہن سکیں جو ایک طویل امیدواری کے بعد عطا ہوتا ہے۔

صحافت اور خواتین

نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کے شعبۂ خواتین کا حال ہی میں ایک جلسہ ہرہائی نس لیڈی آغا خان کے مکان پر ہوا۔ مسٹر ایس جیپن نے "صحافت اور خواتین" کے موضوع پر تقریر کی۔ مسز میک کنزی صدر تھیں۔

یورپ اور امریکا کی موجودہ صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر جیپن نے بتایا کہ خواتین نے وہاں اخبارات اور رسائل کی پیداوار میں کس طرح حصہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اب تقریباً تمام اخبارات میں بعض خاص باتیں عورتوں کے پسند کی بھی ہوتی ہیں؛ اور یہ باتیں عورتوں کے لئے عورتوں کی جمع کی ہوئی اور لکھی ہوئی ہوتی ہیں جو صحافت کے تقریباً ہر شعبہ میں پہنچ چکی ہیں۔ یہاں تک کہ اشتہارات بھی ایسی وضع و ترکیب سے شائع کئے جاتے ہیں کہ وہ گھر کی مالکہ اور مصارف کی مختار کو مسحور کر سکیں۔ ہندوستان کی ترقی کے ساتھ بھی ایسی مطبوعات کی مانگ بڑھ جائے گی جو خواتین کے لئے دلچسپی کا باعث ہونگی، جو امریکا اور یورپ کی مطبوعات سے سبقت لے جائیں گی۔ اور اگلے دس بیس سال میں ہم دیکھیں گے کہ ہندوستان کے زنانہ رسائل مغرب میں مقبول ہو رہے ہیں۔ اگر ہندوستان کی صحافت میں خواتین نے اپنا دخل پیدا کر لیا جیسا کہ انہوں نے مغرب میں کیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ اس کے اثرات ترقی و تہذیب کے لئے ممد و معاون ثابت ہونگے۔

سا گرجا بنانے کی اجازت دی۔ اب بھی وہ کمرہ موجود ہے جس کے وسط میں ایک ستون اور گوشوں سے آ کر اُس ستون پر مل جانے والی گیلریاں ہیں، جہاں یہ مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اس کا نام "عبادت خانہ" تھا۔ مقررین نہایت آزادی سے تقریریں کرتے تھے۔ ایک سیرت نگار کا بیان ہے کہ بادشاہ یہاں متشکک ہو گیا۔ اکبر نے ان مجالس شبینہ پر اکتفا نہیں کی۔ وہ صبح اُٹھ کر دیر تک تنہائی میں عام مسائل زندگی اور خاص فرائض شاہی پر غور کیا کرتا تھا۔

اکبر کا مخصوص مذہب، جو کہ ایک طرح کا مختلف خیالات سے انتخاب کیا ہوا "ہمہ اوستی مسلک" (Pantheisme Eclectique) ہے بہت کم کامیاب ہوا۔ اُسے صرف ایک درجن متبعین نصیب ہوئے جو گھر ہی کے لوگ تھے، اور کوئی فرقہ قائم نہ ہو سکا۔ ہندوستانی اسلام کو البتہ اس منصوبہ سے نقصان پہنچا۔ کلمۂ شہادت سکہ اور خطبہ سے نکال دیا گیا، بچوں کے نام پیغمبر کے نام پر نہیں رکھے جاتے تھے، مسجدیں خالی ہو گئیں اور بعض میں فوجیوں کے لئے بارکیں بنا دی گئیں۔ مذہب اسلام کے احکام کے خلاف جو زندہ چیزوں کی تصاویر ممنوع قرار دیتے ہیں، اکبر نے اپنے محل میں ایسے مناظر جو عیسائی اور بدھ مذہب کی روایات سے ماخوذ تھے، نقش کرائے۔ الیکساندر سیویر (Alexandre Severe) کا بیان ہے کہ اُس نے یسوع اور بدھ کی مورتیں اپنے کمرہ میں رکھ چھوڑی تھیں[۵]۔ سول حکومت میں رواداری و ایتلاف کا اصول زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ اکبر کے

---

[۵] اکبر کی لامذہبی اور بدعات کے متعلق یورپین مصنفین بالعموم مبالغہ سے کام لیتے، اور اکثر نا واقفیت یا غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اکبر کا مذہب طویل اور گہری بحث کا محتاج ہے جس کے لئے اس وقت موقع نہیں ہے، لیکن اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ اکبر کی زندگی میں مختلف مذہبی دور گزرے ہیں۔ ابتداءً وہ ہندوستانی معیار سے (اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ معیار چنداں بلند نہ تھا) پکا مسلمان مانا جاتا تھا۔ ابوالفضل اور فیضی کے اثر سے اکبر کے خیالات میں تغیر پیدا ہوا۔ ایک زمانہ آزاد مشربی، تشکک اور ہمہ اوستی و ہمہ دوستی میں گزرا۔ لیکن خود اکبر اور اُس کے مذہبی مرشد و معلم ابوالفضل اور فیضی اسلام کی بندش سے کبھی آزاد نہیں ہوئے، بالخصوص اسلامی تصوف کا ان پر نہایت زبردست اثر رہا۔ اسلامی تصوف کی وسیع مشربی ہی کے تحت میں وہ تمام دنیا کے مذاہب کا خیر مقدم کرتے رہے۔ ابوالفضل فیضی اور اکبر ہندوستانی مسلمانوں (مثلاً تنگ دل مگر راستباز ملا عبدالقادر) کی نظروں میں ہمیشہ مطعون رہے، اور انہیں لوگوں کے مبالغہ آمیز بیانات نے بعد کے مورخوں میں بہت کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ یورپین مورخوں نے اپنی تخیل کی مدد سے اور بھی رنگ آمیزیاں کیں، جس کی وجہ سے اکبر کی سیرت کے بیان میں صداقت سے انحراف ہو جاتا ہے۔ اخیر عمر میں اکبر کے خیالات میں ردعمل ہو گیا تھا، اور اُس کی موت یقینی طور پر ایک مسلمان کی حیثیت سے ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اکبر (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر دیکھئے)

دوش بدوش اس اصول کی تعلیم اُس کے وزیر اور دوست ابو الفضل نے بھی دی جس کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔

انتظامِ سلطنت میں اکبر نے ایک سابق غیر مغل پادشاہ شیر شاہ کے کام کو جاری رکھا۔ کچھ ہی عرصہ پیشتر اُس پادشاہ نے ہندوستان میں نہایت دانشمندی کے ساتھ سلطنت کی تھی۔ وہ مغلوں کا دشمن تھا۔ خراج شاہی زیادہ عدل کے ساتھ قائم کیا گیا اور مالگذاری مقرر کرنے میں اور ٹکسوں کی نگرانی میں زیادہ انصاف برتا گیا۔ وہی اصول اب تک چلے آتے ہیں۔ ایک راجہ کی لڑکی سے عقد کرتے وقت اکبر نے دو ٹکس جو ہندوؤں کی دل آزاری کا موجب تھے معاف کر دیئے۔ ایک تو وہ ٹیکس جو اُن جاتریوں کو دینا پڑتا تھا جو جاترا کے لئے برہمنوں کے تیرتھ کی جگہوں پر جاتے تھے، اور دوسرا ٹیکس جزیہ تھا، جو اسلامی فقہ کی رُو سے غیر مسلموں کو دینا پڑتا تھا۔ اکبر نے مقامی سکوں کے مسئلہ پر بھی توجہ کی۔ اُس نے مقامی سکّوں کو ممنوع قرار دیا، مروجہ سکّوں میں اصلاحیں کیں، اور رائج الوقت سکّوں کی قیمتیں قائم کیں۔ اخلاقی حیثیت سے اُس نے جنگی قیدیوں پر سختی کرنے کی ممانعت کی اور اپنے ایک رضاعی بھائی کو جو مجرم تھا اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ اُس نے ستی کی رسم کو خلافِ قانون قرار دیا۔

اکبر کا ایک دوسرا بڑا کارگذار ملازم، سپہ سالار ٹوڈرمل تھا، جو ایک لائق فوجی افسر اور ایک ممتاز ماہر سیاست تھا۔ اُس نے اس عہد کے انتظامی کام میں بڑا حصہ لیا۔ باغی راجاؤں کے خلاف مسلسل فوج کشیوں کے دوران میں جن میں وہ ہمیشہ کامیاب رہا، اس نے ایک سلسلہ ایسے مالی انتظامات کا سرانجام دیا، جو کہ بہترین ماہر مالیات ہی کا حصہ ہو سکتی ہیں۔ اُس نے املاک کی ایک صحیح فہرست بنائی، جور و تشدد کی دادرسی کے لئے سہولتیں نکالیں بندوبست انیس برس تک کے لئے کیا، اس کا خیال رکھا کہ اس دوران میں لٹیرے یا مقامی عہدہ دار دست اندازی نہ کر سکیں، بعض چھوٹے عہدہ دار کم کئے، کاشتکاروں کے لئے نقد اور غلہ کی تقاوی مقرر کی، محصّلوں کو ہر سال حساب پیش کرنے کا حکم دیا ہوا حساب خزانچی کو دیا جاتا تھا۔ مصائب مثلاً ژالہ باری و طغیانی کی فوری اطلاع کی جاتی تھی تحصیل سال میں چار مرتبہ ہوتی تھی۔ یہ ہیں وہ خاص خاص انتظامات جن کا نفاذ گویا کسی زمانہ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) اسلام سے کبھی دست بردار یا بے تعلق نہیں ہوا۔ اسی وسیع مشربی کے زمانہ میں جب کہ فتح پور سیکری میں عبادت خانہ تعمیر ہو رہا تھا فتح پور سیکری کی شاہی مسجد بھی بنائی جا رہی تھی جو اکبر کے عہد کی بہترین عمارت ہے۔ حکومت کا اسلامی نظام (قاضی، مفتی، امام، خطیب) برابر قائم رہا۔ بجز اس کے کہ دربار کے چند آدمیوں کے خیالات میں ہیجان ہوا، ہندوستان کے اسلام پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ تصاویر کا رواج عمارات وغیرہ میں پہلے سے بھی تھا۔

حال کے دماغ نے کیا تھا۔

انتظاماتِ ملکی کی عمدگی کے ساتھ ہی اکبر کا عہد فنون کی ترقی کے لئے ممتاز ہے۔ شمالی ہند میں عالی شان تعمیرات موجود ہیں جو اکبر نے بنوائی تھیں۔ آگرہ کا قلعہ جو اب بھی ہمارے سامنے موجود ہے، اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ اکبر نے صنائع کی طرف بھی خاص التفات کیا۔ آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ اُس نے توپوں کو بہتر بنایا، ایک نئی قسم کی گاڑی ایجاد کی اور ایک ڈنڈا توپوں کے صاف کرنے کے لئے بنوایا۔

سلطان جہانگیر نے جو اکبر کا بیٹا اور جانشین اور خود بھی ایک ممتاز شخصیت تھا، ایک تزک یا روزنامچہ چھوڑا ہے، جس کا طرزِ تحریر عالی، سہل و درخشاں ہے۔ اس کتاب میں اکبر کی سیرت اور اُس کے خیالات کے جاننے کے لئے بعض قیمتی مقامات ہیں۔ جہانگیر ابتداءً آگرہ میں اپنے باپ کے بعد اپنے تخت پر بیٹھنے کا حال لکھتا ہے اُس نے ایک سکہ چلایا، جس کا مضمون یہ تھا:-

"اسے آگرہ میں مسکوک کیا۔ خسروِ عالم، محافظِ دنیا، پادشاہ نورالدین جہانگیر بن شاہِ اکبر نے"

وہ لکھتا ہے:-

"اس موقع پر میں نے اُس تخت کا استعمال کیا جو میرے والد نے بنوایا تھا، اور جس کی آرائش ایسے شاندار طریقہ پر کی گئی تھی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ میں نے سالِ نو کا جشن منایا اُس وقت آفتاب برج حمل میں تھا۔

اکبر نے ایک نیا سنہ ایجاد کیا تھا، جو کہ اعتدالِ ربیعی سے شروع ہوتا ہے۔ وہ آگ اور سورج کی تعظیم کرتا تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہے "پادشاہ کا خیال ہے کہ آگ اور روشنی کی تعظیم کرنا ایک مذہبی فرض ہے"

جہانگیر نے بعض ایسے واقعات لکھے ہیں جن سے اکبر کی رواداری کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ علاوہ بعض دیگر امور کے وہ ایک یہ واقعہ لکھتا ہے کہ اکبر کی زندگی میں راجہ مان سنگھ نے ایک مندر تعمیر کرایا، جس پر پانچ کروڑ چالیس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ خاص بت کے سر پر ایک تاج تھا جس میں جواہرات جن کی قیمت کل مصارف کا بارھواں حصہ تھی لگے ہوئے تھے۔ اس بت کے گرداگرد اور بت بھی تھے جو سونے سے بنائے گئے اور مرصع تاج پہنے ہوئے تھے جہانگیر نے اکبر سے پوچھا کہ آپ ان بت پرستی کی کارروائیوں کو کیوں نہیں روکتے۔ اکبر نے جواب دیا "اے میرے عزیز بیٹے! میں جانتا ہوں کہ میں ایک نہایت طاقتور بادشاہ ہوں اور دنیا میں خدا کا سایہ۔ میں دیکھتا ہوں کہ خدا کی رحمتیں تمام مخلوق پر بلا امتیاز نازل ہوتی ہیں۔ میں اپنے عالی رتبہ کے فرائض میں کوتاہی کروں گا اگر میں اپنی مرحمت و نوازش کو اُن لوگوں سے جو میری حمایت میں ہیں دریغ رکھوں گا۔ میں تمام انسانی اقوام، تمام خدا کی مخلوق کے ساتھ صلح کر چکا ہوں۔ پھر میں کس طرح روا رکھ سکتا ہوں کہ ایک دوسرے کو ستائے یا دست درازی کرے؟"

جہانگیر کا بیان ہے کہ جوانی میں اکبر لذائذِ دہر سے مستغنی نہیں تھا لیکن وہ ہمیشہ خدا کی برتر قوت کا ایسا مخلصانہ و منکسرانہ احساس رکھتا تھا کہ باوجود زبردست افواج، بے شمار مہیب جنگی ہاتھیوں، بے نظیر خزائن اور عظیم الشان سلطنت کے جس کی شان پر فوقیت نہیں دی جاسکتی، مالک ہونے کے وہ کبھی اُس بے زوال ہستی کو فراموش نہیں کرتا تھا جس کی وہ عبادت کرتا تھا۔ ہمیشہ یہ الفاظ اُس کی زبان پر رہتے تھے۔

"ہر حال میں اور ہمیشہ تمام انسانوں کے ساتھ صلح رکھ اور ہر حال میں پوشیدہ طور پر اپنی آنکھیں اور اپنا دل اپنے رفیقِ ازلی کی طرف رکھ" اُس کی سیرت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ تمام مذاہب کے ساتھ کامل دوستی رکھتا اور جب موقع ملتا ہر جماعت کے نیک اور روشن دل بزرگوں کی صحبت اختیار کرتا تھا۔"

اکبر فی الواقع ہمارے زمانہ کے تھیاسوفی خیالات کے بانیوں میں سے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا طرزِ عمل اُس کا نقطۂ خیال حتیٰ کہ اُس کے الفاظ دوبارہ لے لئے گئے ہیں۔ اُس نے مختلف مذاہب کے ایسے جذبات کو جو کہ پاکیزہ و عالی معلوم ہوئے منتخب کرلیا تھا، لیکن عقاید کے متعلق وہ متشکک تھا اور ایسے بیرونی مراسم کی جو اسے نامناسب معلوم ہوتے تھے کھلی ہوئی مخالفت کرتا تھا۔ مثلاً اسلام کی رسومِ ختنہ اور کتوں کا ناپاک سمجھا جانا اور ہندوؤں کی رسم ستی۔ بلاشبہ اکبر دنیا کی ان بڑی ہستیوں میں سے ہے جو مذہبی خیالات کے میدان میں پیدا ہوئیں جو خیالات اُس نے ہندوستان میں آج سے تین سو برس پہلے ظاہر کئے تھے وہ ہمارے زمانہ میں بھی ہمیں نئے معلوم ہوتے ہیں۔

اکبر کا مقبرہ سکندرہ میں ہے۔ جہانگیر کا بیان ہے کہ اکبر میانہ قامت سنہرہ رنگ، سیاہ ابرو، سیاہ چشم تھا۔ اُس کا جسم "شیر کا" تھا، سر بڑا، بازو اور ہاتھ لمبے تھے۔ اُس کی آواز بلند تھی۔ اُس کا اندازِ گفتگو اور اطوار و عادات نہایت شائستہ اور ممتاز تھے۔ ہندوستان کی آبادی نے اُس کی یاد کو محفوظ رکھا ہے ہندوؤں کی قومی شاعری نے اُس کے کام کی وسعت، اُس کی بہادری، اُس کی عالی ظرفی اور اُس حمایت کو جو اس نے اُن کی قوم کے ساتھ دکھائی پیش نظر رکھتے ہوئے بطور اپنے ملک کے ایک سربرآوردہ سورما کے اُسے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

سید حسن برنی

پیرانِ سالوس

(۱)

مجرم ہیں، یہی سزا ہیں دینے والے
طوفان ہیں، خود سفینہ کھینے والے
واللہ کہ اک وبا ہیں بیدل سے لیے
ظاہر میں خدا کا نام لینے والے

(۲)

ایماں کو جبینوں پہ فدا کرتے ہیں
شغلِ دل و دیدہ بس ادا کرتے ہیں
پر پیکرِ دلوں سے نمازِ فسق ہو
جیبوں کو مریدوں کی تکا کرتے ہیں

(۳)

نیکی کی ہیں راہ بتاتے رہتے
اللہ سے ہیں ہر وقت ڈراتے رہتے
تسبیح کی گردشوں میں رہتے مصروف
اور شوق سے مالِ غیر کھاتے رہتے

(۴)

وہ رشتۂ تسبیح ہیں، ہم پھندے ہیں
پاکیزہ وہ، وہ بری ہیں، ہم گندے ہیں
دیکھو وہ نکل رہے ہیں مسجد سے شیوخ
گویا وہ خدا ہیں اور ہم بندے ہیں

جوش ملیح آبادی

طنزیہ شاعری

سب جانتے ہیں کہ ہماری شاعری کا جزوِ اعظم ہمیشہ سے غزل رہی ہے۔ غزل کے لغوی معنی ہیں حدیثِ عشق بازناں۔ اس اعتبار سے غزل یا تغزل کی بنیاد جن مضامین پر ہے وہ عموماً وصفِ معشوق، آرزوئے وصال، شکایتِ فراق، رشکِ رقیب، مذمتِ ناصح، زارنالی، شکوۂ چرخ، طنز و تعریض، چھیڑ چھاڑ وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگرچہ متاخرین نے غزل کو اس قدر ہمہ گیر و وسیع بنا دیا کہ تصوف، فلسفہ، اخلاق غرض کوئی مبحث ایسا نہ تھا جو تنگنائے غزل میں داخل نہ ہوگیا ہو، مگر قدما نے غزل کو اُس کے حدود سے متجاوز نہ ہونے دیا اور خلطِ مبحث سے اجتناب کیا۔
یہ فارسی شاعری کا حال تھا۔ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ فارسی شاعری کے انحطاط کا دور تھا۔ اس لئے شعرائے اردو کے سامنے جو نمونہ تھا وہ فارسی کے شعرائے متاخرین کا کلام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شعرا کی غزلوں میں (بہ استثنائے بعض) متقدمین شعرائے فارسی کی سادگی، اثر، جوش، صدقِ جذبات کم نظر آتا ہے اور تصنع اور تکلف زیادہ۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ امر فی نفسہٖ اچھا تھا یا بُرا۔ مگر کم از کم غزل میں تغزل کی شان باقی نہیں رہی۔
تغزل کے اجزائے ترکیبی میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ایک چیز طنز و تعریض بھی ہے جو اردو شعرا کے کلام میں شاذ و نادر نظر آتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم اسی موضوع پر بحث کرنی چاہتے ہیں۔
طنز (طعنہ دینا) اور تعریض (کنایہ میں بات کہنا) کا مقصد کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ مخالف کو جلی کٹی سنا کر دل کا بخار نکالا جائے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ اشتعال دے کر اپنی مطلب برآری کی جائے۔ کلام میں تعریض سے کام لینا ایک طرف تو شاعر کی نازک خیالی کی دلیل ہے۔ دوسری طرف اُس کی قدرتِ زبان کا ثبوت۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اساتذۂ اردو میں مومن خاں سے زیادہ طنز کا استعمال کسی نے نہیں کیا۔ یہ منجملہ اُن چند خصوصیاتِ شاعری کے ہے جن میں وہ متفرد اور اپنے دوسرے معاصرین سے ممتاز ہیں۔ چونکہ اُن کے کلام پر رائے لکھنے والوں نے بیشتر اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اوراق میں مومن کی اس خصوصیت پر اجمالی تبصرہ کیا جائے۔
مومن کو قدرت نے غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کبھی روشِ عام پر چلنا پسند نہ کیا۔

نزاکتِ خیال اور ندرتِ اسلوب میں اُن کے ہم عصروں میں صرف غالب اُن کے شریک کہے جاسکتے ہیں اگرچہ شریکِ غالب نہیں ۔مومن کی غزل حقیقی معنے میں غزل ہوتی ہے ۔اور تغزل کی محدود جولانگاہ کے باوجود ان کی نادرہ کار طبیعت اس میں وہ نقش آرائیاں کرتی ہے کہ نگارخانۂ چین کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے خیر یہ بحث تو کسی آیندہ فرصت پر اٹھا رکھنی چاہئے ،اس وقت ان کے طنزیہ اشعار سے غرض ہے ۔

ملحوظ رہے کہ طنز میں کبھی متکلم حقیقت کو مستہزیانہ انداز میں شکایتاً پیش کرتا ہے اور کبھی امرِ غیر حقیقی کو غیرت دلانے کی نیت سے بطورِ حقیقت بیان کرتا ہے ۔ ذیل کے اشعار سے طنز کا اندازہ ہوگا

محبوب نے آکر عاشقِ بیمار کو قتل کر دیا ہے ۔شاعر اس پر یوں چٹکی لیتا ہے ۔

قتل کیا آن کے اچھا کیا — غیر عیادت سے بُرا مانتے

معشوق نے عاشق پر اتنے ستم کئے کہ اب آسمان کو بھی رحم آنے لگا ۔شاعر کہتا ہے کہ اگر تم اس قدر ظلم نہ کرتے تو چرخِ بے مہر کو ہرگز رحم نہ آتا ۔اب گویا تمہارا ستم کرم ہوگیا ۔

تو نے کرم اے ستم آرا کیا — رحمِ فلک اور مرے حال پر

لوگ کہتے ہیں کہ اُس (معشوق) نے عاشق کو خاک میں ملا دیا ۔مومن کو اس سے انکار ہے ۔دیکھنا کس منہ سے انکار کیا ہے جس میں ہزار طعن و طنز پنہاں ہیں ۔لکھتے ہیں ۔

کہتے ہیں لوگ خاک میں اُس نے ملا دیا — مٹی نہ دی مزار تلک آکے اُس پہ بھی

ناصح نے کہیں کہہ دیا تھا کہ عشق کا انجامِ کار وصال ہے ۔مومن وصال کے لفظ سے خاص فائدہ لیتے ہیں ملاحظہ ہو ۔

کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سنا دیا — فرماتے ہیں وصال ہے انجامِ کارِ عشق

دوسرا شعر اور سنئے ،

کیونکر کہوں لے سے مرے مرنے کا غم نہیں — نامِ وصال سنتے ہی ہوتا ہے مضطرب

رقیب اپنے لئے عمرِ دراز کی دعا مانگ رہے ہیں ۔شاعر اپنے تجربہ کے مطابق عمرِ دراز کو طولِ زمانۂ ہجر کا مترادف سمجھتا ہے اور کہتا ہے ۔

دیکھو زمانِ ہجر کے امیدوار ہیں — عمرِ دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ میرا حال اس قدر زار ہے کہ سنگدل آدمی کے سوا دوسرا سننے کی تاب نہیں لاسکتا

سنگدل یار رقیب ہو سکتا ہے یا معشوق۔ مگر اس بات کو صاف صاف نہیں کہتا بلکہ تعریض سے کام لیتا ہے۔ ملاحظہ ہو

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں ۔۔۔۔ کہ سخت چاہیئے دل اپنے رازداں کیلئے

عاشق نے اتفاق سے ایک دن ناصح کی گفتگو کان دھر کر سن لی چونکہ دورانِ گفتگو میں معشوق کا ذکر آتا تھا جی لگ گیا۔ اس واقعہ کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

کیا جی لگا ہے تذکرہ یار میں، عبث ۔۔۔۔ ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

گویا قولِ ناصح صرف اس لئے قابلِ سماعت ہے کہ اس میں کہیں کہیں تذکرۂ یار آجاتا ہے۔ چارہ گر جوشِ جنوں کا علاج کرنا چاہتا ہے۔ عاشق اس از خود رفتگی کے عالم میں بھی کس مزے سے چٹکی لیتا ہے۔

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر ۔۔۔۔ لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

یعنی جس طرح بازار میں جنگل کی جستجو جنون ہے اسی طرح میرے جوشِ وحشت کا علاج بھی دیوانگی ہے۔ معشوق کی نظر التفات رقیب کی جانب دیکھ کر عاشق رسم و راہِ الفت ترک کر دیتا ہے۔ اتفاق سے کہیں ملاقات ہوتی ہے محبوب رشکِ دشمن کا عذر تسلیم نہیں کرتا۔ اس پر عاشق کہتا ہے۔

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے ۔۔۔۔ میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

غرض معمولی تفحص سے مومن کے اشعار کا معتد بہ حصہ ایسا ملے گا جس میں نہایت لطیف نوک جھوک یا چھیڑ چھاڑ سے کام لیا گیا ہے۔ ذیل میں اسی رنگ کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں جن کی تشریح کرتے ہوئے یہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں اُن کی لطافت کا خون نہ ہو جائے اس لئے یوں ہی نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

کیا پسند آئی اپنی جور کشی ۔۔۔۔ چرخ کے انتخاب نے مارا

جو پھر جائے اُس بے وفا سے تو جانوں ۔۔۔۔ کہ دل پر نہیں زور چلتا کسی کا

کس دن تھی اُس کے دل میں محبت جو اب نہیں ۔۔۔۔ سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

دیکھ مضطر کیوں نہ پھیرے دشنہ پھر ۔۔۔۔ یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے ۔۔۔۔ زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

ہم حال کسے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے اتنا تو یہاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے

کیا رحم کھا کے غیر نے دی تھی دعائے وصل ظالم کہاں وگرنہ اثر میری آہ میں

طنز و تعریض سے ملتی ہوئی ایک اور طرزِ سخن ہے جس میں کوئی استاد مومن کے قریب کیا معنی ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ یعنی اس رنگ کے بھی وہی بلا شرکتِ غیرے مالک ہیں۔ میں اس طرز کو مکرِ شاعرانہ سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس مکر سے مراد یہ ہے کہ مومن اپنے مقصود کو اس طریقہ سے بیان کرتے ہیں کہ مخاطب سمجھتا ہے کہ اس میں مومن کا نہیں بلکہ خود میرا فائدہ ہے۔ اس اعتبار سے طنز و مکر ایک حد تک متحد المقصد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ شاعر پیچ سے اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہے۔ چونکہ مومن کا تغزل حقیقی تغزل اور اُن کا عشق وارداتِ قلب کا آئینہ ہے اس لئے یہ شوخی اور بھی پُر لطف اور یہ شراب اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔

شاعر کی یہ عین تمنا ہے کہ محبوب اُس کی طرف ملتفت ہو مگر وہ کیوں ہونے لگا۔ اس لئے اپنی خواہش کو اس بہانہ سے بیان کرتا ہے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

یعنی قصداً مجھ سے اجتناب کرو گے تو غیر تاڑ جائیں گے کہ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" دیکھنا اس شعر میں کس طرح محبوب کو اشتعال دلا رہے ہیں۔

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

یعنی میرے شعلۂ دل کو چمک کا دعویٰ ہے، تم آ کر جلوۂ رخ دکھاؤ تو اس کا غرور مٹے۔ اسی طرح ایک شعر میں مہر (سورج) کو غیرت دلاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

اس منہ پہ اُس سے دعویٔ حسن، اک ذرا نہیں اے مہر روشنی مرے روزِ سیاہ میں

یعنی اگر تو میرے روزِ سیاہ (بدنصیبی) کو روشنی سے مبدل کر سکے تو دعوائے حسن کرنا بھی تجھے زیب دے۔

اگر محبوب سے عرضِ وصال کرتے ہیں تو حصولِ تمنا معلوم۔ اس لئے دعوتِ ستم دیتے ہیں اور اس حیلہ سے مطلب برآری چاہتے ہیں۔

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

چونکہ عادت کے خلاف ہر بات تکلیف دیتی ہے، اس لئے اگر مجھے تکلیف دینا مقصود ہے تو وصل سے بہتر ستم اور وصل سے بڑھ کر ایذا میرے حق میں اَور کیا ہوسکتی ہے۔ کیونکہ سہتے سہتے ہجر میں اب اذیت نہیں رہی اثر کو شاعر کی دعا سے دشمنی ہے، اس لئے شاعر نے ارادہ کیا ہے کہ آیندہ سے ہم ہجر کی دعا مانگا کریں گے تاکہ جو مانگیں اُس کے خلاف ملے۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی ٭ آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

مرزا غالب نے بھی اسی مضمون کو باندھا ہے مگر بندش ذرا سست اور انداز غیر شاعرانہ ہوگیا ہے۔

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے (غالب)

اس رنگ کے اشعار مومن کے کلیات میں بکثرت ملتے ہیں۔ بخوفِ طوالت فرداً فرداً ہر شعر کی توضیح سے قطع نظر کر کے چند اَور اشعار نقل کئے جاتے ہیں یقین ہے کہ قارئینِ کرام اس امر میں ہم سے متفق ہونگے کہ یہ شوخ رنگ دوسرے اساتذہ کے کلام میں کہیں نہیں ملتا۔

مت رکھیو گردِ تارکِ عشاق پر قدم ― پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا ― مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

لذتِ جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا ― طعنے کیا کیا اُسے اربابِ ستم دیتے ہیں

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا ― جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

ہجرِ بتاں میں تجھ کو ہے مومن تلاشِ زہر ― غم پر حرام خوار توکّل نہ ہوسکا

خار بستر پہ شبِ ہجر بچھاؤں کیونکر ― دل میں تو ہے وہ گل اندام اگر بر میں نہیں

جلایا آتشِ ہجراں نے دل کو ― ترے گھر میں لگی لے بے خبر آگ

خو رنجِ رشکِ غیر کی بھی ہم کو ہوگئی ― اب اَور کچھ نکالئے آزار کی طرح

رحم کر خصمِ جانِ غیر نہ ہو ― سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

رہاں کو آنے دینے پہ بیرے نہ کیجے قتل ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

گر ذکرِ وفا سے یہی غصہ ہے نواب سے گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کریں گے

نوک جھوک کرنے اور جلی کٹی سنانے کے لئے شعرا نے واسوخت یا واسوز کا میدان تلاش کیا ہے اس کی ایجاد کا سہرا متاخرینِ شعرائے عجم کے سر ہے۔ اساتذۂ اردو نے بھی اس رنگ میں بہت کچھ دادِ سخن دی ہے اور تمام طعن و تشنیع کی قوت اسی محدود موضوع پر صرف کی ہے۔ مومن جو عملاً عشق (یا ہوس) کی وادیوں میں مدتوں سرگشتہ رہے ہیں کیونکر دوسروں سے پیچھے رہتے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اُن کے واسوختوں نے اصلاً واسوخت کے منشائے ایجاد کو پورا کر دیا۔ واسوخت تو درکنار، اُن کی بعض غزلوں پر بھی واسوخت کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہم یہاں ان غزلوں کے چند اشعار درج کرتے ہیں اور صحت و عدمِ صحتِ مذاق کا فیصلہ اربابِ فہم پر چھوڑ کر مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں۔

اب اَور سے لَو لگائیں گے ہم جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
برباد نہ جائے گی کدورت کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم
دل دے کے اک اَور لالہ رُو کو پھر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم
لب کا ترے دعوئ مسیحی مر اَور پہ آزمائیں گے ہم
گر تیری طرف کو بے قراری کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم
گر خواب میں آن کر جگایا سوتے مردے جگائیں گے ہم
بت خانہ جیسں ہو گو ترا گھر مومن ہیں تو اب نہ آئیں گے ہم

دوسری غزل کے چند شعر اور سنتے جائیے

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے
ٹھیرے ہی کہ زنجیر سے ٹھیرائیں گے دل کو پر بر بھی زلف کا سودا نہ کریں گے

پھر جائے نہ تا چشمِ صنم آنکھ کے آگے
سیرِ چمنِ نرگسِ شہلا نہ کریں گے

ضیاء احمد

مسافر

فلک فرسائیاں کچھ ہو چکیں، جو باقی ہیں سو ہوتی رہیں گی مگر آج ایسے مسافروں کا ذکر مقصود ہے جن کی عالمِ بالا تک قطعی رسائی نہیں۔ یہ شوریدہ سر مسافر ٹڈی دل کی طرح آتے ہیں، پھیلتے ہیں، جو کچھ ملے اسے چٹ کرتے ہیں مگر پھر ایسے غائب ہوتے ہیں کہ گویا کبھی آئے نہ تھے۔ طرفہ یہ ہے کہ ان مسافروں کی زندگی کا مدار باہمی کشمکش پر ہے جس قدر ایک دوسرے سے برسرِ پرخاش رہیں اسی قدر ان کی گرم بازاری ہے۔ جہاں ان کا لڑائی ڈنگا مٹا وہیں یہ خود بھی کس مپرسی کے بوجھ تلے دب مرے۔

یہ مسافر عقائد ہیں۔ عالمِ بالا میں جبرائیل بیچارے کے پر جلتے ہیں تو ان لڑاکوں کی کیا مجال؟۔ وہ جگہ جو تُو تُو مَیں مَیں سے خالی ہو، جہاں جو پہنچے وہ کچھ نہ رہ کر سب کچھ بن جائے عقائد کے جنجال سے آزاد ہے، وہ جگہ جو ہے مگر جس کا ذکر گناہ بر تر از کفر ہے ...... نہیں، نہیں! میں اپنے قارئین کو وہاں نہ کھینچوں گا۔ جسے وہاں جانا ہو وہ پہلے یہاں کے مسافروں کا حال سنے اور جب ان سے چھٹکارا ہو جائے (قطعی اور کلّی) تو پھر ممکن ہے کہ.......

دوست! پیارے دوست!! کیا تم نے سمجھا کہ میرا قلم کیوں رکا؟۔ یہ بھی اک عقیدہ ہے کہ "عقیدہ نہ ہو" میں ایسی مہلک چیزوں سے کوسوں بھاگتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے عقائد سے محبت ہے اور مجھے اچھی طرح علم ہے کہ لنگڑوں کو تیمور ہوتے اور قیصروں کو بے دست و پا ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لو اب سنو۔

(۲)

جب میں چھوٹا ہوتا تھا تو جادو میں اعتقاد خاص لاہور میں کافی زوروں پر تھا۔ ہر شخص کی زبان پر تھا "جادو برحق جادو کرنے والا کافر"۔ اس زمانے میں بہت سی بیماریاں جو اب جراثیم کے سر تھوپی جاتی ہیں جادو کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ ان کا علاج بھی جادو ہی کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ کئی آدمی مشہور جادوگر تھے۔ ان کی خاصی دوکان چلتی تھی۔ مقدموں میں ہار جیت بعض دفعہ جادو کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ وہی لاہور اب ہے کہ نہ جادوگر ہیں نہ جادو۔ یہ پرانا اعتقاد اب موت کی طرف رینگ رہا ہے اور کوئی ایسا نہیں کہ اس بڈھے کے مرنے پر شادیانے بجانے کی آرزو رکھتا ہو۔

یہ بھی ایک اعتقاد تھا کہ بڈھے کا مرنا خوشی کا موجب ہے۔ اب اول تو کوئی بڈھا مرنا نہیں چاہتا ار سول سٹ کے طالب علموں سے اس کا حال پوچھا چاہیئے، اور مرے بھی تو کس امید پر۔ کوئی خوشی کرنے والا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ یہ اعتقاد بھی تپ دق کے تیسرے درجہ میں مبتلا ہے۔ تعویذ باز بھی اپنے پرانے ایمان سے پھرے نظر آتے ہیں جھاڑ پھونک نہ گنڈے۔ ڈاکٹروں کی چاندی ہے۔ پیروں کے گھر تک رہے ہیں مگر کیا مجال کہ کسی کمبخت آنکھ سے ایک آنسو بھی بہا ہو کہ تعویذوں میں اعتقاد اب بستر مرگ پر ہے۔

ایک سب سے بڑا اعتقاد تھا کہ ہاتھ کا دیا کام آتا ہے۔ کئی خضر نما بزرگوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چھپ چھپ کر خیرات کرتے تھے کہ اس مولا کے نام کے سودے کا چرچا نہ ہو۔ اب جس چندہ دہندے کا نام ہیں اخبار و میں نہ چھپے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا احسان فراموش ہے۔ یہ پرانا اعتقاد بھی چل بسا۔ وہ اللہ والے مولی پرست ہی نہیں تو مولا سے سودا کون کرے؟

تعجب ہوتا ہے کہ جب انسان اعتقادوں کے لیئے زندہ ہیں اور اعتقادوں کی یہ حالت ہے کہ کچھ دن فیشنیبل رہ کر پھر وہ ایسے مرتے ہیں کہ کوئی اُن کا نام لیوا تک نہیں رہتا تو کیوں اس قدر اعتقاد پرستی پر زور ہے؟ کیوں انسان اس قدر بے بس ہیں کہ بجائے اس کے کہ اپنے لئے زندہ رہیں وہ پسند کرتے ہیں کہ اپنے دماغوں کو مرنے والوں، اعتقادوں کی مزاریں بنائیں؟

اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ تین چار پھٹے پرانے کپڑوں والے کمرے میں داخل ہوئے محض عادتاً میں تعظیم کے لیئے کھڑا ہوا اور ان حضرات سے اشارے سے کہا کہ آپ تشریف رکھئے۔ بیٹھتے بیٹھتے ان لوگوں نے رسم تعارف ادا کی۔ ایک صاحب بولے "مجھ مسکین کا نام **خیرات** ہے"۔ دوسرے بزرگ بولے "اس عاجز کو **پیری مریدی** کہا جاتا تھا"۔ تیسرے پرانے نے دبی زبان سے کہا "مجھ خاکسار کو **جادو** کے نام سے یاد کیا جاتا تھا"۔ چوتھے صاحب کچھ کہنے کو تھے کہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول اٹھا، "حضرت تعارف تو ہوتا ہی رہے گا آپ بیٹھیئے تو سہی مسلمان کا گھر ہے۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ اس قدر تکلف کیوں فرماتے ہیں؟ یہ جملہ چونکہ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا تو ان بزرگوں کے چہرے پر کچھ رونق سی نظر آئی۔ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ مجھ بدنصیب سے آج تک کوئی نیک کام نہ ہوا تھا۔ شاید یہی نیکی کام آجائے کہ میں اِن لوگوں سے اچھی طرح ملا ہوں۔

تھوڑی دیر تو ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ گردشِ ایام کی نسبت فقرے چست ہوئے۔ غرض کے بندوں کو بُرا بھلا کہا گیا۔ لوگوں کے ظاہر باطن کا پول کھولا گیا مگر آخر کار یہ وفد اپنے اصل مطلب پر آیا۔

جادو۔ سنیئے مسٹر۔ ہم جو مخل ہوئے ہیں تو کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں ہوئے۔ اپنا وقت اچھا یا برا ہم لوگ گذار چکے۔ نیا دور دورہ ہے اور اگر ہم لاکھ معقول وجہ بھی آپ کی سائنس کے برخلاف پیش کریں تو بھی ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہم ہزار دفعہ کہیں کہ "طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خرمی بینم" مگر ہماری سنتا کون ہے۔ جن لوگوں کی نظروں میں خر خر ہی نہیں بلکہ براق ہے ان سے بحث فضول ہے۔ ہمیں یہ فخر کافی ہے کہ ہماری اترن سائنس کے زیبِ سر ہے۔ ہم تو صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ اگر ہم لوگوں کے لئے پنشن بھی میسر نہیں ہو سکتی تو آپ کم از کم یہ تحریک تو کریں کہ ہماری تجہیز و تکفین تو ایک معقول طریقے سے کر دی جائے۔ اس سے زیادہ ہمارا کچھ مطلب نہیں۔ ہم اہلِ دنیا کی خدمت کرتے کرتے تھک گئے۔ خود اپنے آپ سے تھک گئے۔ ہم اب چلنے بھلے مگر کیا آپ کی خودداری اس امر کی اجازت دے گی کہ آپ کے بزرگوں کے ہم نوالہ ہم پیالہ اس غیر حالت سے مریں کہ ع

کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

میں۔ (رسمی طور پر) بندہ پرور للہ مجھ سے تو ایسے الفاظ نہ کہئے۔ بزرگوں سے جو آپ کی مراعات تھیں وہ میرے دل پر نقش ہیں اور کافر ہو جو یہ جانے کہ آپ کا وقت پورا ہو چکا۔ ابھی تو ہندوستان میں صدیوں آپ کا ڈنکا بجے گا۔

خیرات۔ آپ ہم سکینوں سے یہ رسمی جملے استعمال نہ کریں ہمارا جنازہ آج نہ نکلا تو کل نکلے گا۔ آپ سے عرض کرنے کا مدعا صرف اس قدر تھا

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

خدا کی شان کہ خود آپ بچپن میں ہم سے کھیلے اور اب یہ بیگانگی کہ مغربی تہذیب کے دامِ تزویر پھیلائے جاتے ہیں

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میں۔ معاف کیجیئے۔ آپ کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے۔ قوم کی احسان فراموشی کی آپ زندہ تصویر ہیں مگر آخر یہ تو فرمائیے کہ قوم بچاری خلافت والوں سے طلاق لینے کے بعد سیدھی تبلیغ تنظیم والوں کے گھر جا پڑی اور وہ لوگ پیسے پیسے کے پیر ہیں اب آپ کے لئے رقم آئے تو کہاں سے؟

پیری مریدی۔ تو گویا آپ کی طرف سے صاف جواب ہے۔

میں۔ جی نہیں۔ میں تو آپ لوگوں کا خادم ہوں جس باوفا نے آپ لوگوں کو لندن اور پیرس میں نہ بھلایا جس نے

وہاں سفید ہاتھوں پر بیعت کی ہو اور جو اخضر آنکھوں کے جادو سے نہ بچا ہو وہ آپ سے کیا بے اعتنائی کریگا مگر آپ ہی ارشاد کیجئے کہ اب صورت ہو تو کیا ہو؟

جادو، خیرات، پیری مریدی۔ (یک زبان ہو کر نہایت مایوسی کے لہجے میں) کیا آپ کو یقین ہے کہ مسلمان ایسے گئے گذرے ہو گئے کہ ہمارے نام سے بھی بیزار ہیں۔

میں۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ آپ یہ نہ فرمائیے۔ اب بھی لاکھوں خدا کے بندے ہیں جو آپ کا دم بھرتے ہیں مگر رفتارِ زمانہ کو تو دیکھئے۔

سب۔ تو ہم آپ سے کیا امید رکھیں؟

میں۔ مجھ بے بس کا زور چلے تو آج آپ سب کو مثلِ سابق تخت نشین کر دوں اور میری قوم کو بھی شاید عذر نہ ہو مگر مصیبت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو غیر مذاہب وہابی ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔ مکے مدینے میں لوگ وہابی ہو گئے تو لاہور بچارے پر کیا گلہ۔

سب۔ بڑی مشکل ہے۔ مرنے آپ نہ دیں جینے کے یوں لالے، ہم کریں تو کیا کریں۔

میں۔ حضرت۔ قرائن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کو رحلت ہی کرنی ہوگی اور وہ بھی خفیہ خفیہ مگر شرطِ ایمان تو یہ ہے کہ لَا تَقْنَطُوْا ممکن ہے کہ آپ کے دن پھریں اور پھر آپ اور میری قوم شیر و شکر ہو کر رہیں۔

سب۔ آپ نے رہا سہا بھی ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ گو ہم تھک گئے ہیں مگر ہم اب چلیں گے۔ رونا صرف یہی ہے کہ اگر ہم کو ذرا بھی شبہ ہوتا کہ مسلمان بھی ہم سے غداری کریں گے تو ہم آج سے کئی سو سال پہلے اس قوم سے پہلو تہی کرتے۔ افسوس ہے تو بس اس قدر کہ آپ نے بھی حقِ صحبتِ دیرینہ ادا نہ کیا۔ لیجئے۔ خدا حافظ

وہ بزرگ تو چل دیئے مگر ان کا آخری جملہ تیر کی طرح کھٹکا۔ میں ان کے پیچھے لپکا کہ انہیں بلاؤں، گلے سے لگاؤں اور یقین دلاؤں کہ اوروں کا تو ذمہ لینا مشکل ہے مگر جہاں تک میرا دم ہے ان کی عزت حرمت میں فرق نہ آئے گا۔ مگر وہ تھکے مسافر بلا کے گرم رفتار نکلے۔ یونہی جھلک سی دکھائی دی کہ وہ اسی گروہ میں مل گئے جس میں پرانے مصری فرعونی اعتقاد۔ پرانے یونانی اعتقاد۔ پرانے رومن اعتقاد۔ پرانے تورانی اعتقاد تھے۔ بہت دیر تک کلیجہ مسوسا کیا مگر آخر شکر کیا کہ اب مسلمانوں کو بھی موقع ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ یہ سوچیں کہ کیا تھا، یہ سوچیں کہ کیا ہو۔ مگر میرا شکر قبل از وقت ثابت ہوا کیونکہ جونہی میں مڑا تو پہلو سے ایک ناگوار قہقہہ کی

آواز آئی اور وہ بزرگ جن کو اپنا تعارف کرانے سے میں نے ٹوک دیا تھا تضحیک آمیز لہجہ سے فرمانے لگے: "آپ نے اُس وقت میری بات نہ سنی۔ مجھ ہیچمدان کا نام رواج ہے۔ آپ چند بوسیدہ اعتقادوں کے اُٹھ جانے پر اس قدر خوش کیوں ہیں؟ ابھی تو میرا تسلّط قائم ہے۔ جب تک شادی بیاہ، ترکہ، میراث اور روزانہ میل جول میں پرانے رسم و رواج قائم ہیں تب تک کیا ہو گی تدبیر عبث ہے۔ مشرقی انڈوں سے مغربی مرغے پیدا ہو چکے مگر میں آپ کو وعظ سنانے کے لئے حاضر نہیں ہوا۔ میں جو ان جوانا مرگوں کے ساتھ مل کر آپ کے پاس پہنچا تو اس کی علتِ غائی صرف یہ تھی کہ آپ کو اس خطرہ سے آگاہ کروں جو ذاتی طور پر آپ کو درپیش ہے۔ ایک دفعہ آپ میرا مقابلہ کر کے زک اُٹھا چکے ہیں۔ اب آپ کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں غازی کمال پاشا کے خیالات کی توسیع ہو اور دعویٰ آپ کا یہ ہے کہ آپ کے یہ خیالات اُس وقت سے ہیں جب ابھی کسی نے غازی پاشا کا نام بھی نہ سنا تھا۔ آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ قوم کے لیڈروں کی ہاں میں ہاں ملائیے اور اپنی مشرقی لکڑوں کوں کو جاری رکھئے۔

(۳)

جب یہ بڈھا اپنی بک بک ختم کر چکا تو مجھے خیال ہوا کہ رواج مذہبی عقائد سے کہیں زیادہ مضبوط ہے اور جو چند مستورات اس بڈھے کا گلا دبانے میں مصروف ہیں وہ اسے مذہب کے پھندے سے پھانسی دینا چاہتی ہیں حالانکہ رواج کی جان یہ ہے کہ جہاں اس سے لڑو وہیں وہ پہلے سے زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ یہ سوچتے ہی ہر روزانی روزانہ اخبار میں ایک اشتہار روانہ کیا۔

"ضرورت ہے سخت ضرورت ہے۔ فوراً ضرورت ہے۔ ایسے خندۂ پیہم کی جو ایک بڈھے کو ہنساتے ہنساتے اس کا دم نکال دے"۔

سائنس کی طرف سے جواب آیا کہ جناب من میرے کارخانے میں اور سب کچھ ہے مگر ہنسی کی ساخت شروع نہیں ہوئی۔

مذہب کی طرف سے جواب آیا "کارِ خیر میں بھی ہنسی سے امداد طلب کرنا مذہب کی توہین ہے"۔

اس جواب پر تو لاحول پڑھا اور پھر شیطان کا خط شوق سے کھولا۔ لکھتے ہیں۔

"حضرت میرے ایک چیلے سے میرے دوسرے چیلے کو قتل کرانا چاہتے ہو! بڑے اُستاد ہو کہ مولویوں کے کام میں ابلیس کی اعانت کے مدعی ہو"۔

جب ابلیس سے بھی مایوس ہوا تو عقل کے پوسٹ کارڈ پر نظر پڑی۔ بڑی بی نے صرف ایک

جملہ لکھا۔

"تم تو سودائی ہو"

(۴)

مگر مجھے اس بڈھے مسافر کو ضرور اگلے جہان کا ٹکٹ لے کر دینا ہے۔ اور اس ٹکٹ کے دام وہی ہیں یعنی خندۂ پیہم۔ اس قدر اس بڈھے پر ہنسا جائے، اس قدر اسے ہنسایا جائے کہ جہاں پیری مریدی کی قبر ہے وہیں اس کی بھی مڑھی بن جائے۔

فلک پیما

یاد

مجھے یاد کرنا جب میں یہاں سے چلا جاؤں
دور دراز کے خاموش اور سنسان ملک میں۔
جب تم میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لے سکو گی
اور نہ میں جاتے جاتے مڑ کر پھر رک سکوں گا۔
مجھے یاد کرنا جب وہ دن گذر کر دور ہو جائیں گے
جب ہم تم اپنے مستقبل کے لئے لطیف منصوبے باندھا کرتے تھے۔
صرف مجھے یاد کرنا تم جانتی ہو
کہ اس وقت مدد اور التجا کا وقت ختم ہو چکا ہوگا۔
لیکن اگر کچھ عرصہ کے لئے میری یاد فراموش ہو جائے
اور اس کے بعد میں پھر یاد آجاؤں، تو رنج نہ کرنا۔
اگر موت کی تاریکی اور قبر کے ڈراؤنے تغیرات کے خیالات
میرے گذشتہ جذبات کا ایک شمہ بھی تمہارے دل میں باقی چھوڑیں
تو کہیں بہتر ہے کہ تم مجھے بھلا کر مسکرا دو
بجائے اس کے کہ مجھے یاد کر کے رنجیدہ ہو۔

(روزیٹی)

محسن عبداللہ

درسِ عمل

علّامہ سر اقبال

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم — لیک نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم

موجِ زخود رفتہ تیز خرامید و گفت — ہستم اگر میروم، گر نہ روم نیستم

ترجمہ از آزاد انصاری

کسی کنارۂ ساکن نے بحر سے یہ کہا — اگرچہ خلق ہوئے مجھ کو مدتیں گذریں

مگر ہنوز عجب گومگو کا عالم ہے — نہ زندگی ہی مسلّم، نہ موت ہی کا یقیں

سنا جو موج نے لہرا کے یہ جواب دیا

"اگر رواں ہوں تو زندہ سمجھ، نہیں تو نہیں"

حکیم آزاد انصاری

جزیرۂ جاوا

بحرِ ہند میں جزیرۂ جاوا ایک سرسبز و شاداب زمردین خطۂ زمین ہے۔ گرد و نواح کے تمام جزیروں میں یہ سب سے زیادہ زرخیز ملک ہے۔ اس جزیرے پر ڈچ قوم کی حکومت ہے اور یہ اُن کا بڑا بیش قیمت مقبوضہ ہے کوہِ آتش فشاں کا سلسلہ جزیرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاری ہے۔ اکثر پہاڑ ہمیشہ آگ برساتے رہتے ہیں۔ دریا یہاں بے شمار ہیں اور زمین کا چپہ چپہ زرخیز ہے۔ چونکہ سطحِ سمندر سے یہاں کی زمین بہت بلند ہے اس لئے باوجود خطِ استوا پر واقع ہونے کے یہاں کی آب و ہوا نہایت معتدل و خوشگوار ہے۔ جو سطحِ زمین آٹھ سو فٹ سے زیادہ بلند ہے وہاں سرد ملکوں کے پودے اور درخت پائے جاتے ہیں۔ وادیوں اور میدانوں میں مختلف قسم کی پیداوار ہوتی ہے۔ مثلاً چاول، کافی، چاء، نیل وغیرہ۔ گنے اور یہاں کے مخصوص مصالحوں کی کاشت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ضروریاتِ زندگی اس قدر افراط کے ساتھ قدرت نے مہیا کردی ہیں کہ باوجود اس کے کہ ملک کا بیشتر حصہ اب تک جنگل ہے یہاں کی آبادی جس کا شمار دس لاکھ سے زائد ہے پچاس ہزار مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے جزیرے کا طول تقریباً چھ سو میل اور وسط میں اُس کا عرض تقریباً ساٹھ میل ہے۔

یہاں کی آبادی میں ملائے قوم کا عنصر غالب ہے، جو مغربی کوہستانی علاقہ میں سنڈین کے نام سے موسوم ہے یہ قوم اب تک غیر ملکی لوگوں میں مخلوط ہونے سے بچی ہوئی ہے۔ مشرقی علاقہ میں مادوری ایک قوم آباد ہے یہ لوگ بڑے مضبوط اور مستقل مزاج ہوتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں ہندو فتوحات کے زیرِ اثر وسطِ جزیرہ کی آبادی نسبتاً مہذب و متمدن ہوگئی تھی۔ اس دورِ تمدن کے آثار اب تک بکثرت شکستہ مندروں کی صورت میں پائے جاتے ہیں، جن سے اُس زمانہ کی معاشرت و صنعت و فنون کا پتہ چلتا ہے، کہ یہ لوگ بھی اسی قدر ذہین اور کاریگر تھے جس قدر کہ وہ لوگ جنہوں نے اہرامِ مصری تعمیر کئے تھے۔ پندرھویں صدی میں مسلمانوں نے اس جزیرے پر حملہ کیا تھا۔ ان کے تسلط سے یہاں کے قدیم مذہب اور خصوصیاتِ ملکی پر بڑا اثر پڑا۔

یہاں کے باشندے عموماً ذہین ہوتے ہیں۔ ان کی زبان اور لب و لہجہ میں اور ان کی رسوم وغیرہ میں مذہبی رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کے پاس ان کی قدیم زبان میں جو سنسکرت سے بہت مشابہ ہے ایک مقدس کتاب

ہے۔ اس کتاب کے علاوہ ادب وعلوم قدیمہ کا کچھ اور ذخیرہ بھی اس زبان میں اب تک محفوظ ہے۔ یہاں خوشخطی کا بڑا رواج ہے۔ اہلِ جاوا کی تحریر کی خوبصورتی اور خوشنمائی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ لوگ زیب وزینت، رنگ ونفاست کے بڑے دلدادہ ہیں۔ یہاں کی مشہور صنعت وحرفت کشتی سازی، کاسہ گری، چرم سازی، پارچہ بافی، کشیدہ کاری، رنگ سازی ہے۔ یہ لوگ کپڑوں پر تصویریں بنانے اور ہتھیاروں اور برتنوں پر نقش ونگار بنانے میں بڑے ماہر ومشاق ہیں۔ اس کے علاوہ زراعت بھی یہاں کا مرغوب پیشہ ہے۔ کاشتکار بڑے جفاکش اور محنتی ہوتے ہیں۔

اہلِ جاوا عموماً خوش اطوار و عافیت پسند ہوتے ہیں۔ فرمانبرداری ان کی فطرت میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈچ حکومت کے زیرِ اثر یہ لوگ نہایت امن وامان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں اہلِ چین اہلِ ہند، اہلِ عرب اور دوسرے ملکوں کے لوگ بسلسلۂ تجارت وہاں آکر آباد ہو گئے ہیں اور اصلی باشندوں کے ساتھ مخلوط ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اہلِ جاوا بہت آزادی کے ساتھ دوسری اقوام سے شادی بیاہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اہلِ چین کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے یہ لوگ اپنے ملک سے اپنی عورتیں ساتھ لاتے ہیں۔

ابتدا میں جب یورپ نے یہاں نو آبادیوں کا سلسلہ قائم کیا تو سب سے پہلے پرتگالی یہاں آئے لیکن اُن کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ یہاں کی سرزمین میں قدرت نے کیسے کیسے خزانے چھپا رکھے ہیں۔ سولھویں صدی کے آخر میں ڈچ قوم نے اپنے قدم جمانے شروع کئے۔ اسی درمیان میں انگریزوں کی آمد ورفت بھی شروع ہو گئی۔ لیکن ایک صدی کے بعد انگریز تو یہاں سے چلتے بنے مگر ڈچ لوگ اپنا ڈیرہ ڈالے رہے اور جنگی محاربوں کے ساتھ رفتہ رفتہ تمام ملک پر انہوں نے اپنا قبضہ کر لیا۔ ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۶ء تک جاوا پر انگریزوں کا تسلط تھا لیکن صلحِ عام کے بعد انگریزوں نے یہ نو آبادی ہالینڈ کو دے دی۔ اب یہاں ہالینڈ کی دو عملی حکومت ہے۔ کچھ تو ایسی ریاستیں ہیں جن پر ملکی شہزادے حکمران ہیں لیکن اُن کے مشیرِ کار ڈچ ریزیڈنٹ ہیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہر گاؤں میں ایک سردار یا سرگروہ منتخب کر لیا جاتا ہے اور وہی ان پر حکومت کرتا ہے۔ اہلِ جاوا کی طینت میں غلامی کا مادہ سرایت کئے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی انتہائی تمنا یہ ہوتی ہے کہ اُن کو ڈچ حکومت کی ماتحتی میں کوئی ملازمت مل جائے۔

جزیرہ جاوا میں سربیا ایک نہایت آباد تجارتی شہر ہے اور بڑا عالی شان بندرگاہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں جزیرہ مدورا واقع ہے۔ اس بندرگاہ سے ایک ریلوے لائن سولونگ جاری ہے۔ شہر سولو جزیرے کے

اندرونی حصے میں واقع ہے اور یہاں کا دارالحکومت ہے۔ ایک ملکی شہزادہ یہاں برائے نام بادشاہ ہے۔ ورنہ دراصل عنانِ حکومت ڈچ ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ سولو ریلوے لائن کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ جزیرے میں ہر چہار طرف یہاں سے ریلوے لائن جاری ہے۔ جزیرے کے اس حصے میں جوکجوکارتا ایک آزاد سلطنت ہے۔ یہاں کا رئیس سلطان کے لقب سے موسوم ہے۔

یہاں اکثر شہر بارونق اور آباد ہیں ریلوں کی کثرت سے ان میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔ سڑکیں بہت کشادہ اور صاف ہیں۔ دیہاتوں کی سڑکیں بہت عمدہ اور سایہ دار بنی ہوئی ہیں۔ دریاؤں پر کثرت سے پل بنائے گئے ہیں یا کشتی کے پلوں کا انتظام ہے۔ شہروں میں خوب ہل چل رہتی ہے۔ سڑکیں ہمیشہ آدمیوں سے بھری رہتی ہیں۔ لوگ طرح طرح کے رنگین اور بھڑکیلے لباس پہنے چلتے پھرتے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مردوں کی ٹوپیاں چھاتے سے ملتی جلتی پٹاری کی طرح ہوتی ہیں۔ یہ چپاؤ دار اور مختلف رنگوں کی بنائی جاتی ہیں۔

دیہاتوں میں کثرت سے کیلوں اور بانسوں کے کنج سرسبز و شاداب کھیتوں کے درمیان پائے جاتے ہیں یہاں تمام سال ہر موسم میں تخم ریزی ہوتی رہتی ہے اور ساتھ ساتھ فصلیں کٹتی رہتی ہیں۔ زمین کا ایک ایک بسوہ کارآمد بنا لیا گیا ہے۔ یہاں کی پہاڑیوں کا منظر بھی خوب ہوتا ہے۔ ہرے بھرے لہراتے ہوئے دھانوں کے کھیت ان پر چاروں طرف دکھائی دیتے ہیں اور ان کے بیچ بیچ میں چھوٹی چھوٹی نہریں جاری ہوتی ہیں جن کی وجہ سے پہاڑیوں کا نظارہ نہایت دلفریب و دلکش معلوم ہوتا ہے۔

موسم کی حالت تمام سال یہاں ایک سی رہتی ہے۔ اور ہمیشہ بہار جیسا سماں رہتا ہے۔ اس لئے قدرتی مناظر میں ایک دائمی حسن پیدا رہتا ہے۔ قدرتی مناظر میں جس قدر رنگوں کی افراط اور گوناگونی یہاں پائی جاتی ہے شاید ہی اس قدر کہیں اور ہو۔ مارچ سے اکتوبر تک البتہ آسٹریلیا کے ریگستان سے خشک آندھیاں اس جزیرے کے شرقی حصہ میں کچھ دنوں کے لئے خزاں کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں پھر ملک سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ شاذ و نادر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پانی متواتر کئی کئی سال تک نہیں برستا خشک سالی کی وجہ سے قحط پڑ جاتا ہے اور خلقِ خدا تباہ و برباد ہونے لگتی ہے۔ لیکن جیسے ہی پانی برسنا شروع ہوا تمام ملک میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ساری فضا خوشحالی اور فراغ بالی کے ترانوں سے گونج اٹھتی ہے۔ بارش عموماً سہ پہر کو ہوتی ہے۔ اور اس قدر پابندی اور التزام کے ساتھ ہوتی ہے کہ گویا کہیں بارش کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر روز وقتِ معینہ پر اُس کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور بادل اُٹھ کر پانی برسا جاتے ہیں۔

محمد عبدالحی

میں حیران ہوں!

میں یہ سوچتا ہوں کہ آج سے چھ سات ہزار سال پہلے جب آدم نے پہیے کو ایجاد کیا تو اُس نے کیا خیال کیا ہوگا؟ ـــــ اُس نے ایک ایسے عقدہ کو حل کیا جس کے طفیل اس نے اپنے زمانے کو باربرداری، سواری اور دیگر ضروریات کے لئے بیل گاڑی جیسی کارآمد چیز دی۔ اور پھر ساتھ ہی کمہار کو چاک جیسی مفید شے مل گئی جس سے برتن اور دیگر اشیاء بننے لگیں۔ چرخا بنا، آدمی کاتنے، بننے، کپڑا پہننے لگا۔ دنیا کا وہ اولین محسن جو چکّر کا موجد ہے جس نے وہ چیز نکالی جو آج کل موٹریں، ریلیں، ہوائی جہازیں رونما ہے اپنے زمانہ کا ایڈیسن ہوگا۔ اُن دنوں لوگ اپنے آباؤاجداد سے اپنے آپ کو بڑھ چڑھ کر جانتے ہونگے۔ اُس وقت کے لوگ یہ کہتے ہونگے کہ اس "جدید زمانے" میں بھی لوگ کتنے جاہل ہیں کہ انہیں کسی بات کی سمجھ نہیں۔ وہ حیوانوں کے مشابہ ہیں، ان میں "ابھی تک" بربریت، بہیمیت اور سفاکی پائی جاتی ہے۔ جوان آدمی کہتے ہونگے کہ ابھی تک لڑکیاں اُن سے جھینپتی ہیں، ان سے بچتی ہیں اور محبت کو نہیں جانتیں۔ نوخیز، پختہ کاروں کو ابلہ، سٹھیایا اور بہترا کہتے ہونگے۔ لوگ تانبے، پیتل کے برتن، ہتھیار، ساز و سامان اور زیورات کے استعمال میں پھولے نہ سماتے ہونگے۔ وہ ازمنۂ حجریہ کے باشندوں کو کتنا حقیر جانتے ہونگے اور بزعمِ خود دنیا کے افضل ترین، اشرف ترین اور افہم ترین انسان ہونگے۔

اس کے بعد زمانۂ حدیدیہ کے لوگ اور بھی مغرور، طاقتور اور لئیق ہونگے۔ پیتل تانبے کے زمانوں کو وہ بہت نیچا گردانتے ہونگے۔ پچھلے لوگوں کی باتوں، قصوں اور روایتوں پر خوب ہنستے ہونگے۔ ان کے کھنڈروں اور دیگر آثار کو دیکھ کر وہ لوگ کون جانے کن کن خداؤں کی درشتی اور غیض و غضب سے تھرّاتے ہونگے۔ اُن دنوں ایہوا جو بعد میں یہودہ۔ جیہودا (Jehovah) جوپیٹر (Jupiter) جوو (Jove) اور God بنا دنیا پر اور لوگوں کے دماغوں پر متمکن تھا۔ ان دنوں ہر خارجی طاقت ذی روح تھی، ان دنوں خدا لوگوں کے بہت نزدیک تھے اور بہت مغلوب الغضب تھے۔ وہ قہاریت، جبروت اور ہیبت سے عالم کو منظم کرتے تھے۔ ان دنوں آدم بہت پست تھا کیونکہ خداوندستانے اور مٹانے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ مگر لوگوں کے دل وسیع تھے کیونکہ وہ ایک خدا کا تصور اپنے باقی ماندہ خداؤں کی بے حرمتی شمار کرتے تھے۔ اِخناٹن بیچارا وہ فرعونِ مصر جو توحید کا

پہلا مُبلغ تھا مصریوں کے غصّہ کا شکار ہُوا اور اپنی سلطنت تک کھو بیٹھا۔ مگر لوگ خداوندانِ عالم کی اُسی تعبد، ذلّت اور خوف سے پرستش کرتے رہے۔ آدم جب بھی اپنے زمانے کی بہترین مخلوق تھا۔

اسیریوں، بابلیوں اور کلدانیوں کی دنیا جو دجلہ و فرات کے منبع سے لے کر خلیج فارس تک لمبائی میں اور ایران سے لے کر مصر تک چوڑائی میں پھیلی ہوئی تھی۔ جنھوں نے علم النجوم کی بنیاد ڈالی، جنھوں نے پہلے پہل قانون مرتب کئے، وہ جنھوں نے اول اول گھوڑوں کا استعمال کیا اور جنھوں نے اپنی تہذیب کو مصری پیوند دے کر حطّیوں کو ورثہ میں چھوڑا، اُن کا آدم دنیا کا اکمل ترین انسان سمجھا جاتا تھا۔

حطّی، کریٹی، ایجی اور دُوری اقوام پے بہ پے مہذب ہوئیں، بڑی بڑی سلطنتوں کی موسس ہوئیں تمدن کی راہ میں کئی ایک قدم بڑھیں۔ علم التعمیر میں انہوں نے رنگ رنگ کی اختراعات کیں۔ کتنی چیزیں سنوریں بہتر ہوئیں علم میں، دولت میں، طاقت میں ترقی ہوئی۔ ان دنوں جب کناسس کے محلات میں منوئی بادشاہ لڑکیوں کا ناچ اور سرکس کے کھیل دیکھا کرتے تھے، جب آدم کا دماغ ماقبل سے کئی درجہ اونچا تھا۔

یونانیوں میں آدم بہت بڑھا پھولا، ان کی تخم ریزی لوگ اب تک نہیں بھولے، ان کے آثار ابھی تک تحسین کا خراج لے رہے ہیں۔ اور معلوم نہیں ان کی آبیاری کتنی دیر تک پھل لاتی رہے گی۔ ان دنوں جب سقراط دنیا کا اجمل ترین اور اعقل ترین شخص تھا، وہ زمانہ کیا تھا؟ جب حسن کی تعظیم میں آدمی بلند ترین مقاموں تک

تصاویر دیکھنے لگے اس وقت آدم فضائے بسیط میں اُڑنے لگا۔

اور اب جس وقت لاسلکی کے ذریعہ سے عکاسی ہو رہی ہے اور روحانیات اور دور احساسی کے مسائل ابعادِ ربعہ کی باریکیوں کے ساتھ ہمارے دماغوں میں کھولے جا رہے ہیں، جب آدم نیچر کو تسخیر کر رہا ہے، جب ہم دس ہزار سال کی سعیِ پیہم کے جائز وارث سمجھے جاتے ہیں، جب ہم مستقبل کو جوان نظروں سے دیکھ رہے ہیں، جب ہمارے خون میں حدت ہے، دل میں جوش ہے، دماغ میں بصیرت ہے اس وقت میں تنہائی میں بیٹھا سوچتا ہوں کہ میرے آباؤ اجداد میں کوئی آج سے ہزار، دو ہزار، دس ہزار سال پہلے بھی سوچ رہا ہوگا کہ وہ کتنا ترقی یافتہ، مہذب اور متمدن ہے۔ وہ ماضی کی سطح سے کتنا اونچا اور اُس کی فکر کتنی رسا ہے۔

اور جب میں خیال کرتا ہوں کہ آج سے دو ہزار سال بعد میری اولاد یہ سوچتی ہوگی کہ بیسویں صدی میں دنیا ابھی صغر سن تھی اور لوگ کورانہ خیالات رکھتے تھے، وہ کس قدر توہم پرست تھے ان کے افکار و افکار کتنے طفلانہ تھے تو چالیسویں صدی کا آدم مجھے یہ کہتا سنائی دیتا ہے "میں کتنا اعلیٰ اور برتر ہوں"۔ میں یہ سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں!

فیاض محمود گیلانی

جامِ صہبائی

(۱)

جامِ مئے لالہ گوں کہاں سے لاؤں
درمانِ غمِ دروں کہاں سے لاؤں
تا کے ہے اضطرابِ ناآسودہ
بیچین کو سکوں کہاں سے لاؤں

(۲)

گر زیست ہے جبر تو زحمت سہیے
زہرابِ الم کے جام پیہم پیجیے
تعویذِ آرام صبرِ کوہِ غم بھی
گردن نہ کبھی جھکا کے جیتے جیجیے

(۳)

تاریکیِ شب میں روح گھبراتی ہے
پیغامِ طرب مگر سحر لاتی ہے
ہستی پہ جو چھائے ہیں تو آفات بھی ہے
یوں سب کی گزرتی ہے گزر جاتی ہے

(۴)

جو لطف کہ جستجو میں ہے حاصل میں نہیں
لذت جو کشاکشِ رہِ دور میں ہے منزل میں نہیں
وہ منظرِ زندگی کہ امواج میں ہے
مستی میں نہیں سکونِ ساحل میں نہیں

دیوار پر چہرہ

گزشتہ شام ڈینی کے ہاں ایک واقعہ پر مجھے اتنی خفت اٹھانی پڑی کہ اب تک میں سخت منفعل ہوں، ہاں اتنا اطمینان ہی کہ اِس انفعال میں بہت سے دوسرے لوگ بھی میرے شریکِ حال ہیں، — غرض —

— مرگِ انبوہ جشنے دارد —

فوق الفطرت واقعات کا تذکرہ ہو رہا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ موضوع جس قدر لا حاصل ہے اسی قدر دلفریب بھی ہے۔ چنانچہ ہم میں سے تقریباً ہر شخص نے کوئی نہ کوئی واقعہ بیان کیا لیکن ان بیانات سے سننے والے کچھ بہت زیادہ متاثر نہ ہوئے۔ جن لوگوں سے میری شناسائی نہ تھی اُن میں مختصر سے قد و قامت کا ایک زرد رو شخص بھی تھا جو بشرے سے بہت متفکر معلوم ہوتا تھا۔ اس شخص کو رڈسن وائٹ اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ ہم میں سے ہر ایک کا بیان نہایت توجہ سے سنتا رہا لیکن اپنی زبان کو اُس نے مطلق جنبش نہ دی۔ پھر اُسے بھی گفتگو میں شریک کرنے کے لئے ڈینی نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا "کیا آپ کو کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو قابلِ ذکر ہو، کوئی ایسی داستان جس کا کوئی حصہ ناقابلِ توجیہ ہو؟"

اُس نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا "اچھا تو پھر سنئے مگر یہ کوئی داستان نہیں، یعنی داستان کا لفظ عرفِ عام میں جس مفہوم کا حامل سمجھا جاتا ہے اس کا اطلاق میرے بیان پر نہیں ہو سکتا۔ آپ میں سے اکثر صاحبوں نے محض سنی سنائی باتیں بیان کی ہیں، لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ حقیقت افسانہ کے مقابلہ میں نہ صرف بدرجہا تحیر خیز ہوتی ہے بلکہ بدرجہا زیادہ دل آویز بھی ہوتی ہے۔ میری داستان آپ بیتی ہے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج ہی سہ پہر کے وقت یہ داستان تکمیل کو پہنچی"۔

ہم نے بہ اصرار اس سے داستان شروع کرنے کی درخواست کی۔

اس نے کہا "سال یا دو سال قبل میں نے "گریٹ آرمنڈ سٹریٹ" میں ایک قدیم مکان کے چند کمرے اپنے رہنے کے لئے کرایہ پر لے رکھے تھے۔ سونے کے کمرے کی دیواروں پر کسی سابق کرایہ دار نے رنگ کرایا تھا لیکن چونکہ جگہ سیلی تھی اس لئے دیواروں پر جا بجا رنگ کے چٹخنے سے بڑے بڑے نقش بن گئے تھے۔ ان میں سے ایک، جیسا کہ اکثر اتفاق ہوتا ہے ہو بہو انسانی چہرے سے مشابہ تھا اور یہ مشابہت معمول سے بہت زیادہ

تو ہی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چونکا دینے والی تھی۔ صبح کے وقت بستر پر لیٹے لیٹے اور بیٹھتے اُٹھتے یہ چہرہ ہمہ دم میری آنکھوں کے سامنے رہتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ مجھے ایک حقیقی چہرہ معلوم ہونے لگا اور میں اسے اپنا شریکِ خانہ سمجھنے لگا تعجب یہ تھا کہ دیواروں پر اس قسم کے دوسرے تمام نقوش ٹوٹتے اور اپنی ہیئت تبدیل کرتے رہتے تھے لیکن یہ ہمیشہ بالکل غیر متغیر اور ہمیشہ بالکل ویسے کا ویسا رہتا۔

"اسی زمانے میں مجھ پر نزلہ اور بخار کا ایک شدید حملہ ہوا اور مرض نے کسی قدر پیچیدہ صورت اختیار کر لی میں دن بھر بستر پر لیٹا مطالعہ اور سوچ بچار میں مستغرق رہتا تھا۔ اس کے سوا مجھے اور کوئی کام نہ تھا۔ انہیں دنوں وہ چہرہ میرے دل و دماغ پر اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ مستولی ہونے لگا۔ میں اُسے روز بروز زیادہ حقیقی اور روز بروز زیادہ جاذبِ توجہ پاتا تھا بلکہ وہ دن اور رات ہر وقت میرے خیالات پر حاوی رہتا تھا۔ ناک کی ایک نرالی وضع اور پیشانی کے ایک مخصوص جھکاؤ کی وجہ سے اس چہرے میں انفرادیت کا امتیاز بدرجۂ اتم موجود تھا۔ یہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جسے ہم ہزارہا انسانوں میں سے صاف الگ پہچان سکتے ہیں۔

صحت پانے کے بعد بھی میرے خیالات اس چہرے کی قید سے آزاد نہ ہونے پاتے۔ میں بازاروں میں اُس کے ہم صورت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا تھا۔ مجھے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں ایسا ایک حقیقی شخص بھی ضرور موجود ہے اور میرا اس سے ملنا ناگزیر ہے۔ مجھے اس کی کوئی وجہ معلوم نہ تھی کہ میں اپنی اور اس کی ملاقات کو کیوں اٹل سمجھتا تھا، مجھے صرف اتنا یقین تھا کہ کارفرمایانِ قضا و قدر نے کسی پُراسرار طریقہ سے میری اور اُس کی ذات کو باہم وابستہ کر رکھا ہے۔ میں عام اجتماعات میں کثرت سے آنے جانے لگا۔ سیاسی مجالس، فٹ بال وغیرہ کے مقابلوں اور ریلوے سٹیشنوں پر میری جستجو پرور نگاہیں ہر طرف دیوانہ وار پھرا کرتی تھیں ــــــــ بالخصوص صبح کے وقت، جب مضافاتی ٹرینیں پلیٹ فارم پر آ کر انسانوں کو انبوہ در انبوہ اگل دیتی تھیں، اور پھر شام کے وقت جب وہ انہیں دوبارہ نگل جانے کے لئے آن موجود ہوتی تھیں۔ لیکن میری یہ تمام تگ و دو بالکل بے حاصل ثابت ہوئی۔ یہ حقیقت اس سے قبل مجھ پر کبھی اتنی واضح طور پر نہ کھلی تھی کہ انسانی چہرے کی اس قدر کثیر التعداد مختلف صورتیں ہیں، اور پھر اس قدر کم! کیونکہ اس اختلاف کے باوجود ہم ان کو از روئے اصطفات اتنے قلیل التعداد گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں کہ اُن کا شمار ہاتھوں کی انگلیوں پر ہو سکتا ہے۔

"یہ جستجو میرے لئے ایک سودا بن گئی اور میں بجز اس جستجو کے دوسری ہر بات سے غافل ہو گیا۔ میں بیچ بیوپار کی منڈیوں اور عام گزرگاہوں میں لوگوں کی بھیڑ پر نظر جمائے برابر پہروں کھڑا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے

لگے۔ اُدھر کوتوالی کی توجہ میری طرف منعطف ہوگئی اور وہ مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ نسوانی چہروں سے میری غلط انداز نگاہیں کوئی واسطہ نہ رکھتی تھیں۔ بس مرد اور صرف مرد ہی میری نظر بازی کا مرکز تھے؟"

احساسِ کوفت کی شدت کے باعث اُس نے اپنا ہاتھ پیشانی پر پھیرا اور پھر اپنی داستان کو جاری رکھتے ہوئے کہا "آخر میں نے اُسے دیکھ لیا وہ ایک ٹیکسی میں سوار تھا جو پکیڈلی میں مشرقی سمت کو جارہی تھی میں دفعتہً مڑا اور کچھ دور تک اُس کے ساتھ بھاگا۔ پھر مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ میں نے ڈرائیور سے ہانپتے ہوئے کہا اس ٹیکسی کا تعاقب کرو اور خود اچھل کر اس میں سوار ہوگیا۔ ڈرائیور نے اس ٹیکسی کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ آخر ہم چیرنگ کراس پہنچے اور میں ٹیکسی سے اترتے ہی پلیٹ فارم کی طرف بھاگا۔ وہاں میں نے اُس شخص کو دو خاتونوں اور ایک ننھی بچّی کے ساتھ کھڑا پایا۔ وہ دو بج کر بیس منٹ کی گاڑی سے فرانس کو روانہ ہونے والے تھے۔ میں اس کے ساتھ ایک آدھ بات کرنے کا موقع پانے کے لئے اس کے قریب اِدھر اُدھر منڈلاتا رہا لیکن مجھے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بہت سے اور لوگ بھی اُسے رخصت کرنے کے لئے سٹیشن پر آپہنچے تھے اور وہ اُن کے درمیان گھرا ہوا گاڑی میں سوار ہوگیا پھر میں نے بھی جلدی سے فوکسٹن کا ٹکٹ خرید لیا۔ مجھے امید تھی کہ وہاں جہاز کے روانہ ہونے سے قبل میں اس سے مل سکوں گا۔ لیکن فوکسٹن میں وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مجھ سے قبل جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوگیا۔ جہاز کے اس حصے میں اُس نے متعدد کمرے اپنے لئے مخصوص کرا رکھے تھے میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی نہایت متمول شخص ہے۔

"مجھے پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اس پر میں نے بھی سمندر کو عبور کرنے کا ارادہ کرلیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جہاز کا سفر شروع ہونے کے بعد وہ خاتونوں کو تنہا چھوڑ کر عرشے پر ٹہلنے کے لئے باہر آئے گا۔ میرے پاس اُس وقت بولون تک صرف ایک طرف کے کرائے کی رقم تھی لیکن ان باتوں سے میرا عزم کہاں متزلزل ہونے والا تھا۔ میں اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے ہی بیٹھ کر انتظار کی ساعتیں گننے لگا۔ ایک مدت کے انتظار کے بعد دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلا لیکن چھوٹی بچّی اس کے ساتھ تھی۔ میرا دل نہایت زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے اس کے چہرے کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہوئی تھی۔ ایک ایک خال اور ایک ایک خط اسی پیوا والے چہرے کا تھا۔ اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور پھر عرشۂ جہاز کے بالائی حصے پر جانے کے لئے ایک بغلی راستے کی طرف ہولیا۔ میں نے دل میں کہا کہ اگر اب بھی میں ناکام رہا تو پھر مجھے کامیابی سے ہمیشہ کے

لئے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہہ ہی دیا معاف فرمائیے میں حائج ہوں لیکن اگر آپ مضائقہ نہ سمجھیں تو مجھے اپنا ملاقاتی کارڈ عنایت فرمائیے۔ میں نہایت اہم وجوہ کی بنا پر آپ سے تعارف حاصل کرنے کا خواہشمند ہوں،

"وہ یہ سُن کر کچھ متحیر سا رہ گیا لیکن اُس نے میری درخواست قبول کر لی چنانچہ نہایت دلجمعی کے ساتھ اُس نے جیب میں سے اپنا کارڈ نکالا اور اسے میرے حوالہ کر کے خود بسرعت تمام بگھی کی معیت میں آگے نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ اُس نے مجھے دیوانہ خیال کیا اور یہی زیادہ مناسب سمجھا کہ میری خواہش پوری کر دی جائے۔

"میں کارڈ کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے کر اُسے پڑھنے کے لئے جہاز کے ایک تنہا گوشے میں چلا گیا۔ میری آنکھیں پتھرا گئیں اور میرا سر چکرانے لگا جب میں نے کارڈ پر اُس کا نام پڑھا: مسٹر آرمنڈ وال۵ پٹس برگ، ریاستہائے متحدہ امریکا۔ اس کے بعد مجھے اور کچھ یاد نہیں۔ جب میں ہوش میں آیا تو میں نے اپنے آپ کو بولون کے ایک شفاخانے میں پایا۔ وہاں میں ہفتوں خراب و خستہ حالت میں پڑا رہا اور اب مجھے وہاں سے واپس آئے بمشکل مہینا بھر گزرا ہے"۔

اس کے بعد وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

ہم سب فرطِ حیرت سے کبھی اُس کی طرف اور کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے۔ اس شام ہم نے جس قدر باتیں سنی تھیں وہ اس چھوٹے سے زرد رُو آدمی کی داستان کے مقابلہ میں بالکل ہیچ معلوم ہوتی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد اُس نے کہا "میں نے گریٹ آرمنڈ سٹریٹ میں واپس آکر اس امریکن کے حالات کی تحقیق و تفتیش کا کام شروع کیا جس کی زندگی میں بعض پُر اسرار اتفاقات نے مجھے یوں دخل انداز کر دیا تھا۔ میں نے پٹس برگ میں لوگوں کو خطوط لکھے، امریکن ایڈیٹروں سے مراسلت کی اور لنڈن میں جو امریکن مقیم تھے اُن سے میل ملاقات شروع کی لیکن مجھے بجز اس کے اور کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ایک کروڑپتی ہے اور اس کے والدین انگریز تھے جو لنڈن میں رہا کرتے تھے۔ یہ مجھے باوجود انتہائی کوشش کے معلوم نہ ہو سکا کہ لنڈن میں اُن کی جائے سکونت کس مقام میں تھی۔

"گزشتہ صبح تک حالات بدستور رہے۔ میں رات کو معمول سے زیادہ تھکا ماندہ لیٹا تھا، اس لئے دیر تک سوتا رہا۔ جب میں بیدار ہوا کمرے میں دھوپ پھیل رہی تھی۔ میں نے حسبِ عادت سب سے پہلے دیوار پر چہرہ

---

۵ WALL دیوار

دیکھنے کے لئے نظر اٹھائی۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے مل مل کر دیکھا اور خوف و ہراس سے کانپ اٹھا چہرہ کے محض دھندلے سے نقوش دکھائی دے رہے تھے۔ گزشتہ ہی شب چہرہ حسبِ سابق بالکل صاف صاف نظر آتا تھا بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کیا ہی چاہتا ہے لیکن اب صرف ایک ہیولیٰ سا باقی رہ گیا تھا۔

"میں افسردہ و سراسیمہ بستر سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ صبح کے اخبارات چھپ کر بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے آ چکے تھے۔ فہرستِ مضامین کے اشتہاروں میں میری نظر اس عنوان پر پڑی "امریکن کروڑپتی کو موٹر کا حادثہ" آپ سب نے اخبارات میں یہ واقعہ پڑھا ہوگا۔ میں نے فوراً اخبار خرید لیا اور جو خبر مجھے پڑھنی چاہئے تھی پڑھی۔ "پٹس برگ کے کروڑپتی مسٹر آرمنڈ وال متعلقین کے ساتھ ایک موٹر کار میں سپیزا سے پیسا کو جا رہے تھے کہ ان کی موٹر ایک چھکڑے سے متصادم ہو کر الٹ گئی۔ مسٹر وال کی حالت نازک ہے"

"میں اسی سراسیمگی کی حالت میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور پلنگ پر بیٹھ کر اپنی دھندلی آنکھوں سے دیوار پر چہرے کو دیکھنے لگا۔ اسی حالت میں چہرہ دفعتہً بالکل غائب ہو گیا۔

"بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ضربات کی شدت کے باعث مسٹر وال غالباً ٹھیک اسی وقت جاں بحق ہو گئے تھے"

اس کے بعد وہ پھر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

ہم سب نے فرداً فرداً مختلف کلمات سے اظہارِ تعجب کیا اور فی الواقع یہ مقامِ استعجاب تھا۔

پھر اجنبی نے کہا "مجھے اس واقعہ میں تین باتیں نہایت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ لنڈن کے ایک مکان کی دیوار کے چٹخنے سے نہ صرف ایک ایسے شخص کی صورت بن گئی جو امریکا میں تھا بلکہ یہ صورت اس شخص کی زندگی کے ساتھ نہایت گہرا ربط بھی رکھتی تھی اس واقعہ کی توجیہ سائنس سے فی الحال ممکن معلوم نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس شخص کا نام بھی اسی مقام سے ایک نسبت رکھتا تھا جہاں کسی پوشیدہ قوت نے ایک عجیب و غریب طریقے سے اس کی صورت بنا دی تھی۔ یقیناً آپ کو بھی ان واقعات پر حیرت ہوئی ہوگی"۔

ہم سب نے اس سے اتفاق کیا اور پھر ہم لوگوں کے درمیان فوق الفطرت مظاہر کے متعلق دوبارہ وہی بحث پہلے سے دو چند جوش و خروش کے ساتھ چھڑ گئی۔ اس اثنا میں وہ اجنبی شخص اٹھا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوا۔ ابھی وہ دروازے ہی میں تھا کہ ہم میں سے ایک شخص نے "مقامِ مسرت ہے کہ وہ میں نہیں تھا" اس سے

اس دلچسپ واقعہ کے متعلق تیسری حیرت انگیز بات دریافت کرکے ہمیں اپنی گرماگرم بحث کے محرک کی طرف دوبارہ متوجہ کیا سپینٹن نے اُسے یاد دلایا کہ اُس نے تین حیرت انگیز باتیں کہی تھیں۔

اُس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "ہاں وہ تیسری بات، میں اسے بھول ہی رہا تھا۔ تو اس داستان کے متعلق وہ تیسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میں نے اسے نصف ہی ساعت قبل تصنیف کیا تھا۔ لیجئے خدا حافظ"

ہوش و حواس درست ہونے کے بعد ہم نے رڈسن وائٹ کو تلاش کیا جو اس مارِ آستین کو محفل میں لے کر آیا تھا لیکن وہ خود بھی غائب ہو چکا تھا۔

(ترجمہ) حامد علی خاں

دیہاتی گیت

۱۔ میری بارہ برس کی عمر میں میرے پران ناتھ پردیس گئے۔ بارہ برس کے بعد لوٹے تو باغ میں ڈیرا ڈالا۔ انہوں نے گاؤں والوں کو بلا کر پوچھا کہ میری بیوی کی چال ڈھال کیسی ہے۔

۲۔ گاؤں والوں نے کہا آپ کی بیوی بڑی نیک ہے اُس کے چہرے سے روحانیت برستی ہے وہ عالی خاندان اور نہایت شریف ہے۔

۳۔ باغ سے اٹھ کر شوہر اپنے دروازے پر آیا اور اُس نے خادمہ کو بلا کر پوچھا کہ میری بیوی کا رنگ ڈھنگ کیسا ہے؟

۴۔ خادمہ نے جواب دیا "مالک! آپ کی بیوی انگوٹھا دبا کر چلتی ہے۔ گھونگھٹ کاڑھ کر قدم اٹھاتی ہے وہ بڑے گھر کی لڑکی ہے اُس نے تینوں خاندانوں (ننہال۔ ددھیال اور سسرال) کی عزت کو برقرار رکھا ہے۔

۵۔ شوہر اب اپنے گھر میں داخل ہوا اُسے دیکھتے ہی ماں نے چوکی بچھا دی اور بہن پانی لے کر دوڑی۔

۶۔ اُس نے ماں سے پوچھا کہ میری بیوی کا چال چلن کیسا ہے۔ ماں نے کہا۔ بیٹا! تیری بیوی تیری محبت میں مگن ہمیشہ نیچی نظر کرکے چلتی ہے۔

۷۔ میرے لختِ جگر! میری بہو کا بدن تو سوکھ گیا لیکن اس کے چہرہ پر شوہر کی غیر فانی محبت چمکتی رہتی ہے۔ وہ شریف خاندان کی لڑکی ہے اُس نے تینوں خاندانوں کی عزت کا خیال رکھا ہے۔

۸۔ شوہر اب اپنی خوابگاہ میں پہنچا اس کی بیوی وہاں سو رہی تھی۔ اُس نے جگا کر اُس کو چھاتی سے لگا لیا اور پوچھا کہو کیسی ہو؟ بیوی نے جواب دیا "میرے سرتاج! آپ کے بغیر نہ تو میں نے پان کھایا اور نہ چھالیا کتری۔

۹۔ آنگن تو میرے لئے بیابان جنگل اور دروازہ خواب و خیال تھا آپ کی جدائی میں مجھے سیج کالی ناگن کی طرح کاٹتی تھی۔

اعظم کریوی

غزل

یہ کاوش باوجودِ سعیِ امکانی نہیں جاتی
محبت کی خلش دل سے بآسانی نہیں جاتی

نظر آیا تھا اِک دن جلوۂ رخ بے حجابانہ
اُسی دن سے تصوّر کی پریشانی نہیں جاتی

طلسمِ رنگ و بُو کی سب حقیقت کھل گئی پھر بھی
سرابِ زندگی! تیری درخشانی نہیں جاتی

شعاعِ حُسن سے پھر جگمگا دے خلوتِ غم کو
دلِ ویراں کی ہیبتناک ویرانی نہیں جاتی!

کہیں بھولے سے حرفِ آرزو اک دن جو نکلا تھا
لبِ فریاد کی اب تک پشیمانی نہیں جاتی

غمِ حرماں اُڑا لایا ہے مجھ کو اس بلندی پر
جہاں سے حسن کی صُورت بھی پہچانی نہیں جاتی

دکن چھوڑے زمانہ ہو گیا ذوقی مگر اب تک
دلِ برباد کی آشفتہ سامانی نہیں جاتی

ذوقی

نیند کا غلبہ

رات کا سناٹا ہے۔ تیرہ برس کی نوعمر ملازمہ کریمن پالنے کو آہستہ آہستہ جھلا رہی ہے اور نہایت مدھم آواز میں گنگناتی جاتی ہے۔

آجا ری نندیا آجا ری آ　　　بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

کمرے میں ایک چھوٹی سی ہری ہری لالٹین جل رہی ہے۔ اس سرے سے اُس سرے تک ایک سوت کی رسی بندھی ہے، جس پر بچے کے ننھے کپڑے، مالک کی قمیصیں اور مالکہ کی ساڑھیاں لٹک رہی ہیں۔ چھت پر روشنی کا ایک بڑا سا سبز دھبا جھلملا رہا ہے۔ پالنے کا نصف حصہ، کریمن اور الگنی کے کپڑے نیم تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں جب قندیل کی لَو جھلملانے لگتی ہے تو چھت کے سبز دھبے اور کپڑے کے سایوں میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ بھی آہستہ آہستہ جنبش کرنے لگتے ہیں۔ کمرے میں گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ باورچی خانہ سے گندے پانی اور باہر جوتے کی دوکان کی بدبو اندر داخل ہو رہی ہے۔

بچہ رو رہا ہے۔ روتے روتے اس کا گلا بیٹھ گیا ہے، بے دم ہو گیا ہے مگر اب بھی اس کا رونا برابر جاری ہے، خدا معلوم کب چپ ہوگا۔ کریمن کو نیند آ رہی ہے، اس کا سر جھک گیا ہے آنکھیں مندی جا رہی ہیں، بیٹھے بیٹھے اس کی پیٹھ اکڑ گئی ہے، اُس کی گردن میں شدت کا درد ہو رہا ہے، اس میں آنکھیں کھولنے کی طاقت نہیں، اس کے ہونٹوں کی قوت سلب ہو چکی ہے، اس کی آواز لڑکھڑا رہی ہے، مگر پھر بھی وہ گنگنا رہی ہے۔

آجا ری نندیا آجا ری آ　　　بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

چولہے سے ایک جھینگر کے بولنے کی پیہم آواز آ رہی ہے۔ دوسرے کمرے میں مالک اور بیوی پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ گہوارے سے "چرچوں" "چرچوں" کی کراہ نکل رہی ہے۔ کریمن کی آواز رات کی فرحت فزا سنسناہٹ سے ہم آہنگ ہے۔ اُسے اب اپنی لوری سے اذیت پہنچ رہی ہے۔ اس سے خود اُس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔ مگر اسے سونا نہیں ہے۔ خدا نہ کرے کہ اس کی آنکھ لگ جائے۔ مالک کی بید اُس کے لئے تیار ہے۔

قندیل جھلملا رہی ہے۔ چھت کا سبز دھبا اور کمرے کے سائے حرکت کر رہے ہیں اور خواہ مخواہ کریمن کے چہرے اور آنکھوں پر ناچ رہے ہیں۔ اس کے نیم خفتہ دماغ پر دھندلی دھندلی مبہم تصویریں صورت پذیر ہو رہی ہیں وہ آسمان

پہ رنگ برنگ کے بادلوں کو ایک دوسرے کا تعاقب کرتے اور بچے کی طرح چیختے چلاتے دیکھ رہی ہے۔ لیکن ہوا چلنی شروع ہوتی ہے۔ بادل آسمان پر بکھر کر غائب ہو جاتے ہیں۔ کرمین کی نظر ایک وسیع سڑک پر پڑتی ہے جو کیچڑ اور پانی سے لبریز ہے۔ یہاں سے وہاں تک سڑک پر لدی ہوئی گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ بھاری بھاری بوجھ پیٹھوں پر لادے ہوئے، لوگ اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں، ان کے سائے اُن کے پیچھے پیچھے ناچ رہے ہیں۔ ہوا کہر آلود ہے۔ سڑک کے دونوں جانب جنگل دھندلا دھندلا نظر آ رہا ہے، ایک بیک سڑک پر سب لوگ کیچڑ پانی میں گر پڑتے ہیں اور بالکل ساکت ہو جاتے ہیں۔ "ہائے یہ کیا ہو گیا" کرمین تعجب سے پوچھتی ہے "ہمیں نیند آ رہی ہے، ہم سوئے جا رہے ہیں" لوگ یک آواز ہو کر جواب دیتے ہیں۔ وہ سب گہری نیند میں سو جاتے ہیں اور مزے سے سوتے رہتے ہیں۔ صبح ہو جاتی ہے۔ وہ اب بھی پڑے سوتے ہیں۔ درختوں کی پھلنگیوں پر سے قسم قسم کے پرندے بچے کی طرح چیخ چیخ کر انہیں جگانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں ......

دفعتاً اس کا سر پالنے سے ٹکرا جاتا ہے وہ چونک کر آنکھیں کھولتی ہے اور اِدھر اُدھر دیکھ کر گنگنانے لگتی ہے

آ جا ری نند یا آ جا ری آ   بابے کی آنکھوں میں گھل مل جا

کرمین ایک تنگ و تاریک کمرے میں ہے۔ اُس کا مرحوم باپ کلّن فرش پر لوٹ رہا ہے اور وہ اسے دیکھ نہیں سکتی، صرف اس کے لوٹنے اور کراہنے کی آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی ہیں "ہائے ہائے میری انتڑیاں پھٹ گئیں" وہ چلاتا ہے اور شدتِ درد سے اس کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ اُس کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ اس کے دانت کٹ کٹ بج رہے ہیں گویا وہ سردی سے کانپ رہا ہے۔ اُس کی ماں اپنے مالک کو خبر کرنے گئی ہے کہ میرا خاوند مر رہا ہے۔ اسے گئے بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب اُسے واپس آ جانا چاہئے۔ کرمین جاگ رہی ہے اور چولہے کے پاس بیٹھی اپنے باپ کی کراہ سن رہی ہے۔

دروازے پر ایک گاڑی آ کر کھڑی ہوتی ہے۔ ایک نوجوان ڈاکٹر اس میں سے اترتا ہے اور اندر داخل ہوتا ہے۔ اندھیرے میں وہ دکھائی نہیں دیتا۔ دروازے کی چُول بجتی ہے اور اس کے کھانسنے کی آواز سنائی دیتی ہے "کوئی چراغ تو جلاؤ" ڈاکٹر کہتا ہے

"ہائے میں مرا۔ میں مرا" ڈاکٹر کے حکم کا اس کے باپ کی کراہ جواب دیتی ہے۔ اس کی بوڑھی ماں دوڑ کر چولہے کے پاس آتی ہے۔ دیا سلائی جلا کر ٹوٹے ہوئے چراغ کی تلاش کرتی ہے۔ چراغ میں تیل نہیں ہے۔ ایک لمحہ خاموشی سے گزر جاتا ہے۔ ڈاکٹر اپنی جیب سے ٹٹول کر دیا سلائی کی ڈبیہ نکالتا ہے۔ کمرے میں اجالا ہو جاتا ہے

"حضور میں ابھی آئی - ابھی آئی" کہتی ہوئی اُس کی ماں باہر چلی جاتی ہے اور چند منٹ بعد پڑوس کے گھر سے ایک موم بتی کا ٹکڑا لئے ہوئے پھر واپس آتی ہے -

اُس کے باپ کی آنکھیں چمک رہی ہیں - اس کے رخسار انگارے کی طرح سرخ ہیں وہ سب کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظریں ڈاکٹر اور دیوار دونوں کو پار کرتی ہوئی باہر کسی چیز کو دیکھ رہی ہیں -

ڈاکٹر اُس کی طرف مڑتا ہے "کیا کر رہے ہو - کس خیال میں غرق ہو"؟ وہ پوچھتا ہے "کیا کر رہا ہوں؟"

اُس کا باپ جواب دیتا ہے "مر رہا ہوں میرا وقت آگیا - میرا شمار اب زندوں میں نہیں ہے"

"خرافات مت بکو - میں تمہیں اچھا کر لوں گا" ڈاکٹر تسلّی دیتا ہے -

"شکریہ شکریہ حضور بہت بہت شکریہ" اس کا باپ کہتا ہے "مگر میرا وقت آگیا ہے - موت میرا انتظار کر رہی ہے - وہ دیکھو سامنے کھڑی ہے!"

پندرہ منٹ تک ڈاکٹر مریض کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا ہے - پھر کھڑا ہو جاتا ہے اور اُس کی والدہ کو ایک طرف لے جا کر کہتا ہے -

"آہ - بہت مشکل ہے، میں کچھ نہیں کر سکتا - شفاخانے لے چلو، وہاں ہم سب مل کر دیکھیں گے - فوراً تیار ہو جاؤ - وقت ضائع مت کرو - بہت دیر ہوگئی ہے - سب سو گئے ہونگے، لیکن کوئی مضائقہ نہیں - میں رقعہ لکھے دیتا ہوں - کچھ سُن رہی ہو! ——"

"مگر بندہ پرور" اس کی ماں جواب دیتی ہے "جائیں گے کا ہے پر، ہم لوگوں کے پاس سواری بھی نہیں ہے"

"اس کی فکر نہ کرو" ڈاکٹر کچھ سوچ کر کہتا ہے "میں تمہارے مالک سے کہتا ہوں، اس کا گھوڑا لے لینا"

ڈاکٹر چلا گیا - موم بتی بجھ گئی - پھر وہی "آہ آہ" کی دلدوز آوازیں آرہی ہیں - آدھ گھنٹے کے بعد ایک گاڑی آتی ہے - کرمین کا باپ تیار ہو کر شفاخانے جاتا ہے -

اب صبح کی روشنی تمام دنیا پر پھیلی ہوئی ہے - اس کی ماں مکان پر نہیں ہے، شفاخانے میں اُس کے باپ کی تیمارداری کر رہی ہوگی - کسی گھر سے بچّے کے رونے کی آواز آرہی ہے اور کوئی کرمین کی آواز کے ساتھ گا رہا ہے -

آجا ری نندیا آجا ری آ ——— بابے کی آنکھوں میں گھل مل جا

اُس کی ماں واپس آتی ہے - خاموشی سے بیٹھ جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے -

بٹے جانے میں بہت وقت لگ گیا۔ صبح ہوتے ہوتے اُس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی خدا مغفرت کرے ـــــ"

اُس کی ماں رو رہی ہے مگر اُسے رونے سے منع کر رہی ہے۔

"بیٹی اب رونے دھونے سے کیا ہوگا! صبر کر بیٹی صبر کر۔ تیری قسمت میں یہی لکھا تھا ـــــ ہائے میری بچّی یتیم ہوگئی" اور وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگتی ہے۔

کریمن باہر چلی جاتی ہے اور وہاں خوب دل کھول کر روتی ہے۔ اتنے میں کوئی بڑے زور سے اس کی پیٹھ پر گھونسا مارتا ہے۔ وہ گرتی ہے، درخت کا سہارا لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہے، آنکھ کھل جاتی ہے۔ نہ درخت ہے نہ جنگل، نہ اس کی کٹیا! اس کا مالک اُسے تیوری چڑھائے گھور رہا ہے۔

"نامعقول، ہنکحرام کہیں کی۔ بچّہ کب سے چیخ رہا ہے اور آپ پڑی خراٹے لے رہی ہے۔ لے میں تجھے سونے کا مزہ چکھاتا ہوں" اور بید لے کر سٹراک سٹراک دو رسید کرتا ہے۔ کریمن آنکھ ملتی ہے۔ گہوارے کو ہلاتی ہے اور سسکیاں لیتی ہوئی گاتی ہے۔

آجا ری نندیا آجا ری آ بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

چھت پر روشنی کا سبز دھبا اور دیواروں پر کپڑے کے سائے پھر ناچنے لگتے ہیں، پھر اُس کا دماغ معطل ہونے لگتا ہے اسی وسیع کیچڑ والی سڑک پر وہ پھر چل رہی ہے۔ لوگ اسی طرح میٹھی نیند میں پڑے سو رہے ہیں۔ اُس کا بھی پڑ رہنے کو دل چاہتا ہے۔ مگر اُس کی ماں اُس کے ساتھ ہے۔ وہ اُسے ٹھہرنے نہیں دیتی اور کہہ رہی ہے "بیٹی شہر چلنا ہے۔ کہیں نوکری چاکری ڈھونڈیں گے۔ آخر کب تک بھوکوں مریں گے۔

"بال بچوں کی خیر، بابا" اُس کی ماں راہگیروں سے کہتی ہے "تین دن کا فاقہ ہے۔ میری بچّی بھوک سے بے دم ہو رہی ہے ـــــ خدا کی راہ پر کچھ دو، بابا ـــــ"

اس کے جواب میں کوئی مانوس آواز اُس کے کانوں میں آتی ہے "بچّے کو مجھے دے" ایک لمحہ کے بعد اس آواز کی پھر تکرار ہوئی۔ "بچّے کو مجھے دے ـــــ مار کھانے پر بھی ہوش ٹھکانے نہیں ہیں، امیر زادی کہیں کی۔ بچّے کو چھوڑ کر بے ہوش پڑی سو رہی ہے!"

کریمن چونک کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتی ہے۔ کہاں کی ماں؟ کہاں کی سڑک، کہاں کے راہگیر؟ اُس کی مالکہ پالنے کے پاس کھڑی غصے سے اُس کی چوٹی کھینچ رہی ہے!

مالکہ بچے کو چمکار کر دودھ پلا رہی ہے اور کریمن کھڑی انتظار کر رہی ہے کہ بچہ دودھ پی چکے تو مالکہ سے لے لے۔
کھڑکی سے اندر آنے والی ہوا اب خوشگوار ہے۔ چھت کی سبز روشنی اب زردی مائل ہوتی جا رہی ہے۔ بہت جلد اب صبح ہو جائے گی۔

"لے بچے کو لے" مالکہ سلوکے کے بٹن لگاتے ہوئے کہتی ہے "منع کرتی ہوں کہ بچے کو باہر نہ گھمایا کر۔ آخر نظر لگ گئی تیرا کیا بگڑ گیا۔ تکلیف تو ہمیں ہو رہی ہے۔ بیچارہ رات بھر چلاتا رہا ہے ——"

کریمن نے بچے کو گہوارہ میں لٹا دیا ہے پھر اُسے آہستہ آہستہ ہلا کر اپنی لوری سنا رہی ہے۔ روشنی کا سبز دھبا اب بالکل غائب ہو گیا ہے، کپڑوں کے سائے معدوم ہو گئے ہیں صبح کی روشنی کمرے میں آنی شروع ہو گئی ہے، مگر اُس کی پلکوں پر نیند کا خمار اب بھی متحرک رہا ہے۔ وہ اپنا سر پالنے پر رکھ دیتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے سارے جسم کو جنبش دیتی ہے کہ کمبخت نیند کسی طرح تو اس کا پنڈ چھوڑے۔ مگر اُس کا سر چکرا رہا ہے۔ نیند اس کی پلکوں کو گوند کی طرح جوڑے دے رہی ہے . . . .

"کریمن چولہا جلا" اس کے مالک کی آواز آتی ہے۔

ہاں۔ پھر کام کاج کا وقت آ گیا۔ غریب چھوکری دوڑ کر ایک کمرے میں لکڑی لانے کے لئے جاتی ہے۔ وہ خوش ہے، جب انسان چلتا پھرتا ہے تو اُسے نیند سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی کہ ایک جگہ ساکت بیٹھنے سے!

وہ چولہا جلاتی ہے۔ اُسے محسوس ہو رہا ہے کہ اس کا چہرہ اب پہلے کی طرح سخت نہیں ہے۔ اس میں پھر نرمی آ چلی ہے۔ اس کے سر کا چکرانا بند ہو رہا ہے۔ اس کے خیالات اب اتنے پراگندہ نہیں ہیں۔

"کریمن چائے تیار کر" اُس کی مالکہ اپنے کمرے سے آواز دیتی ہے۔ اُس نے ابھی کیتلی آگ پر نہیں رکھی کہ ایک دوسرا حکم صادر ہوتا ہے۔

"کریمن اپنے مالک کے جوتے صاف کر ڈال"

وہ زمین پر جوتے صاف کرنے کے لئے بیٹھ جاتی ہے۔ وہ سوچ رہی ہے کہ ایک بڑے سے جوتے میں سر ڈال کر سو جانا کس قدر آرام دہ ہوگا۔ یک لخت جوتا بڑھنا شروع ہوتا ہے اور بڑھتے بڑھتے کمرے کے برابر ہو جاتا ہے اس کے ہاتھ سے برش چھوٹ جاتا ہے۔ مگر فوراً وہ اپنا سر ہلاتی ہے اور سب چیزوں کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھنا شروع کرتی ہے تاکہ اُن کا بڑھنا بند ہو جائے اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے نہ ناچیں۔

"کریمن، اندر بیٹھی کیا کر رہی ہے؟ سیڑھیاں جھاڑ ڈال۔ گاہک دیکھیں گے تو کیا کہیں گے" اس کی مالکہ کہہ رہی ہے۔

کریمن سیڑھیوں کو پانی سے صاف کرتی ہے ۔کمرے میں جھاڑو دیتی ہے ، پھر چولہا جلاتی ہے اور دوڑ کر دوکان میں آتی ہے ۔ کام پر کام نکلتے چلے آرہے ہیں، سانس تک لینے کی فرصت نہیں ہے ۔

نعمت خانے میں ایک مقام پر بیٹھ کر آلو چھیلنا کتنا تکلیف دہ ہے ۔ اس کا سر زمین میں گڑا جا رہا ہے آلو اُس کے سامنے شعبدہ باز کے گیندوں کی طرح ناچ رہے ہیں ۔ اُس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑتا ہے ۔ مالکہ جو آستینیں چڑھائے برابر کمرے میں ٹہل رہی ہے اُسے گھور کر دیکھتی ہے اور اس زور سے چلاتی ہے کہ کریمن کے کان دیر تک گونجتے رہتے ہیں ۔

اس کے بعد دستر خوان بچھانا، کھانے کے وقت حاضر رہنا، برتن مانجھنا، بچّے کے گندے صاف کرنا اور پھر سینا پرونا بھی وبالِ جان ہے ۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر، فرش پر پڑ کر سو جاتے اور کئی دن تک سوتی رہے ۔

دن گذر جاتا ہے ۔ شام کی تاریکی ہر شے پر مسلّط ہو جاتی ہے ۔ کریمن اپنی تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ پھیرتی ہے اور خدا معلوم کیوں خود بخود مسکراتی ہے ۔ شام کا دھندلکا اُس کی مخمور آنکھوں کو گہری نیند کا پیغام دیتا ہے !

رات کو اُس کے مالک کے دوست احباب اور ملنے جلنے والے آتے ہیں کریمن کو چائے بنانے کا حکم ملتا ہے چھوٹی سی کیتلی ہے ۔ چائے کا دور چل رہا ہے ۔ اُسے پانچ پانچ سات سات مرتبہ چائے بنانی پڑتی ہے ۔ چائے کا دور ختم ہو جاتا ہے مگر کریمن وہیں کھڑی ہے ۔ مالک اور اس کے دوستوں کو اس سے سو کام ہیں ۔ وہ وہاں سے کیونکر ٹل سکتی ہے ۔

"کریمن دوڑ کر ایک پیکٹ سگریٹ تو لیتی آ،،

وہ تیز تیز قدم رکھتی ہوئی دوکان پر جاتی ہے تیز چلنے سے شاید نیند بھاگ جائے !"کریمن پان بنا کر لا ۔ کریمن حقہ بھر لا ۔ کریمن ذرا تمباکو لیتی آ ۔ کریمن یہ کر ڈال ۔ کریمن وہ کر ڈال"۔ احکامات کا تانتا بندھا ہوا ہے !

لیکن اب مہمان جا چکے ہیں ۔ روشنیاں گل کر دی گئی ہیں گھر میں خاموشی ہے ۔ مالک اور مالکہ اپنے خانگی کمرے میں جا چکے ہیں ۔"کریمن بچے کو جھولا جھلا" آخری حکم مل چکا ہے ۔

چولہے میں جھینگر بول رہا ہے ۔ روشنی کا سبز دھبا پھر چھت پر نمودار ہے، کپڑوں کے سائے پھر اُس کی آنکھوں پر ناچ رہے ہیں ۔ پھر اس کا دماغ معطل ہو رہا ہے ۔ پھر وہ پالنے کو ہلا ہلا کر گنگنا رہی ہے ۔

آجاری نندیا آجاری آ ٭ بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

بچہ پھر چلانا شروع کرتا ہے اور روتے روتے بے خود ہو جاتا ہے ۔ پھر کریمن ایک کیچڑ اور پانی سے لبریز سڑک پر اپنی ماں اور باپ کو دیکھ رہی ہے، سب کچھ سمجھ رہی ہے ۔ سب کو پہچان رہی ہے، مگر اس نیم بیداری نیم خواب کے عالم میں یہ

سمجھنے سے قاصر ہے کہ کونسی قوت اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈالے ہوئے ہے۔ کونسی طاقت اُس کے سینہ کو تھپڑے دبائے ہوئے ہے اور اُس کی زندگی کو دوبھر کئے ہوئے ہے؟

وہ نظریں پھیر کر چاروں طرف دیکھتی ہے کہ اگر اس طاقت کا پتہ چل جائے تو اس سے نکل کر بھاگ جائے یا اسے زیر کرنے کی کوشش کرے مگر اُس کی تلاش بے کار ثابت ہوتی ہے۔

انتہائی اور آخری کوشش کے بعد وہ آنکھیں کھول کر سب چیزوں کو دیکھنے میں کامیاب ہوتی ہے بچے کی چیخ سنتی ہے، روشنی اور تاریکی کا آنکھ مچولا دیکھتی ہے اور اس روشنی اور تاریکی میں اُس دشمن کی تلاش کر لیتی ہے جو اُسے مار ڈالنے پر تلا ہوا ہے!

وہ دشمن گہوارہ میں پڑا ہوا طفل شیر خوار ہے!

وہ ہنستی ہے۔ اُسے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اتنی سلیس اور آسان سی بات اُس کی سمجھ میں اس سے پہلے کیوں نہ آئی۔ روشنی کا سبز دھبا کپڑوں کے سائے اور چولہے میں بولتا ہوا جھینگر سب کے سب اُس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں۔

اُسے پھر طلسمی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ پھر اُس کی آنکھ اسے دھوکا دینے لگتی ہے مگر اب کی بار وہ مسکرا کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے۔ اُسے ایک خیال آ چکا ہے۔ وہ خوش ہے کہ بہت جلد وہ اس سنگِ راہ سے نجات حاصل کر لے گی!

"بچے کو مار ڈال اور پھر سو جا۔ آرام سے گہری نیند میں سو جا" ہوا کی سائیں سائیں اُسے تعلیم دیتی ہے۔
کرمین ہنستی ہے۔ روشنی کے سبز دھبے کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہے اور دبے پاؤں جا کر پالنے پر جھک جاتی ہے۔

اور جب وہ بچے کا گلا گھونٹ چکتی ہے تو چپکے سے بلا کچھ سوچے ہوئے زمین پر دراز ہو جاتی ہے۔ اُسے ملال نہیں ہے، اُسے تاسف نہیں ہے۔ وہ زیر لب مسکرا رہی ہے کہ اب وہ گہری نیند سو جانے کے لئے آزاد ہے!

اور اب وہ مُردوں کی طرح بے حس و حرکت پڑی گہری نیند میں سو رہی ہے!!

(چیخوف)

سید
ممتاز اشرف
قادری

ترانۂ گویا

پوچھو نہ مری سوزشِ پنہاں کو ابھی
جلنے دو چراغِ تہِ داماں کو ابھی

دیکھا ہے گلِ چاک گریباں کو ابھی
سمجھے ہی نہ تھے رنگِ گلستاں کو ابھی

پوچھو نہ مآلِ گلِ خنداں کو ابھی
دیکھو تو ذرا رنگِ گلستاں کو ابھی

رودادِ چمن، بھول سی! اے صبحِ غضب!
کیوں توڑ رہی ہے دلِ مہماں کو ابھی

توحید جبھی تک ہے کہ باقی ہے "دوئی"
رہنا ہے یونہی فرقِ دل و جاں کو ابھی

ہے دور تو ہاتھ آئے گا جام اپنے کبھی
سمجھیں نہ برا گردشِ دوراں کو ابھی

تا صبح جسے یاد کیا ہے شبِ غم
کیا بھولیں گے اس شمعِ شبستاں کو ابھی

وہ آنکھ کہ جو منکرِ دیدار رہوئی
پہنچی ہی نہیں جلوۂ پنہاں کو ابھی

ہر اشک ہے اک گوہرِ دریائے نظر
معلوم نہیں دیدۂ گریاں کو ابھی

اے یاس! ہے امید ہی سے دل کی بہار
برباد نہ کر میرے گلستاں کو ابھی

اے نورِ سحر پردۂ شب چاک نہ کر
محجوب نہ کر شمعِ فروزاں کو ابھی

ایمان جبھی تک ہے کہ نادیدہ ہے وہ
پردے ہی میں رکھ حاصلِ ایماں کو ابھی

قائل ہوں اگر اس کا کہ ناظر ہے خدا
ظاہر نہ کروں میں غمِ پنہاں کو ابھی

گویا ہے اسی در سے تو امیدِ نظر
رہنے دو یونہی چاکِ گریباں کو ابھی

گویا جہان آبادی

دولت یا محبّت؟

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ محبت کرنا روپیہ کمانے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ روپیہ تو ایک احمق بھی پیدا کر سکتا ہے لیکن ایک ایسا آدمی نہایت ہی کمیاب ہے جو اپنے کلبۂ احزان میں پڑا پڑا دم توڑ دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اور شاید کسی کلبی ہی کو اس پر اصرار ہوگا کہ کوئی بیوقوف بھی محبت کر سکتا ہے، کیونکہ اس صورت میں ہمیں دنیا کا شیرازہ منتظم نظر نہ آتا! آپ عدالت ہی میں جا کر طلاقوں کی فہرست دیکھ لیجے کہ کتنوں نے اپنی حماقت سے محبت کو مکدر کر دیا ہے۔

آلیور ہیل بران ایک کامیاب مصنف ہے جو اپنے پُر تکلف دار المطالعہ میں بیٹھا ایک ناول کے ابتدائی ابواب اپنی ٹائپسٹ جیسیکا کاکس سے لکھوا رہا ہے۔ ہیل بران اپنی عمر کے ساٹھ برس گزار چکا ہے مگر محبت کے افسانوں کا اثر ہے کہ اس کا دل ابھی جوان ہے، کامیابی کی گرمی اُس کے خون میں جوش پیدا کرتی ہے اور وہ ہر سال نہایت باقاعدگی سے پچیس ناول لکھ ڈالتا ہے۔ اُس کے رقیب جو ابھی نوجوان ہیں اس پر طیش بھی کھاتے ہیں مگر تخیل کی رسائی پر کس کا زور چلتا ہے۔

جیسیکا کاکس صرف اکیس برس کی ہے، مگر چونکہ سترہ برس کی عمر سے کمانے کا بار اُس کے سر پر پڑ چکا ہے اس لئے اب وہ اچھی خاصی عورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یتیم ہے ہمیشہ اکیلی رہی ہے اور اُس کی واقفیت بہت کم ہے۔ اُس کا جسم مختصر سا ہے مگر اُس میں کام کرنے کی غیر معمولی قوت ہے، اور اس کی ایک خاص ادا ہے جو بعض اوقات اسے بے اندازہ خوبصورت بنا دیتی ہے۔

ہیل بران نے کہا "میری یہ کہانی پہلی تمام کہانیوں سے مختلف رنگ رکھتی ہے،،

تجربہ کار جیسیکا نے جواب دیا "ہاں، سب مصنّف یوں ہی کہا کرتے ہیں۔ میں نے جس کسی کی کتاب بھی لکھی ہے اُسے اسی زعم میں دیکھا ہے کہ اُس کی یہ کتاب صدی کی بہترین کتاب ہے،،

مصنف نے کہا "مگر یہ کہانی اُس مقام سے شروع ہوتی ہے جہاں لوگ ختم کرنے کا خیال کر رہے ہوتے ہیں"

جیسیکا نے کاغذ کے صاف تختے پر موٹے حروں میں "پہلا باب" لکھا اور کہنے لگی "اچھا، تو میں تیار ہوں"

آپ شروع کیجے۔"

ہیل بران نے کہا "افسانے کا نام ہے "دولت یا محبت؟" ہیروئن ایک مصیبت زدہ لڑکی ہے اور میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اُس کی تصویر کھینچنے میں میرے مدِ نظر تمہاری ذات ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا"

جیسیکا نے رنجیدہ آواز میں جواب دیا "نہیں بالکل نہیں۔ اب مجھے ان باتوں کی کچھ عادت سی ہوگئی ہے، اور جب تک مجھے ہر جمعہ کے دن اپنی مزدوری مل جاتی ہے میں نے ایسی باتوں کا خیال کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

"آؤ پھر شروع کریں"

"بہت اچھا"

ہیل بران نے لکھوانا شروع کیا "دوپہر کا وقت تھا، باغ میں تپتی ہوئی دھوپ میں ایک آدمی اور ایک لڑکی کھڑے تھے۔ لڑکی کا سر سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ سٹیفن بریسٹ نے حریص نظروں سے خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا جو ایک آرام کرسی میں لیٹی ہوئی تھی۔ نیا پارہ، یکایک وہ اُس کی طرف مڑا "گلوریا، مجھے تم سے محبت ہے، بے اندازہ محبت، تمہاری محبت میرے دل میں مدت سے بسی ہوئی ہے۔ تم دنیا میں اکیلی ہو، مجھے اپنی تنہائی کا مونس بنالو۔ گلوریا، تم مجھ سے شادی کروگی؟" "نہیں" اُس نے جواب دیا؛ "تم مجھ پر بڑی مہربانی کرتے ہو مگر میں تم سے شادی نہیں کرسکتی۔" "

مس کاکس نے جو خاموش لکھ رہی تھی پنسل ہاتھ سے رکھ دی اور ہیل بران کی طرف دیکھنے لگی "معاف کیجیے گا، لیکن آپ حقیقت سے ذرا دور چلے گئے ہیں۔ ایک لڑکی جو مجھ جیسی بے یار و مددگار ہو ــــ گلوریا جیسی ــــ وہ شادی کے پیغام کو اِس آسانی سے رد نہیں کرسکتی، یہ فطرت کے خلاف ہے۔"

ہیل بران وقت ضائع نہیں کیا کرتا تھا مگر بولنے سے پہلے اُس نے کوئی دس سیکنڈ تک جیسیکا کی طرف غور سے دیکھا۔

اُس نے کہا "عام طور پر محبت کے متعلق کچھ کہنے کا حق جوانوں ہی کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ میرا شمار اب بوڑھوں میں ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ میں ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا کہ محبت کی نسبت میرے خیالات کو غلط سمجھا جائے ــــ گو لوگوں نے اب نئے نئے انداز اختیار کرلئے ہیں اور تہذیب بھی بہت ترقی کرگئی ہے"

جیسیکا کی ہنسی سے کمرہ گونج اٹھا۔

اُس نے جواب دیا " بڑھاپے کی تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن آپ کے خیالات ضرور دقیانوسی ہیں۔ آج کل ہم لوگ زندگی کو تجارتی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں ـــــ ہر شخص اور ہر چیز آج کل دنیا میں ایک مالی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے اس کا تجربہ تو نہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ لڑکیاں محبت کی بجائے دولت پر زیادہ فریفتہ ہو جاتی ہیں۔"

ہیل بران نے آہستہ سے کہا "کلبیّت"۔

لڑکی نے جواب دیا "کلبیّت ہی تو تہذیبِ حاضر کا پروانہ ہے"۔

ہیل بران نے کہا "میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر یہ اس بات کا صرف نظریاتی پہلو ہے اور عملی نکتۂ نظر سے مجھے یقین ہے کہ کوئی اس زمانے کی لڑکی بھی کسی کروڑپتی سے شادی کا فیصلہ کرنے میں اُسی قدر متامل ہوگی جتنی آج سے دو پشت پہلے کی لڑکی ہوتی تھی، بجز اس کے کہ اُسے اُس سے محبت ہو۔"

"میں آپ کے اِس دعوے سے متفق نہیں۔ جب آپ مانتے ہیں کہ نظریاتی پہلو سے میں درست کہتی ہوں تو آپ کو یہ بھی ماننا چاہیئے کہ گلوریا یقیناً سٹیفن کو بغیر کسی غور کے قبول کر لیتی"۔

ہیل بران نے پُرغرور انداز سے کہا "میرے افسانے حقیقی زندگی پیش کرتے ہیں۔ اگر میرے ناولوں کی بنیاد نظریوں پر ہو تو وہ بِک نہیں سکتے۔ گلوریا، جیسا میرا اُس کا ـــــ تمہارا ـــــ تصور ہے، کسی شخص سے محض اس لئے شادی کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہیں کر سکتی کہ وہ اتفاق سے بڑا امیر ہے"۔

جیسیکا نے جواب دیا "آپ کا خیال غلط ہے۔ چونکہ آپ مجھے اس افسانے میں گھسیٹ رہے ہیں اس لئے میں کہہ سکتی ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی بدصورت سے بدصورت آدمی بھی شادی کرنے کو کہے تو میں انکار نہ کر سکوں بشرطیکہ اُس کے الفاظ کی پشت پر چوکھا سونا کھنکھنا رہا ہو۔

ہیل بران نے کہا "کچھ بھی ہو تمہارا خیال غلط ہے"۔

"نہیں، غلط نہیں ـــــ کام، کام، کام ـــــ اور کس لئے؟ کیا میں اتنا کما لیتی ہوں کہ زندگی کا لطف اٹھا سکوں؟ میں آپ کو ایسی لڑکیاں دکھا سکتی ہوں جو عسرت کے مصائب سے تنگ آ کر آرام کے اُن اوقات کی حسرت دل میں رکھتی ہیں جنہیں دولت خرید سکتی ہے"۔

ہیل بران نے مایوسانہ لہجہ میں کہا " دنیا میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں دولت نہیں خرید سکتی"۔

جیسیکا نے کہا "سچ ہے، مگر موجودہ حالت میں میرے پاس کیا ہے —— حالانکہ روپیہ ہو تو ——"

"بعض ایسے افکار بھی ہو سکتے جن کا فی الحال تمہیں علم نہیں"

جیسیکا نے ہنس کر کہا "ایک وقت میں مَیں ایک ہی خاوند سے شادی کر سکتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ بالکل کافی ہے"

ہیل بران لڑکی کے اس سبک سرانہ طرزِ گفتگو پر چیں بہ جبیں ہو گیا، پھر یکایک اُس کے چہرے کی کیفیت بدل گئی، وہ اس کی طرف بڑھا اور اُس نے جیسیکا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

"مس کاکس —— جیسیکا —— جو کچھ تم کہہ رہی ہو مجھے اس میں امید کی ایک کرن جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے —— بے اندازہ محبت —— تمہاری محبت میرے دل میں مدت سے بسی ہوئی ہے —— تم دنیا میں اکیلی ہو —— مجھے اپنی تنہائی کا مونس بنالو —— جیسیکا، تم مجھ سے شادی کرو گی؟" اُس نے یہ الفاظ نہایت پُر ارمان نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ختم کئے، اور اُس کی آواز میں ایک غیر معمولی تڑپ تھی۔

"شادی کروں؟" جیسیکا نے گھبرا کر کہا۔ پھر بولی "نہیں، آپ مجھ پر بڑی مہربانی کرتے ہیں مگر میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے آپ سے محبت نہیں —— ایک طرح مجھے آپ سے محبت ہے —— مگر میں جوان ہوں اور آپ بوڑھے ہیں —— اور —— اور سخت ......" اور اُس نے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں چھپالیا۔

ہیل بران نے بے تاب ہو کر کہا "سٹیفن بریسٹ بھی ایسا ہی تھا۔ چلو اب لکھو۔ کھانے سے پہلے پہلے میں افتتاحی باب ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

ترجمہ منصور احمد

غزلیات

مر کے کیا قبر میں راحت ہوگی — آنکھ کھلتے ہی قیامت ہوگی

دل کو یہ کہہ کے تسلّی دی ہے — بعد تکلیف کے راحت ہوگی

ذکرِ جنت ہے نہ فکرِ دوزخ — آج واعظ کہیں دعوت ہوگی

اک نگاہِ غلط انداز سہی — دل کی آخر کوئی قیمت ہوگی

سو گئے گھر سے آتے آتے — نیند اُن کی مری قسمت ہوگی

اشک کس نے سرِ بالیں ٹپکائے — میری شمعِ سرِ تربت ہوگی

وصل کی شب نہ بڑھا دو زیور — سادگی اور قیامت ہوگی

تم اُٹھے اور مرا دم نکلا — تم سے پہلے مری رخصت ہوگی

گلِ معنی بھی کھلیں گے صفدر
کچھ شگفتہ جو طبیعت ہوگی

صفدر مرزا پوری

۲

نشاطِ روح کو چونکا رہا ہے — محبت کا فرشتہ گا رہا ہے

ذرا دیکھوں تو مجھ میں کیا رہا ہے — زمانہ آئنہ دکھلا رہا ہے

سنائی آئے گی کوئی چمن سے — دل آپی آپ بیٹھا جا رہا ہے

قفس میں آ تو یوں دنیا یہ سمجھے — سفر سے لوٹ کر گھر آ رہا ہے

مری فطرت مجھے رلوا رہی ہے — زمانہ اپنی گا رہا ہے

ذرا چہرہ تو دیکھو ناخدا کا — کوئی طوفان جیسے آ رہا ہے

بڑی جنت یہی ہے تو ہو راضی — وگرنہ خلد میں زیبا رہا ہے

[illegible]

۳

اس خزاں کو بہار ہونا تھا — گل چراغِ مزار ہونا تھا

کشتۂ انتظار ہونا تھا — آپ سے شرمسار ہونا تھا

حسن کی پردہ پوشیاں کب تک — عشق کا رازدار ہونا تھا

بے نیازی نے موت کی مارا! — جبر پر اختیار ہونا تھا

کیوں بھلا بیٹھے وعدۂ فردا — حشر کیا بار بار ہونا تھا

آنکھ ساقی کی کھل چکی ہے تپش
تجھ کو بھی ہوشیار ہونا تھا

عبد اللطیف تپش

۴

بے اختیار چھیڑ دیا ان کو پیار میں — وہ کون ہے کہ جس کے ہو دل اختیار میں

بھر کر نگاہ دیکھنا اُن کو مری مجال — "پنہاں تھا آفتاب حجابِ غبار میں"

میں جانتا ہوں لذتِ خبرِ وصالِ دوست — یہ کیف وہ نہیں ہے جو ہے انتظار میں

میں اور بزمِ غیر میں جاؤں محال ہے — یہ جرم اگر ہوا تو ہوا شوقِ یار میں

جمعیتِ سکونِ دلِ مبتلا گیا — تم کیا گئے کہ جان گئی اضطرار میں

میدانِ شاعری کے نہیں مردِ ہم شہاب
کچھ بات ہے کہ آ گئے اس کارزار میں

مہر محمد خاں
شہاب
مالیر کوٹلوی

محفلِ ادب

زبان کی تدریجی ترقی

اول اول جب انسان نے ہوا کو تکلم کا واسطہ بنایا اور اوزاروں کے ذریعہ سے ادائے مطلب کا اہتمام کیا تو وہ صرف انہیں معدودے چند سہل المخرج آوازوں کے نکالنے پر قادر تھا جنہیں بول کر چھوٹے بچے اپنی خواہشات وجذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن جوں جوں انسان کو آلاتِ گویائی کے استعمال میں مہارت ہوتی گئی، وہ حسبِ ضرورت انہیں چند سہل المخرج اصوات کو اونچے نیچے سروں میں ادا کر کے یا اُن میں اتار چڑھاؤ پیدا کر کے یا اُن کو گھٹا بڑھا کر مختلف معنی پیدا کرتا گیا۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ کا خیال ہے کہ شروع شروع جب انسانوں نے اصوات کو ادائے مطلب کا ذریعہ بنانا چاہا تو انہوں نے صرف تین مفرد حرکتوں یا آوازوں کو منضبط کیا جنہیں ہم اعراب یا حرکاتِ ثلاثہ کے نام سے نامزد کرتے ہیں۔ یہ تینوں آوازیں یعنی اَ اِ اُ وہی ہیں جو زمانہ پیدائش سے اُن کے ساتھ سانس کے ہمراہ آئی تھیں اور سہل المخرج ہونے کے سبب ہر شخص سے بآسانی اپنے اپنے موقع پر سرزد ہو جایا کرتی تھیں۔ یعنی درد کے موقع پر درد کا سماں ان میں تھا دریا کی موجیں، ہوا کی لہریں، گنبدوں کی گونجیں، اترنے کی سیڑھی، چڑھنے کا زینہ، اور اپنے پیاروں کو پکارنے کی ندا، ہر قسم کی صدا، ہاتھیوں کی چنگھاڑ، شیروں کی دھاڑ، اور بادلوں کی گرج، بھنبیری کی بھنبھناہٹ، مگس کی تنین، قریب اور بعید کی چیزوں کے اشارے، دنیا کے ابتدائی دھندے، ان ہی تین آوازوں یعنی "اَ، اِ، اُ" میں موجود تھے۔ اور ہر ایک کیفیت اُن ہی کے گھٹانے بڑھانے سے حاصل ہو جاتی تھی۔ لیکن یہ رائے غلو اور مبالغے پر اور حقیقت سے دور معلوم ہوتی ہے۔ مختلف خیالات، جذبات اور واقعات کو صرف ایک ہی آواز کی تین صورتوں کی مدد سے بیان کرنا اور لوگوں کا متکلم کے منشا کو معلوم کر لینا بعید از قیاس ہے۔ ننھے بچے بھی مندرجہ بالا حرکاتِ ثلاثہ کے علاوہ چند اور سہل المخرج آوازیں بولتے ہیں۔ جیسے: ماما، بابا، دادا، اہا وغیرہ۔ لہٰذا انسان بھی عہدِ رموزی ہی میں اپنے جذبات چند قسم کی آوازوں سے ظاہر کرتا ہوگا۔ لیکن "عہدِ صوتی" میں ضروریات واحتیاجات، خیالات و معلومات میں اضافہ ہو جانے کے باعث زیادہ آوازوں کی ضرورت آن پڑی۔ چونکہ طویل مدت کے گزر جانے سے دماغ کے حصۂ گویائی کی بھی پہلے سے زیادہ نشوونما ہو گئی تھی اور اُس کے ساتھ آلاتِ گویائی مثلاً ہونٹ، ناک، منہ، زبان، تالو، حلق، دانت وغیرہ کی ساخت اور ہیئت میں بھی کسی قدر ترقی ہو گئی تھی، اس لئے انسان کو ان کی مدد سے مختلف قسم کے اصوات نکالنے میں سہولت

واقع ہوئی۔ انسان نے آوازوں کو اس طرح ترقی دی کہ کسی کو دونوں ہونٹ ملا کر، کسی کو تالو سے، کسی کو حلق سے، کسی کو زبان کی نوک سے، کسی کو ناک کی شرکت سے نکالا۔ اب مختلف قسم کی آوازیں انسان کے قابو میں آگئیں۔ پس مختلف مفرد آوازوں سے مختلف قسم کے خیالات یا اشیا کا اظہار ہونے لگا۔ لیکن روز افزوں حاجتوں اور ضرورتوں کے سبب سے یہ محدود مفرد آوازیں تمام معلومات کے اظہار کے لئے ناکافی ثابت ہوئیں۔ لہذا مفرد اصوات کے اختلاط سے تمام اشیا کے نام رکھے جانے لگے۔ اول اول جس شے کی جو فطری آواز تھی اس کی مناسبت سے اسما بنائے گئے۔ کیونکہ یہ طریقہ سہل اور قدرتی بھی تھا جیسے ہوا کے چلنے کو سائیں سائیں اور پانی برسنے کو جھم جھم، کتے کے بھونکنے کو بھوں بھوں، بلّی کی بولی کو میاؤں میاؤں وغیرہ سے تعبیر کیا۔ اسی طرح جھیں جھیں کرنے والے جانوروں کا نام جھینگر، اور ٹرٹر کرنے والے کا ٹرّو، بھن بھن کرنے والے بھونرا، جھر جھر بہنے والے پانی کا نام جھرنا پڑا۔ جس شے کے ساتھ کوئی فطری آواز وابستہ نہ تھی، اس کا جو کچھ مناسب سمجھا گیا نام رکھ دیا گیا۔ اس طرح ایک معقول تعداد اسما کی تیار ہو جانے پر زبان کو غیر معمولی گرانباری سے بچانے کے لئے یہ اصول رکھا گیا کہ اگر کسی نئی شے میں دو یا زیادہ اشیا کی صفات یا مشابہات پائی جائیں تو اس شے کا ایک نیا نام تجویز کرنے کے بجائے اشیاءِ معلومہ کے اسما کی آمیزش سے مرکب لفظ بنا لیا جائے۔ مثلاً "کنسلائی" اُس سلائی کے مانند باریک کیڑے کو کہا جو کان میں رینگ جاتا ہو "کنکھجورا" اُس کیڑے کا نام پڑا جو کھجور کے مشابہ ہو اور کان میں بیٹھ جائے "اجگر" (اج۔ بکرا + گر۔ نگلنے والا) اُس اژدھے کو کہنے لگے جو بکرے کو نگل جائے۔ اگر کوئی جانور دو یا زیادہ جانوروں کے مشابہ ہو تو اس کا نام ان ہی مشابہ جانوروں کے اسما کا مجموعہ قرار پایا مثلاً شتر مرغ۔ گاؤمیش، فیل مرغ، شتر گاو پلنگ (زرافہ) وغیرہ۔ بعض جانوروں کے نام ان کی صفات یا خواص کی مناسبت سے رکھے گئے۔ مثلاً "ہاتھی" یعنی ایک ہاتھ والا جانور، سونڈ ہاتھ کی بجائے سمجھی گئی۔ "چیتا" وہ درندہ جس کی کھال پر چتیاں ہوتی ہیں۔ سمندر (سام۔ آگ + اندر۔ درمیان) اُس کیڑے کا نام پڑا جو آگ میں رہے۔ بعض چیزوں کے نام اُن کے افعال کے باعث رکھے گئے مثلاً مار خور، چوہے مار، چڑی مار، نیولا (نیو یعنی بنیاد، کھودنے والا) وغیرہ۔ الغرض ان ہی اصول پر تمام اشیا کے اسما قرار دیئے گئے۔ اوپر کی تمام مثالیں فرہنگِ آصفیہ سے دی گئی ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا بیانات سے ہرگز یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ابتدائی دورِ تمدن میں اشیا کے وہی نام تھے جو اُوپر بیان کئے گئے اور دورِ بربریت کا انسان اردو بولنے پر قادر تھا۔ محض اصول سمجھانے کے خیال سے ایسے الفاظ کی مثالیں دی گئی ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں۔ ابتدائی انسانوں نے ان ہی اصول پر اشیا کے نام رکھے نام کچھ ہی کیوں نہ ہوں، لیکن ان کے مقرر کرنے کے لئے اصول وہی تھے، جو اوپر بیان ہوئے۔ یہی وہ ابتدائی زینے تھے جن پر رفتہ رفتہ گامزن ہو کر زبان نے اعلیٰ زینے تک صعود کیا۔ واضح رہے کہ الفاظ کے نام بھی پہلے فطری آوازوں ہی کی

مناسبت سے رکھے گئے ۔ مثلاً بھونکنا، گڑگڑانا، غرّانا، کھنکھٹانا وغیرہ ۔ جہاں قدرتی آوازوں کا فقدان تھا وہاں جو کچھ مناسب سمجھا گیا فعل کا نام رکھ دیا گیا ۔ اکثر افعال کے نام اسمائے اشیا سے بنائے گئے ۔ ہتھیانا یعنی کوئی شے ہاتھ میں لینا اور اس پر قابض ہوجانا، برفانا، یعنی کسی شے میں بجلی گذارنا وغیرہ ۔ انگریزی زبان میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں گی اس کے بعد اسماءمیں باہم نسبت دینے کے لئے روابط قائم کئے گئے ۔ جب اسماء، افعال اور روابط مقرر ہو چکے تو گویا ایک باقاعدہ زبان کا ڈھیچر تیار ہوگیا ۔ رفتہ رفتہ اس کالبد کی مناسب عضوبندی ہوتی رہی، یہاں تک کہ بالآخر ایک گتھا ہوا سڈول جسد تیار ہوگیا اور علم وفن کی ترقی نے آگے چل کر اس میں جان ڈال دی ۔ تشبیہ و استعارہ کا نقاب ہٹالئے سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ معاشرت کی ترقی، احتیاجات کے اضافے، ضروریات کے ہجوم، معاملات کی پیچیدگی، زندگی کی کشاکش کے زیرِ اثر زبانِ صوتی، دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی گئی، ذخائرِ الفاظ میں اضافہ ہوتا گیا اور لغات بڑھتی گئیں ۔ جس طرح بچوں کی معلومات محض اشیائے مادی ومحسوس ومقرون تک محدود ہوتی ہیں اور انہیں مجردات کا تصور نہیں ہوتا، اسی طرح ابتدائی انسان کی واقفیت مادی اور مرئی چیزوں تک محدود تھی ۔ لیکن تمدّن کی ترقی اور ارتقائے ذہن کے باعث خیالات میں لطافت اور پاکیزگی آتی گئی اور مجردات وتوصیفات کے لئے بھی نام تجویز کئے گئے ۔ رفتہ رفتہ ادائے مطلب کے لئے عمدہ پیرایۂ بیان اور اظہارِ خیالات کے لئے حسنِ اسلوب کی جانب ذہنِ انسانی رجوع ہوا ۔ چنانچہ بمرورِ زمانہ ایک مرتب اور باقاعدہ زبان کی مستقل حیثیت قائم ہوگئی ۔ آبادی اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان بھی ترقی کرتی گئی ۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا کچھلے الفاظ زبان کی رگڑ کھا کھا کر منجھتے، صاف ہوتے اور گھل گھل کر سلیس ہوتے گئے ۔ چنانچہ امتدادِ زمانہ سے الفاظ زبان کی خراد پر چڑھ کر تراش خراش پاتے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر زبان میں شستگی، حلاوت اور گھلاوٹ پیدا ہوگئی لیکن تقریری زبان میں اس حد تک ترقی ہونے پر بھی رسم الخط وطرزِ تحریر ہنوز پردۂ خفا میں تھی ۔ الفاظ وخیالات ابھی ضبطِ تحریر میں آکر پابندِ سلاسل نہیں ہوئے تھے ۔ دیوتاؤں کے بھجن، پیشوایانِ دین کی تعلیم، دانشمندوں کے اقوال، راجاؤں اور سورماؤں کے کارنامے عرصۂ دراز تک محض زبانی طور پر نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے رہے ۔

"اردو"

مشاہدات

حوض میں مستانہ بط کے تیرنے سے جس طرح کائی میں پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہگزار
حافظے پر یوں ہی اک بیدار کن گہری خراش ڈال دیتی ہے شبِ مہ میں پپیہے کی پکار

مسکرایا خواب میں اس طرح اک طفل صبیح
ہوگیا دل دیکھنے والوں کا شاد و باغ باغ
اور اس نرمی سی جیسے بتکدے کے طاق میں
جھٹپٹا ہوتے ہی روشن کردیا جائے چراغ!

شب کو اکثر کھو کھلی تاریکیاں میدان کی
روح پر کرتی ہیں طاری اس طرح خواب گراں
دل سمجھتا ہے کہ ہے غم کی گھٹا چھائی ہوئی
جس طرح کہرے پہ ہو جاتا ہے بارش کا گماں!

سب سے پہلے عشق کی شب میں دل عشاق کو
چٹکیوں میں یوں مسلتا ہے خیال روئے یار
صبح کچی نیند سے جس طرح چونک اٹھنے کے بعد
کمسنی کی بھول سی آنکھوں میں چبھتا ہے خمار!

وداع طفلی و قرب شباب کے باعث
نزی "نگاہ" ہے، یا وہ "خیال دل افروز"
بدل رہا ہے جو پہلو ضمیر شاعر میں
اور آب و تاب سے موزوں نہیں ہوا ہے ہنوز!

جوش ملیح آبادی
"نگار"

نغمۂ الفت

"مجھے اگر تو میرے "حسن" کی خاطر چاہتا ہے
تو مجھ سے الفت کرنا چھوڑ دے!
آفتاب، شاندار حسین آفتاب سے الفت کر
اُس کی ضیا مجھ میں کہاں؟
میری "جوانی" پر اگر تو فدا ہوا ہے
تو مجھ سے الفت کرنا چھوڑ دے!
بہار کو دیکھ اس کے شباب کو ہر سال نئی بقا ہے
میری طرح اُسے فنا نہیں!
"دولت" کے لئے اگر تو مجھ سے محبت کرتا ہے
تو مجھ سے الفت کرنا چھوڑ دے!
بے بہا نایاب گوہر سمندر میں پوشیدہ ہیں
پھر تو انہیں کیوں نہیں چاہتا؟
اگر تو مجھے محض "محبت" کی خاطر چاہتا ہے
تو پیارے مجھ سے الفت رکھ!
میرا دل جو سورج سمندر اور بہار سے کم نہیں
ہمیشہ کے لئے تیرا ہے!

"نظام کالج اردو میگزین"

اندھے کا گیت

میں اندھا ہوں، اے باہر والو، ایک عذاب ہے یہ،
ایک نقیض ہے ایک تضاد ہے یہ،
ایک دن دونا رات چوگنا بوجھ
اپنا ہاتھ اپنی جورو کے کاندھے پر رکھ لیتا ہوں
اپنا بیرنگ ہاتھ اُس کی بے رنگ بے رنگی پر،
اور وہ مجھ کو ایک خالی عالم میں لئے پھرتی ہے
تم کتراتے ہو، ذرا ہٹتے ہو، جگہ دیتے ہو اور سمجھتے ہو
کہ تمہارے ہٹنے بچنے کی آوازیں پتھروں کے ٹکرانے کی آوازوں سے نشیریں تر ہیں۔
لیکن تم غلطی پر ہو۔ میں تنہا
جیتا ہوں، رنج سہتا ہوں، شور کرتا ہوں۔
میرے اندر نالوں کا ایک طوفان ہے۔
اور مجھے پتہ نہیں چلتا کہ یہ میرے اندر کون چلا رہا ہے
میرا دل یا میری انتڑیاں۔
سنے تم نے یہ گیت؟ کچھ تم نے تو گائے نہ تھے یہ،
اور گائے بھی تھے تو بالکل اسی انداز سے نہیں۔
تمہارے کھلے کھلے گھروں میں تمہارے لئے
روز کے روز ایک نئی گرمی، ایک نئی روشنی نازل ہوتی ہے۔
اور تم ایک دوسرے کے چہروں سے متاثر ہوتے ہو،
اس سے آدمی آدمی کا خیال کرتا ہے۔

"جامعہ"

فہرستِ مضامین

جلد ۱۶ — بابت ماہِ دسمبر ۱۹۲۹ء — نمبر ۶

تصویر:- گوئٹے اٹلی میں

سالگرہ نمبر

ہمایوں کے آٹھویں سال کا یہ آخری پرچہ ہے۔ جنوری کا رسالہ سالگرہ نمبر ہوگا، اور اس تقریب پر حسبِ معمول وہ خاص اہتمام سے تیار کیا جائے گا۔ اس کا حجم پونے دو سو صفحات سے زائد تجویز کیا گیا ہے اس کیلئے بہترین اور بلند پایہ ادیبوں اور مصوروں کے مضامین و تصاویر صرفِ کثیر اور کاوشِ عظیم سے حاصل کئے گئے ہیں۔ مضامین کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے کہ ہمایوں کا یہ سالگرہ نمبر گزشتہ کی بہ نسبت زیادہ دلچسپ اور زیادہ کارآمد ہوگا۔ تصویروں پر دلکش نظمیں ہونگی یعنی مصوری کی ترجمانی شاعر کے احساساتِ لطیف کریں گے۔

دنیا کے نئے تمدن کے متعلق ایک جامع اور مبسوط مضمون ہوگا جس میں انسان کی آئندہ رفعت و عظمت کا نقشہ پیش کیا جائے گا۔

ہمایوں کے فلک پیما نامہ نگار کے قلم سے ایک "کلیمانہ" مضمون ہوگا، جس کی ندرت اور شگفتگی کیف انگیز ہونگی چار یا پانچ مختلف النوع افسانے ہونگے جن میں زندگی، کمال بینی، محبت اور اخلاق کے بصیرت افروز مناظر نظر آئیں گے۔

عورتوں کی زبان میں ایک پُرلطف سیر کی سرگزشت ہوگی جسے ایک مسلّمہ اور مستند اہلِ زبان نے لکھا ہے۔

زبانِ اردو کی ایک نہایت اہم تحریر پر تنقید ہوگی جو اپنی دلچسپی کے لحاظ سے لاجواب ہوگی۔

دوسرے عالی پایہ مضامین، دل افروز نظمیں اور خوبصورت یک رنگی و سہ رنگی تصاویر بھی قابلِ دید ہوں گی نظم کا حصہ خاص طور پر بلند ہوگا۔

سالگرہ نمبر میں مندرجہ ذیل بڑے بڑے ادبا و شعرا جلوہ افروز ہونگے:۔

میاں عبدالعزیز، سید سلطان حیدر جوشؔ، آغا حیدر حسن دہلوی، حکیم آزاد انصاری، مولانا جوش ملیح آبادی حضرتِ اصغر گونڈوی، جناب حمید احمد خاں، حامد اللہ صاحب افسرؔ میرٹھی، عاشق حسین صاحب بٹالوی، میاں عطاء الرحمٰن، حضرت احسن مارہروی، جناب آثر صہبائی، جناب جگرؔ بریلوی۔

سالگرہ نمبر نئے سال کا بہترین تحفہ ہوگا۔ اسے کثیر تعداد میں چھپوایا جا رہا ہے۔ اپنے دوستوں کے لئے زائد جلدوں کی فرمائشیں جلد بھجوائیے قیمت ایک روپیہ مقرر کی گئی ہے سالانہ خریدار بننے والوں سے اس پرچے کی علیحدہ قیمت نہ لی جائے گی۔

مینجر

رباعیات

(۱)

آزاد بشر ہے ایک حد کے اندر
مختار ہے اپنے نیک و بد کے اندر
ممکن ہے بہشت و [illegible] اس کی پروا
محبوس ہے گو روح جسد کے اندر

(۲)

یہ زندگی عاقل بھی ہے جاہل بھی ہے
یہ زندگی صادق بھی ہے باطل بھی ہے
وابستہ ادھر حق سے ادھر دنیا سے
یہ زندگی ناقص بھی ہے کامل بھی ہے

(۳)

ہر کام ہے اب کام مری بربادی کا
ضامن ہی ہے ہر اک اپنے غم و شادی کا
کٹ جائیں گے ایک ایک کر کے سب بند
دنیا میں زمانہ ہے اب آزادی کا

(۴)

کچھ کام ہیں ایسے کہ پشیمان ہوں میں
کچھ کام ہیں ایسے بھی کہ نازاں ہوں میں
اب ناز کروں اپنی پشیمانی پر
یا ناز پہ بھی اپنے پشیمان ہوں میں

بشیر احمد

جہاں نما

امریکا میں حبشیوں کی ترقی

گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں انقلاب انگیز تبدیلیوں نے جہاں ممالکِ متحدہ امریکا کو اقوامِ عالم کی سب سے اگلی صف میں لاکھڑا کیا وہاں حبشیوں کے لئے بھی ترقی کا راستہ کھول دیا - اب حبشی خوش بختی کے دور میں داخل ہوچکا ہے اور جلد جلد حیاتِ ملیہ کا ایک جزو شمار ہورہا -

آج سے بیس سال قبل اسے ملک کی ترقی کے لئے بڑی بھاری رکاوٹ سمجھا جاتا تھا، ایک ابدی وازلی ذلیل ہستی جسے امریکی زندگی سے کوئی سروکار نہ ہو - اُس وقت اسے بھی اپنے آپ پر اعتماد نہ تھا - اسے اپنی ذلت کا پورا یقین تھا اور اسے خیال تک نہ تھا کہ اپنے حقوق منوانے کے لئے وہ اپنے پراگندہ شیرازے کو منظم کرسکتا ہے - اُس زمانے کی سائنس اُسے ادنیٰ قسم کا انسان شمار کرتی تھی اس پر صرف حبشی کا اطلاق ہوتا تھا اور یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ اُس کی کوئی تاریخ نہیں ہے - لوگ ہر ہفتہ تین حبشی ہلاک کردیتے تھے - اُن کے مال واملاک چھین لئے جاتے تھے جنوبی علاقوں میں نوواردوں نے حبشیوں سے وہ کام چھین لئے جو نسلاً بعد نسلٍ شمالی علاقوں میں انہیں کے قبضے میں چلے آتے تھے - اُن ابتدائی صنعتوں میں جنہوں نے امریکا کا مرتبہ بلند کیا حبشیوں کا کوئی حصہ نہ تھا - بہت کم حبشی کالجوں میں تعلیم پاتے تھے اور بہت کم حبشی تعلیم یافتہ پیشوں میں تھے - حبشی ادب بالکل موجود نہ تھا چیسٹ نٹ اور ڈنبار جیسے مصنفین مستثنیات میں سے سمجھے جاتے تھے - جنوب میں حبشیوں کی تعلیم پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی - سیاست دانوں کو پختہ یقین تھا کہ حبشی تپِ دق، جرم اور کمزوری کی وجہ سے بالکل نابود ہوجائیں گے -

آج حبشی ایک زبردست اور منظم قوم ہے جو اپنے حقوق کی خود حفاظت کرسکتی ہے، اپنی ترقی کے لئے رستہ صاف کرسکتی ہے اور اپنی ضروریات کو مہیا کرسکتی ہے - اب وہ اپنی نسل پر نازاں ہیں - اب سائنس بھی اُن کا ہمنوا ہے اور کہتا ہے کہ اُن کی پستی کا کوئی ثبوت نہیں اور امریکی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ان میں ہر طرح کی اہلیت موجود ہے - اب گورے اور کالے سکولوں میں حبشی تاریخ پڑھائی جاتی ہے - افریقہ کے حبشی تمدن کی اب قدر سمجھ آچلی ہے اور اسے پسند بھی کیا جاتا ہے - حبشیوں کے قتل کے واقعات ۱۹۲۸ء میں صرف گیارہ تک رہ گئے - اب بہت سے شہروں میں حبشی ارکانِ کونسل موجود ہیں - وہ رکنِ مجلس قانون ساز ہیں، بلکہ ملکی کانگرس

میں بھی ان کا ایک رکن موجود ہے۔ دس ہزار حبشی ہر سال امریکن کالجوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نکلتے ہیں۔ ان کے ۴۵ ہزار معلّم ہیں جن میں سے ۴ اسو اعلیٰ تعلیمی مراکز میں ہیں۔ حبشی ناول نویس مضمون نگار اور شاعر امریکا کے ادب میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ جارج کارور اور ارنسٹ جسٹ بہت بڑے سائنس دانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۲۵ سو حبشی ڈاکٹر اور سرجن ہیں۔ ایک ہزار سے زائد حبشی وکیل ہیں جن میں سے کئی جج ہیں اور دونوں نسلوں میں دادِ انصاف دے رہے ہیں۔

حبشیوں کے جلد نابود ہو جانے کے متعلق تمام پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوئی ہیں۔ برخلاف اس کے دوسروں کے مقابلہ میں ان کی موت میں اک نمایاں کمی واقع ہو گئی ہے۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان صرف تپِ دق کی اموات میں ۴۲ فی صدی کمی واقع ہو گئی ہے۔ حبشیوں کی رفتارِ پیدائش اس وقت وہی ہے جو آج سے ۳۰ سال قبل گوری قوم کی تھی اور جو کئی یورپین ممالک سے زیادہ ہے۔ عام تعلیم، بہتر اقتصادی حالت اور بہتر صحت کی وجہ سے اس میں اور بھی ترقی ہو رہی ہے۔

گذشتہ بیس سال میں حبشی ترقی کی راہ میں بہت آگے نکل گئے ہیں لیکن بعض مشکلات اب تک اُن کے راستے میں حائل ہیں۔ ابھی اُن کو بہت طویل راستہ طے کرنا ہے لیکن وہ صحیح راستے پر گامزن ہیں اور پچھلے بیس سال کے واقعات پر نظر ڈالنے سے صاف طور پر نظر آتا ہے کہ وہ بہت جلد منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

ٹالسٹائی کس طرح مرا

اخبار "ٹونگ ایج" لکھتا ہے کہ سوویٹ حکومت ایسی تحریریں نہایت سرگرمی سے شائع کر رہی ہے جن سے کونٹ ٹالسٹائی کے عہد اور اس کی شخصیت پر کوئی نئی روشنی پڑتی ہو، شاید اس لئے کہ لینن نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "جنگ اور امن" دنیا کی بہترین تصنیف ہے۔ ان تحریروں میں سے آخری وہ تاروں کا مجموعہ ہے جو اشاپوو کے مقام سے بھیجے گئے جہاں ٹالسٹائی کا انتقال ہوا۔ ذیل کی سطور ہم اس اخبار سے نقل کرتے ہیں:-

اواخر اکتوبر ۱۹۱۰ء میں معمر کونٹ نے اپنے گھر کو چھوڑا۔ اسے خیال تھا کہ اس کی نقل و حرکت بالکل پردۂ خفا میں ہے لیکن حقیقت میں پولیس اُس کے ساتھ تھی جو اُس کے تمام حالات سے اُس کی بیوی کو خبردار رکھتی تھی۔ اُس نے ڈان سے راستوو کا ٹکٹ لیا اور اپنے دوست ڈاکٹر میکووش کی معیت میں سفر کر رہا تھا کہ ۳۱ اکتوبر کو تیسرے پہر کا یک بیماری نے آن دبایا۔ اُس وقت گاڑی اشاپوو کے گاؤں سے گذر رہی تھی۔

کونٹ کو فوراً گاڑی سے اتار لیا گیا۔ سٹیشن ماسٹر نے اپنا مکان اپنے معزز مہمان کو پیش کر دیا۔ پولیس ٹالسٹائی کے

خاندان، جرائد اور پادریوں کو فوراً خبر دی گئی اور یہ تمام اس چھوٹے سے قصبے میں آوارد ہوئے۔ ٹالسٹائی کی بیوی گاڑی کے ایک ڈبے میں فروکش ہوئی اور اس علاقے کا گورنر ایک دوسرے ڈبے میں۔ فوجیں بلائی گئیں اور توپیں اور بارود موقع پر جمع کر دیے گئے۔ کلیسا نے اس وقت تک اُس کے لئے دعا کرنے سے انکار کر دیا جب تک وہ دوبارہ کلیسا کے حلقہ میں داخل ہونے کے لئے رضامند نہ ہو جائے۔ حکام کے اوسان خطا تھے اور وہ تشدد پر آمادہ ہو رہے تھے لیکن تمام قوم میں ہمدردی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔

اس چھوٹے سے اسٹیشن سے برقی پیغامات کا ایک طوفان امڈا چلا آتا تھا۔ ان پیغامات کے مختلف مضامین سے معاشرہ کے مختلف طبقوں کے دلوں کا ایک مدہم سا نقشہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ پہلا پیغام پولیس افسروں کا ہے! "مصنف کونٹ ٹالسٹائی گاڑی میں بیمار ہو گیا۔ اسٹیشن ماسٹر روزولن نے اُسے پناہ دی" دوسرے روز خود ٹالسٹائی نے اپنے ایک دوست کو تار دیا "کل بیمار ہو گیا۔ مسافروں نے مجھے گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھ لیا۔ آج حالت اچھی ہے اپنا سفر جاری رکھوں گا۔ تدبیر کرو۔ نکولیو"۔ لیکن یہ بات جلد ہی صاف ہو گئی کہ "نکولیو" جیسا کہ اُس نے اپنا نام ظاہر کیا تھا اس اسٹیشن سے زندہ رخصت نہ ہو سکے گا۔ اُس کے باقی حالات مندرجہ ذیل پیغامات سے ظاہر ہوتے ہیں "اگر امن قائم رکھنے کے لئے مدد کی ضرورت ہو تو لیبیڈین سے پولیس بھیج دی جائے" یہ ایک ہمسایہ صوبے کے گورنر نے مقامی گورنر کو لکھا۔ "آج اسٹاپوو پہنچا۔ کونٹ کا گھرانہ یہیں ہے۔ کل پھر تار دوں گا۔ دعا کے لئے تہ دل سے استدعا کرتا ہوں۔ وارسونوف (پادری)"۔ ایک اخبار نویس نے پیغام بھیجا "خزاں کی تاریک اور طوفان انگیز رات تمام حاضرین کی روحوں کے ساتھ غم انگیز خیالات میں ہمنوا ہے۔ کیا روس کا آفتاب غروب ہو جائے گا؟" پولیس لکھتی ہے "بالکل امن ہے۔ اسٹاپوو کے باشندے کونٹ کی طرف سے بے پرواہ ہیں۔ انتظامات معقول ہیں"۔

جب کونٹ کا آخری وقت آن پہنچا تو پیغامات میں زیادہ ہیجان پیدا ہو گیا "دل کو سخت تکلیف ہے حالت نازک ہے"، "گھر والوں کو جگا یا گیا اور بلایا گیا ہے۔ حالت خطرناک ہے"، "دل کمزور ہو رہا ہے۔ گھر والے اسٹیشن پر پہنچنے والے ہیں۔ کونٹس بھی۔ ڈاکٹر رو رہے ہیں" "تیار رہو" "سو رہا ہے۔ نبض کمزور ہے۔ "ڈھائی بجے، کوئی قابل ذکر بات نہیں" "تین بجے۔ نئے خطرے پیدا ہو گئے ہیں"، مارفائن کا ٹیکہ لگایا گیا۔ حالت ویسی ہے۔ سو رہا ہے۔ ٹانگیں گرم ہیں" "پانچ بجے۔ دل یکا یک کمزور ہو گیا حالت سخت خطرناک ہے۔ دھند جھکڑ چل رہا ہے۔ پولیس پہرے پر ہے"

اس کے پانچ سنٹ بعد پولیس افسر نے اعلیٰ عہدہ دار کو تار دیا "ٹالسٹائی مر گیا" اُس کی موت کی پہلی خبر اُس کی بیماری کی پہلی خبر کی طرح پولیس ہی نے بھیجی۔

پنجاب میں علم کی سرپرستی

مندرجہ ذیل شذرہ ہمیں پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے اشاعت کے لئے موصول ہوا ہے:۔

مولفوں اور مصنفوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک فنڈ قائم ہے، تاکہ اس صوبے کی دیسی زبانوں کے اہل قلم کو مفید اور عمدہ کتابیں لکھنے کی ترغیب اور تحریک ہو، اور علم ادب میں ترقی ہو۔ یہ انعام صرف اس صوبے کے رہنے والوں کے لئے ہیں اور صرف چیدہ اور خاص تعریف کے قابل کتابوں کے لئے دئیے جاتے ہیں۔ ترجمے جب تک غیر معمولی اور انوکھی قابلیت کے نہ ہوں انتخابِ انعام میں نہیں آسکتے۔ انتخابِ انعام کے متعلق کمیٹی نے چند قواعد و ضوابط مرتب کر دیئے ہیں، اور انتخاب کے وقت ان پر عمل ہوتا ہے۔ ان قواعد کی نقل دفتر پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

واضح ہو کہ انعام دینے کی غرض سے کمیٹی ان تصانیف پر غور نہیں کرتی جن میں سیاسی اور مذہبی متنازعہ معاملات پر بحث مباحثہ ہو، یا جو کسی خاص فرقہ کے متعلق ہوں، یا ان میں سے ایسے مضامین ہوں کہ جن سے کسی طرح قوموں میں باہمی نفرت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، یا جن میں موجودہ فرقہ وارانہ سیاسی متنازعہ معاملات پر بحث کی گئی ہو، یا جو درسی کتابیں ہوں، یا جن کا کسی پیشہ سے تعلق ہو۔ ترجیح ایسی کتب کو دی جاتی ہے جو عوام الناس کے واسطے مفید ہوں اور جو عام فہم سائنس، تاریخ، سوانح عمری یعنی سیرت اور سیاحت سے تعلق رکھتی ہوں۔ یا جن کا مدعا یہ ہو کہ مدرسوں کے بچوں کے لئے آسان مفید اور دلچسپ علم ادب مہیا کیا جائے، یا جو کہ خاص طور پر لڑکیوں کے لئے لکھی گئی ہوں +

ہر سال ماہ جنوری میں ٹکسٹ بک کمیٹی کتبِ موصولہ پر غور کیا کرتی ہے۔ اس سال کی کتابیں برائے انتخاب ۲۔جنوری ۱۹۳۰ء تک دفتر میں آنی چاہئیں۔ گویا یہ آخری دن ہے +

موجودہ قواعد کی رو سے بہترین کتاب کے لئے انعام ہزار روپے تک ہو سکتا ہے اور کوئی انعام پانچ سو سے کم نہ ہوگا۔

تفصیلِ انعامات سال ۱۹۲۹ء حسب ذیل ہے:۔

نمبر شمار	جس کو انعام دیا گیا	نام کتاب	رقم انعام
۱	حافظ محمود شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی لاہور	پنجاب میں اردو	ایک ہزار
۲	ڈاکٹر سو لکھن سنگھ ایم بی بی ایس میڈیکل آفیسر خالصہ کالج امرت سر	نثری رک رکھیا	سات سو پچاس
۳	لالہ سنت رام بی اے لاہور	البیرونی کا بھارت حصہ سوم	پانچ سو
۴	ڈاکٹر سکھا رام مہیدی رتنا ایم بی بی ایس لاہور	جڑی بوٹی حصہ اول و دوم	پانچ سو

گوئٹے اٹلی میں

گوئٹے اپنی جوانی میں ایک رندِ لاابالی تھا، لیکن ۱۷۸۱ء کے موسمِ بہار میں جب وہ سوئٹزرلینڈ میں سردیاں گزار کر واپس آیا تو اُس کے دل میں پھر ادبی جوش پیدا ہوا۔ اُس نے سپینوزا کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی زندگی میں متانت اور مستعدی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ اُس نے ولہلم میسٹر اور ٹیسو دو تصانیف کی طرح ڈالی اور سیزر، محمد، آوارہ یہودی اور پرومی تھیوس پر مضامین کے خاکے تیار کئے۔

چھ اور سالوں تک وہ اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر میں رہا جس کے چاروں طرف باغ تھا اور جو ڈیوک کارل آگسٹ نے اُسے دے رکھا تھا۔ لیکن اُس کی طبیعت یہاں بھی بے کیف ہی رہتی تھی۔ اُسے ایک تازہ فضا کی ضرورت تھی جس میں اُس کے خیالات ابھریں۔

سو ۱۷۸۶ء میں کسی کو اطلاع دیئے بغیر گوئٹے چپکے سے اٹلی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ عمر بھر اُسے اٹلی جانے کی تمنا رہی تھی۔ جب انگور کی بیلیں، زیتون کے جھنڈ، پرانے شہر اور اس سے بھی پرانے کھنڈر اُس کی نظروں سے گزرتے تھے تو اُسے یہ سفر گھر سے زیادہ خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے اپنی شدید کلاسیکی رنگ میں ڈوبی ہوئی تصنیف افی گینیا یہیں مکمل کی جو جرمن زبان میں ایک یونانی المیہ ناٹک ہے۔ روما سے وہ سسلی میں پہنچا جس میں اُس نے یونان سے زیادہ یونانیت پائی۔

اٹلی میں گوئٹے نے اپنے عمر بھر کے ذوقِ تصویر کشی و نقاشی کو خیرباد کہی اور ہمہ تن شاعری میں محو ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سمجھ لیا کہ فطرت نے اُسے شاعری کے لئے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ وہ پھر ویمر میں آیا تا کہ اپنے عزائم کو بار ور ہوتا دیکھے۔ اُس نے ڈیوک سے کہہ کر دفتری تفکرات سے آزادی حاصل کر لی اور ادب کی خدمت کے لئے تیار ہو گیا۔

منصور احمد

غالب اور ہائنے

کامرڈ کے ایک پرانے پرچے میں ہندوستان کے مشہور مستشرق پروفیسر صلاح الدین خدابخش نے جرمنی کے جلیل القدر شاعر ہائنے کا موازنہ غالب سے کیا تھا۔ مضمون گو پرانا ہے مگر پرانی شراب کی خاصیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے پیش کرنے میں کسی خاص معذرت کی ضرورت نہیں۔

(مترجم)

حال میں ہائنے کے سوانح زندگی شائع ہوئے ہیں جن سے اُس کے تمام خصائل وخصوصیات، اُس کے افکار وآلام اس کے عشق ومحبت کی داستان اور آخر میں اس کی تکالیف اور علالت کے واقعات من وعن معلوم ہوجاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہائنے خود ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مخصوص بذلہ نواز لہجے میں اپنے اسرارِ دلی کہہ رہا ہے۔ جب اُس کے دل پر سے واقعاتِ عالم کا پردہ اُٹھتا ہے تو ہمیں اس آئینہ میں اُس کی صورت صاف نظر آتی ہے۔ گویا اس کا دل غمگین ہے، بے قرار ہے، اور کسی کی جستجو میں خون بہا رہا ہے۔

ہائنے پر اٹھارہویں صدی کے خیالات کا بہت گہرا اثر تھا اور یہ اثر مرتے دم تک ایک صورت پر قائم رہا۔ ہائنے جرمنی کے شہر ڈسلڈارف میں ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوا۔ تاریخ کے لحاظ سے گو وہ اٹھارھویں صدی کے اختتام پر پیدا ہوا، لیکن اس صدی کا نقش اُس کے دل پر پتھر کی لکیر کی طرح ثبت تھا۔ اس کی ماں فرانس کے مشہور فلسفی اور سیاسی روسو کی شاگرد تھی اور روسو کی مشہور تصنیف "ایمیل" سے جو تعلیم پر ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے، پورے طور پر واقف تھی۔ ہائنے کو اس طرح اٹھارہویں صدی کے خیالات وراثۃً ملے تھے۔ اٹھارھویں صدی سیاسی مباحث اور تحقیر مذہب کے لئے خاص طور پر مشہور ہے۔ اس زمانہ میں عقل ہی ہر چیز کا معیار سمجھی جاتی تھی۔ فلسفہ، علم، سیاست، سائنس غرض ہر شعبۂ زندگی میں انسان اپنی ان تھک کوششوں کا ثبوت دے رہا تھا۔ گذشتہ واقعات اور روایات پر سختی سے نکتہ چینی ہوتی تھی۔ مذہب کو بغیر سوچے سمجھے قبول کر لینے کے خلاف ایک ہنگامہ گرم تھا۔ خون اور نسل کا تفوق مٹتا جا رہا تھا۔ خدا کی ودیعت کردہ حکومت کے اصول کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اور سوسائٹی کو ایک نئے مرکز پر لانے کی کوششیں جاری تھیں اور ساتھ ہی ساتھ سیاست بھی اپنا رنگ بدل رہی تھی۔ اس صورتِ حالات میں جب کہ یورپ ایک انتشا

کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اور اس پر سے دماغی اور سیاسی انقلابات کی موجیں گزر رہی تھیں ہائینے نے دنیا میں قدم رکھا۔ جو کچھ روسو نے سیاست کی دنیا میں کیا بالکل وہی ہائینے نے عقل کی دنیا میں کیا۔ ایک طرف روسو انسان کے طوقِ غلامی کے خلاف برابر آواز بلند کرتا رہا۔ اور ہمیشہ انسان کو سیاسی غلامی سے نجات دلانے کی فکر میں سرگرداں رہا۔ دوسری طرف ہائینے نے اپنی تلوار سنبھالی اور اُن تمام گتھیوں کو کاٹ دیا جو عقل میں لپٹی ہوئی تھیں۔

ہائینے کو اوائلِ عمر ہی سے لکھنے کا شوق تھا۔ اُس نے سولھویں ہی برس میں اپنے قلم کو جنبش دینا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد جب اس دریا میں طوفان آیا تو آخر تک یہی کیفیت باقی رہی۔ اُس کا قلم اُس کے خیالات کی ترجمانی میں کبھی سست نہیں رہا۔ اُس کی ماں کو بڑا شوق تھا کہ وہ اپنے جوان بیٹے کو ایک کامیاب ساہوکار بنتا ہوا دیکھے اور وہ روپے سے کھیلے لیکن اُس کو کیا خبر تھی کہ اس کا بیٹا ایک ایسا پیشہ اختیار کرے گا جس کا اُس کو سان گمان تک نہیں۔ ماں کے اصرار پر بہرحال اُس نے ایک ساہوکار کی دوکان پر نوکری کر لی اور وہاں آنے جانے لگا مگر اس لین دین میں اُس کی طبیعت نہ لگتی تھی۔ تین ہفتہ تک بمشکل اُس نے اپنے دل پر صبر کی سل رکھ کر اس مصیبت کو برداشت کیا اور اس کے بعد اپنی ماں کو کسی طرح راضی کر کے وہاں سے علیحدہ ہو گیا۔ وہ اب جاننے لگا کہ تجارت سے اُس کا مذاق کوسوں دور ہے اور اپنی تمام کمزوریوں اور قوتوں پر اس غرض سے غور کرنے لگا کہ اب اُس کو کیا کرنا چاہیے۔ اُس نے سوچا کہ مجھ کو اگر کہیں سرخروئی نصیب ہو سکتی ہے تو وہ ادب کی دنیا ہے اور واقعی اس دنیا میں اُس نے جو نام پیدا کیا وہ نہ صرف اُس کے لئے بلکہ اُس کے تمام ملک کے لئے تاریخ کے صفحات میں ایک زریں کارنامہ رہے گا۔ ساہوکارہ چھوڑ کر اُس نے قانون کی طرف رجوع کیا لیکن یہ بھی اُس کے مذاق کے مطابق نہ نکلا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ بے شک ایک ایڈووکیٹ بن گیا مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس پیشے سے اُس کو اپنی روزی پیدا کرنے میں کسی قسم کی سہولت نہ ہوئی۔

بڑے بڑے اصحابِ نظر کی طرح اس کو وقت کی سوسائٹی سے بالکل لگاؤ نہ تھا۔ ۱۶ سال کی عمر میں جب ایک جلاد کی لڑکی سے اُس کو عشق ہو گیا تو وہ لکھتا ہے کہ میں اس سے اپنے جذبات کی بنا پر عشق نہیں کرتا بلکہ مجھ کو سوسائٹی کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے میں مزا آتا ہے۔

یہاں ہم پر اس کے مزاج کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اپنی تمام زندگی اُس نے ایک کمربستہ سپاہی کی طرح کاٹ دی ہمیشہ وہ آزادی کے لئے لڑتا رہا۔ کون سی آزادی؟ وہ آزادی جو انسان کو گذشتہ روایات کی جماعتی اور عقلی غلامی سے آزاد کرائے۔

اپنے متعلق وہ لکھتا ہے کہ میں حسین عورت اور انقلابِ فرانس کا ہمیشہ شیدائی رہا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا کا کون صاحب

دل ایسا ہے، خواہ وہ لشکر شکن سپہ سالار ہو یا ملکوں کو تہ و بالا کرنے والا سیاس گوشہ میں بیٹھ کر فلسفہ کے ادق مسائل پر غور و فکر کرنے والا فلسفی ہو یا ادب کے لطائف اور نکات پر مسرور ہونے والا شاعر جو ایک حسین عورت کا شیدائی نہ ہو۔ قیصر کو لیجئے۔ خود جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ خالد اور ابو سینا کو دیکھئے۔ کیا یہ لوگ محبت کی دیوی کے پرستار نہ تھے؟ لیکن بہت ممکن ہے کہ ہائنے کا دل عورتوں پر اس زمانے کی سختیاں دیکھ کر پسیج گیا ہو اور اس طرح اس کے عشق میں ایک قسم کی شعریت پیدا ہو گئی ہو۔ عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے آواز بلند کرنے سے اُس کی مراد کمزوروں کی حمایت تھی۔

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اُس کو دولت کی دیوی کے دربار میں حاضری کا کم موقع ملا لیکن جب ملا تو اس کا نتیجہ اس کی طویل علالت کی صورت میں ظاہر ہؤا۔ اس کے اس بیان میں کتنا درد ہے کہ میں نے اپنے زمانۂ قیامِ یونیورسٹی میں جواہرات زیرِ حلق اتارے ہیں اور موتیوں کو ہضم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میری گھڑی کو میرے دل کا راز مجھ سے زیادہ معلوم ہے اور وہ اس کو مشتہر بھی کرتی ہے اس لئے کہ وہ کبھی کبھی کسی یہودی کے تہ خانہ کی بے تکلف سیر بھی کرتی ہے۔ ان الفاظ میں محض شاعری کی لطافت نہیں ہے بلکہ یہ وہ تلخ حقائق ہیں جن کو ہائنے نے محسوس کیا مگر معمولی طور پر ظاہر کیا۔ اس کی تمام زندگی غربت اور علالت کی وجہ سے بے کیف رہی اور ایک دفعہ اُس نے کس حسرت بھرے انداز میں کہا ہے "کاش میں دنیا سے اُٹھ جاتا۔ اے سوزِ جانگزا تیرا نام ہائنے ہے!"

اُس کی تمام تحریروں میں، کیا نظم، کیا نثر، اس کے ذاتی سوز و گداز کا ذکر موجود ہوتا ہے۔ اس کی شوخ اور مذاحیہ تحریروں میں بھی یہ رنگ صاف جھلکتا ہے اور اکثر اوقات یہ رنگ اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ گویا ہم فریادِ جرس سن رہے ہیں ہائنے کی افتادِ طبیعت روسو سے بالکل مختلف تھی۔ روسو کی سرشت میں تعمیر تھی اور ہائنے تخریب پسند تھا۔ اس کے اندازِ تحریر میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جس سے معلوم ہو کہ ہائنے کو کسی نئی چیز کے تیار کرنے میں لطف آتا تھا۔ اُس کا مقصد محض اس قدر تھا کہ وہ عقل کو تمام فرسودہ روایات سے پاک کرے۔ نپولین کے اور اُس کے خصوصیات میں بڑی حد تک یکرنگی تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ نپولین کا شیدائی تھا۔ نپولین بھی اس کی طرح توڑ پھوڑ میں مشاق تھا۔ انقلابِ فرانس کا وہ بڑا مداح تھا۔ اس لئے کہ اُس نے اُن تمام روایات کو خاک کے ذروں کی طرح اڑا دیا جو اخوت آزادی اور مساوات کے راستے میں حائل تھے۔ مذہب پر اس کے تمام حملوں کا ذکر بھی اسی روشنی میں ہو سکتا ہے۔ مذہب ہمیشہ قدامت پسند طبقے کا بڑا قلعہ رہا ہے اور اُس نے خیالات کی ترقی میں کافی روکاوٹیں ڈالی ہیں۔ ہائنے نے اس لئے مذہب پر سخت حملے کئے کہ یہ نئے خیالات کی ترویج کو روکتا اور قدیم کو مستحکم کرتا ہے۔ وہ مذہب کا تار و پود بکھیرتا ہے اور اپنی نظموں میں

اس پر آوازے کستا ہے معجزات کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ خدا کو اپنے افعال کی تنقید اب منظور نہیں اسی لئے معجزات بند ہو گئے ہیں۔ اُس کے زمانہ میں جرمنی کے اندر مذہب کے خلاف ایک تحریک شروع ہوئی ہائنے اس میں شریک ہوا اور اس نے مذہب پر خوب خوب حملے کئے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھ پر چند حلقوں میں اعتراض ہوا ہے کہ میں نے جرمنی کے رخ سے کیوں نقاب الٹ دیا اور کیوں میں نے جرمن قوم پر یہ ظاہر کر دیا کہ وہ جس بہشت کی پرستش کر رہے ہیں وہ سراسر دیوتاؤں سے خالی ہے۔ ہاں وہاں البتہ ایک خضر صورت ہستی ضرور نظر آتی ہے جس کے دل میں رنج و غم کا وفور ہے اور اُس کے ہاتھ کسی بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ اور اس صورت کا نام "ضرورت یا احتیاج" ہے۔ میں نے تو صرف ایک تنبیہ کی ہے کہ ہر شخص کو خود اس طرف قدم بڑھانا چاہیئے اور اپنی بساط کے مطابق علم حاصل کرنا چاہیئے۔ اور جو انوکھی باتیں میں آج کر رہا ہوں وہ دریائے رائن کے اُس کنارے پر (فرانس) مدتوں سے کہی جا رہی ہیں۔ ہم میں وحدانیت کے ایسے پرستار بھی ہیں جو والٹیر کو زندہ جلا دیں اس لئے کہ وہ پوشیدہ طور پر موحد ہے"!

آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس کی تحریر میں کتنی تلخی ہے اور اُس نے اپنے مطمح نظر کو ثابت کرنے کے لئے کتنا وحشیانہ پہلو اختیار کیا ہے۔ اُس کو صرف مذہب ہی سے نہیں بلکہ سارے جماعتی نظام سے نفرت ہے۔ بادشاہ سے لے کر غلام تک، رئیس سے لے کر مالگذار تک اور فلسفی سے لے کر بیوقوف تک سب اس کے تیر ملامت کا نشانہ بنتے ہیں۔ دنیا اس کے نزدیک گویا اپنے محور سے ہٹ گئی ہے۔ اس میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے اور ان حقائق کو وہ برابر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

لیکن کیا وہ دنیا کی تمام خرابیوں کو لاعلاج سمجھتا تھا کہ اس کی تباہی کا خیال ہر وقت اس کو رہتا تھا نہیں اُسے ہرگز یہ خیال نہ تھا۔ وہ ان خرابیوں کی اصلاح مستقبل کے پردہ پر اپنی دوربین آنکھوں سے دیکھتا تھا، اور اس معاملہ میں اس کی وسعت نظر اس کے پیش رووں اور پس رووں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ وہ تمام انسانوں کی ایک مجلس کے قیام کا موید تھا۔ وہ دنیا میں ایسا دستور چاہتا تھا جس سے ہر شخص کا دوسرے سے لگاؤ پیدا ہو۔ ذیل میں اس کی ایک عبارت کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس سے انسانوں کے متعلق اس کی محبت صاف طور پر آشکارا ہوتی ہے،

"کتنی بہاریں آئیں اور چلی گئیں لیکن اُن کا جوبن کبھی نہیں نکھرا۔ میں بہار کی ترنم ریز بلبل کے شیریں مگر دروغ نالوں پر ہرگز یقین نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کا فروغ بے ثبات ہے اور جب میں کلی کے ننھے دل کو پھول میں مدلتے خون ہوتے اور آخر میں ہوا کے کسی شوخ جھونکے کی تاب نہ لا کر مرجھاتے اور پیوند خاک ہوتے

دیکھتا ہوں تو میرے سامنے بے ثباتی کی ایک مجسم تصویر ہوتی ہے۔ مجھ کو ہر جگہ موسمِ سرما کا ظہور نظر آتا ہے جو دلوں کی گرمی شباب کی شوخی اور موجوں کی روانی کو سرد کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود بھی میرے سینہ میں ایک چنگاری موجود ہے جس میں تمام عالم پر چھا جانے اور اُس کو مسخر کر لینے کی ایک آرزو پوشیدہ ہے۔ ستاروں کی رفاقت اس کو ناپسند ہے اس لئے کہ اُن میں سراسر سردی ہے۔ کہکشاں کی سفیدی اُس کو منظورِ نظر نہیں اس لئے کہ وہ بے میل ہے۔ غرض آسمان اور زمین میں اس کے بسنے کے لئے اگر کوئی ممکن جگہ ہے تو وہ صرف میرا دل ہے۔ یہی محبت ہے جس کا ظہور اکثر دیوتاؤں کی صورت میں ہوا ہے"۔

زندگی میں ہم کو تعمیری اور تخریبی دونوں قوتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ دونوں کے حلقۂ عمل جداگانہ ہیں اور ضروری ہیں۔ ہر قوم کی تاریخ میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب تخریب کی ضرورت اشد ہوتی ہے اور اس وقت ہم تخریبی قوائے عملیہ کو برسرِ کار لا کر تمام خرابیوں کا قلع قمع کر دیتے ہیں تاکہ ہم سچائی کو اس کی پوری شان و شوکت کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ فرمائی کا موقع دیں۔ اور اس ذیل میں ہائنے نے بنی نوعِ انسان کی جو خدمت کی ہے وہ تاابد زندہ رہے گی۔ بے ایمانی، ریاکاری، مکاری کا اس کے ہاں مطلق گذر نہیں۔ اس کے علم پر انصاف اور سچائی کے الفاظ کندہ تھے۔ اور اُس نے اس علم کو تازندگی کبھی سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر قسم کے حوادثِ زمانہ کا ثابت قدمی اور دلیری سے بلاخوفِ نتائج مقابلہ کرتا رہا۔ اگر وہ عیش و آرام کی زندگی میں پڑ جاتا تو اتنا بڑا کام کبھی نہ انجام دے سکتا۔ اس کے باپ نے اس کو ایک دفعہ نصیحت کی تھی کہ "بیٹا۔ تمہاری ماں چاہتی ہے کہ تم ریکٹر شلیمر سے جا کر فلسفہ پڑھو۔ یہ اس کا معاملہ ہے۔ مگر میں فلسفہ پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ صرف خیالی اور وہمی چیز ہے۔ میں بیوپاری آدمی ہوں۔ مجھ کو اپنے بیوپار میں اس سے کیا مدد ملے گی۔ لیکن اگر تمہارا جی چاہے تو میں تمہیں اس سے روکتا نہیں مگر عوام کے سامنے تم اپنے انکار کا ذکر نہ کیا کرو۔ اس لئے کہ اس سے میرے بیوپار کو نقصان پہنچے گا خاص کر اُس وقت جب لوگ سنیں گے کہ میرا لڑکا خدا پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ یہودی تو مجھ سے لین دین مطلق بند کر دیں گے اور تم جانتے ہو کہ یہودی کتنی جلدی قیمت ادا کر دیتے ہیں اور اپنے مذہب پر کتنی سختی سے پابند ہیں"۔

لیکن باپ کی یہ نصیحت ہونہار بیٹے کے لئے بالکل بے سود ثابت ہوئی۔ ہائنے نے اپنا عندیہ اپنے باپ سے صاف اور واضح طور پر کہہ دیا۔ اس کو بہت سا لالچ بھی دیا گیا مگر ہائنے کا پختہ دل اپنے راستے سے تنکا برابر بھی ہٹنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آزادی کا یہ علمبردار جرمن زبان کی نثر کا پیغمبر بھی تھا۔ جرمن زبان شاید ہی کسی دوسرے شخص کا نام بتا سکتی ہے جو اس قدر صاف، رواں، سلیس

پُرزور اور پُرمعنی تحریر پر قادر ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہائنے اپنے فن میں لاثانی ہے۔ کون سا دل ہے جو اُس کی غزلیں پڑھ کر بے قرار نہ ہو جائے اور کون سا ہاتھ ہے جو کوہ ہرز کا سفرنامہ پاکر مصنف سے مصافحہ کا شائق نہ ہو جائے۔ ہاں، کون ہے جو اس کے انگریزی حالات کو پڑھ کر اپنے دل کو قابو میں رکھ سکے۔ لیکن اس کی زندگی قریب قریب رنج وغم کی ایک داستان ہے جس میں مسرت اور خوشی کے صفحات کم نظر آتے ہیں۔ ۱۶۔ فروری ۱۸۵۶ء کی وہ شام پُرحسرت تھی جب کہ اُس کا آفتابِ حیات ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ اُس کے حسبِ ذیل الفاظ سے اُس کے دردِ دل کا حال کسی حد تک معلوم ہوتا ہے:-

"دیکھو میرے تابوت کی لکڑیاں مضبوط اور عمدہ ہوں۔ خیال رکھنا کہ وہ دریائے رائن کے پل سے لمبی ہوں۔ میری نعش کو کاندھا دینے کے لئے کم سے کم بارہ قوی ہیکل جوانوں کو بلانا تاکہ وہ میری بھاری نعش کو اٹھا کر قبر کے گڑھے میں ڈال دیں۔ مگر سنو میری نعش کے لئے سمندر کی گہرائی زیادہ موزوں ہے۔ میری نعش آخر کیوں اتنی بھاری ہوگی اس لئے کہ میرے دل میں دو عالم کے خزائن پوشیدہ ہیں۔ سمندر کی گہرائی میرے لئے مناسب ہے اور میں وہیں رہ سکوں گا کیونکہ ایک طرف مجھ میں دنیا کی ساری کلفتیں ہنگامہ آرائی کرتی ہونگی اور دوسری طرف محبت اپنی پوری تیزی کے ساتھ جوش مار رہی ہوگی"

تھوڑا عرصہ ہوا کہ میں نے غالب اور ہائنے کا موازنہ کیا تھا جو محض سطحی تصور کی بنا پر نہ تھا بلکہ خاصی فکر اور دماغی کاوش کا نتیجہ تھا۔ ہائنے کے سوانح شائع ہونے سے یہ رنگ ذرا صاف ہو جاتا ہے، اور ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور ہائنے کے سینوں میں ایک ہی دل تڑپتا تھا۔ رقعاتِ غالب پڑھئے اور ساتھ ہی ساتھ ہائنے کے خطوط کا بھی مطالعہ کیجئے پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں کتنی دماغی قربت تھی۔ دونوں میں آورد کا نام تک نہیں اور نہ وہ کسی جوش کو دبانے یا ظاہر کرنے کی کوئی خاص کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کلام گویا ایک پردہ ہے جس کو اٹھا کر وہ اپنے دل کی کیفیت عالم پر آشکارا کرتے ہیں۔ خلوت میں وہ بالکل اطمینان اور صفائی قلب سے باتیں کرتے ہیں۔ ان کی صحبتوں میں ہر حسین اور پُر رونق چیز کا ذکر ہوتا ہے۔ دونوں میں حقیقت کے دریافت کرنے کی تڑپ موجود ہے۔ دونوں کو آپ کسی خیالی معشوق کے لئے سرگردان اور پریشان پائیں گے۔ اُن کے کلام سے روح کو تازگی اور فرحت ملتی ہے، دماغ کو روشنی اور تاریکی کا امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ اور عالی حوصلگی و رفعتِ خیال کو تقویت ہوتی ہے۔ دونوں اپنے فن کے کامل استاد ہیں اور کون ہے جو اُن کے اثرات سے زندگی کے پوشیدہ راز کو معلوم کرنے کا خواہاں نہیں ہے؟ دونوں دنیا کی تکالیف پر آنسو بہاتے ہیں۔ اُن کا دل انسانیت کے غم میں

بے قرار ہے لیکن انسان کی آخری تباہی پر کون ہے جس کو یقین نہیں ہے؟ دونوں ملول ہیں مگر ان کے اس انداز میں بھی ایک شاہانہ تمکنت ہے۔

اردو ادب میں غالب کا وہی درجہ ہے جو جرمن ادب میں ہائنے کا ہے۔ اردو نثر کی شگفتہ بیانی کی ابتدا کا سہرا بجا طور پر غالب کے سر ہے۔ غالب نے اس میں سلاست، ترنم، روانی اور حسن پیدا کیا اور اسکی ترقی کے لئے لامتناہی راستہ کھول دیا۔ لیکن غالب اور ہائنے کا موازنہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ دونوں ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب ایک دور ختم اور دوسرا شروع ہو رہا تھا۔ موجودہ طرزِ زندگی اور خیالات کی رُو سے پریشان ہوکر دونوں نے اپنی دنیا الگ آباد کی۔ دونوں کے حسرت و ارمان اور رنج و مسرت کے بیان سے رازِ دلی صاف ظاہر ہوتا ہے اور یہی اُن کے فن کا سب سے بڑا جادو ہے جو دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ دونوں نے دل کی زبان میں نغمہ سنجی کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام تا ابد تازہ اور شاداب رہے گا۔

دونوں اس طرح حقیقت کے چہرہ سے نقاب کشائی کرتے ہیں اور اس طرح انسانی دل کے راز کو آشکار کرتے ہیں کہ ہم فوراً اُن کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر ہمیں اپنے طرزِ بیان سے اس طرح حیرانی میں مبتلا کرتے ہیں کہ گویا اس راز کا افشا ہماری زندگی کا عین مقصد تھا۔ دونوں کے دل میں انسانی ہمدردی اور محبت کا سمندر جوش مارتا ہے۔ دونوں کمال نومیدی و حیرت کے عالم میں انسانی گوشت پوست کو امید کے روح افزا پیاموں سے مسرور کرتے ہیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دونوں مشعل کا کام دیتے ہیں۔ دونوں ایک خیالی حقیقت کے پیچھے بڑی سرگرمی اور جوش سے دوڑتے ہیں اور ہر راہرو کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں لیکن دونوں کی سعی پیہم عالم کی لامتناہی وسعت میں جاکر گم ہو جاتی ہے۔ دونوں زخمِ دل کا علاج کرتے ہیں اور انتہائی حرماں کے وقت دستگیری کرتے ہیں۔ دونوں انسانیت کو ایک خوش آیند زندگی کا مسرت آمیز پیغام دیتے ہیں۔ کمال اور اطمینانِ قلب دونوں کا اصل الاصول ہے۔ اور اس لئے اُن کے راستہ میں جتنی دقتیں حائل ہوتی ہیں اُن کا بڑی مردانگی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ مذہب پر غالب کا حملہ ویسا ہی سخت اور تیز ہے جیسا ہائنے کا سخت اور تمسخر آمیز ہے۔ دونوں کو ایسے مذہب سے بالکل انس نہیں جو صرف نام کی خاطر زبان سے ادا کیا جائے۔ دونوں کبھی اپنی محنتوں کے ثمر حاصل کرنے کے شائق نہ تھے۔ دونوں ہمیشہ قسمت کے ہاتھوں نالاں رہے اور برابر قلم اسی کی شکایت پر صرف کرتے رہے ہ

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اگر ہائنے نے انسانی ادب کی جنگ میں اپنی سپہ گری کا کمال دکھایا تو غالب بھی اس سے پیچھے نہیں رہا۔ غالب ہمیشہ رنگ و بو کے پردے میں حقیقت کو تلاش کرتا تھا اُس کا دل ہمیشہ محبت کے ولولوں سے سرشار رہا۔ قدیم روایات کا وہ سرے سے مخالف تھا اور ان کے خلاف اسی جوش اور سرگرمی سے آواز بلند کرتا رہا جس جوش اور سرگرمی سے جرمنی میں ہائنے نے کی۔ دونوں کے کلام میں محبت کی چاشنی اور انسان کی نیکیوں اور کمزوریوں کا بیان بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لہٰذا دونوں کے کلام صفحۂ ہستی پر روشن حروف میں جگمگا رہے ہیں اور اس عالم میں ہمیشہ تاریکی کو دور کرنے میں مدد دیتے رہیں گے۔

"فراخاں"

نوائے راز

کوئی ادا فروش ہے کوئی جفا فروش
بازارِ حسن میں ہوں میں تنہا وفا فروش

ہے کوئی اہلِ ہوش میں جاں بازِ تشنہ کام
تیغِ فنائے عشق ہے آبِ بقا فروش

اہلِ جہاں سے اپنی نبھے بھی تو کس طرح
وہ ہیں خدا فروش تو میں ماسوا فروش

اب منکرانِ حق سے شکایت نہیں مجھے
جو بُت شکن تھے آج وہ خود ہیں خدا فروش

بزمِ سخن میں اور بھی تو خوش کلام ہیں
اے رازؔ ایک تو ہی نہیں ہے نوا فروش

رازؔ چاندپوری

شیطان اور بزرگ

بیٹھے بیٹھے انجیل کا ایک جملہ جو یاد آیا تو معًا یہ خیال گذرا کہ یا اگلے وقتوں کے لوگ بہت غصیلے تھے یا آج کل کے لوگ زیادہ شائستہ ہیں۔ وہ فقرہ یہ ہے "Get thee behind me, Satan."
اس کا لفظی ترجمہ ہے "پیچھے ہٹ بے شیطان!" لاحول ولاقوۃ۔ یہ کہاں کی شائستگی ہے کہ ایک ہستی اپنا فرضِ منصبی ادا کرے اور اُسے جھڑک کر کہا جائے چل! ہم نہیں آتے۔ تیری ایسی کی تیسی"! اگر بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نیک رہنے کے لئے ترش رو ہونا لابدی ہے پھر بھی ناگوار سا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی مقدس ترش روئی کے ساتھ اندازِ گفتگو بھی بازاری ہو۔ آج کل کی زندگی میں سینکڑوں دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ شیطان کو سخت سے سخت جواب اگر کسی نے دیا تو بس اتنا ہی کہا "والله معاف کیجئے۔ آج ناچ میں شریک نہ ہو سکوں گا۔" قصہ ختم ہوا۔ نہ یہ کہ بازاری زبان اور پھر ہزاروں سالوں تک اس کا چرچا! آخر وہی دنیا ہے وہی شیطان ہے مگر اخلاق وسیع تر ہیں، یہاں تک کہ آج کل کے محمد شاہ رنگیلوں کو عیش پرستی کا تواتر بھی بارِ خاطر ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ اسی خیالی کشمکش میں تھا کہ حضرتِ ڈیش کی خوشبو آئی۔ نہیں اُن کے سگرٹ کی! ابھی کمرے سے باہر ہی تھے کہ فرماتے ہیں۔

ڈیش۔ اب کہیں چلو گے بھی یا یونہی اس کمرے کا ناک میں دم کرو گے؟ تمہارا کمرہ تم سے اکتا چکا ہے۔ کمرے کا حق ہے کہ کبھی کبھی تازہ ہوا اسے بھی نصیب ہو۔

میں۔ ایک مشکل حل کر دو تو جہاں کہو چلوں۔

ڈیش۔ اگر مشکل مشکل ہے تو تو بندہ حاضر ہے لیکن آسان مشکلوں کے لئے کسی قومی لیڈر کو چندہ عطا کیجئے۔

میں۔ واقعی خوفناک مشکل ہے (یہ کہہ کر اسے "ہٹ بے شیطان" والی دقت پیش کی۔ ڈیش صاحب نیا سگرٹ جلا کر فرماتے ہیں)

ڈیش۔ میں تم سے بیس دفعہ کہہ چکا ہوں کہ موجودہ زندگی کا پہلا سبق یہ ہے کہ زمانہ گذشتہ کی کسی بات کو بھی اس طرح سے بیان نہ کرو جس طرح کہ وہ ہوئی بلکہ اس طرح سے بیان کرو جس طرح سے کہ تمہارا اپنا نصب العین

پورا ہو۔ مرنے والے مر مرا چکے۔ نہ ہم سے پوچھ کر وہ پیدا ہوئے نہ ہم سے پوچھ کر انہوں نے کھایا، پہنا، برتا پوجا۔ اگر ان کا ہم پر کوئی حق ہے تو بس اس قدر کہ ہم یہ ثابت نہ کریں کہ وہ بہت گمراہ تھے۔

میں۔ تو گویا تاریخ کوئی چیز نہیں۔

ڈیش۔ بہت بڑی چیز ہے، بالخصوص اس لئے کہ اسے بدلتے رہنا ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اخبار روزانہ کھلم کھلا حالاتِ حاضرہ کو بدلتے رہتے ہیں۔ ایک اخبار میں ایک وزیر دانشمندی کا پُتلا ہے تو دوسرے میں تعصّب کا بھُوت۔ آخر تاریخ اسی مصالح سے تیار ہوگی اور آج کل کے ٹکے سیر والے وزیر تو کیا ہمارے سامنے کئی نپولین، کئی کلائو، کئی اورنگ زیب موجود ہیں اور جیسی ضرورت ہوگی ابھی اَور تیار ہو نگے۔

میں۔ اچھا! آپ تاریخ کو رہنے دیجئے۔ اصل مطلب پر آئیے۔

ڈیش۔ یہی تو اصل مطلب تھا کہ جس طرح ہم تاریخی ہستیوں کی حسبِ ضرورت اصلاح کرتے رہتے ہیں اسی طرح ہمیں پیغمبروں کو اصلاح کا بیڑا ابھی اٹھانا چاہئے۔

میں۔ توبہ کرو توبہ! کیا کفر بکتے ہو!

ڈیش۔ کفر تم تولتے ہو۔ تم اور تمہارے ہم خیال ہر دفعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہو کہ سب کے سب پیغمبر ناکامیاب ہوئے اور دنیا ویسی ہی بُری ہے جیسی کہ ان کے نازل ہونے سے پہلے بُری تھی۔ میرے دل میں چونکہ پیغمبروں کی سچّی عظمت ہے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بے انتہا کامیاب ہوئے۔

میں۔ وہ کیسے۔

ڈیش۔ بالکل آسان ہے۔ فرض کرو کہ کسی پیغمبر نے حکم دیا کہ زیتون کا تیل حرام ہے۔ مگر خود اس کی امت کے کچھ لوگ دبنا د میں نغزہی میں ہلدی میں زیتون کے تیل کے خُم لنڈھاتے رہے ہے۔ تم لوگ تو یہ کہہ دوگے کہ اس امر کی تعمیل نہیں ہوئی۔ گویا پیغمبر کو اس خاص معاملہ میں ناکامیابی ہوئی۔ میں یہ کہوں گا کہ ممانعت ہرگز نہ تھی۔ صرف یہ حکم تھا کہ جنہیں آسانی سے میسّر نہ ہو سکے وہ خواہ مخواہ زیتون کے تیل کی ہوس میں مغروض نہ ہوں۔ یہی صُورت اس جملے کی ہے۔ میں اس جملے کا ترجمہ یوں کروں گا "جنابِ من۔ مجبوراً میں آپ کی طرف پیٹھ کر رہا ہوں۔ مجھے دوسری طرف جانا ہے"۔ قصہ ختم ہوا۔ فرض کرو کہ تم نے یہ نتیجہ نکالا ہوتا کہ اگلے وقتوں کے لوگ بہت صاف گو تھے اور آج کل منافقت کا زور ہے۔

میں۔ یہ نتیجہ تو ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ اگلے وقتوں کے لوگ تو ذرا ذرا سے عقائد کے فرق پر دھمکیاں دیتے

تھے کہ جلوگے، بھنوگے، دنیا غرق ہوجائے گی۔ بات بات پر قیامت کے آثار دکھائی دیتے تھے۔

ڈیش۔ تم بہت اکھڑ ہو۔ یہ اُن لوگوں کا محاورہ تھا، رنگین بیانیاں تھیں۔ اور کچھ بھی ہو سوال یہ نہیں کہ وہ کیا تھے بلکہ یہ کہ ہم انہیں کس کام میں لاسکتے ہیں؟ کسی چیز کو برا کہنا اور پھر اُسے استعمال کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ ہمارا فرضِ عین یہ ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگوں کے عقاید تبدیل کرتے رہیں۔ تمام موجودہ تنقیدی تفسیروں کا مرکزی اصول ہی یہ ہے کہ زمانۂ سابق کے عقاید کی اصلاح کی جائے۔ نہ صرف عقاید کی بلکہ عادات کی۔

میں۔ خاک تم نے میری مشکل حل کی۔ ایک مشکل کو دس مزید گورکھ دھندوں میں لپیٹ دیا۔

ڈیش۔ بھائی تم فیشن ایبل انسان ہو۔ میں بچارا سیدھا سادھا قدامت پسند ہوں۔ مجھے واقعی زمانۂ ماضی کی ہر وہ چیز پسند ہے جو میری رائے کے موافق ہے اور جو بظاہر میری رائے کے موافق نہیں اُسے میں عقل کے نور سے اپنی رائے کے موافق کرلیتا ہوں۔ آخر خدا نے عقل انسان کو اس لئے تو نہیں دی کہ اُس کا استعمال نہ کیا جائے۔ بندۂ خدا! لوگ معجزوں پر ہاتھ صاف کرچکے۔ ضروری غیرضروری احادیث رائج کرچکے اور تم ابھی یہ ٹھوکریں کھا رہے ہو کہ معمولی سے ترجمے میں تصرف جائز ہے کہ نہیں۔ اگر کچھ بھی تمہیں پاسِ وفا ہے تو اللہ کا نام لو اور ماضی کو بدنام نہ ہونے دو۔

(میری بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہیں)

ڈیش۔ (کرسی اُن کی طرف کھسکاتے ہوئے) آداب۔ اجی بیگم صاحب کچھ ان حضرات کی نو اصلاح کیجیے۔ فیشن کے مارے بزرگوں سے علیک سلیک رکھنے کے روادار نہیں۔

میں۔ تم ڈیش کی بک بک پر نہ جاؤ۔ آپ فرماتے ہیں کہ بزرگوں کے عقائد کی اصلاح ہمارا فرضِ عین ہے۔

بیگم۔ سبحان اللہ۔ اپنے دھندوں سے تو فراغت نہیں بزرگوں کے پیچھے عقل کی لاٹھی لئے کون پھرے!

ڈیش۔ این خانہ تمام آفتاب است۔ بیگم صاحبہ یہ تو سوچئے کہ ہمارے بزرگ نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے۔ اگر اور ان سے اچھا کام کوئی نہ بھی ہوا ہو تو یہ تو کارِ خیر وہ کرگئے کہ ہم سے جانشین چھوڑ گئے۔

بیگم۔ مگر اُن کے عقائد کی اصلاح کس طرح ممکن ہے؟

ڈیش۔ وہ خود تو میدان میں آکر لڑنے سے رہے۔ اب تو جو ہم کہیں سو وہ ہیں۔ عصائے موسوی اور قبائے یوسفی سے آخر ہمیں کچھ کام لینا ہے یا نہیں؟ اگر لینا ہے تو اپنی طرح ان چیزوں کو بدل کر قدامت پسندی کا ثبوت دیں۔

بیگم ۔آپ دراصل ہر بات کی تضحیک کرتے رہتے ہیں اور مولوی بچارے سچ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں الحاد کا زور ہے۔
خود تو ملحد ہوئے سو ہوئے اب بزرگوں کو بھی آزاد خیال کرنے چلے۔ یہ بے ایمانی کیا نیا مذہب ایجاد ہوا ہے؟
ڈیش ۔عورتوں کی اس تنگ خیالی سے دق آکر اسلام نے گذشتہ سات آٹھ سو سال میں کوئی عالم عورت
پیدا نہیں ہونے دی۔ ہر نیا مذہب ابتداً ایک ناپسندیدہ بدعت ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ہی ہر نیا مذہب یہی
کہتا ہے کہ دنیا کو وہی سکھایا جا رہا ہے جو پہلے پیغمبر سکھلا گئے۔
بیگم ۔میں تو بحث کے مخمصے سے کوسوں بھاگتی ہوں۔ یہ بتائیے کہ چائے ابھی منگواؤں یا تھوڑی دیر ٹھہر کر!
میں ۔ جیسے تمہاری خوشی ڈارلنگ
ڈیش (تمسخر سے) ایمانداری کے دعوے اور ساتھ ہی ملحدوں کو چائے کی دعوت؟
بیگم (قہقہہ لگا کر) یہی تو ہماری اخلاقی عظمت کا ثبوت ہے کہ سوشل تعلقات میں مذہبی اختلاف ہارج نہیں ہوتے۔
اللہ کے بندے آپ کو چائے پلائیں گے مگر اللہ آپ کو جہنم ہی بھیجے گا۔
ڈیش ۔مجھے جہنم رسید کر کے آپ کو کیا خوشی ہوگی؟
بیگم (ہنستے ہوئے) بے انتہا خوشی! یہ خوشی کہ انصاف ہوا اور سچ پوچھو تو جنّت میں رہنے کی اصل خوشی یہی ہے
کہ جن لوگوں نے یہ نہ مانا وہ جہنم میں ہیں۔ تمام اصلی اور سچّی خوشی کی بنیاد یہ ہے کہ کوئی اور اپنی غلطی کے باعث
تکلیف میں ہو۔
ڈیش ۔معاذ اللہ، معاذ اللہ۔

(بیگم چائے کے لئے حکم دینے جاتی ہے)

میں ۔کیا تم کبھی بھی متانت سے کسی مشکل مسئلہ پر گفتگو کر سکتے ہو؟
ڈیش ۔میں تو ہمیشہ ہی متانت سے گفتگو کرتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہیں کیوں تکلیف ہوتی ہے اگر کسی نے شیطان
سے درشت کلامی کی؟
میں ۔ لاحول ولا قوۃ! عجب احمق ہو! شائستگی سے گفتگو کرنا ہر شریف آدمی کا ذاتی فرض ہے متکلم چاہے کوئی
ہو۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ شیطان جو مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھوڑتا اس کی وجہ زیادہ تر غالباً یہ ہے کہ ہم اسے
ہر وقت ستاتے رہتے ہیں۔ کبھی شیطان الرجیم کہتے ہیں، کبھی اعوذ باللہ کہتے ہیں۔ آخر اس فضول دل آزاری
سے حاصل کیا ہے؟ اگر ہم اس کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کریں تو ممکن ہے کہ وہ بھی ہمیں کم دکھ دے!

ڈیش ۔کیا مطلب؟

میں ۔ یہ مطلب کہ اگر خوشامد خود خدا کو پسند ہے تو شیطان کو تو بہت ہی زیادہ پسند ہوگی ۔کیوں ہم شیطان کی اس کمزوری کا فائدہ نہ اٹھائیں؟ جب مسلمان کو شیطان ملے وہ بجائے نعوذ باللہ کہنے کے خوش اخلاقی سے پیش آئے ۔ اسے موٹر میں سیر کرائے اور اگر موقع ملے تو کسی ہندو کانگرسی یا مہا سبھائی لیڈر سے شیطان کا تعارف کرائے ۔شیطان کے لئے بھی ایک نئی دلچسپی ہوگی اور کانگرس کا بھی بھلا ہوگا ۔ہم لوگ اپنی کج اخلاقی سے خواہ مخواہ شیطان کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔

ڈیش ۔خیال تو بہت اچھا ہے مگر مہاتموں اور پنڈتوں میں شیطان بچارا کیا کرے گا؟

میں ۔کرے یا نہ کرے ہمارا تو پیچھا چھٹکا رہو۔

ڈیش ۔ اچھا تو تم شیطان کو ہر دلعزیز بناؤ اور میں بزرگوں کے عقاید کی اصلاح کروں ۔اس تقسیم کار سے شاید قوم کچھ ابھرے۔

فلک پیما

سحرِ نغمہ

شبِ سیاہ، خموشی، تلاطمِ انجم

فضا میں نالہ کناں ہے مغنّیہ کی صدا

عیاں ہے کیفیتِ کائنات تو لیکن

جو میرے دِل پہ گزرتی ہے کہہ نہیں سکتا

اختر

انصاری دہلوی

بزمِ خرابات

(۱)

ساقی اُفق سے جامِ بادۂ گلگوں لا شاہا!
حلقہ میں لئے ہوئے ہے دل کو شبِ ماہ
میں اور تصوّرِ بہشت و کوثر!!
لاحول و لاقوۃ اِلّا باللہ

(۲)

ہے اوج پہ اوج پیش و پس اے ساقی
باقی نہیں اب کوئی ہوس اے ساقی
یہ آ گیا عرش اور صبا ہو توقف
وہ جھک گیا آسمان بس اے ساقی!!

(۳)

رندوں کو روا ہے کامرانی ساقی
ہے روزِ جزا فقط کہانی ساقی
محشر میں اگر ہوئی بھی پرسش بالفرض
دے دے گی جواب نوجوانی ساقی

(۴)

مجروح ہے ہر لطف سے اوقات اے دل
یکتا ہے کوئی تو لاکھ بھی جدا آفات اے دل
رونا ہے کہ وقت صبح رونا ہوگا
ناخوش ہے کہ باقی ہے ابھی رات اے دل

جوش
ملیح آبادی

تاریکی

میں نے ایک خواب دیکھا، جو اصل میں خواب نہ تھا،

روشن سورج بجھ گیا تھا، دھندلے بے نور ستارے لامحدود خلا میں بھٹکتے پھرتے تھے، اندھی اور تاریک دنیا چاند کی کرنوں سے محروم ٹھنڈی ہوا میں گردش کر رہی تھی۔

صبح آئی اور چلی گئی، آئی اور اپنے ساتھ دن نہ لائی۔

انسان اپنی بربادی کے خوف میں ساری خواہشات بھول گئے تھے، تمام دل روشنی کے لئے خود غرضانہ دعاؤں میں مشغول تھے، لوگ آگ جلا جلا کر زندہ تھے۔ حکومت کرتے ہوئے بادشاہوں کے محلات، غریبوں کی جھونپڑیاں اور تمام ذی روحوں کے مسکن روشنی اور گرمی پہنچانے کے لئے جلا ڈالے گئے تھے۔

شہر کے شہر جل رہے تھے اور انسان اپنے مشتعل گھروں کے چاروں طرف جمع تھے، کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر دل کو ڈھارس دیں۔

ایک خوفناک امید تھی جو ساری دنیا میں باقی رہ گئی تھی۔

جنگلوں کو آگ لگا دی گئی تھی ـــــ لیکن لمحہ بہ لمحہ وہ جل جل کر گرتے جاتے تھے، اور اُن کی روشنی مدھم ہوتی جاتی تھی، چٹختے ہوئے درختوں کے تنے مہیب آواز سے پھٹ کر بجھ جاتے تھے، اور اندھیرا ہو جاتا تھا۔

آدمیوں کے چہرے اس ڈگمگاتی ہوئی روشنی میں ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے ـــــ اُن میں سے کچھ لیٹ گئے، اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگے، اور بعض نے اپنی ٹھوڑیوں کو اپنی بند مٹھیوں پر رکھ لیا اور مسکرانے لگے، اور کچھ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے، کہ اپنی جلتی ہوئی چتاؤں میں لکڑیاں ڈالیں اور پھر مایوس ہو کر اندھیرے آسمان کی طرف جو گذری ہوئی دنیا کا سیاہ تابوت معلوم ہوتا تھا، مجنونانہ بے چینی سے دیکھتے تھے، اور لعنت بھیجتے ہوئے زمین پر گر کر کراہنے لگتے تھے۔

جنگلی پرندے چیختے تھے اور سہم کر اپنے بیکار بازوؤں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے زمین پر آ گرتے تھے، خوفناک درندے مطیع ہو گئے تھے اور کانپتے ہوئے شہروں میں گھس آئے تھے، سانپ زمین پر رینگتے تھے اور لوگوں کو لپٹ لپٹ کر پھنکاریں مارتے تھے، مگر اُن کا زہر ختم ہو چکا تھا ـــــ اُن کو کھانے کے لئے مار لیا جاتا تھا۔

جنگ جو کچھ عرصے کے لئے بالکل ختم ہو گئی تھی پھر اپنا اثر دکھانے لگی۔

ایک ایک نوالہ خون سے خریدا جاتا تھا، اور ایک دوسرے سے دور دور اندھیرے میں بیٹھ کر زہر مار کر لیا جاتا تھا۔

محبت باقی نہ رہی تھی۔

دنیا کو صرف ایک خیال تھا اور وہ فوری اور گمنام موت کا خیال تھا۔

قحط نے اپنا اثر تمام اعضاء پر ڈالنا شروع کر دیا تھا، آدمی مرتے تھے اور اُن کی ہڈیوں کو مثل اُن کے گوشت کے کوئی مزار نصیب نہ ہوتا تھا، ایک کمزور آدمی دوسرے کمزور آدمی کو کھا لیتا تھا، حتیٰ کہ کتے بھی اپنے مالکوں پر حملہ کر کے انہیں کھا گئے، سوائے ایک کتے کہ جو اپنے آقا سے اُس کے مرنے کے بعد بھی وفادار رہا، پرندوں، درندوں اور بھوکے آدمیوں سے اُس نے اپنے آقا کی لاش کو بچایا، یہاں تک کہ بھوک نے اُن میں سے بہت سوں کو آلیا اور باقی کے اُن مرے ہوؤں کو چٹ کر گئے۔ خود اپنے لئے اُس نے کوئی غذا تلاش نہ کی، بلکہ اپنے مالک کا ہاتھ چاٹتے ہوئے جس سے کہ اُسے تھپکی کی کوئی اُمید نہ تھی، وہ ایک دردانگیز سسکی بھرتا ہؤا مر گیا +

مجمع آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔

ایک بڑے شہر میں سے صرف دو زندہ رہے، اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے، وہ دونوں ایک بڑے مندر میں قربان گاہ کے بجھتے ہوئے انگاروں کے قریب ملے جہاں بہت سی متبرک اشیاء ناپاک استعمال کے لئے ڈھیر کر دی گئی تھیں انہوں نے اپنے ٹھنڈے اور سوکھے ہوئے ہاتھوں سے بھوبل کو کُریدا اور چند مدھم انگاروں کو اپنے کمزور سانس سے ایک موہوم زندگی کی امید میں پھونکا، ایک چھوٹا سا تمسخر آمیز شعلہ بلند ہؤا، شعلے کی بڑھتی ہوئی روشنی میں اُن دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور چیخ ماری، اور چیخ مار کر مر گئے، وہ صرف ڈر کر مر گئے، اور کسی نے کسی کو نہ پہچانا، کیونکہ اُن میں سے ہر ایک کے چہرے کو بھوک نے شیطان کی طرح بھیانک کر دیا تھا۔

دنیا خالی ہو گئی تھی ـــ کبھی آباد و پُرشوکت، اب ایک بیکار ڈھیر بے موسم، بے برگ، بے انسان، بے زندگی، موت کا ڈھیر۔ مٹی کا بے ترتیب مجموعہ دریا، جھیلیں، سمندر سب ساکن تھے، اُن کی خاموش گہرائیوں میں کوئی حرکت نہ ہوتی تھی۔

جہاز بے ملاحوں کے سمندروں میں سڑ رہے تھے اور اُن کے مستول ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے، اور جونہی کہ وہ پانی پر گرتے تھے، خاموشی سے تیرنے لگتے تھے، کوئی لہر نہ اٹھتی تھی ـــ لہریں مر گئی تھیں، مدوجزر اپنی اپنی قبروں میں پہنچ چکے تھے، آندھیاں بدبودار ہواؤں میں تحلیل ہو گئی تھیں، اور بادل ضائع ہو گئے تھے۔

تاریکی کو ان کی ضرورت نہ تھی ـــ وہ خود تمام "جہان" تھی +

(لارڈ بائرن)

محسن عبداللہ

نفاست کا طلسم

بعض دولت مند ہندوستانی کوٹھیوں کے گول کمرے میں فرش فروش، میز اور کرسی، پردے اور قالینیں، آتشدان کے نمائشی نوادرات اور دیواروں پر رُوکھے پھیکے فوٹو کمپنیوں کے نوتعلیمیافتہ (یا ناتعلیمیافتہ) مذاق کا زندہ ثبوت ہیں۔ قالین اگر آگ بھبوکا ہے تو پردے جوگی اور میزپوش خاکی۔ کرسیوں کے غلافوں کی آب وتاب اگر ایک بھی ہو تو بھی ہر کرسی کا دم خم الگ ہے۔ ایک پر بیٹھو تو تحت الثریٰ تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑتی، اور جو دوسری پر ستانا چاہو تو گویا کمر میں کسی نے آہنی سلاخ ٹھونک دی۔ جس قدر یہ کمرے آنکھ کے لئے گستاخ اور کمر کے لئے ناہموار ہیں اسی قدر ان کی روحانی آب وہوا کثیف ہے۔ بھلا جہاں قالین چیخ چیخ کر پردے سے کہہ رہی ہو "بھیّا! خدارا اپنے پاؤں تو ذرا ہٹاؤ" اور جہاں زرق برق میز پوش دیوار کی تصویروں پر ناک بھوں چڑھا رہے ہوں وہاں ملنے کا کیا لطف؟ اور اگر مل بھی بیٹھیں تو ناممکن ہے کہ فرنیچر کے اس شور و بکا میں نیچی نظروں کا، میٹھی باتوں کا جادو چلے اور رنگ لائے +

انسان بالکل پھول ہیں۔ جسطرح لُو پھولوں کو جھلس دیتی ہے اُسی طرح گرم فرنیچر خیال کو، خیال کی عروسیت کو سوخت کر دیتا ہے۔ ہزار رعنائی تصور سے انسان ایسے کمرے میں داخل ہو، فصاحت کے ہزار دُرِ شاہوار نثارِ خندۂ سیم تناں ہونے کے لئے طیار ہوں مگر جہاں ایسے کمرے میں ذرا بیٹھے تو باتیں یہ ہوتی ہیں کہ کلب میں آجکل جوتے میں دال بٹ رہی ہے، کانگرس کا چرخا نہیں چلتا، سرکار کا حقہ پانی بند ہے اور علیٰ ہٰذا القیاس۔ یعنی جو باتیں برآمدے کے کسی ذلیل کونے میں ہونی چاہئیں وہ فرنیچر کے تشدد سے گول کمرے میں اُگلی جاتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے گول کمرے ہیں بھی اسی قابل +

جن لوگوں کو اس تنقید پر شک ہو، وہ ایک سیدھے سادھے معیار سے اپنے گول کمرے کی لیاقت کو پرکھ لیں۔ کسی ماہر راگ شیریں ادا سے دو بول سُن لیں۔ اگر کمرے کا رنگ، پردے اور باقی لباس موزون نہیں تو راگ دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر جان دیدیگا۔ لیکن اگر کمرہ کسی نستعلیق ہستی کی توجہ کا ممنون ہوا ہے تو راگ پھیلے گا، چیزوں سے لپٹے گا، دلوں میں کھنچے گا، آنکھیں بند ہونگی، سارے جسم میں خفیف سا رقص ہوگا اور راگ روح کو لے اُڑے گا +

راقم حروف کو کسی کمرے کی توہین مقصود نہیں اور یہ تنقید محض تعلیمی ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ امیر ہندوستانی کوٹھیوں میں اگر بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ ہے تو اب یہ بھی لازمی ہے کہ کمروں کی تعلیم کی بھی ابتدا ہو۔ بعض کوٹھیوں میں

اس وقت بھی گول کمرے نمایاں طور پر دلفریب ہیں۔اس ضمن میں بیگم ب، ت کا گول کمرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔داخل ہوتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کمرے میں انسانیت ہے۔اگلے دن چند منٹ مجھے تنہا اس کمرے سے ملاقات کا موقع ملا۔نہ تو کمرہ مجھ پر جھنجھلایا نہ " اِدھر دیکھو، اُدھر دیکھو" کہہ کر اُس نے میرے کان کھائے۔نہ کہیں رنگ ایک دوسرے کو پھاڑے ڈالتے تھے نہ تصویروں سے دیواریں جھکی پڑتی تھیں۔بعض اچھے گول کمروں کا سامان بھی بسا اوقات اس قسم کا ہوتا ہے جیسے غزل میں شعر یعنی ایک دوسرے سے آزاد، مگر بیگم ب، ت کے کمرے کے سامانِ آرائش میں غرورِ حسن سے بھی بڑھ کر خلوصِ یگانگت کی جھلک تھی، یعنی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی مزاج شناس نے ہر مختلف چیز کو زندہ اور بامذاق سمجھ کر اس کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس کے لئے ٹھیک جگہ اور مناسب ہمنشیں تجویز کئے ہیں اور اس مزاج شناسی کی داد میں کمرے کی ہر چیز خوش و خرم تھی +

جب میں داخل ہوا تو پہلی ہی کرسی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ساتھ والی میز نے رسیلی آواز سے کہا " اس فوٹو کو تو ملاحظہ کیجئے!" فوٹو نے انداز سے کہا " میرے بغاوت پر مستعد کاکل میری Chin.[1] کے لئے کس قدر دلفریب Background (پس منظر) ہیں"۔ بندے نے پنجاب میں بیٹھے بیٹھے اس بہاری ادا کے عکس کی داد دی اور دل ہی دل میں کہا " کمرہ کیا ہے کسی کی طبعی نفاست کا طلسم ہے +

پرستارِ حسن

[1] نوٹ - Chin کا اُردو ترجمہ ایسے کمرے کے ذکر میں استعمال کرنا گناہ ہے۔سخت گنوار لفظ ہے، اس کمرے کی نفاست کا یہی کافی ثبوت ہے، کہ سینکڑوں میل اس سے دُور بیٹھے بھی اس کے خیال کے ساتھ زنخدان اور ذقن جیسے لفظ بھی ثقیل معلوم ہوتے ہیں +

*

پروانہ

سلمائے سحر کے حسن کی ضو تاریک فضا پر چھانے لگی
وہ انجمِ رقصاں ڈوب چلے، وہ شمع کی لَو تھرّانے لگی

جو مطرب و مے سے رنگیں تھی وہ محفلِ عشرت ختم ہوئی
خوابیدہ فضا نے کروٹ لی کیفیتِ غفلت ختم ہوئی

کچھ خاک کے ذرّے، کچھ پر ہیں بے برگ و نوا پروانوں کے
یا، دیکھ کہیں انجام نہ ہوں یہ شب کے حسیں عنوانوں کے

وہ آخرِ شب دھندلا سا تجلّی بار سماں بھی ختم ہوا
وہ شمع بجھی اُٹھا وہ دھواں، لو اب وہ دھواں بھی ختم ہوا

پروانہ کی ہستی میں کیا کیا عبرت کے خزانے ملتے ہیں
ہر دَور میں اس کے کتنے لامحدود زمانے ملتے ہیں

اعجازِ وفا ہے صبر و سکوں سے، تلخیِ پیہم سہہ جانا
یوں آتشِ دل کے شعلوں میں خاموش سلگ کر رہ جانا

شب تیرہ دروں تھی شمع کی ضو نے محفلِ شب نورانی کی
پروانہ کو دیکھو، جس نے محبّت ہی کے لئے قربانی کی

احسان کی لذت شمع کے جل بجھنے کی ہوس کا عنواں تھی
پروانے کے دل میں لیکن صرف الفت کی تجلّی رخشاں تھی

تعمیرِ حیاتِ شمع ہے مضمر شمع کے پیہم جلنے میں
پروانہ مگر مجبور نہیں اس راہِ وفا پر چلنے میں

اس طرح کوئی آزاد غرض، جاں اپنی کسی پر کھو نہ سکا
وہ کام ہوا پروانہ سے خود شمع سے بھی جو ہو نہ سکا

اختر

عبرت

"بھلا کیوں وہ لوگ جنہیں میں چاہتی ہوں یہاں نہ آئیں۔ آخر کوئی سبب بھی؟"

"بہت خوب تو پھر آپ مختار ہیں۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں،" یہ کہتے ہوئے عطیہ دریچہ کی طرف گئی اور غصہ میں وہاں کھڑی ہو کر دریچہ سے باہر کی طرف یونہی دیکھتی رہی۔ اگرچہ دراصل وہ کسی چیز کو دیکھ نہیں رہی تھی۔"

"کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتی ہو کہ یہ لوگ میرے کس کام کے ہیں۔"

"میری سمجھ پیزار کہ کون ہمارے کس کام کا ہے"! عطیہ نے جھلّا کر کہا۔

جمال نے تیزی سے کمرے کے فاصلہ کو طے کیا اور بڑھ کر کسی حد تک کرختگی سے اپنا ہاتھ اپنی بیوی کے نازک کندھے پر رکھا اور کہا "مگر میں چاہتا ہوں کہ تم سمجھو کہ میں اِن بے فکرے مردوں اور عورتوں کو ہر شام اپنے گھر میں بھرے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

"آپ ایسے ہی مہمان نواز تو ہیں" عطیہ نے طعن سے کہا۔ "اور تم تو ہمیشہ ان ہی لدّ قانونی کاغذات یا مختلف اخبارات میں دفن ہوئے رہتے ہو۔ اور میں تمہارے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہا کروں، اور تمہاری جرابیں سیتی رہا کروں، کیوں ہے نا یہی بات؟"

عطیہ! میں تو یہ کوشش کر رہا ہوں کہ قانونی دنیا میں نام پیدا کروں۔ اور پھر تمہارے لئے روپیہ کی ریل پیل کر دوں۔"

"ہاں؛ تو یہ سب میرے ہی لئے ہے؟ جی بجا کیوں نہیں"!

بیوی کے الفاظ سُن کر جمال اس سے پرے ہٹ کر دور چلا گیا اور بولا عورتیں بڑی ہی کوتاہ عقل ہوتی ہیں"

"میں عورتوں کے بارے میں تمہاری اس رائے کے خلاف احتجاج کرتی ہوں" عطیہ نے بیٹھتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔

"اور ہاں کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم بچوں کے سامنے یوں لڑا کریں؟"

"استغفر اللہ، قطعاً ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ میں بالکل تم سے متفق ہوں" وہ جھکا اور اُس نے اپنے بیٹے

کے بل کھائے ہوئے بالوں کو چھوا اور بولا "لو بچو اب اپنے اپنے بستروں پر جاکر سو رہو۔ دارا تم اور صفیہ تم بھی اپنا انجن لے لو۔"

"دیکھو جی یہ سگنل تو میرا ہے۔"

"جھوٹ جھوٹ یہ میرا تو ہے۔"

"ارے بس کی گانٹھ کل تو تو نے اپنا سگنل توڑ ڈالا تھا" یہ کہنے کے ساتھ دارا نے غصہ سے اپنا سگنل چھین لیا۔ بس پھر کیا تھا صفیہ لگی چیخنے چلانے اور سسکیاں بھرنے۔

"صفیہ! دارا!! مت لڑو" عطیہ نے یہ کہا اور اٹھ کر اپنی ننھی سی بیٹی صفیہ کو گود میں اٹھا لیا۔ پھر بولی "ادھر آؤ میرے بچو! کل تمہاری انا تلاش کر کے سگنل مرمت کر دے گی۔"

قبل اس کے کہ ماں بیٹی دوسری طرف جائیں۔ دارا نے اپنا کھلونا لے لیا اور اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو کر بولا "ابا جان بھلا کیا یہ صفیہ ضدن بس کی گانٹھ ہے کہ نہیں۔ دیکھئے اپنا انجن اور سگنل تو کل توڑ پھوڑ ڈالا اور اب میرے کھلونے پر قبضہ جما بیٹھی۔ ڈھٹائی تو اس کی دیکھئے۔"

جب تنہائی ہوئی اور جمال اپنے بیٹے کو گود میں لینے کے لئے جھکا تو اس کا چہرہ کسی قدر مکدر تھا۔ اور اس نے بیٹے سے کہا "ارے میاں وہ غریب چھوٹی سی لڑکی ہی تو ہے۔ اس لئے تمہیں کو صبر و تحمل کی عادت ڈالنی چاہئے۔"

"ابا جان! وہ لڑکی ہے اسی لئے تو ضدی ہے۔ کیوں ہے نا؟"

اس وقت اس کی ماں کمرے میں واپس آگئی۔ اس کا باپ بولا۔ وہ ضدی نہیں ہے، دارا وہ ضرور تمہاری چیز تم کو دے دیتی، اگر تم ہی ذرا نرمی کا برتاؤ اس سے کرتے۔"

لڑکے نے برہمی سے تیوری چڑھائی اور بولا "لیکن میری بجائے وہی کیوں نرمی نہ برتے۔" اس سوال پر اس کا باپ یوں ہی سا مسکرا دیا۔

"ارے بوڑھے بزرگوار دارا یہ ہم مردوں ہی کا حصہ ہے کہ نرمی برتا کریں۔"

"لیکن کیوں"؟ معصوم بیٹے نے اپنی مضبوط ٹانگیں پھیلاتے ہوئے جرات سے اپنے باپ کو دیکھتے ہوئے بتکرار کہا۔

باپ بولا "بیٹے! نرمی اور مہربانی اچھی چیز ہے اور جب تم بڑے ہو گے تب تم کو یہ بات معلوم ہو جائے گی۔ لو اب جاؤ اور اگر ہو سکے تو کل اپنی بہن کا انجن مرمت کر دو۔"

دارا لڑکیوں کے متعلق کچھ بڑبڑاتا اور لڑکیوں کی ضد اور انجنوں اور سگنلوں کی باتیں آپ ہی آپ کرتا ہوا ماں کی طرف بڑھا تاکہ وہ اُسے پیار دے۔ اور گو وہ ناراض سی تھی تاہم اُس نے اُسے پیار کیا۔ دارا ماں سے پیار لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور ہر ہر قدم پر مخالفت اس کی حالت سے ظاہر تھی۔

بچے کا جانا تھا کہ عطیہ غضبناک ہو کر خاوند پر برس پڑی۔ اور بولی یہ کیا غضب ہے کہ تم ہمیشہ عورت ذات پر ناک بھوں چڑھاتے رہتے ہو؟ اور یہی تم ابھی سے اپنے بچے کو سکھا رہے ہو کہ وہ بھی تمہاری طرح عورت سے نفرت کرنے لگے اور تم ہمیشہ بچے کو دکھانے ہو اور سمجھاتے ہو کہ نامراد عورتیں ہی بیہودہ اور الٹی سمجھ کی ہوتی ہیں۔ اس وقت بھی تم نے یہی ثابت کیا ہے کہ نصیبوں جلی صفیہ ہی ضدی اور ذلیل ہے۔

"بجا! تو کیا اس میں کچھ جھوٹ بھی ہے؟"

"مجھے تو پتہ نہیں کہ تم نے کبھی اس بات کے جاننے کی بھی کوشش کی ہو کہ سگنل درحقیقت ہے کس کا؟"

جمال یہ سن کر کسی قدر تلخ ہنسی ہنسا۔ اور بولا "میری پیاری عطیہ کیا یہ بھی کوئی سمجھ کی بات ہے کہ بچوں کے سامنے یوں لڑا جائے؟"

"میں نے تو کوئی لڑائی نہیں کی ہاں تم ہی ہو جو لڑائی مول لیتے ہو۔ اور یہ تمہارا قاعدہ ہے کہ تم خطا ہمیشہ مجھ کم نصیب کی بتایا کرتے ہو۔ میرے ملنے والوں سے تمہیں نفرت ہے اور یہ بات بھی تمہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی کہ میں کبھی ہنس بول ہی لیا کروں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر بچوں کا خیال نہ ہو تو میں ۔۔۔۔ میں تو تم کو بالکل چھوڑ چھاڑ کر کہیں کو نکل گئی ہوتی۔"

"اور یہاں سے جا کر اپنی ماں کے پاس رہتیں کیا یہی بات ہے نا؟" جب اُس کے خاوند نے یہ فقرہ کہا تو کہہ کر مزاحاً ہنسا بھی "عطیہ! بھلا تم اپنے آپ کو کچھ کم سمجھتی ہو۔ ماشاءاللہ تم ایک آتش فشاں پہاڑ ہو۔ میری تو خیر جب تم اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتی تھیں تو اُس سے تمہاری کیا بنتی تھی؟"

"بس جی بس! میرا تو آپ سے جی جلا ہوا ہے" عطیہ نے چلا کر کہا "اور تمہارے آئے دن کے طعنوں سے میرا سینہ چھلنی ہو چکا ہے اور تمہارے عورتوں کے متعلق پرانے فرسودہ اور احمقانہ خیالات سے مجھے دلی نفرت ہے۔ میں تو اب یہ چاہتی ہوں کہ یہاں سے کہیں چلی جاؤں اور اپنے ٹکڑے کی آپ فکر کروں۔ آخر رزاق تو خدا ہے۔ میں تو کب کی سب کچھ کر گزرتی اگر بچوں کا پاس نہ ہوتا اور میں ۔۔۔۔ میں تو آج ہی چلی جاؤں گی۔ بس بس میں تو اب جا کر سوتی ہوں۔"

یہ کہتے ہی وہ گویا کود کر کمرے سے باہر نکل گئی اور اپنے پیچھے زور سے کواڑ بند کرتی گئی۔

جمال کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے قانونی کاغذات اٹھا کر قریب ہی بچھی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ امید اور مسرت کی کیسی تباہی اور بربادی ہے! وہ اور عطیہ جو پوری والہیت سے ایک دوسرے کے پجاری تھے اب ان کا کیا حال ہے! عطیہ جس میں وہ تمام نسوانی محاسن بحدِ انتہا موجود تھے جو وہ کسی عورت میں خیال کر سکتا تھا کیسی سمجھدار اور خوش دل ہشاش بشاش اور ہمیشہ اور ہر حال میں اُس کی ہمدرد اور اس کے اشاروں کو سمجھنے والی تھی۔ اسے اب کیا ہو گیا۔ ابتداءً اُن کے باہم مل کر زندگی بسر کرنے کے کیسے کیسے دلربا ارادے تھے، جو اب خاک میں مل چکے ہیں۔ جمال کو آرام کرسی پر لیٹے لیٹے اپنی شادی کے ابتدائی ایامِ مسرت جو کشمیر میں بسر ہوئے تھے یاد آ گئے۔ گلمرگ کی طویل، خاموش، پُر کیف چاندراتوں اور مسرت و سرشاری کے مختصر دنوں کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ اُس زمانہ میں کام کا کسے ہوش تھا۔ دنیا رہے یا جائے اک پیار کرنے والی عورت سب کا نعم البدل ہے۔ پھر اسے وہ زمانہ بھی یاد آ گیا کہ اس جنتِ ارضی کی سیر سے وہ کس بے دلی کے ساتھ بمبئی میں اپنے کام پر واپس آیا تھا اور یہاں آ کر انہوں نے اپنے لیے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ بیوی کی سلیقہ شعاری اور سلیم مذاق کے باعث ہر ایک بات دونوں کی طبیعت اور میلان کے مطابق انجام پاتی تھی۔ اس کے بعد اُسے اپنی بیوی کی تکلیف کی وہ گھڑیاں بھی یاد آئیں جب وہ اپنے پہلوٹے بیٹے اور بیٹی کی پیدائش پر موت کے پنجے سے بمشکل بچی تھی۔ اور پھر اس کی بتدریج آہستہ آہستہ شفا یابی، اور خود اس کا اپنی بیوی کی نہایت دلسوزی سے تیمارداری کرنا اور محبت وغیرہ غرض گذری ہوئی ایک ایک بات اُس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اس کے بعد دفعتہً اُس کی بیوی کے مزاج میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ وہ ہر روز زیادہ سے زیادہ روپیہ اپنے مصارف کے لئے مانگنے اور نئے نئے طریقے اپنے دل بہلاؤ کے لئے ایجاد کرنے لگی۔ اور اس طرح آئے دن روپے کے سوال نے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں ایک ناگوار تغیر پیدا کر دیا۔

عطیہ نے ایک گراموفون خریدا۔ اور جمال کو اس سے چڑ تھی۔ اُس نے نہ صرف معمولی طور پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ نغمہ و سرود کی مجالس منعقد کرنی شروع کیں، بلکہ کھانے کے بعد روزانہ چند نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی بلانا شروع کر دیا۔ جمال کو مجال نہ تھی کہ وہ ان کدکڑوں کی شکایت کر سکے۔ وہ اسی طرح اپنے آپ کو اپنے دل بہلاؤ میں مختار سمجھتی تھی جیسا کہ اُس کے نزدیک جمال اپنے مذاق کی باتوں میں مختار تھا۔ یہ باتیں ہوتی رہیں۔ مگر اُس کے ساتھ اب شاید

جیسا کہ اُس کے نزدیک جمال اپنے مذاق کی باتوں میں مختار تھا۔ یہ باتیں ہوتی رہیں۔ مگر اُس کے ساتھ اب شاید

ساتھ وہ اپنے خاوند کی معمولی سے معمولی بات کو بڑھا چڑھا کر رائی سے پہاڑ بنا دیا کرتی تھی "روپیہ میرا ہے" یہ تو اُس کی روز کی بولی تھی۔ باہر کے لوگ جب اُس کے گھر پر آتے تو وہ شوہر کے لئے معمولی رقعہ لکھ کر یا پیغام دے کر جہاں جی چاہتا چلی جاتی۔

اب تو یہ حال تھا کہ جمال کو اپنی بیوی کی زندگی میں کوئی حیات بخش عنصر دکھائی نہ دیتا تھا۔ حتیٰ کہ یہ بچے بھی میاں بیوی میں باہمی سرپھٹول کا ایک خطرناک ذریعہ بن گئے تھے۔ اس لئے وہ کیا کر سکتا تھا؟ عطیہ اس کے پیشہ سے بھی ناراض تھی اور وہ چاہتی تھی کہ اُس کا خاوند کام وام تو سب ترک کر کے رکھ دے اور اُس کے کھیل کود میں شامل ہو جائے۔ اور اس کے باوجود روپیہ دینے میں کمی نہ ہونے پائے۔ لیکن جمال کا اصولی طور پر یہ پختہ اعتقاد تھا کہ ہر ایک شریف آدمی کا گھر اُس کی ذاتی سلطنت ہے۔ اگر اُس کے گھر پر اِدھر اُدھر کے "بنتے ہوئے" شرفا کی چڑھائی ہو تو کم از کم اس کی اجازت سے ہونی چاہئے۔

اسراف نے عطیہ کو بدل دیا۔ اُس کے لئے زندگی کے بعض عجیب مگر نئے دروازے کھل گئے۔ وہ خود تو ان میں بذوق وشوق داخل ہوگئی، لیکن اپنے خاوند کو تنہا، حیرت زدہ اور بے چین کھڑا چھوڑ گئی۔ یہ سب باتیں تو تھیں مگر جمال کو یقین تھا کہ یہ سب باتیں ٹھیک ہو جائیں گی اور یقیناً ہو جائیں گی، مگر اُس وقت جب اس کو مقدمات میں بڑی بڑی فیسیں ملنے لگیں گی۔ جمال کو اپنی ذات پر غیر محدود اور بجا بھروسا تھا کہ اُس کی آمدنی ضرور ترقی کرے گی۔ اُس وقت وہ عطیہ کی ہر ایک فرمائش بجا لایا کرے گا لیکن ابھی تو یہ بات میسر نہ تھی۔ جب زمانہ بدلے گا تو وہ اسے اپنے ہمراہ کہیں باہر لے جائے گا، اور یوں اُن کے لئے گویا ایک نیا دورِ مسرت شروع ہوگا۔ رہے یہ باہمی جھگڑے اور شکر رنجیاں جن سے اس کے دل میں گھاؤ پڑے ہوئے تھے ان کے متعلق اس کا خیال تھا یہ کدورتیں محض اُن کی زندگی کی سطح پر ہیں جو جلد ہی فراموش ہو جائیں گی۔

جمال تو اپنے ان خیالات کے سمندر میں تیر رہا تھا اور عطیہ اپنے بستر پر بیٹھی لباسِ شب خوابی پہن رہی تھی اور آپ ہی آپ غصہ اور اشتعال کی حالت میں باتیں کر رہی تھی وہ اپنے خاوند کے فرسودہ خیالات سے تنگ آچکی تھی۔ موجودہ زمانہ کی اصطلاحاتِ شکایت اُس کی نوکِ زبان پر تھیں "اب میں ان بیہودگیوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اور میری ان "مصیبتوں" کی تلافی کوئی چیز حتیٰ کہ بچے بھی نہیں کر سکتے۔ میں اس روز روز کی "کلکل" سے "نفرت" کرتی ہوں اور میرا تمام اندوختہ اپنا غم غلط کرنے میں صرف ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ جمال نے تو روپیہ دینے سے "انکار" کر دیا ہے۔ وہ ان باتوں کو پسند

نہیں کرتا اس لئے وہ روپیہ بھی نہیں دیتا۔ "آپ" کہتے ہیں کہ میں بچوں کے لئے روپیہ جمع کر رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ چاہتے ہیں میری جوانی بغیر کسی تفریح و تفنن کے گزر جائے"۔ سرکشی کا ایک طوفان اُس پر سوار ہوا اُس نے اپنا لبادہ اوڑھا اور اُٹھ کر ملاقاتی کمرے کی طرف دوڑی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور بگولے کی طرح اپنے خاوند کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"اُدھر دیکھو! تم سے طعنے سنتے سنتے اور یہ دیکھ دیکھ کر کہ میرا ہی لڑکا میرے اور اپنی بہن صفیہ کے مخالف ہو گیا ہے، میرا کلیجہ پک گیا ہے اور میں سخت بیمار ہوں۔ اس لئے بھی کہ میں بہت سست اور بے کار رہتی ہوں اور جب کچھ تفریح کرنا چاہتی ہوں تو بُرے الفاظ سنتی ہوں، میں کل یہاں سے رخصت ہوتی ہوں۔

جمال نے کہا "میں خود بچے کو ہمراہ لے کر پونا جا رہا ہوں۔ تم بھی کسی قدر خستہ ہو چکی ہو۔ یہ تبدیلی تمہارے لئے بہتر ہو گی"

"میں بہتری ہی کے لئے تو یہاں سے جا رہی ہوں" عطیہ نے باختصار کہا۔

"کیا تم دیوانی ہوئی ہو"

"میں کیوں دیوانی ہوئی بالکل تندرست اور باہوش ہوں لیکن اب میں تمہارے پاس نہیں رہ سکتی"

"مجھے تم خارج از بحث سمجھو۔ مگر کیا سچ مچ تمہارا یہ ارادہ ہے کہ تم اپنے بچوں کو چھوڑ دو گی محض اس لئے کہ ہم میں کچھ شکر رنجیاں ہیں"

"نہیں" عطیہ گرج کر بولی "اس لئے نہیں کہ ہم میں بعض شکر رنجیاں ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ میں بیمار ہوں —— سخت بیمار۔ اور میری بیماری تمہارے ہر وقت کام میں لگے رہنے اور تمہارے طعنوں اور میری اپنی بے کاری و سستی اور زندگی کی خوفناک یکسانیت کے باعث جو تم میرے لئے تجویز کرتے ہو بڑھتی جائے گی"

"میں اب تک ایک بہت بڑے اور نہایت مشکل مقدمہ کے لئے تیاری کر رہا تھا" جمال نے نرمی سے جواب دیا۔

"جی ہاں! تم تو تعطیلات کے موقع پر بھی اس سال یونہی لگے رہے تھے۔ تم خود تو کسی تفریح میں شامل ہوتے نہیں البتہ ہر ایک چیز پر طعنہ زنی کرتے رہتے ہو"

"میں بے کاروں اور بے فکروں کی طرح راتوں کو موٹروں پر اِدھر اُدھر مارا مارا نہیں پھر سکتا"

"بہت اچھا۔ تو میں تو یہی کروں گی۔ لو بس میں جاتی ہوں"........

"جاتی کہاں ہو؟" اب جمال کا چہرہ بالکل سفید اور سخت ہو گیا اور اُس پر شکنیں پڑ گئیں۔ مگر باوجود اِس کے اُس کی آواز اُس کے قابو میں تھی۔

"مجھے نہیں معلوم شاید پہلے لیلیٰ کے پاس جاؤں"۔

"یہ تو وہ عورت ہے کہ میں ابداً روادار نہیں کہ تم اُس کے پاس ٹھیرو"۔

"نہیں میں اس کے پاس نہیں ٹھہرتی لیکن میری بیزار سے کہ تم کیا خیال کرتے ہو کیا نہیں کرتے۔ وہ میری دوست اور سہیلی ہے"۔

"یا دشمن"؟

"نہیں وہ تو دشمن نہیں البتہ تم میرے دشمن اور جان کے لاگو ہو" عطیہ نے وحشیانہ طور پر چیخ کر کہا۔ "ذرا خیال توکرو میرے دوستوں کے متعلق کیسی کیسی باتیں کہتے ہو۔ میں لیلیٰ کو چاہتی ہوں مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ میری دوست ہے"!

"اسے کوئی قابلِ رشک شہرت حاصل نہیں"۔

"بالکل جھوٹ سفید جھوٹ۔ چند بے شعور اور حاسد لوگ ایسی ایسی افواہیں اڑا رہے ہیں۔ لو میں جاتی ہوں میں تو کل کو یہاں سے چلی ہی جاؤں گی"۔

یہ کہہ کر عطیہ جھپٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور غریب جمال پھر دوبارہ اپنی آرام کرسی میں لیٹ گیا۔ یقیناً یہ بہت بیہودہ بات تھی۔

شاید یہ بات غیر صحیح تھی کہ عطیہ محض چند بے معنی شکر رنجیوں کی بنا پر اس کو اور اپنے بچوں کو چھوڑ کر چلی جانے والی تھی۔ مگر کیا اسے اپنے قانونی پیشہ کی بنا پر یہ تجربہ حاصل نہ تھا کہ تقریباً روزانہ بعض احمق نوجوان عورتیں اپنے خاوندوں کو بغیر کسی معقول وجہ کے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ معاً ایک خیال بجلی کی طرح اس کے دل میں چمک گیا۔ اور ایک لمحہ کے لئے تو جمال اس خیال سے ادھ موا سا ہو گیا۔

اس کے ایک لمحہ بعد وہ تیزی سے اپنی بیوی کے کمرے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ اُس نے بلا تامل اُس کے کمرے کے کواڑ کھول دیئے۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک معمولی برش ہاتھ میں لئے کسی خیال میں گم بیٹھی ہے۔ "عطیہ!" یہ کہہ کر قدم بڑھاتا ہوا وہ اُس کے پاس پہنچ گیا۔ اور ایک ایسی آواز میں جو اس کی بیوی نے آج سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی بولا۔ "کیا تم میں اور مجھ میں کوئی اور شخص تو روک نہیں ہو گیا؟"

"اُس کی بیوی نے تقریباً تبسم کے ساتھ اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس ستم ظریفی کا شکریہ۔ میری ہتک کے لئے کچھ اور کسر رہ گئی ہو تو وہ بھی اٹھا نہ رکھئے"؟

عطیہ کی آنکھوں میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی جس سے اُس کے خاوند کو یقین ہو گیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس کا حرف حرف درست ہے اس خیال سے جو نوری اور اچانک راحت اُسے حاصل ہوئی اُس نے ایک لمحہ کے لئے تو اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا کر دی کہ وہ اپنے بڑے اور مضبوط بازوؤں میں اسے لے لے اور اپنے سینہ سے بھینچ کر لگا لے، مگر ایک طبعی شعور نے اُسے فوراً متنبہ کر دیا کہ یہ طریقہ برتنا موزوں نہیں۔ دل میں یہ خیال گذرنے کے ساتھ ہی وہ بولا۔

"تو پھر تم دیوانی ہوئی ہو جو کہتی ہو کہ مجھے اور بچوں کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟"

"نہیں صاحب میرے ہوش بجا ہیں۔ کم از کم اتنی باہوش تو ہوں جتنے آپ کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتے بس بس یہاں سے آپ تشریف لے جائیے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ یہاں آئیں اور آسمان سر پر اٹھائیں۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ اور نہیں تو اتنی مہربانی تو کیجئے کہ میرے کمرے کو میرے ہی لئے رہنے دیجئے۔"

"میں تو خود اسے چھوڑ کر جانے کو ناپسند کرتی ہوں لیکن میں اسے ایک سبق دینا چاہتی ہوں"، عطیہ اپنے زانوؤں پر پیڈ رکھے ہوئے ایک سہیلی کو خط لکھ رہی تھی "میں امّاں حوّا کے زمانہ کی کہنہ اور پھوہڑ عورتوں میں سے نہیں ہوں، جو ہم پر تو طعنہ زنی کرتی ہیں لیکن خود کسی ایک مرد کی بھی دیکھ بھال نہیں کر سکتیں۔ وہ خیال کرتا ہے کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں اور اسی لئے میں اُسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہی ہوں، لیکن برخلاف اس کے سچ تو یہ ہے کہ وہی وہ میری رگ رگ اور ذرہ ذرہ میں سمایا ہوا ہے۔ مگر اس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وہ میری ہر ایک تفریح اور کھیل سے بے کیف ہو جاتا ہے اور اتنا بُرا مناتا ہے کہ الٰہی توبہ۔ تم نے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ دیوالی آؤں یا کسی دوسری جگہ کا نام لیا تھا۔ بہرحال اب میں دو مہینوں کے لئے آزاد ہوں۔ اور خدا کا شکر اپنی تنہائی مبارک تنہائی کے لئے ادا کرتی ہوں۔ اور وہ بھی سمجھ تو جائے گا۔ خدا اس کو برکت دے۔ جس وقت اُسے گھر کا انتظام آپ کرنا پڑے گا اور بچوں کی نگرانی بھی کرنی پڑے گی تو وہ یقیناً سمجھ جائے گا۔ میں خوشی سے اُسے معاف کرتی ہوں اے میرے پیارے خدا میری مدد کر۔ میری ازدواجی زندگی کو آسان کر۔ لیکن ہائے ہائے۔ ارے دیکھو تو سہی یہ مرد ے کس قدر احمق ہیں؟" . . . .

عطیہ نے اپنے خط کو سربمہر کر کے بند کر دیا تو مینا کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔

"بانو امیاں دارا اب سے دُور کچھ علیل تو نہیں ہیں۔ مجھ سے تو انہیں دیکھا نہیں جاتا۔ کیا آپ آتی ہیں؟ جب میں کھانا کھا کر اُن کے کمرے میں آئی تو دیکھا کہ وہ کپکپا رہے تھے۔ اور اُن کا ماتھا تو بہت ہی گرم ہے۔"

عطیہ یہ سنتے ہی اچھل کر کھڑی ہوگئی اور دفعتہً اُس کا دل بیٹھنے لگا۔

"کیا کہتی ہے ری مینا! نہیں وہ بیمار نہ ہوگا۔ ابھی وہ چائے کے لئے نیچے آیا تھا تو بالکل بھلا چنگا تو تھا۔"

"جی ہاں بیوی! وہ دن بھر تو ماشا اللہ اچھے خاصے تھے" کھلائی مینا نے کہا "پر ابھی ابھی کچھ مزاج خراب ہوا ہے۔ میں جانوں بہتر تو یہ ہے کہ فوراً ڈاکٹر میر صاحب کو بلالیں۔"

عطیہ نے اپنے بستر پر دراز ہو کر دوسری طرف رکھے ہوئے ٹیلیفون کا "رسیور" سنبھالا اور کہا "نہیں میں نہیں، مینا تم ہی ٹیلیفون پر ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ اور کہو کہ فوراً یہاں آجائیں۔ اور میں دارا کے پاس جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تو دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی اور بچوں کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کا ننھا سا معصوم بچہ بار بار کرب و اضطراب سے کروٹیں بدل رہا تھا اور تنہائی میں یوں بول رہا تھا "مینا! یہاں آؤ مجھے پیاس لگی ہے۔ اری مینا میرا سر پھٹا جاتا ہے مجھے پانی دو پانی۔"

ماں کو تو گویا وہ جانتا ہی نہ تھا۔

"میری جان، یہ دیکھو تو تمہاری امی یہاں ہے۔ قربان ہوگئی، واری گئی امی! میرے بچے امی تمہیں پانی پلائے گی۔"

بچے نے بڑی چاہت سے پانی پیا اور پھر بے سدھ ہو کر لیٹ گیا۔ اور ناطاقتی میں پڑا کراہتا رہا۔

کھلائی واپس آگئی اور بولی ڈاکٹر صاحب ابھی آتے ہیں۔ ہاں میں غریب صفیہ کو تو آپ کے بستر پر سلادوں خدا نخواستہ کوئی متعدی مرض نہ ہو۔"

عطیہ نے اپنے لڑکے پر جھکے جھکے ہی رضامندی کے لئے سر ہلادیا۔ اور کھلائی صفیہ کو جو وہیں اپنے بستر پر سو رہی تھی اٹھا کر باہر لے گئی۔

ڈاکٹر آیا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑی ہی دیر میں آیا ہے۔ بچے کا معائنہ کیا اور پھر عطیہ کو مخاطب ہو کر مختصراً کہا۔ کان کی تکلیف ہے۔ میں ایک دوسرے آدمی کو اس کی نگرانی کے لئے کل لے کر آؤں گا۔ یہ دوائی تو آج شب کو پلائیے اور نرس کا اس کے پاس رہنا بہت ضروری ہے۔"

"یہ کان کی تکلیف کیا ہے۔ کہیں کان میں کوئی پھوڑا پھنسی تو نہیں؟"

میں صبح تک تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں مجھے امید ہے کہ بچہ اچھا ہو جائے گا۔ آپ کے میاں کہاں ہیں؟"

"ڈرائنگ روم میں۔"

ڈاکٹر چند ضروری ہدایات اور ہمدردانہ الفاظ کہنے کے بعد جمال کے پاس چلا گیا۔ اور اُس سے کہنے لگا کان کے پیچھے ایک خطرناک قسم کا پھوڑا ہے"۔

"آپ کا مطلب کیا ہے؟" جمال نے کہا۔ اور اُس کا چہرہ بے رنگ اور ستا ہوا تھا۔

"مجھے توقع ہے کہ یہ پھوڑا بڑھے گا نہیں میں نے نرس کو سمجھا دیا ہے کہ اُسے کیا کرنا چاہئے لیکن اگر اپریشن کی ضرورت ہی پڑی ——— ممکن ہے کہ اپریشن کسی قدر گہرا بھی ہو۔ میں صبح غور کروں گا اور صبح سویرے ہی حاضر ہوں گا"

دوسرے دن تو دارا کی حالت بہت ہی خراب تھی اور غیر معمولی تعجیل کے ساتھ فیصلہ کیا گیا کہ اپریشن ہی ضروری ہے۔ پھر کیا تھا آن کی آن میں ڈاکٹر اور نرسیں گھر میں بھر گئیں۔ کیونکہ عطیہ اس بات پر بالکل راضی نہ تھی کہ اُس کا بچہ شفاخانے میں جائے۔ صفیہ اپنے کھلنڈرے ساتھی کو یوں اچانک کھو کر کچھ پریشان سی ہوئی۔ مگر اتنی ہی جتنی کہ ایک ننھی بچی ایک معصوم کے لئے ہو سکتی ہے۔

دارا کی حالت دم بدم بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی اور اُس کے ماں باپ اس فکر و اندیشہ سے بے حال ہوئے جارہے تھے کہ کیا یہ بچہ اُن سے چھن جائے گا۔ عطیہ کے دل میں کئی بار خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے خاوند کے بازوؤں میں گر پڑے، لیکن اس کے مضبوط مگر پریشان چہرے پر ایک نظر کر کے وہ اپنا دل اُس کی طرف سے پتھر بنا لیتی تھی۔ بعض اوقات تو اُس نے جمال کے یوں مردہ دلی اور بے جگری سے اس کمرے میں آنے پر بھی برا منایا اسے یہ خیال بھی بار بار آتا تھا کہ یہ شخص کوشش کرتا ہے کہ اس معصوم کو عورتوں کا مخالف بنا ڈالے۔ اور یہی ہمیشہ بیچاری صفیہ کے مقابلے میں لڑکے کی طرفداری کرتا ہے۔ غرض اس کی فکرمندیوں نے اُس کی نفرت کو اور بڑھا دیا۔ اور جمال بھی ان باتوں کو دیکھ رہا تھا اور افسوس کے ساتھ اپنے بچے کی حالت اور کام کی کثرت سے گھلا جا رہا تھا اُس کے ہونٹوں پر مہر سی لگ گئی۔ اُس نے بیوی کی طرف کوئی میلان ظاہر نہ کیا۔ کیونکہ یہ باتیں بے کار تھیں۔

آخر کار وہ دن بھی خدا خدا کر کے آیا کہ میاں دارا کمزور و نقیہ ایسے کہ جسم میں خون کا ایک قطرہ نہ تھا چند منٹ کے لئے اپنے کمبلوں میں لپٹے لپٹائے بستر پر ہی بیٹھ گئے۔

"ماشاءاللہ! اب تو ہمارے "بڑے میاں" تم اچھے ہو رہے ہو" صبح کو ناشتے سے کچھ ہی پہلے اُس کے باپ نے کہا۔

"اباجان! تو کیا میں کل نیچے چل سکوں گا؟"

"نہیں بھئی کل تو نہیں پرسوں شاید۔ اور میں تمہیں خود اپنی گود میں اٹھا کر نیچے لے جاؤں گا۔ ہے نا؟"

"نہیں ابّا جان! میں خود چل سکوں گا"

اُس کا باپ ہنسا اور بولا "کیا تم چل سکو گے بہت اچھا ہم بھی دیکھیں گے"

دارا نے پوچھا "کیا صفیہ میرے انجن کے ساتھ کھیل رہی ہوگی؟"

اُس کے باپ نے مسکرا کر کہا "بھئی تم اچھے تو ہو جاؤ۔ میرا خیال ہے وہ ضرور کھیلتی ہوگی مگر تم اس کی پروا نہ کرو"

اتنا کہہ کر جمال اپنی بیوی کی طرف ہمدردی و صفائی کے لئے دیکھا کیا لیکن وہ دارا پر جھکے ہوئے اُس کے اردگرد کے کھلونوں کو درست کرتی رہی۔

" دیکھتے جاؤ پھر دارا کو صفیہ کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے" وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی "اب جونہی کہ دارا تندرست ہوا وہی پرانے جھگڑے پھر زندہ ہو گئے"

جمال اپنے مطالعہ کے کمرے میں جا کر گذشتہ فکر و تردد کے تین ہفتوں کے متعلق سوچنے لگا۔ کیا عطیہ نے اُس کو چھوڑ کر چلے جانے کی احمقانہ دھمکی کا خیال اپنے سر سے نکال دیا ہے؟ اب تو اُس نے بھی جی میں ٹھان لی تھی کہ اپنی بیوی کو دکھا دے کہ اب وہ ایسی باتوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس نے سرسری طور پر ایک مسودہ بھی تیار کر لیا تھا وہ دکھا دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے قول کے مطابق عمل کرنے کو تیار ہے۔ اور پھر جب بھی عطیہ نے اپنی گفتگو شروع کی وہ فوراً یہ تحریر اُس کے سپرد کر دے گا۔

آہ! اُس کی حسینہ و جمیلہ پری وش عطیہ! وہ اپنا کام شروع کرنے سے پہلے اُس کی تصویر کو جو کمرے میں آویزاں تھی ایک وارفتگی کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس سے اتنی سختی کرے گا؟ کر سکے گا؟ یا وہ حد سے زیادہ نرم تھا اور ابھی اسے اور نرم اور ملائم ہونے کی ضرورت تھی؟ وہ اسے اپنے محبوب ننھے بچے کی نگرانی اور مسلسل تیمارداری میں فداکارانہ مصروف دیکھ کر پہلے سے زیادہ پیار کرنے لگا تھا۔ لیکن جھگڑوں کو چکایا کس طرح جائے؟ اور عورتوں سے نباہنے کی صورت کون سی ہے؟ وہ اپنی آیندہ زندگی کے متعلق جب عطیہ اُس کے پاس نہ ہوگی غور کر رہا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس کے بغیر جینا ناممکن ہے حتیٰ کہ عطیہ کے نئے نئے خیالات اور اُس کے حد سے بڑھے ہوئے غصے اور نئی نئی آزادیوں کے باوجود وہ ہر طرح اُس کی محبت میں مبتلا اور ثابت قدم تھا۔ وہ اس کی زندگی بخش آواز، اُس کی نازک و دلکش ہنسی، اس کے حسن اور فہم و فراست کا شیدائی تھا۔ عطیہ کی بے رکھائی اور اکھڑپن

تو بعد میں اُن کی مسرور زندگی میں داخل ہوگیا تھا۔ اُس نے بتکرار اپنے دل میں اُس ناچاقی اور اس کے اسباب پر غور کیا جس نے ان کی مسرتوں کے ساز کو بے آواز کر دیا تھا لیکن اس درز کو بند کرنے کی کوئی تدبیر بھی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

اس دوران میں عطیہ بھی اپنے خاوند کی اس ہلکی طعن آمیز ہنسی پر غور کر رہی تھی جب کہ اُس نے دارات کہا تھا کہ "میں سمجھتا ہوں کہ صفیہ ضرور تمہارے انجن سے کھیل رہی ہوگی" اُس کی نفرت کا بجھتا ہوا شعلہ دوبارہ بھڑک اٹھا۔ اُسے عورتوں کے متعلق اس بے مہرانہ بولی ٹھولی اور نیم متمدنانہ آواز کے سننے سے نفرت تھی۔ اس لئے اب جیسا کہ طے ہو چکا تھا وہ اپنی دوست نیلی کے پاس جانے پر آمادہ تھی جس نے اُس کے آنے کے ارادے پر مبارکباد کہی تھی اور جس نے اس خلیج کو جو خود عطیہ نے اپنے اور اپنے میاں کے درمیان پیدا کرلی تھی اور وسیع کر دیا تھا۔ اتنے میں اُس کے بیٹے نے پکارا "امی جان! کیا صفیہ آکر میرے ساتھ کھیلے گی؟" دارا کی آواز تھکی ہوئی اور خستگی لئے ہوئے سنائی دی "ہاں میرے بچے! قربان گئی امی! کیوں نہیں۔ وہ ضرور کھیلے گی اور اس سے تمہارا دل بہلے گا۔"

عطیہ نے صفیہ کو بلایا اور کہا "میری ننھی بچی! بیٹے کوئی اچھا سا کھیل کھیلو جس میں شور نہ ہو اور یہ اوپر دوڑتی نہ پھرو کہ اس سے تمہارے بھائی کے سر میں درد ہو جائے گا۔ میں اب چند خط لکھنے جا رہی ہوں جب لکھ چکوں گی تو آکر پیار کروں گی۔"

عطیہ نے یہ کہہ کر صفیہ کو ایک چھوٹی سی کرسی پر اس بڑی کرسی کے سامنے جس پر میاں دارا کپڑوں میں لپٹائے بیٹھے تھے بٹھا دیا اور خود سیڑھیوں سے اتر کر اپنے کمرے میں خط لکھنے کے لئے چلی گئی۔ وہاں جا کر اُس نے نیلی کو تو یہ لکھا کہ وہ آئندہ دو شنبہ کو آتی ہے اور جمال کے لئے اس مضمون کا ایک مختصر رقعہ لکھا کہ وہ پونا جا رہی ہے اور موسم سرما وہیں گزارے گی۔ اور واپس صرف اسی وقت آسکتی ہے کہ جمال تم چھوڑ کر اپنے موجودہ مسلک کو بالکل بدل دے۔ بچوں کی نگرانی کرے گی کہ وہ ان کی چارج ہے۔ لیکن اگر سچ پوچھئے تو نہ تو میاں بیوی اور نہ بچے ان مسائل کے لئے تیار تھے۔

اُس کا خط تمام ہو گیا۔ وہ نرسری میں گئی کہ صفیہ کو وہاں سے لے کر ملاقات ہونا بچے لیے کسی ضروری کام پر لگی ہوئی تھی۔ نرسری میں صرف بچے ہی تنہا تھے۔ عطیہ نرسری کی طرف تاریکی میں سے ہو کر گئی۔ اور قبل اس کے کہ وہ کمرے میں داخل ہو دفعتہً صفیہ کی یہ آواز سن کر جہاں تھی وہیں تھم گئی۔

لو آؤ امّی جان اور ابا جان والا کھیل پھر کھیلیں۔ مجھے تو وہ کھیل بہت ہی اچھا لگتا ہے۔"

دارا ماندگی کے ساتھ سنبھلا۔

یہ خیال کر کے کہ یہ بچّے کیا کھیل کھیلتے ہیں۔ عطیہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

"بہت اچھا" دارا نے کہا "تو اب کس طرح شروع کریں؟"

"ایسے ہی جیسے کہ پچھلی دفعہ امی جان اور ابا جان میں ہوا تھا۔"

صفیہ نے سر ہلایا اور بولی "ہاں تم گھنونے بنو اور میں ناراض ہونگی، خوفناک ناراض۔ اور چیخ چیخ کر آواز نکالوں گی۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے تیور بدل لئے۔ اور غصے سے اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

عطیہ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور جب اُس نے صفیہ کا چہرہ دیکھا تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ اُس نے حیرت زدہ ہو کر قدم پیچھے ہٹا لیا۔

"جمال تم نے مجھے کبھی سکھ نہیں دیا۔ تم تو کہیں کے وحشی درندے ہو"

"میری جان عطیہ!" دارا نے پورے طور پر اپنے باپ کی نقل اتارتے ہوئے، متبسم ہو کر اپنی بھنوؤں کو اٹھانے کے بعد کہا "کیا میں نے کبھی تمہاری کسی فرمائش کو رد کیا ہے؟ تم عورتیں بھی عجیب ناشکر گزار ہوتی ہو"

"بس رہنے دو۔ تم ذرا ذرا سی چیز لانے سے تو انکار کر دیتے ہو۔ تم تو بس ایک درندہ ہو۔ میرا تو تم سے جی جلتا ہے۔ تم کبھی "انسان" نہ بنوگے۔ میری تو قسمت پھوٹ گئی۔ میں تو اس وقت کو روتی ہوں جب میں نے تم سے شادی کی تھی۔ کاش نہ ہوتی۔"

صفیہ گرم ہو ہو کر اٹھتی تھی اور نرسری کے فرش پر اچھل اچھل پڑتی تھی اور کہتی جاتی تھی "تم وحشی ہو وحشی۔ تمہارے خراٹے ہی ختم نہیں ہوتے۔ نہیں معلوم تم ایسے جانور میرے پلّے کہاں سے پڑ گئے۔"

"میری پیاری عطیہ، تمہیں بتاؤ میں اس سے زیادہ تمہارے لئے اور کیا کر سکتا ہوں۔"

"کرنا چاہو تو بہت کچھ"، صفیہ نے چیخ کر کہا "میں تو ہر رات نئی نئی تفریحیں، نئے نئے کھیل قسم قسم کے گراموفون باجے چاہتی ہوں۔ لیکن میں تم سے سیر ہو چکی۔ میں نے تو تم سے بھر پایا۔ میرے لئے تو تم ایک خوفناک مصیبت اور مہیب بلا ہو۔ میں تو اب یہی دعا کرتی ہوں کہ تمہارا جنازہ اٹھے۔ کسی کی آئی جمال بندے تم کو آئے۔ جیسا تم نے مجھ کو جلایا ہے۔"

دارا نے آہ بھری اور تھک کر کمزوری سے پیچھے کو جھک گیا اور پھر کسی قدر گہری ٹھنڈی سانس بھری۔

"اب بولتے کیوں نہیں ۔ کیا منہ کو تالے لگ گئے ہیں"۔ صفیہ نے بپھر کر کہا۔

"افوہ! عطیہ میں تو تمہیں سمجھاتے سمجھاتے بے جان ہو گیا۔ لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ابھی اپنے متعلق بہت کچھ کہنا ہے"۔

عطیہ آہستگی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ صفیہ کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔

"بچو یہ سونے کا وقت ہے"۔ اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ لیکن اُس کی آواز میں ایک متبسمانہ لرزش پائی جاتی تھی۔ اور دارا کے چہرے پر تکان اور خستگی کی علامات ہویدا تھیں جو بالکل اس کے مشابہ تھیں جو اکثر جمال کے چہرہ پر ہویدا ہو جایا کرتی تھیں۔

عطیہ کے لئے یہ ایک اچانک انکشاف تھا۔ اُس کا دل بیٹھ سا گیا۔ ایسا روشن اور صاف سبق آج تک کسی عورت کو نہیں ملا تھا۔ اُس پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اُن کے آپس کے جھگڑے میں خطا کس کی تھی۔ عطیہ کے لئے یہ ایک روح فرسا صدمہ اور ایک جانکاہ حادثہ تھا کہ صفیہ بیماری کے مارے صابر و شاکر دارا کو گالیاں دے دے کر آپ مزے لے رہی تھی۔ جب اُس نے صفیہ کو گود میں اٹھایا تو اُس نے دارا کو آہستگی سے یہ کہتے سنا کہ "لڑکیاں بڑی وحشی ہوتی ہیں"۔ یہ بات عطیہ پر صادق آتی تھی۔ وہی جمال کے لئے وحشی بنی ہوئی تھی۔ وہ جمال جس سے شادی کرنے کی اُسے اس قدر آرزو اور تمنا تھی اور جو غریب اپنی جان مار مار کر اُس کے لئے کام کرتا تھا اور اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے ہر وقت اپنے ہی کو قصوروار سمجھتا تھا۔

اسے خیال آیا کہ کیا اس کی دوست لیلیٰ خوش تھی؟ اس نے تو اسے کبھی شاد نہیں دیکھا جب سے اُس نے اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کی ہے اور وہ بھی بلا کسی معقول وجہ اور سبب کے وہ کبھی خوش نہیں ہوئی۔

کسی چیز نے نامعلوم طور پر اُس کی نسوانی محبت میں ایک جوش سا پیدا کر دیا جس نے عطیہ کے گہرے روحی زخموں کو یکدم معجزانہ طور پر مندمل کر دیا۔ اسے اپنے بیمار بچے دارا کے چہرے پر بالکل جمال جیسی گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نظر آئے اور اُس نے دل میں سوچا کہ وہ کیا غضب کرنے والی تھی کہ اپنے جمال، اپنے شوہر، اپنے قابل رشک شوہر کو چھوڑ جانا چاہتی تھی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اُس نے جھٹ پٹ صفیہ کو بینا کی گود میں دے کر دارا کو بڑے ہی پیار سے بوسہ دیا اور پھر نہایت تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صفیہ کے الفاظ اس کے کان میں گونج رہے تھے کہ "امی جان تم ناراض تو نہیں کہ میں تمہاری طرح ناراض ہو رہی تھی" اور مینا کے بے کیف چہرے نے اُس کے دل میں ایک اور درد پیدا کر دیا۔

وہ آرام کرسی پر بے اختیار گر پڑی اور سسکیاں لینے لگی۔ ایسی سسکیاں جو اُس نے اپنی عمر میں کبھی نہ لی تھیں......... آخر کار......... بے حالی میں لرزتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھی اور اُس نے اپنے منہ پر پانی ڈالا اور آنسوؤں کو خشک کیا اور اس کے بعد آہستگی سے اپنے خاوند کے مطالعہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

"عطیہ کیا تم ہو؟" اُس نے بغیر دیکھنے کے کہا۔

"ہاں جمال میں ہی ہوں"

وہ اٹھا اور اُس کی نگاہ کاغذوں پر جھکی ہوئی تھی "میں نے ایک تجویز کی ہے کہ جب تم باہر ہو گی تو میں تمہارے اخراجات کے لئے کس قدر روپیہ دے سکوں گا۔" اُس نے آہستگی سے کہا اور میں ــــــ عطیہ! ہیں یہ کیا؟ جب اُس نے اس کے چہرے کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ وہ نہایت پژمردہ اور افسردہ ہو رہا ہے وہ پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا پھر اُس نے کہا "کیا دارا کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟" اور اس کی آواز میں فکرمندی کی علامات نمایاں ہو گئیں۔

"نہیں جمال لیکن میں ــــــ میں ــــــ" وہ اپنی باہیں پھیلا کر اُس کی طرف بڑھی اور ان کو مضبوطی سے اس کی گردن میں حمائل کر دیا۔

"ہائے جمال! جمال!" اس نے کہا اور سسکیاں لیتی ہوئی اس کے اور قریب ہو گئی۔

"میری پیاری میری جان!" جمال نے آہستہ سے کہا اور زور سے اُس کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور کوئی سوال نہیں پوچھا۔ وہ مطمئن تھا کہ ایک فوری راحت اُسے مل گئی ہے۔ اور وہ نہ جانتا تھا اور نہ جاننے کی پرواہی کرتا تھا کہ عطیہ میں تغیر کیسے پیدا ہوا۔

"جمال میں ہی اب تک تمہارے لئے وحشی بنی رہی"

"اور میں بھی کچھ کم احمق نہ تھا"

"اب تو تم مجھے اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتے۔ کیا جدا کر دو گے؟" نادان عطیہ نے پوچھا۔

جمال نے کہا "میں نے تو کبھی بھول کر بھی یہ ارادہ نہیں کیا کہ تم کو، اپنی نادان بھولی زندگی کی رفیقہ کو اپنے سے جدا کر دوں"

مہر محمد خاں شہاب

غزل

نہ میں زمیں کے لئے ہوں نہ آسماں کے لئے
ہوا ہوں خلق ترے سنگِ آستاں کے لئے

بشر کے دم سے کون و مکاں کی آرائش
کھچا ہے نقش یہ تزئینِ دو جہاں کے لئے

مرے بیانِ وفا پر نہ لے عتاب سے کام
کیا ہے ذکر ترا حسن داستاں کے لئے

فدا ہوا ہوں میں تجھ پر کہ عیش میں کاٹوں
فنا ہوا ہوں میں آرامِ جاوداں کے لئے

بہارِ گلشنِ ہستی میں جی نہیں لگتا
خبر نہیں کہ میں بے تاب ہوں کہاں کے لئے

ہوائے الفتِ منزل! اڑائے چل مجھ کو
مثالِ گردِ پریشاں ہوں کارواں کے لئے

مزارِ افسرِ بے کس زمیں پہ رہنے دو
کوئی جگہ تو رہے دورِ آسماں کے لئے

افسر
صدیقی امروہوی

چھلاوہ

فیروز نے اخبار ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا "آج اس میں میرے ایک دوست کے انتقال کی خبر ہے۔ میں نے اُسے صرف ایک دفعہ دیکھا ہے مگر وہ اکثر میرے خیال کی آنکھوں کے سامنے رہا ہے۔ کیا خوب آدمی تھا!

"رات کا وقت تھا اور گاڑی راولپنڈی کی طرف جا رہی تھی۔ میں ایک اول درجہ کے کمرے میں تھا اور میرا ایک ہی ہم سفر کہیں راستے میں اتر چکا تھا۔ تنہائی مجھے ناگوار نہ تھی کیونکہ اب میں جس قدر چاہتا پھیل سکتا تھا اور نرم نرم گدیلے مجھے دعوتِ استراحت دیتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے لیمپ بجھا دیا، اپنا اوورکوٹ اوڑھا اور اطمینان کا ایک لمبا سانس لیتے ہوئے دراز ہو گیا کہ اب وہاں کوئی نہ تھا جسے میرے پاؤں پھیلانے سے تکلیف ہوتی۔

"گاڑی اب ایک وسیع میدان میں سے گزر رہی تھی۔ انجن پوری رفتار پر جا رہا تھا اور میرا کمرہ کسی پرانے یکے کی طرح ہچکولے کھاتا رواں تھا۔ یہ ہچکولے مجھے اپنے کندھوں کے بل پر آگے، اور پیچھے مسلسل جنبش دے رہے تھے۔ سر کے اوپر میرے سوٹ کیس میں سے ایک باریک آواز نکل رہی تھی، کھڑکیاں کھٹ کھٹ بج رہی تھیں اور پہیوں اور بریکوں سے ہولناک چیخوں کی سی آواز آ رہی تھی۔ لیکن جونہی کہ میں نے آنکھیں بند کیں اس شور کی لے مجھ پر چھانے لگی، میں اپنے آپ کو پھر بچپن کے زمانے میں پانے لگا اور مجھے اپنی کھلائی کی لوری کی شیریں آواز آنے لگی۔

"انہیں مہمل خیالات میں مجھے نیند آ گئی۔ گاڑی چلتی رہی اور اُس کا شور میرے کانوں میں گونجتا رہا۔

یکایک کمرے کی فضا متغیر ہو گئی اور میں جاگ اٹھا۔ میرے منہ کے قریب تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو کمرہ بدستور خالی تھا اور میرے سامنے والا دروازہ بھی بند تھا۔ مجھے پھر نیند آ رہی تھی کہ رات کی سرد ہوا کا ایک اور تھپیڑا آ کر مجھے لگا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو میرے سر کی طرف کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور فرش پر ایک شخص بیٹھا تھا جس کے پاؤں پائیدان پر تھے۔

"میرے حواس باختہ ہو گئے کیونکہ میرا دماغ ابھی نیم بیداری کی حالت میں تھا۔ سب سے پہلے مجھ پر متوہمانہ خوف سا چھا گیا۔ کیونکہ پوری رفتار سے جاتی ہوئی گاڑی میں یکایک کسی انسان کے ظاہر ہونے پر یہی

خیال ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی بھوت ہے۔ پھر مجھے گاڑیوں میں آگھسنے والے لٹیروں، اچکّوں اور خونیوں کا خیال آیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا ہوں اور گو میرے اور دوسرے مسافروں کے درمیان صرف ایک لکڑی کا تختہ حائل ہے لیکن میں کسی ذریعہ سے بھی اُن کو اپنے خطرے سے آگاہ نہیں کر سکتا۔ یہ شخص ضرور کوئی ڈاکو ہے!

حفاظتِ نفس کے جذبے سے مجبور ہو کر میں اُس پر ٹوٹ پڑا اور اپنی کہنیوں اور گھٹنوں سے لے باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا لیکن دروازے کو بے تحاشا پکڑے رہا، اور میں اُس کی گرفت ڈھیلی کر کے اُسے باہر پھینکنے کی سعی میں مصروف رہا۔ اس میں شک نہیں کہ میں ایک محفوظ جگہ پر کھڑا تھا اور مجھے یہ فوقیت حاصل تھی۔

"خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں کوئی مضرت نہ پہنچاؤں گا!" یہ الفاظ اُس نے ایسی لجاجت سے کہے کہ مجھے اپنے سلوک پر شرم آگئی اور میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ ہانپتا کانپتا وہ پھر بیٹھ گیا۔ میں نے وہاں سے ہٹ کر لمپ روشن کر دیا۔

"اس کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہے۔ وہ ایک غریب کسان تھا اور اُس نے موٹے کھدر کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس کی سیاہ پگڑی اُس کے چہرے سے کچھ زیادہ تاریک نہ تھی جس میں اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور پیلے پیلے دانت نمایاں تھے۔ وہ احمقانہ ممنونیت میں کھلکھلا رہا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے تھیلے میں سے کچھ تلاش بھی کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں اپنی نیکی پر افسوس کرنے لگا۔ ابھی وہ تلاش میں مصروف تھا کہ میں نے اپنے ریوالور پر ہاتھ ڈالا۔ اب وہ بے خبری میں مجھ پر حملہ نہ کر سکتا تھا۔

"آہستہ سے اُس نے کوئی چیز اپنے تھیلے میں سے نکالی، اور میں نے بھی اُس کی تقلید میں اپنا ریوالور آدھا باہر نکال لیا، لیکن میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں محض ایک فرسودہ کاغذ کی چھوٹی سی کترن تھی، جسے وہ خوشی سے میری طرف بڑھا رہا تھا۔

"دیکھو، میرے پاس ٹکٹ موجود ہے"

"میں نے اُس کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا!

"میں نے کہا "لیکن یہ تو پرانا ہے! یہ تو سالہا سال سے بے کار ہو چکا ہے۔ اور اس کے علاوہ کیا یہ تمہیں چلتی گاڑی میں چھلانگیں لگانے اور یوں لوگوں کو ڈرانے کی معافی دے سکتا ہے"

"اس پر اُس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا، اُسے پھر خوف ہو گیا ہے کہ میں اسے باہر پھینک دوں گا لیکن

اپنی حساسیت کے باعث مجھے اس پر رحم آنے لگا۔

"میں نے کہا "تم اندر آجاؤ اور دروازہ بند کردو"

"نہیں صاحب، شکریہ!" اُس نے کڑی آواز سے کہا "مجھے اندر آنے کا حق نہیں ہے، میں یہیں باہر بیٹھوں گا۔ میں اُس جگہ کے قابل نہیں"

"اور وہ دروازے ہی میں بیٹھا رہا۔ میں بھی اُس کے قریب ہی بیٹھا تھا اور میرے گھٹنے اُس کے کندھوں کو چھُو رہے تھے۔ گاڑی کی رفتار کے ساتھ ہوا طوفان کی طرح اندر آرہی تھی، اور روشنی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دروازے میں سے چھن کر اور ہمارے بے ڈول سایوں کو ساتھ لے کر بنجر میدان کو چھوتا ہوا ہمارے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ تار کے کھمبے رات کے سیاہ پردے پر زرد رنگ کے عمودی نقوش کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے چلے جاتے تھے، اور چنگاریوں کے جگنو انجن سے نکل نکل کر پیچھے کی طرف بھاگتے تھے۔

"وہ مضطرب سا نظر آتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے اطمینان سے بیٹھنے کی عادت ہی نہیں۔ میں نے اُسے ایک سگار پیش کیا۔ ذرا سی دیر کے بعد اُس نے باتیں شروع کردیں۔

اُس نے مجھے بتایا کہ وہ ایسا سفر ہر ہفتے کیا کرتا ہے۔ وہ سٹیشن سے دور کھڑا گاڑی کا انتظار کرتا رہتا ہے اور جب وہ قریب پہنچتی ہے تو دوڑ کر ایک ہی چھلانگ میں اُسے پکڑ لیتا ہے، اور پائدان پر کھسکتا ہوا کسی خالی کمرے تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر گاڑی کے کسی سٹیشن پر داخل ہونے سے پہلے ہی کود جاتا ہے، اور جب وہ چل پڑتی ہے تو پھر اس پر چڑھ آتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ اپنی گاڑی بدل لیتا ہے تاکہ سنگدل گاڑی والوں کی نظر سے بچا رہے۔

"میں نے پوچھا "لیکن تم کہاں جارہے ہو؟ اور ہر ہفتے تم اتنے بڑے خطرات میں کیوں پڑتے ہو؟"

معلوم ہوا کہ وہ اتوار کی چھٹی اپنے بال بچوں میں گزارنا چاہتا تھا مگر وہ اور اس کی بیوی انتہائے غربت کے باعث اکٹھے نہ رہ سکتے تھے۔ وہ ایک شہر میں کام کرتا تھا اور اُس کی بیوی کسی دوسرے شہر میں۔ پہلے پہل وہ یہ سفر پیدل طے کیا کرتا تھا اور ساری رات چلتا رہتا تھا، مگر جب وہ وہاں پہنچتا تو بے حال ہو کر گر جاتا تھا اور تکان کے باعث نہ اپنی بیوی سے بات کر سکتا تھا نہ بچوں سے کھیل سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بےباک ہو گیا اور اب اس نے گھر پہنچنے کا ایک آسان رستہ نکال لیا۔ بچوں کو دیکھ کر اُس کے اعضا میں بقیہ ہفتے کے لیے زیادہ تندہی سے کام کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی تھی۔ اُس کے تین بچے تھے۔ سب سے چھوٹی لڑکی ابھی اچھی طرح چل بھی نہ سکتی تھی لیکن

وہ اپنے باپ کو پہچانتی تھی اور جب کبھی وہ آتا وہ پیار لینے کے لئے اُس کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیتی تھی۔

"میں نے اُس سے کہا لیکن کیا تم ڈرتے نہیں کہ کسی دن یہ سفر تمہارا آخری سفر نہ ہو جائے"۔

"وہ مسکرایا اور اُس کے مسکرانے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنے پر اعتماد ہے" نہیں، جب گاڑی کسی گسستہ عناں گھوڑے کی طرح شعلے اگلتی اُس کی طرف بڑھی چلی آتی تھی تو اس کو ڈر نہ آتا تھا۔ وہ کافی دلیر تھا، ایک ہی جست میں وہ اس کے اوپر ہوتا، اور گو کبھی کبھی اترتے وقت اُسے ایک آدھ دھکا لگ جاتا لیکن وہ پہیوں کی زد سے اپنے آپ کو صاف بچا لیا کرتا۔

"اُسے صرف مسافروں کا خطرہ ہوتا تھا۔ اول درجہ کی گاڑیاں اُسے عموماً خالی ملتی تھیں لیکن آج کی طرح کے مواقع بھی اسے پیش آ ہی جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جو عورتوں کے لئے مخصوص تھی۔ وہاں دو عورتیں بیٹھی تھیں اُن کی چیخوں نے اسے ایسا ڈرایا کہ اسے گاڑی سے اترتے ہی بنی اور باقی راستہ پیدل چل کر جانا پڑا۔

"ایک رات جب وہ چوری چوری ایک دروازہ کھول رہا تھا کسی نے اُس کے سر پر اس زور کی ضرب رسید کی کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ بس اُس دن اُسے یقین تھا کہ یہ اُس کا آخری سفر ہے! یہ بات سناتے سناتے اُس نے اپنی پیشانی پر مجھے ایک بہت بڑا داغ دکھایا۔

"آہ، اُس کے ساتھ بڑی بدسلوکی ہوئی تھی لیکن اس کی اُس کو شکایت نہ تھی۔ اُسے لوگوں سے گلہ نہ تھا کہ کیوں وہ اس سے ڈرتے اور اپنی حفاظت کی کوشش کرتے ہیں۔ جو سلوک اُس سے ہوتا تھا وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا۔ مگر جرم کے سوا اُس کے پاس چارۂ کار ہی کیا تھا جب کہ وہ مفلس و قلاش تھا اور اسے اپنے بچوں کو دیکھنے کی آرزو بھی تھی۔

"اتنے میں گاڑی کی رفتار کم ہونی شروع ہوئی جیسے کوئی سٹیشن آ رہا ہو۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے کہا، دیکھو، تمہارے سٹیشن پر پہنچنے سے پہلے راستے میں ایک قیام اور ہوگا، تم بیٹھے رہو اور تمہارا کرایہ میں ادا کر دوں گا"۔

"اُس نے بلا تامل جواب دیا" نہیں صاحب، گارڈ پھر بھی مجھے دروازے سے گزرنے نہ دے گا۔ اُس نے کبھی مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ وہ دیکھے۔ مگر میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کو یہ سفر مبارک ہو۔ میں نے آپ جیسا رحم دل اور نیک کوئی آدمی نہیں دیکھا!"

"یہ کہہ کر اُس نے پائدان پر پیر رکھا اور غائب ہوگیا"

"جلد ہی گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر ٹھیر گئی۔ مجھ پر پھر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی کہ یکایک مجھے پلیٹ فارم پر اشتعال آمیز آوازیں سنائی دیں۔ یہ قلی وغیرہ تھے جو گاڑی کے محافظوں کو کسی کے تعاقب کا رستہ دکھا رہے تھے۔

"وہ جارہا ہے! تم میں سے ایک دوسری طرف ہو جاؤ تاکہ وہ بچ کر نکل نہ جائے!...... لو وہ گاڑی کے اوپر چڑھ گیا!.... جلدی کرو!"

"اور چند ہی لمحوں میں میرے کمرے کی چھت غضبناک پولیس کے بھاری بھاری قدموں سے ہلنے لگی۔

"میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا تو اگلی گاڑی کی چھت سے ایک آدمی نیچے گر رہا تھا۔ ایک تودے کی طرح وہ زمین پر آپڑا، پھر بے تحاشا بھاگ اُٹھا اور جلد ہی رات کے سیاہ پردے میں چھپ گیا۔

"گارڈ اور اُس کے دوسرے ساتھی زور زور سے بول رہے تھے اور طیش سے ہاتھ ہلا رہے تھے

"میں نے اُن میں سے ایک سے پوچھا "یہ کیا بات ہے؟"

"اُس نے کہا "یہ وہی ہے وہی سواری کا چور! یہ چھلاوہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا، مگر ہم ضرور اسے پکڑ کر رہیں گے!"

"چھلاوے" کو میں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اکثر سردی کی راتوں میں مَیں یہ سوچ سوچ کر حیران ہوا ہوں کہ آیا وہ اس وقت بھی کہیں باد و باراں کے طوفان میں کھڑا ناساز گار گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہا ہوگا، اور پھر دشمن کے مورچے کو مسخر کر لینے والے کسی بے باک سپاہی کی طرح وہ اس پر چڑھ رہا ہوگا"

پھر نیرولڈ نے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور آج اس میں لکھا ہے کہ چک لالہ کے قریب کسی کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اڑے ہوئے پائے گئے۔ یہ وہی ہے ـــــ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی ہے۔ آہ، وہ جو خطرے کو ڈھونڈتا ہے، اس میں پڑتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے، چار طویل سالوں تک اُس نے اپنا یہ وظیفہ جاری رکھا، جب جی اُس کا دل اپنے بچوں کو چومنے کے لئے چاہا وہ کسی وحشی درندے کی طرح اپنے شکار پر جھپٹا گیا، یہاں تک کہ آج صبح کی روشنی نے اُسے اُس رستے پر پڑا پایا جس پر تاریک رات نے اُسے اکثر ایک بہادر انسان کی طرح موت کو دعوتِ مقابلہ دیتے ہوئے دیکھا تھا۔

منصور احمد

(ترجمہ)

دنیائے رنگ و بو

(۱)

دلچسپ ہیں مناظر دنیائے رنگ و بو کے
حیرت زدہ ہے ناظر نظارۂ چمن سے
ہر گل ہے جانِ راحت
سرمایہ دارِ عشرت

(۲)

حسنِ بہارِ رنگیں دلکش ہے دلکشا بھی
آئینہ دارِ نزہت نرگس ہے موتیا بھی
نیرنگِ شانِ یزداں
ہر سمت ہے نمایاں

(۳)

اہلِ نظر ہزاروں ہر ایک گل بداماں
ہیں محوِ دیدِ گلشن بے خوف و بے محابا
وہ بے خودی ہے طاری
پروا نہیں کسی کی

(۴)

کچھ اہلِ دل نشستہ سایہ میں تاک کے ہیں
وہ بے پیے ہوئے ہی بیخود بنے ہوئے ہیں
ہر گل نظر میں اُن کی
ہے جامِ زندگانی

(۵)

ہشیار، دیکھ غافل! یہ وقت ہے غنیمت
اِک جام تُو بھی لے لے بڑھ کر، اگر ہو ہمت
انجام سے نہ گھبرا
انجام نیک ہوگا

راز
چاندپوری

شاعر اور مغنیہ

لندن میں ہر جگہ ہُن نہیں برستا، بلکہ بعض ایسے محلے بھی ہیں جہاں افلاس اور تہی دستی کے دل ہلا دینے والے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اسی گھر کو لیجئے جو گلی کے نکڑ پر واقع ہے، اور تنگ دستی کے جملہ نوادر کا معدن بن رہا ہے۔ ایک بیوہ عورت بسترِ علالت پر کراہ رہی ہے، اور اس کا یتیم لڑکا پائنتی سرہانے بیٹھا گنگنا رہا ہے بیماری بجائے خود ایک مصیبت ہے، مگر جب اس کے ساتھ ناداری بھی حملہ کرے تو کوڑھ میں کھاج کی مثل صادق آتی ہے۔ عورت کراہے جاتی ہے لڑکا گنگنائے جاتا ہے اور کسی ایسی بات کا امکان نہیں جو اس ماحول میں کوئی تغیر پیدا کر سکے۔ عورت کو اپنے سہاگ کے دن یاد آتے ہیں، لڑکے کو باپ کی محبت بر آتی ہے لیکن یہ اتحادِ خیال کسی گفتگو کا موجب نہیں ہوتا۔ آفتاب اپنے سفر کی وہ منزل طے کر چکا ہے جہاں بیٹھ کر وہ اہلِ دنیا کو رخصت چاشت دیتا ہے۔ لیکن آج اس کی فردسے ان ماں بیٹوں کا نام خارج ہے۔ ماں کو خوراک نوکجا دوا تک میسر نہیں آتی، اور لڑکے کے منہ میں کھیل تک اڑ کر نہیں پڑی، مگر وہ گنگنائے جاتا ہے اور اس بے مزہ زندگی کی ناخوشگوار گھڑیاں مزے سے گزارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آخر ضبط کی بھی حد ہوتی ہے۔ اس لئے معذور ہے اگر اس ہولناک تنہائی، اس بھیانک ناداری اور ماں کی اس طویل بیماری میں دامنِ صبر اس کے ہاتھ سے نکل جائے اور اُس کی آنکھیں اُن محرمانِ دردِ دروں سے داد طلب کریں جنہیں عرفِ عام میں آنسو کہتے ہیں۔ لڑکا گو ابھی ابھی سن کے اُس حصار سے نکلا ہے جسے بچپن کہتے ہیں۔ مگر آخر مرد کا بچہ ہے اور اس کی غیرت قبول نہیں کرتی کہ اُس کی ماں ایک سنگترے کے لئے ترسے اور کہے ”میری زندگی ایک سنگترے کے لئے ختم ہوتی ہے“ اور وہ منہ دیکھتا رہے۔ لنڈن اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے ساتھ ایک خوش رقم کتاب کی طرح اس کے سامنے کھلا پڑا ہے، لیکن وہ اس کے پڑھنے کے ناقابل ہے۔ تنازعِ بقا میں ایک ایسا خاموش اعترافِ شکست اُس کے سمندِ غیرت پر تازیانہ کا کام کرتا ہے مگر بے کسی رنگ جمائے جاتی ہے اُسے سنگترہ حاصل کرنے کی تمام راہیں مسدود نظر آتی ہیں۔

تھوڑی دیر کی رائگان خاموشی کے بعد پھر وہ گنگنانے میں مصروف ہو گیا۔ اُس کی بے معنی گن گن سے حسرت و یاس ٹپکتی تھی، اور اس دردناک منظر کو اور بھی اداس کر دیتی تھی۔ اس گنگناہٹ کی صورت کو معانی سے پیوند دیا جائے تو وہ گیت صورت پذیر ہوتا تھا جسے اُس نے خود تیار کیا تھا اور جس کے گنگنانے میں وہ اپنی

پُرالم زندگی کو یک قلم بھول جاتا تھا۔ یہ گیت نہ صرف شاعری بلکہ موسیقی کے اعتبار سے بھی ایک احسن تصنیف کا قابلِ تحسین نمونہ تھا۔ لیکن نوخیز مصنف اپنی متاعِ گرانمایہ کی قدر و قیمت سے بیگانہ نہ تھا۔ اس گلوگیر گردوپیش کے ناتمناہی سلسلہ سے تنگ آگیا تو اس نے کھڑکی سے جھانک کر اپنی نگاہوں کے لئے کوئی اور فضا پیدا کرنی چاہی نیل گوں آسمان پر سورج سنہری پوڈر بکھیر رہا تھا۔ آبِ رواں سے ہوا اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔

کارخانوں کی سر بفلک چمنیوں سے دھواں نکل کر آسمان کی خبر لا رہا تھا۔ سڑکوں پر کوئی آرہا تھا کوئی جارہا تھا۔ دوکانوں پر خریداروں کا جمگھٹا تھا۔ کوئی خریدتا تھا کوئی بیچتا تھا۔ گاڑیوں کا تانتا بندھا تھا۔ ڈھور باربرداری کے فرائض بڑی بردباری سے بجالا رہے تھے۔ پرند فضا میں چکر کاٹ کاٹ کر دانے دنکے کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ غرض کائنات کا ہر ذرہ اپنے فرائض کی بجا آوری اور روزی پیدا کرنے میں سرگرم تھا مگر اس وسیع گیند پر ایک گوشہ ایسا نہ تھا جہاں پاٹری کسبِ معاش کے لئے تگ و دو کر سکے۔ سب کل پرزے مصروفِ کار تھے۔ کارخانۂ قدرت میں ایک بےکار ایک عضوِ معطل صرف پاٹری کی ذات تھی۔ اتنے میں ایک بڈھا بڑے بڑے اشتہاروں کا بستہ بغل میں دابے، ایک ہنڈیا ہاتھ میں لئے آنکلا۔ اُس نے سامنے والی دیوار کو غور سے دیکھا اور ٹھہر گیا۔ پھر اُس نے ایک قدِ آدم اشتہار وہاں چسپاں کیا اور چلتا بنا۔ پاٹری کی آوارہ نگاہیں اشتہار پر جم گئیں اور اس کے علم میں یہ اضافہ ہوا کہ اس شب کو میڈم ہلبرن ایک ایوانِ موسیقی میں نغمہ سرا ہونگی

اس اشتہار کے مطالعہ نے جلتی آگ پر تیل ڈال دیا۔ بیم و رجا کی کشمکش زیادہ تیز و تند ہو گئی۔ کاش میں بھی میڈم کا گانا سن سکتا" ایک نیا زخم تھا جس کا مرہم اس کے گیت کے پاس نہ تھا۔ آخر درد اس حد سے تجاوز کر گیا جب بقولِ حکیم غالب وہ دوا بن جاتا ہے۔ پاٹری نے ایک غبار آلود آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سنہرے بالوں کو سنوارا، ٹوپی سر پر رکھی اور لکڑی کے ایک پرانے اور بےرنگ و روغن صندوقچے سے چند بوسیدہ اور رنگ پریدہ کاغذ جیب میں ڈال کر گھر سے باہر نکل گیا۔

اس عالی شان محل میں وہ سب سامانِ عیش و تنعم مہیا ہے جو دولت کے اشارے پر لگا رہتا ہے۔ فرش فروش، آرائش زیب و زینت مبالغے اور سلیقے کے درمیان ٹھٹھر کر رہ گئی ہے۔ ضروریاتِ راحت و آرام کی بوقلمونی قدرت کو جنتِ جدید کی طرح اندازی کا مشورہ دیتی ہے۔ اس محل کی جلوہ گاہ میں ایک پری پیکر کمرے کے قدِ آدم آئینوں میں عکس افگن ہے۔ اور "کثرت میں وحدت" کی حقیقت پر وعظ کہہ رہی ہے۔ سرمایۂ ہوش و

خرد کو پریشان کرنے کا سامان ہنوز کندھوں پر جھول رہا ہے۔ نیم باز آنکھیں طمانیتِ قلب کا اظہار کر رہی ہیں سفید ریشم سے بدن پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہے۔ غرض حسنِ نسوانی کے جملہ نوادر کی نمائش اس مجسمہ میں بند ہے۔ سامنے ایک تپائی پر ایک سونے کی گھنٹی پڑی تھی۔ اس پر انگلی رکھی۔ ایک دلکش آواز سے کمرہ معمور ہو گیا۔ خادم باادب حاضر ہوا۔

مغنیہ نے کہا "کون ہیں آپ؟ ان ملاقاتوں سے دم ناک میں آگیا ان کے نزدیک مغنیہ اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ شب کو گاتی رہے اور دن بھر اُن کی نقرلفیوں پر سر دھنتی رہے (ذرا خاموشی) جیمز تم بڈھے ہو گئے مگر کسی کو ٹالنا نہ آیا"۔

"حضور کیا عرض کروں۔ سرکار کی بدولت کیا نہیں آتا مگر معصوم بھولے بھالے لڑکے کے سامنے کس منہ سے جھوٹ بولوں۔ ورنہ میری سخن سازی کا لوہا بڑے بڑے لارڈ مانتے ہیں"۔

"وہ یہ بات ہے تو آنے دو اُسے۔ بچوں کا دل توڑنا مجھے بھی گوارا نہیں"۔

پاٹری ایک ہاتھ میں کاغذ اور دوسرے میں ٹوپی پکڑے داخل ہوا جھک کر آداب بجالایا اور اُس کی جنبشِ ابرو پر کہنے لگا "اور اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ اماں بیمار ہیں، اور ہمیں کھانا تو رہا ایک طرف دوا تک خریدنے کی توفیق نہیں۔ اس امید پر آیا ہوں کہ اگر آپ ایک دفعہ میرے اس گیت کو گانے کا شرف عطا کریں تو ممکن ہے کہ کوئی اس کا حقِ تصنیف خرید لے اور میں اماں کے لئے دوا اور سنگترہ خرید سکوں"۔

سروقد حسینہ مسکراتی ہوئی اٹھی۔ اُس نے پاٹری سے کاغذ لے کر اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ مگر اس ایک نظر نے اُسے جتا دیا کہ یہ گیت سرسری نظر سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ اس لئے پہلے تو اس نے یونہی گنگنا کر اس کی موسیقیت کا امتحان کیا پھر دوڑی دوڑی گئی اور پیانو پر گا کر پرکھا اور الٹے پاؤں واپس آکر کہنے لگی۔

"یہ گیت تم نے لکھا ہے! بس اور الفاظ کا یہ حسنِ انتخاب! اچھا تو آج شب گانا سننے آؤ گے"۔

"شوق سے، مگر اماں ——"

"میں کسی کو تیمارداری کے لئے بھیج دوں گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔ یہ لو دس شلنگ۔ ان سے فی الحال دوا اور خوراک خرید لو اور یہ ٹکٹ ہے اسے دکھا کر تم میرے پاس پہنچ جاؤ گے"۔

پاٹری رخصت ہوا تو اُس کی رفتار میں فرق تھا۔ سورج کی روشنی زیادہ روشن اور دنیا رہنے کے قابل نظر آتی تھی۔ وہ چیزیں جن کے نہ مل سکنے کا خیال اُسے قناعت کی تلقین کرتا تھا اب اسے لوازمِ حیات سے معلوم ہوتی تھیں۔ دوا اور سنگتروں کے علاوہ اُس نے اتنی چیزیں خرید یں کہ دس شلنگ ٹھکانے لگ گئے۔ گھر آیا اور چیزیں سامنے رکھ کر ماں سے لپٹ گیا۔

پائری کو آج کا دن معمول سے زیادہ لمبا معلوم ہوا کم بخت کٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ آخر آفتاب نے سرمایہ دار سی روتابی کر کے مزدور کے حال پر رحم کھایا اور خدا خدا کر کے دنیا کا پیچھا چھوڑا۔ پائری نے کھانے سے فرصت پائی ہی تھی کہ ایک ڈاکٹر ایک نرس کو لے کر آپہنچا اور بیمار کے آرام کا انتظام کرنے لگا۔ ماں کی نگہداشت سے مطمئن ہو کر پائری نے ایوانِ موسیقی کا رخ کیا۔ داخل ہوا تو اُسے اور ہی دنیا نظر آئی۔ بجلی کی روشنی کی چمک اور خواتین کے جواہرات کی دمک نے ایوان کو رشکِ فلک بنا رکھا تھا۔ کوئی نشست خالی نہ تھی۔ اور یہ جمِ غفیر ہمہ تن گوش ہو کر پردے کی طرف ٹکٹکی باندھے تک رہا تھا۔ آخر ساز چڑھے۔ حاضرین کی نشست گاہ میں روشنی برائے نام رہ گئی۔ پردہ اٹھا تو ایک ماہ جبیں جلوہ فگن تھی۔ اس کے حسنِ گلوسوز کو دیکھ کر یہ محوِ حیرت دنیا خراجِ تحسین ادا کرنے میں کھو سی گئی اور اُسے دھیان تک نہ رہا کہ اس مجسمۂ رعنائی وزیبائی کا فرض صرف بصارت افروزی نہیں بلکہ سماعت پروری بھی ہے۔

یہ عالم دیکھ کر دم بخود پائری کا ننھا سا دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا۔ پہلے ہی اسے کچھ شک سا تھا۔ اب تو بالکل ناامید ہو گیا کہ یہ خاتون ایسے پُروقار مجمعے کے سامنے اُس کا گیت گانے کو کیونکر روا رکھے گی لیکن پیانو کی دلکش صدا نے خشک دھانوں پر پانی ڈالا اور وہ سمجھ گیا کہ اس کے پردوں میں اس کا گیت بول رہا ہے۔ گانا کیا تھا ایک بولتا ہوا جادو تھا جس نے حاضرین کی سدھ بدھ ہی چھین لی، اور یہ قصرِ تعیش ماتم خانہ کی صورت سوگوار نظر آنے لگا۔ سیدھے سادھے الفاظ میں سوز و گداز اور رقت کے ایسے نشتر پوشیدہ تھے کہ حاضرین کے دل میں اتر گئے۔ بڑے بڑے گھاگ نغمہ نواز معترف تھے کہ انہوں نے آج تک ایسا پُراثر اور درد انگیز گیت نہیں سنا۔

پائری اس غیر متوقع کامیابی سے مدہوش ہو رہا تھا۔ وہ کئی دفعہ اس حقیقت کو خواب سمجھا۔ اُسے کچھ معلوم نہ ہوا کہ وہ کب ایوانِ موسیقی سے نکلا اور کب گھر پہنچا۔

دوسرے دن پائری یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میڈم ملبرن کی شاہانہ گاڑی نہ صرف اُس کے مکان کے سامنے آ کر رک گئی، بلکہ میڈم اس کے مکان میں آ داخل ہوئی اور ایک شکستہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ پائری کو اُس نے گود میں لے لیا۔ اور اس کے سنہرے بالوں میں اپنے ہاتھ سے شانہ کرتے ہوئے اُس کی ماں سے کہنے لگی "بی بی تمہارے بیٹے نے تمہاری عسرت کو تمول سے بدل دیا ہے۔ مبارک ہے وہ ماں جسے خدا نے ایسا بیٹا عنایت کیا۔ آج صبح لندن کے ایک مشہور ناشر نے اس کے گیت کے عوض ساڑھے چار ہزار روپے کی رقم پیش کی ہے اور عہد کیا ہے کہ جب اس کی فروخت سے ایک خاص رقم وصول ہو جائے گی تو پائری شریکِ منفعت شمار ہو گا۔ تمہارا بچہ حقیقی معنوں میں ہمیندر حمٰن ہے۔ لو بنک کی کتاب اور دل کھول کر خرچ کرو۔"

نور الٰہی
محمد عمر

اے سکھی

اے سکھی! راز و نیاز کے وہ گوناگوں محسوسات جو تیری موجودگی میں سراپا راحت تھے اب مجھے محض پُرالم خواب معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے خیال کی نیرنگیاں تھیں!

کون جانتا تھا کہ کسی دن میں اور تو ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے!

لوگ کہتے ہیں پریت کے جالوں میں پھنس کر تو نے میری محبت کے اُس تار کو توڑ ڈالا ہے جو میرے اور تیرے من کو ایک کئے ہوئے تھا، کیا واقعی وہ ٹوٹ گیا اور اب تجھے میرے دل کی دھڑکن نہ سنائی دے گی؟

سچ بتا میری سکھی! آج جب کہ میرے دل کے مندر میں گم کردہ مسرتوں نے ایک شورش بپا کردی ہے کیا اس وقت تو میرے ان جذبات سے محض بیگانہ ہے؟

اے سکھی! خزاں کے موسم میں، جب سورج افق مغرب میں غائب ہوگیا تھا اور تو مجھ سے مل کر آہستہ خرامی کے ساتھ واپس جارہی تھی تجھے نہیں معلوم (آہ تو نے پھر کر میری طرف نہیں دیکھا تھا) کہ میں نے تیری واپسی کی راہ میں کتنے موتی بکھیرے! میں دور تک تیرے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

اے سکھی! تو نے اپنی محبت پر میرے دل کا آرام قربان کردیا مگر میں تجھ کو بے وفا نہ کہوں گی کیونکہ ریت کے دیوتا نے تیری طرف دیکھا اور تو ان نگاہوں کی طرف کھچی چلی گئی!

آہ! ایک شام تھی جب تو مجھ سے بچھڑ گئی اور مجھے نہیں معلوم کہ اب کون دن آئے گا جب میرے خیال کی تاریک بستیوں میں تیرے ملاپ سے ایک نور افشاں روشنی کی نمود ہوگی۔ نہ معلوم فطرت کے دھیان میں اس پریم کی تجلی کا کون سا وقت ہے!!! تو چلی گئی! تیرے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد مجھے مطلق ہوش نہیں کہ کیا ہوا تھا ـــــ شاید میں تھوڑی دیر کے لئے کھوسی گئی مگر اب میرا اضطراب نہ پوچھ؟ میں نہیں جانتی اے سکھی! کہ اب دنیا میں کیا ہوگیا ہے!

آہ! نہ معلوم کیوں یہ دنیا کے راہ و رسم دو محبت کرنے والوں کے درمیان خلیج بن کر حائل ہو جاتے ہیں اس لئے میں جانتی ہوں کہ کسی محبت کا ایک آتشین ہاتھ تجھ کو مجھ سے چھین کر لے گیا۔ مگر میں حیران ہوں کہ میرے دل نے پندارِ مسرت کیوں چھوڑ دیا؟ اسے کس سماوی طاقت نے مجبور کر دیا ہے!!!

اے سکھی تیری جدائی کی الم خیز لذتوں نے، شاید دنیاوی مناظر کا دلکش رنگ سلب کر لیا ہے۔ وہ تمام نظارے جو تیری موجودگی میں مسرت نواز معلوم ہوتے تھے۔ مجھے اب ذرا بھی تسکین فزا نہیں محسوس ہوتے!

مگر یہ کیوں؟ اے میری سکھی! یہ تمام دلی بے چینیاں کیوں؟ صرف اس لئے کہ تُو مجھ سے دور ہے۔ موسم بہار کی دلفریبیاں اب میرے لئے ناخوشگوار ہو گئی ہیں۔ جب میں غنچہ کو چٹکتا ہوا دیکھتی ہوں تو مجھے تیرے نرم و خوش آیند قہقہوں کا خیال آ جاتا ہے اسی طرح جب بلبل کوئی موسمی راگ گاتا ہے تو مجھے وہ گیت یاد آ جاتے ہیں جو میں اور تو ہم آواز ہو کر گایا کرتے تھے!

اے سکھی! کیا تو وہ دلفریب رات بھول گئی جب پھولوں میں نکہت تھی۔ جب چاند کی ترنم پاش روشنی چھائی ہوئی تھی۔ جب راہ نورد ستارے بھی ٹکٹکی باندھے ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور جب بلبل کی میٹھی میٹھی لوریاں سُن کر کائنات بھی سوئی ہوئی تھی ——— اُس رات چمن کا ایک پرنور ستارہ ——— چاندنی کا ایک نازک پھول ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں اسے توڑنے کے لئے لپکی لیکن تو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "حسن کچھ دور ہی سے نظر افروز ہوتا ہے"!

میں رک گئی لیکن میرا دل مچلا جاتا تھا کیونکہ چاہت کو ہمیشہ حصول کی آرزو رہتی ہے!

بس اے سکھی! وہی میرے اور تیرے ملاپ کی آخری رات تھی جس کا خیال میری دلسوزی کے لئے تازیانہ ہے۔ رقص موسیقی کے بغیر ہمیشہ تشنہ رہتا ہے! پھر میں تجھ سے جدا ہو کر کیسے شاد رہوں۔ میں نے تو تیرے بغیر کبھی کسی منظر کا لطف نہیں اٹھایا!!!

اے سکھی! یہ ایک سہانی شام ہے جنگل میں کیف چھایا ہوا ہے۔ آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ دھندلی سی سرمئی نقاب کے نیچے نوزائیدہ چاند "ماہ پارہ" بن کر چمک رہا ہے اور اس کے گرد تاروں کے پھیلے ہوئے شرار، بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کے نیل پر ایک افشاں چھڑک دی گئی ہے!

سماوی سطح ہموار و نظر فریب ہے لیکن متبسم و گلریز صحرا تو خوبیوں کا مرقع بنا ہوا ہے، جہاں لطیف اور تازہ ہواؤں نے عجیب ترنم زا کیفیت پیدا کر دی ہے۔ خوشنما اور دلفریب پھولوں پر آج غیر معمولی نکہت ہے۔ ندی کی لہریں برابر لوٹ رہی ہیں اور کبھی کبھی ان کے ٹھہرنے پر معلوم ہونے لگتا ہے کہ پانی کی عمیق گہرائی فلک تمثال بن گئی ہے!

خاموش جنگل میں، دریا کے کنارے پر معلق، خدا جانے کتنی کافوری شمعیں روشن ہیں یعنی جگنو تیز ہوا سے ٹکرا ٹکرا کر نیچے گرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے تارے ٹوٹ کر گر رہے ہیں!

آہ! کہیں پپیہا گا رہا ہے مگر اس کا وجد آفریں ترانہ مجھے اب ایک دل سوز نغمہ معلوم ہوتا ہے!

مجھ سے بہت دور کہیں آبشار الاپ رہے ہیں لیکن اُن کے راگ میرے لئے اب ایک "ماتمی لَے" ہیں! جس میں ربابِ دل کے غمگین تاروں کو چھیڑ دینے کے سوا، کوئی اور حلاوت نہ ہو! مجھے ہوا کی شوخیاں بھی ناپسند ہیں اور پھولوں کی مسکراہٹ سے ایک غمناک خیال میری روح میں نفوذ کر رہا ہے۔ آہ کائنات اپنی حسن آرائی کے لئے کوئی موقع و محل نہیں دیکھتی!

ملائم و نازک گھانسیں بھی میرے لئے آرام دہ نہیں محسوس ہوتیں۔ ندی کا خرامِ عشوہ پاش برابر جاری ہے اور میں نہیں جانتی کہ اس کی لہریں میرے کتنے آنسوؤں کو بہالے گئیں ہیں!

یہ شام نہ جانے کیوں اتنی دلفریبیاں لے کر طلوع ہوئی ہے جو حسن کو نظارہ کا آرزومند کر دے لیکن آہ مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں کیونکہ میں بہار کے سارے لطف بھول چکی ہوں۔ اے سکھی! گزر جانے والی رات میری آنکھوں میں سما گئی ہے جب تو میرے ساتھ تھی۔ اب کوئی منظر میری نگاہوں میں نہیں سماتا۔ جب تو ساتھ نہ ہو تو ایک اکیلی، تیری سکھی، کس چیز سے دلچسپی لے؟ کیونکہ اے سکھی! بہار کے بغیر تو، کبھی بلبل بھی چمن میں نہیں آیا کرتی!

اے کاش! وہ مسرت بار لمحے پھر پلٹ آئیں جن میں تو مجھ سے ملنے آیا کرتی تھی۔ کاش تو پھر اسی اندازِ خرام سے واپس آجائے!

تجھے ان لہروں کی سوگند! بتا؟ اے میری اچھی سکھی کہ تو کب آئے گی؟ کیا تو اس لئے نہیں آتی کہ میں نے تیری واپسی کے لئے، ندی کے کنارے سے کوئی نایاب تحفہ نہیں چنا؟

دنیا میں نایاب تحفے تو شاید یہی ہیں، پھولوں کی کلیاں، مسرت کے الفاظ، محبت کے جذبات، موتیوں کی لڑیاں اور ستاروں کی بندیاں مگر سب اپنی جگہ پر خوبصورت و نظر فریب ہیں اس لئے میں ان میں سے کس کو انتخاب کرتی؟؟

ہاں مجھے یاد آتا ہے کہ تجھے چھائے ہوئے آسمان کے بکھرے ہوئے ستارے بہت پسند تھے مگر میں تیرے لئے تاروں کے سنہرے گوہر کہاں سے پاؤں؟

اچھا سُن اے سکھی! میں اپنے اشکوں کا، اُن اشکوں کا جو میں نے تیری یاد میں بہاتے ہیں قطرہ قطرہ جمع کرکے اُن کی لڑیاں پروؤں گی اور اے سکھی! جب تو واپس آئے گی تو میں یہ ہار تیرے گلے میں ڈال دوں گی!!

خاک نشیں

تہذیب فاطمہ عباسی

محفلِ ادب

ملی جلی بولی

۱۹۲۹ء کی آل انڈیا ہندی پرچار سبھا کے صدر ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری تھے۔ اُن کا خطبۂ صدارت جہاں ہندوستانی زبان کی ترقی اور اصلاح کی مؤثر تجاویز کا حامل ہے وہاں ادبی لحاظ سے بھی ایک نہایت دلکش اور بلند پایہ چیز ہے۔ ہم اس کا اقتباس یہاں درج کرتے ہیں:-

ہم ایک ملی جلی ہندوستانی زبان کے پھیلانے کی ترکیبیں سوچنے اور اس راستہ میں جو دشواریاں اور کٹھنائیاں ہیں ان پر غور اور وچار کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔

اس ملی جلی زبان کی بابت میں دو باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ ایک تو خود زبان کی شکل صورت دوسری اس کی لکھن کی بابت۔ پہلے خود زبان کو لیجئے۔ کوئی بھاشا یا تو بولنے والوں کے دل کی حالت اور جذبات کو ظاہر کرتی ہے جسے نہ کوئی روک سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے۔ یا پھر یہ اس کا ذریعہ ہوتی ہے کہ دن رات کی زندگی میں جو ضرورتیں پڑیں ان کو ایک دوسرے پر ظاہر کرسکیں۔ بھاشا ان دونوں صورتوں میں سے کیسے پیدا ہوئی اس کی بابت کسی کا کوئی خیال ہو ہندوستانی بھاشا کے لئے تو ہر حالت میں ایک ہی راستہ پر آگے بڑھنا ہے۔ ہم اگر یہ مان لیں کہ ملی جلی زبان اپنی اصلی غرض کی وجہ سے کبھی بھی صرف ایک گروہ کی زبان نہیں ہوسکتی جس میں دوسرے گروہ کی بھاشا ذرا بھی ملی نہ ہو تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم کسی گروہ کے اچھے لکھنے والوں کا یہ حق چھینے لیتے ہیں کہ وہ اپنے خاص انوکھے انداز میں لکھیں اور اس طرح بھاشا کے خزانے کو مالا مال کریں۔ ہاں یہ بات ضرور غور کرنے کی ہے کہ جان بوجھ اور سوچ سمجھ کر اچھے لکھنے والے کہاں تک زبان میں دخل دیں۔ اور میں اس پر اس جگہ زیادہ کہنا نہیں چاہتا لیکن یہ تو سب مانیں گے کہ آپس میں میل جول سے جو ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں اُن کا زبان پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ معاشی اور آرتھک ضرورتوں سے بھاشا میں کتنے ہی نئے نئے لفظ آجاتے ہیں اسی میل جول سے چھوٹے چھوٹے گانوؤں کی زبان بڑھ کر صوبہ کی زبان اور یہ بڑھ کر ساری قوم سارے دیس کی زبان بن جاتی ہے۔ یہی نہیں کہ ایک جگہ اور دوسری جگہ کی زبان الگ ہوتی اور پھر مل جل کر ایک بنتی ہے خود سماج میں ایک حصہ ایک طرح بولتا ہے اور دوسرا دوسری طرح۔ گانوں کے کسان اور شہر کے شہری بات چیت کا اپنا

اپنا انداز رکھتے ہیں شاعر اور کوی بھاشا میں اپنی جدا رسم بنا لیتے ہیں۔ اپدیش اور وعظ کہنے والے اپنا الگ رنگ نکال لیتے ہیں مگر پھر بھی یہ سب مل جل کر ایسی بھاشا بنا دیتے ہیں جو سب کی سمجھ میں آتی ہے اور جسے سب مان لیتے ہیں اور یہ سب کچھ چپکے چپکے ہوتا رہتا ہے۔ بھاشا کے جو بولنے والے سچ مچ کوئی اچھی بات یا کوئی بری بات کہتے ہیں یا کسی بات کو اوروں سے اچھی طرح کہہ دیتے ہیں انہیں کا طریقہ سب کو بھاتا ہے اور سب اسی پر چلنے لگتے ہیں۔ مدرسے، اخبار، کتابیں، ناٹک یہ سب چیزیں اپنے اثر سے زبان کو ایک سا بنانے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ پر اگر ان اثروں سے کوئی بھی جان بوجھ کر اس کی فکر کرے کہ کسی ایک گروہ کی زبان تو ملی جلی بھاشا میں زیادہ آجائے اور دوسرے کی اس میں ذرا نہ ملنے پائے، کسی ایک پیشہ والے کے شبد تو لے لئے جائیں اور دوسرے کے نہیں۔ کسی ایک صوبہ کی بات چیت کا انداز بھاشا میں جان بوجھ کر ملایا جائے دوسروں کا نہیں، تو پھر یہی سب چیزیں قومی راشٹری بھاشا کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ یہی بات ہے کہ میں ان کوششوں سے بہت ڈرتا ہوں جو ہندوستانی زبان کو مسلمانوں کی زبان بنانے کے لئے عربی لفظ ٹھونس کر اور ہندوؤں کی زبان بنانے کے لئے سنسکرت ملا کر کی جاتی ہیں۔ جو لوگ اپنے دیس کے لوگوں سے بات چیت ہی نہیں کرنا چاہتے اچھا ہے کہ وہ عربی یا سنسکرت ہی کو اپنی زبان بنا لیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ ان زبانوں میں بھی کچھ بہت نہ کہہ سکیں گے۔ مگر خیر ان کی خوشی۔ مگر وہ ایک ملی جلی ہندوستانی زبان کی جڑ کیوں کاٹتے ہیں؟ انہیں اگر عربی یا سنسکرت سے بہت لگاؤ ہے تو وہ ہندوستانی زبان کو ہندو مسلمان راجا اور پرجا اوتر اور دکھن کے رہنے والوں کی ملی جلی زبان بننے سے کیوں روکتے ہیں ..... اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ ننھا سا بچہ جو اسی میل کے لئے پیدا ہوا تھا کیسے بڑھے گا۔ ہندوستانی بھاشا نہ عربی ہے نہ سنسکرت، اور نہ ہو سکتی ہے، یہ تو بس ہندوستانی ہے یعنی اس بڑے دیس کے سب رہنے والوں کی زبان جس میں سب ایک دوسرے کی بات سمجھیں جس پر سب کو ناز ہو جس کی سیوا میں سب کا حصہ ہو پر جس پر پورا قبضہ کرنے کا حوصلہ کوئی نہ کر سکے جو لوگ ہندوستانی زبان کا پرچار کرتے ہیں ان کا پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ اس میں زبردستی ایسے عربی اور سنسکرت لفظ نہ ملنے دیں جن سے یہ سب کی زبان نہ رہنے پائے اور کسی ایک فرقہ کی زبان بن جائے۔ اس لئے کہ سب کے میل جول کی یہاں تو ملی جلی زبان ہونی چاہئے۔

میں نے جو کچھ کہا اس سے آپ یہ سمجھیں گے کہ میں بھاشا کو بس کام کاج کے لئے ضروری جانتا ہوں کہ ایک آدمی دوسرے سے اپنا مطلب کہہ سکے، منڈی اور بازار میں اپنا لین دین کا کام نکال سکے اور اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ بھاشا سہل اور سادہ، اور سب کی سمجھ میں آنے والی اور سب کے لئے ایک سی ہو۔ ہاں آپ کا یہ سمجھنا بہت کچھ ٹھیک ہے۔ میں بے شک بھاشا کا یہ کام سمجھتا ہوں پر خالی یہی نہیں سمجھتا۔ الگ الگ دیسوں کے لوگوں میں بات

چیت کے لئے جو زبانیں لوگوں نے بنائی ہیں جیسے مولینا کی سماری زبان یا امیرانتو جس میں ہر چیز کے آخر میں "وہ" ہر صفت کے آخر میں "آ" ہر کام کے نام کے آخر میں "ای" سارے حکموں کے آخر میں "او" ہے یا اسی طرح، او میں نہیں چاہتا کہ آپ ہندوستانی بھاشا کو کتر بیونت کر ایسا باقاعدہ کردیں۔ میں مانتا ہوں کہ کاروبار، کام کاج سے آگے بڑھ کر ہر زبان اپنے آپ کو خوبصورت اور سندر بنانے کا بھی حق رکھتی ہے۔ ہر زبان کے ٹکڑوں میں آپس میں ایسا رشتہ ہوتا ہے جو بس اسی میں ہوتا ہے اور کسی میں نہیں ہوتا اور ہر زبان کو اس خوبصورتی کے پیدا کرنے کا حق ہے پر میرا یقین ہے کہ جہاں کہیں آدمی اپنے دل کے حال کو اچھی اور خوبصورت اور سندر طرح سے دوسروں پر ظاہر کرتا ہے، چاہے بھاشا میں چاہے تصویروں میں، چاہے بات میں چاہے راگ میں چاہے بڑی بڑی عمارتوں میں۔ جو چیز سچی طرح سندر ہوتی ہے اس کا کسی نہ کسی مفید اور کام کی چیز سے ضرور بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ بھاشا میں بھی حسن اور خوبصورتی کام کی باتوں کے ساتھ چل سکتی ہے، نہیں تو یہ ممکن ہے کہ بھاشا ضرورت سے زیادہ خوبصورت، ضرورت سے زیادہ بناوٹی ہو جائے۔ بہت زیادہ لکھے پڑھے بن بن کر باتیں کرنے والے ہمیشہ زبان کو ایسا ہی بناوٹی بنا دیتے ہیں پر ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ لوگ زبان کے کچھ بہت بڑے دوست نہیں ہوتے۔ کام کی بات اور بناوٹ سجاوٹ میں جب آپس کا رشتہ کمزور ہو جاتا ہے تو زبان نیچے گرنے لگتی ہے، ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھانے کی ضرورت اپنا راستہ لیتی ہے اور بناوٹ سجاوٹ اپنا۔ عام لوگ پہلی کے ساتھ ہوتے ہیں، بہت پڑھے لکھے دوسری کے ساتھ، لیکن جدائی سے زبان کے دونوں حصے بڑے ٹوٹے میں رہتے ہیں۔ لیٹن زبان کا حشر یہی ہوا۔ یونانی اور سنسکرت پر یہی گزری۔ میرے نزدیک تو کسی زبان کے اوپر بڑھنے اور نیچے گرنے کی اس سے بہتر کوئی نشانی نہیں کہ اس میں کام کی بات اور بناوٹ سجاوٹ میں کیا تعلق ہے۔ جب کوئی قوم بنتی ہوتی ہے۔ جب بڑی بڑی باتیں اور نئے نئے خیال سب تک پہنچانے ہوتے ہیں، جب آپس کے جھگڑے مٹنے مٹانے ہوتے ہیں، جب سب چیزوں کی کایا پلٹنی ہوتی ہے تو زبان کو سہل اور سادہ رہنا پڑتا ہے اور بناوٹ سجاوٹ دور کھڑی رہتی ہے۔ پر جب قوم بن جاتی ہے ترقی کے رستے پر پڑ لیتی ہے یا چین سے دن کاٹتی ہے، جب مدت بڑھ جاتی ہے، لوگ سب ایک طرح رہنے سہنے لگتے ہیں رسم و رواج سب میں ایک سے ہو جاتے ہیں تو زبان میں بناوٹ سجاوٹ کے دن آتے ہیں، ہم تو ابھی اپنی قوم بنا رہے ہیں ہماری زبان کو سہل اور سادہ رہنا چاہئے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس سادگی کے ساتھ جس کے لئے میں آپ سے کہہ رہا ہوں آپ کی بھاشا سندر اور خوبصورت اور زوردار نہیں ہو سکتی۔ ضرور ہو سکتی ہے۔ پر تب ہی کہ یہ آدمی آدمی میں بس اپنا کام نکالنے کے لئے بول چال کا

کا ذریعہ نہ ہو بلکہ دل کے اندر بھری ہوئی آگ کی گرمی ہو جو باہر نکلے۔ دلوں کے اندر لہریں مارتے ہوئے دریا کا بہاؤ ہو جو سینہ میں نہ سما سکے اور باہر بہ نکلے۔ ہندوستانی زبان کے لیئے دل کی یہ گرمی اور خیالات کا یہ بہاؤ ایک ملی جلی ہندوستانی قوم کے خیال سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لیئے کہ ہندوستانی زبان اسی ملاپ کا نشان ہے، ہم میں یہ خیال جتنا سچا ہوگا اور اسی خیال کے ساتھ جن چیزوں کو لگاؤ ہے جب وہ بڑھیں گی تو ہماری زبان میں بھی گرمی اور خوبصورتی آئے گی۔ قوم کو جن چیزوں سے لگاؤ اور جن باتوں سے پریم ہوتا ہے اُنہی کا روپ اُس کی زبان کی خوبصورتی اور زور میں دکھائی دیتا ہے۔

اب رہا لکھن کا سوال میں جہاں لفظوں کے معاملہ میں ہندو مسلمان دونوں سے چاہتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کا خیال کریں اور اپنا الگ الگ خاص حق نہ جتائیں اور زبان میں جس جس جگہ سے ہو سکے ایسے لفظ لائیں جو ہماری بھاشا کے رنگ سے میل کھاتے ہوں، ہاں لکھن کے معاملہ میں ہندو یا مسلمان کسی سے نہیں چاہتا کہ وہ اپنی لکھن چھوڑ دیں۔ میں نے اپنی سواگت سمیتی کے سبھاپتی کی وہ بات بڑی دلچسپی سے سنی جو انہوں نے مسلمانوں سے کہی ہے کہ وہ عربی لکھن چھوڑ کر دیوناگری لکھن اختیار کرلیں۔ انہوں نے یہ بات دل سے کہی ہے اور صاف صاف کہی ہے، جسے میں بہت پسند کرتا ہوں لیکن میرا خیال ایسا نہیں ہے۔ میرا یقین ہے اور میں نے کانگریس کے سبھاپتی کی حیثیت سے بھی یہی کہا تھا کہ ہندو مسلمانوں میں جو سیاسی یا مذہبی بگاڑ ہے وہ اصل میں ایک زیادہ گہرے مقابلہ کی اوپری شکل ہے جو ہندوستان کے سوا اور ملکوں میں بھی رہا ہے اور تاریخ جس سے ناآشنا نہیں یہ دراصل دو الگ تہذیبوں کا فرق ہے جو ایک دوسرے سے آ کر ملی ہیں۔ اس بگاڑ کو دور کرنے کی سب سے اچھی شکل میرے خیال میں یہ ہے کہ ہر تہذیب کو باقی رہنے کا حق دیا جائے، آپس میں رواداری اور ایک دوسرے کی عزت پیدا کی جائے اور ایسے موقع نکالے جائیں کہ دونوں آپس میں مل کر ایک دوسرے کی دل کی لگی کو سمجھ سکیں۔ اس میں ہندوستان کا سیاسی بھلا ہی نہیں دیکھتا بلکہ اس کی تہذیب اور تمدن کی ترقی کے لیئے بھی یہی ضروری ہے کہ اس دیس میں جتنی قومیں آباد ہیں اُن کے تمدنوں کو اپنی اپنی جگہ پر رہنے اور پھلنے پھولنے کا حق دیا جائے تاکہ آنے والی ہندوستانی تہذیب کے دل لبھانے والے راگ میں ہر ایک اپنا اپنا سر ملا سکے۔ یہ ضروری ہے کہ اس میں دیر لگے گی مگر تمدنوں کا ملنا اور بدلنا کوئی بازیگروں کا کھیل اور تماشا نہیں کہ جب چاہا انہیں ملا دیا اور جب چاہا بدل دیا۔ ہم میں اتنی عقل ہونی چاہیئے کہ ہم ٹھیر سکیں انتظار کرسکیں۔ مسلمانوں سے یہ کہنا کہ وہ اپنی عربی لکھن چھوڑ دیں، ان سے یہ کہنا ہی کہ تم اپنی ساری تاریخ کے سرمایہ سے ہاتھ دھو بیٹھو، اس لیئے کہ اسی لکھن کے ذریعہ تو اس خزانہ کی کنجی اس کے ہاتھ میں آئی ہے، جس میں اس کے سارے پچھلے کام رکھے ہیں۔ یہ کنجی اس سے چھین لینا خود اسی کے لیئے برا نہیں ساری دنیا کے لیئے برا ہے۔

وجدانیات

ہر جلوہ ترے حسن کی محفل نکلا ہر ذرہ ترے درد کا حامل نکلا
جب غور سے یہ ہستئ عالم دیکھی تاحدِ نظر سلسلۂ دل نکلا

کیا لطفِ نظارہ ہے یہ جلوہ کیا ہے ترکیبِ دل و دیدۂ بینا کیا ہے
کیا دیکھا نگاہوں نے، نہ دیکھو اس کو یہ دیکھو نگاہوں میں تماشا کیا ہے

خونِ دل پُرشوق بہا دیتی ہیں اشکوں سے گلِ تازہ کھلا دیتی ہیں
روتا ہوں تو سیرِ غمِ ہجراں کے لئے آنکھیں مری اک باغ لگا دیتی ہیں

"خضرِ راہ"

تعلیماتِ کبیر

۱- پھولوں کے باغ میں نہ جا، اے دوست وہاں نہ جا!
خود تیرے جسم میں پھولوں کا باغ پوشیدہ ہے۔
"تو کنول کی ہزارہا پتیوں میں اپنی جگہ بنا اور وہاں سے حسنِ لازوال کا تماشا کر۔

۲- "مخلوق برہما (خالق) میں ہے اور برہما خود مخلوق میں موجود ہے۔" وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ملے ہوئے بھی۔
وہ خود درخت بھی ہے بیج بھی اور نمو بھی وہی ہے۔ وہ خود پھول ہے۔ میوہ بھی اور سایہ بھی وہی ہے۔
وہ خود سورج ہے، روشنی بھی اور ہر وہ چیز بھی جو روشنی سے منور ہو جائے۔ وہ خود برہما ہے، مخلوق بھی اور مایا بھی
وہ خود مختلف صورتوں میں اور لامحدود مکان میں جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔
وہ خود سانس ہے، لفظ بھی اور لفظ کا مفہوم بھی وہی ہے۔
وہ خود حد ہے، خود ہی لامحدود بھی ہے، اور محدود اور لامحدود کی حدود سے بالاتر بھی ہے۔
وہ خود پاک ہے اور ہر آلائش سے مبرا ہے، وہ برہما اور مخلوق سائر و دائر ہے۔

۳- "اے پانڈے! تو کہتا کیا ہے؟ ہندو اور ترک، یہ کہاں سے آئے ہیں۔ یہ راستہ کس نے نکالا ہے؟ اپنے دل کی تلاشی لو، بہشت کہاں ہے۔ کس نے اُسے حاصل کیا ہے؟ اے بیوقوف! ان خالی خولی باتوں کو ترک کر اور رام نام جپ۔ تم تو بدمعاشی کی باتیں کرتے ہو۔ اے کبیر! جس نے آخری وقت میں رام کی حفاظت قبول نہ کی وہ سخت گھاٹے میں رہا۔"

"اردو"

مطبوعاتِ جدیدہ

پروازِ خیال - یہ جیبی تقطیع کی ایک نہایت خوبصورت مجلد کتاب ہے جسے خواجہ حمید الدین صاحب حمید لکھنوی کا دیوان کہنا چاہئیے - ابتدا میں خواجہ عبدالروف صاحب عشرت لکھنوی کے قلم سے ۵۴ صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ ہے، اس کے بعد صاحب دیوان کی مختصر التماس ہے اور پھر غزلیات ہیں جو ۲۸۰ صفحات پر ختم ہوتی ہیں - کتابت طباعت اور کاغذ کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے - ہر صفحہ دو رنگوں میں چھپا ہے، بیل دار جدول کا رنگ سرخ ہے اور مضمون کے لئے عام سیاہ روشنائی استعمال کی گئی ہے -

مقدمہ میں عشرت صاحب نے پہلے تو زبان اردو کی مختصر تاریخ لکھی ہے، پھر مرکز کا جھگڑا چھیڑا ہے اور اس سلسلہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کی "مردم ناشناسی" اور خدمتِ زبان میں عوام کی شرکت کا گلہ کسی قدر ناگوار الفاظ میں کیا ہے اور پھر حمید صاحب کی شاعری پر تنقید لکھی ہے حمید صاحب کی زبان واقعی نہایت صاف اور صحیح ہے - اشعار فن کے لحاظ سے بے عیب ہیں، لیکن ان میں کیف و اثر اور جدت و ندرت کی بہت کمی ہے عموماً مضامین بالکل سادہ ہیں - چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں :-

طور پر لطف دید کا نہ ہوا | آج تک صورت آشنا نہ ہوا

تیرے بیمار سب اچھے ہیں | کوئی منت کش دوا نہ ہوا

جلوہ گر جب تیغ لے کر سامنے قاتل ہوا | ناز کی چلا کے بولی تو بھی اس قابل ہوا

مٹ گیا چمن والو حیف ہے نشاں اپنا | تھا اسی فضا میں تو کل تک آشیاں اپنا

پروازِ خیال -

قیمت درج نہیں - ملنے کا پتہ یہ ہے :- خواجہ حمید الدین صاحب، ۹ - امین الدولہ پارک لکھنو -

"**دہلی سٹار**" انگریزی زبان کا ایک ہفتہ وار علمی، ادبی اور سیاسی اسلامی اخبار ہے جو مولوی عزیز احمد صاحب کی ادارت میں الہ آباد سے نکلنا شروع ہوا ہے اسلامیات پر اس میں بعض نہایت مفید اور پر معلومات مضامین شائع ہوئے ہیں - قومی معاملات پر آزادانہ رائے رکھتا ہے - ہمارے خیال میں مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں یہ اخبار بہت بڑا حصہ لے گا - حجم ۲۰ صفحات اور سالانہ قیمت چھ روپے بارہ آنے ہے -

"**کامیابی**" - یہ حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ دہلی کا ماہوار رسالہ ہے - اس وقت تک اس کے چھ پرچے شائع ہو چکے ہیں اس میں اچھے اچھے ادیبوں کے قلم سے تجارتی اور اخلاقی مضامین شائع ہوتے ہیں جن میں مسلمانوں کو علم و عمل کی تلقین کی جاتی ہے اور انہیں ترقی و کامیابی کے راستے بتائے جاتے ہیں - لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا ہے سرورق مصور ہے اور بلاک کے ذریعہ سے چھاپا گیا ہے حجم ۴۸ صفحات اور سالانہ چندہ دو روپے

مخزن الحساب و الجبر - یہ حساب و الجبرا کی ایک جامع کتاب ہے جس میں ورنیکلر مڈل ایس وی کلاس اور نارمل سکولوں کے نصاب کے مطابق ایک ہزار دو سو نہایت اہم امتحانی سوالات درج کئے ہیں مشکل سوالات کے حل اور حل کے متعلق ہدایات بھی لکھی گئی ہیں - اس کے علاوہ ۱۹۰۰ سے لے کر ۱۹۲۹ء تک ورنیکلر فائنل امتحانات کے پرچے بھی دیئے ہیں جن سے کتاب اور زیادہ کارآمد ہو گئی ہے - مخزن الحساب یقیناً حساب کی تمام مروجہ کتابوں کا نچوڑ ہے، اور جو طلبا اسے زیرِ مشق رکھیں گے ضرور کامیاب ہونگے - حجم ۲۵۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ کتب خانہ ناشر العلوم لاہور سے طلب فرمائیے -

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۹۳۶ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیے، اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۶ر

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینجر رسالہ ہمایوں

۲۴۔ لارنس روڈ۔ لاہور

منشی نجم الدین مینجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو انعام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

۸۹۱۵۴۳۳۵

ہمایوں جلد ۱

ہمایوں

۲۔ ۱۰۔ ۱۵